ایمان کی دوڑ

قدیم کلیسیا کا حیرت انگیز سفر

ڈی۔ بخت

ناشرین

□

بار ______________________ اول

۲۰۱٦ء

Eemaan kee DauR. Qadeem Kleesia
kaa Hairat-Angez Safar
by Dieter Becht

© 2016 Dr. Dieter Becht. This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NoDerivatives 4.0 International License.

Bible quotations are from UGV.

http://nameofurduwebsite

فہرستِ مضامین

ایمان کی دوڑ 21

1 دوڑ کا آغاز 23

ایمان کا ماحول 32

2 فلسطین: یونانی اور آرامی زبان کا چوک 33

سکندرِاعظم 34

ابتدائی کلیسیا کا یونانی اور آرامی دل 36

ایمان کا پھیلاؤ 39

3 مسیحی ایمان کی یہودی جڑیں 41

4 یہودی یا غیر یہودی کلیسیا؟ 45

کلیسیا کا پھیلاؤ 46
پطرس اور کُرنیلیُس 46
بحران ! 48
یہودی مسیحیوں کی علیٰحدگی 50

5 خوش خبری کے پہلے مبشّر 52
بارہ رسولوں کا تبلیغی کام 52
دیگر ایمان داروں کا تبلیغی کام 54

6 ایمان کا پھیلاؤ 56
مشرق کی کلیسیا 56
مشرق کی طرف بڑھنے کے پہلے اشارے 58
مشرق کی کلیسیا کی خود مختاری 61
مشرق کی کلیسیا کی ترقی و تنزلی 63
تین غیرمعمولی کلیسیائیں 67
مغرب کی کلیسیا 69

7 پھیلاؤ کی وجوہات 70
یہودی جماعتیں 71
عالمی زبان 73
سُریانی زبان 73
یونانی زبان 73
کلامِ مقدس کے دو عالمی ترجمے 73
سُریانی ترجمہ 74

یونانی ترجمہ 74
آزاد کرنے والی خوش خبری 75
تبدیل کرنے والی خوش خبری 75
چال چلن کی تبدیلی 75
محبت کا اظہار 76
مسیح میں ہر ایک کی قدر و قیمت 78
خواتین 78
غلام 78
راہبوں کا انتظام 80
عام ایمان داروں کا بے لوث حصہ 80
مدرسے 81
فلاح و بہبود 81
راستوں کا پکا انتظام 82

8 مشرقی کلیسیا کی تنزلی کی وجوہات 83
بیرونی وجوہات 83
حکمرانوں کی دوسرے مذاہب کی طرف رجوع 83
اندرونی وجوہات 84
عبادت میں سُریانی زبان پر اصرار 84
توہم پرستی 85
سیاست کی طرف رجحان 86
بشارت کی کمی 86

9 قدیم کلیسیا کی ترقی و تنزلی سے اسباق 87

اپنے لوگوں میں خدمت 87
مقبولِ عام زبان کا استعمال 88
ایمان کی آزادی پر زور 88
تبدیل کرنے والی طاقت پر زور 89
ہر ایک کی قدر و قیمت پر زور 89
راہبانہ زندگی کا آپشن 89
عام ایمان داروں کا بے لوث حصہ 89
تعلیم اور فلاح و بہبود پر زور 90
موجودہ وسائل کا استعمال 90

ایمان کا بدعت پر غلبہ 92

10 علم الٰہیات کے پیش خیمے 93

رسولی بزرگ: کلیسیائی انتظام پر زور 95
رسولی بزرگوں کی تصانیف 96
پورا زور کلیسیائی انتظام پر ہے 98
کلیسیا حقیقی اسرائیل ہے 98
رسولی بزرگوں کی کمیاں اور خوبیاں 100
دلیلی: فلسفہ کی مدد سے ایمان کا دفاع 108
یوسطین شہید: انسان میں کلام کا بیج 109
ططیان: مشرق کی سبقت اور زُہد 109
طرطُلیان: کلیسیا کا وکیل 110
دلیلیوں کے خاص مضامین 111

کلامِ مقدس یونانی لباس میں 111
یونانی استاد افلاطون 114
فیلو : مجازی تفسیر اور لوگوس 117
دلیلیوں پر افلاطون اور فیلو کا اثر 121
دلیلیوں کی خوبیاں اور کمیاں 123
عرفانیت : الٰہی آفتاب میں ڈوبنے کی راہ 124
عرفان اور عرفانیت 124
عرفانیت کی بنیادی تعلیم 126
دنیا کے بارے میں عرفانیت کی تعلیم 127
عرفانیت کہاں سے آئی؟ 129
عرفانیت سے سبق 129
مانی : نور اور تاریکی کی جنگ 131
بدعتی یہودی مسیحی : مسیح محض نبی ہے 132
مرقیون از سینوپ : کلام کے دو خدا 133
پرانے عہد نامے کا گھٹیا خدا 134
اِنجیل کا محبت بھرا خدا 135
کلامِ مقدّس کی کانٹ چھانٹ 136
مرقیون کا عرفانیت سے فرق 136
کیا مرقیون اصلاحِ کلیسیا کا پہلا نمائندہ تھا؟ 137
مرقیون سے سبق 137
مُنطانس : روح القدس پر زور 139
مُنطانی نبوتوں کو کلام پر ترجیح 140
نظم و ضبط اور پرہیز گاری پر زور 140

روح کے زمانے کی آمد 141
مُنطانس سے سبق 141
بدعت پر غلبہ: قدیم کلیسیا کے تین ستون 141
نئے عہد نامے کی تصدیق 142
ایمان کا عقیدہ 146
کلیسیا کے منصب 149

11 عقیدۂ تثلیث کی تشکیل 153
عرفانیت کے جواب میں علم الٰہیات کا آغاز 153
ایرینئیُس از لیوں: ایمان کی بہ تدریج راہ 155
ایمان حقیقت پر مبنی ہے 156
انسان اپنی عقل سے خدا کا کلام سمجھ سکتا ہے 156
خدا انسان کے قریب ہی رہتا ہے 157
کلام میں نجات کی بہ تدریج راہ پیش کی گئی ہے 157
مسیح میں پہلا آدم بحال ہو گیا ہے (خلاصہ) 159
ایرینئیُس سے سبق 160
طرُطلیان: ایمان کا وکیل 161
اُمّت سے محفوظ رکھی ہوئی سچائی ایمان کی پختہ بنیاد ہے . . . 162
ایمان کی مدافعت میں جامع بیانات 162
تثلیث کی بارے میں تعلیم 162
مسیح کے بارے میں تعلیم 163
گناہ کا انسان پر اثر 164
خدا کا فضل 164

طرطُلیان سے سبق 165
اسکندریہ کی کلیسیائی عرفانیت 166
کلیمینس: حقیقی عرفانی 167
کلامِ خدا کا دنیا کی تخلیق و تربیت میں ہاتھ 168
حقیقی عرفانی کی کلامِ خدا سے تربیت 169
کلامِ خدا کا نیا گیت انسان پر غالب آ کر اُسے توبہ تک پہنچاتا ہے 170
کلامِ خدا کے کردار کے مطابق چلنا ہے 170
عرفان کی تلاش ایمان دار زندگی کا لازمی حصہ ہے 171
کلیمینس سے سبق 171
اورِغین: بدعت کے کنارے پر مسیحی عرفانیت 175
کلام کا عالِم 177
نظام سازی کا ماہر 178
اورِغین سے سبق 181
بدعتی توحید پر لوگوس کی تعلیم کا غلبہ 184
دوسری صدی کے اختتام پر توحید پر زور 184
تبنیت کی توحید: مسیح کو بیٹا بنایا گیا 186
سبیلیت کی توحید: خدا کی تین صورتیں ہیں 187
پولس از سمیساط کی توحید: یسوع لوگوس کا مقدِس ہے 187
کلیسیا لوگوس کی تعلیم سے مدد لیتی ہے 189
آریُس پر غلبہ 189
آریُس کی زندگی 190
آریُس: خلق کیا گیا کلامِ خدا 191
آریُس کا مسئلہ 192

عقیدۂ نقایہ تک 193
عقیدۂ نقایہ: مسیح اور باپ کا ایک ہی جوہر 193
عقیدۂ نقایہ کی بظاہر شکست 194
عقیدۂ نقایہ کی فتح 195
اَتَناسیُس: انسان کو لافانی بنانے کے لئے مسیح انسان بن گیا 197
خدا باپ اور بیٹا جوہر اور رُتبے کے حساب سے ایک ہیں 198
لوگوس انسانیت کو اپنا کر موت پر غالب آیا 198
مسیح کی فتح سے فانی انسان لافانی بن گیا 199
اتناسیُس سے سبق 200
مرسیلس از انقرہ: تثلیث کا عارضی ظہور ہے 201
کپڈُکیہ کے تین بزرگ: تین اقانیم کا ایک ہی جوہر 202
تثلیث ایک بھید ہے جو صرف کلام کھول سکتا ہے 202
تینوں اقانیم ازل سے الٰہی ذات میں موجود ہیں 203
خدا کی ذات اور ظہور میں امتیاز 203
کپڈُکیہ کے بزرگوں سے سبق 204
عقیدۂ تثلیث کا مقصد 205

12 عقیدۂ مسیح کی تشکیل 208

مسیح کی حیثیت پر نیا دھیان 208
اپولینار: غیر مخلوق لوگوس مسیح کی روح ہے 210
اپولینار کا مسئلہ 212
انطاکیہ: مسیح کی دو الگ الگ ذاتیں 213
اپولینار اور انطاکیہ کا اختلاف 213
انطاکیہ کا طریقۂ تفسیر 214

دوسرے آدم میں کائنات کی بحالی 215
نجات کے دو زمانے 216
انسان کی آزاد مرضی 216
مسیح کی دو الگ الگ ذاتیں (دیوفیسیت) 216
یسوع برتن کی طرح لوگوس سے مالامال ہوا 218
مسیح کی شخصیت میں دونوں ذاتیں ایک ہیں 218
انطاکیہ کی خوبیاں اور خامیاں 219
کیا مسیح کی ایک یا دو ذاتیں ہیں؟ 221
کلیسیا کا سیاست میں دخل 222
دوسروں کو اپنے تحت کرنے کی کوشش 223
نسطوریُس سے چھڑا ہوا تنازع 223
نسطوریُس: مسیح کے دو اقانیم 226
قورلوس: کلیسیائی میافیسیت کا بانی 228
میافیسیت یا دیوفیسیت؟ اسکندریہ اور انطاکیہ کا تضاد 230
اِفسس سے خلقیدون تک 232
لیو کا خط: مسیح کی پستی میں خالق اور مخلوق ایک ہو گئے ہیں . . . 234
عقیدۂ خلقیدون: سمجھوتا 236
مسیح کے بارے میں عقیدے کی کچھ کمیاں 243
خلاصہ 244

13 اوگسطین: گناہ اور فضل 247
مغرب میں اوگسطین کے پیش خیمے 247
مغرب کا پرانے عہدنامے پر زور 248

مغرب کا ایک ہی عقیدہ 249
مغرب کا گناہ اور توبہ پر زور 250
مغرب میں قائم رہنے کے کلیسیائی ہتھیار 253
خلاصہ 254
اوگسطین کی افلاطونی راہ 255
باطن کی طرف رجوع 255
اوگسطین کا روحانی سفر 256
انسان کی روح 259
تثلیث 261
اوگسطین کی فضل تک راہ 262
سب کچھ فضل ہے 263
دوسرے آدم کی نجات 263
خدا کی مرضی پر مبنی نجات 264
فلاغیُس : اپنی طاقت سے گناہ پر غالب آؤ 264
انسان کی فطرت مرضی سمیت اچھی ہے 266
موروثی گناہ کا انکار 266
انسان اپنی طاقت سے گناہ پر غالب آ سکتا ہے 266
اوگسطین کا جواب : پوری زندگی فضل پر مبنی ہے 267
اوگسطین اور فلاغیُس میں بنیادی فرق 267
انسان کی ابتدائی حالت اور گناہ کا اثر 268
موروثی گناہ 269
شریعت اور فضل کی آزادی 270
نجات یافتہ بھی فضل کے تحت رہتا ہے 272

تقدیر کا سوال 273
کلیسیا 274
دوناتس کا تفرقہ 274
کلیسیا کی دُگنی شکل 276
کلام اور مقدس رسومات کی دُگنی شکل 277
تاریخ میں کلیسیا کا کردار 277
خلاصہ 280
اوگسطین سے سبق 281

ایمان کے شہدا اور شہید پرستی 284

14 ایذا رسانیاں 285
ایذا رسانیوں کی جڑیں 285
ایذا رسانیوں کی وجوہات 289
دیوتاؤں کا انکار 289
نجات کا واحد راستہ 289
بغاوت کا خطرہ 290
معاشرے پر منفی اثر 291
خاندان میں نا اتفاقی 292
مغرب کی ایذا رسانیاں 293
پہلا دور: گاہے بگاہے کی ایذا رسانیاں 293
دوسرا دور: مسیحیت کو نیست کرنے کی کوششیں 295
قسطنطین کی تبدیلی 299

قسطنطین کی تبدیلی کے فوائد 300
قسطنطین کی تبدیلی کے نقصانات 302
مشرقی کلیسیا کی بڑی ایذا رسانی 304

15 شہادت اور شہید پرستی 306
شہید کا اصلی مطلب: گواہ 306
پہلی تبدیلی: شہید قربانی ہے 308
شہید پرستی کی ابتدا 310
شہید پرستی کی وجوہات 310
رضاکارانہ شہادت کا مسئلہ 312
شہید پرستی کے طور طریقے 314
دو شہید پرست بزرگ 315
امروز: مغرب کا شہید پرست 315
یوحنا فم الذہب: مشرق کا شہید پرست 317
شہید پرستی کے دو نقاد 322
وِگلِنتیُس: پہلا پروٹیسٹنٹ؟ 322
اوگسطین: شمالی افریقہ میں شہید پرستی کا نقاد 324
مقدسین کا احترام 328
کنواری مریم کا احترام 330
مقدسین کی یادگاروں کا بھی احترام 333
مقدسین کے احترام کا مسئلہ 334
شہدا سے سبق 336

ایمان کے پہلوان: قدیم کلیسیا کے راہب 340

16 مصر کے راہب 341
انتونی: سب سے الگ زندگی 342
معاشرے سے الوداع 343
قبر میں شیاطین پر فتح 349
پہاڑی قلعے میں الٰہی جلال کا حصول 352
راہب کی شہادت 357
اندرونی پہاڑ 358
معجزے 360
رویائیں اور پیش گوئیاں 360
اَن پڑھ کی حکمت 361
وفات 362
پخومیُس: خانقاہ کا پہل کار 365
خانقاہ تک کا سفر 365
خانقاہ کا انتظام 369
مکاریوس: سکیتِس کے چھوٹے چھوٹے گروہ 374
مکاریوس مصری کی زندگی 374
سکیتِس کا انتظام 375
نِطریہ: سکیتِس کا رشتے دار 377
کلِّیہ: نطریہ کی ترقی یافتہ صورت 379

17 بیرونِ مصر کے راحب 380
شام کے راہب 381

انتہاپسند راہب 381
عہد کے فرزند 384
فلسطین: لَورا کا راہبانہ انتظام 386
گپدکیہ کی خدمت گزار خانقاہیں 387

18 آبا کی کہاوتیں 391
کہاوتوں کے مجموعے 393
کہاوتوں کا مقصد 393
راہبوں کے کچھ مرکزی خیالات 395
خیالات کی جانچ پڑتال 396
سکون 398
ہَوس 400
غصہ 404
ماتم 407
رویا 411
کلامِ مقدس 415

19 ہم آبا سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ 418
تنہائی کی ضرورت 418
الٰہی قدوسیت اور گناہ کا احساس 419
انسان کی تبدیلی 419
خیالات کی صفائی 420
روحانی سفر میں مددگار 420
غیر جانب داری 421

راہبانہ خدمت 421
راہبانہ زندگی کا منفی پہلو 422
راہب بننے کی غلط وجوہات 422
زُہد کی انتہا پسندی 422
ازدواجی زندگی کی تحقیر 422
اپنے نیک کام پر انحصار 423
خلاصہ 423

ایمان کی عبادت **424**

20 قسطنطین کا عبادت پر اثر 425

21 اتوار کا دن 427

22 کلیسیائی عیدیں 431
عیدِ ولادت 432
عیدِ قیامت 432
عیدِ پنتکست اور صعودِ مسیح 434

23 مقدس رسومات 435
مقدس رسم کا تصور 435
بپتسمہ 437
عشائے ربانی 441
عشائے ربانی کی قربانی 444

ایمان کی رفاقتی شکل: کلیسیا 448

24 پادریت کا فروغ 449
پادری کاہن بن جاتے ہیں 450
خدمت میں غیر شادی شدہ رہنے کی شرط 453

25 بشپ کے عُہدے کا فروغ 455
نئے عہد نامے میں بشپ کا عُہدہ 456
نئے عہد نامے کے بعد بشپ کا عُہدہ 457
اِغناطسیوس: بشپ کی لازمی سرپرستی 457
ایرینئیُس اور طرطُلیان: بشپوں کا اٹوٹ تسلسل 458
قبریانس: جہاں بشپ نہیں وہاں کلیسیا نہیں 458
بڑے شہروں کے بشپ اور پاطریارک 459
تبدیلیِ قسطنطین کے بعد بشپ کا نظام 459
بشپ کے علاوہ دیگر خدمت گزار 460

26 پوپ کے عُہدے کا فروغ 462

27 مدرسوں کا انتظام 465

28 کلیسیا کی یگانگت 467
مجلس کا انتظام 469

29 کلیسیا کا نظم و ضبط 471
دوناتی تفرقہ 474

ضمیمے 476

30 ضمیمہ اول: قورلوس کا اضافہ 477
خلقیدون کے نتائج 478
سمجھوتے کی کوششیں 479
اِنکیکلیَن: خلقیدون منسوخ 479
ہِنوطِقان: میافیسی رجحان 480
یُوسطِنیان اعظم 481
اقاقی تفرقے کا اختتام 482
دوسرے اقنوم کا دُکھ اُٹھانے کا بیان منظور 483
اورِغین اور انطاکیہ کے تین بزرگوں پر لعنت 484
نئی خلقیدونی تعلیم 485
ایک ہی اقنوم کی دو ذاتیں اور دو جوہر ہیں 486
دوسرے الٰہی اقنوم نے انسانی ذات کو وجود میں لا کر اپنا لیا . . . 487
نئی خلقیدونی تعلیم کی خوبیاں اور خامیاں 488
قسطنطنیہ کی پانچویں مجلسِ عامہ 489
میافیسی کلیسیا کی جُدائی 490
قسنطنطنیہ کی چھٹی مجلسِ عامہ 492

31 ضمیمہ دوم: وحدت الوجود کے راہب 494
یُواگریُس پُنتِکُس 495
اورِغینی تنازع 496
یُواگریُس کی تعلیم 498
ہم یُواگریُس سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ 504

یوحنا کسیان 505

نوٹس 507

References 535

Acknowledgements 544

ایمان کی دوڑ

باب 1

دوڑ کا آغاز

آپ ایمان کی دوڑ میں اچھی ترقی کر رہے تھے! تو پھر کس نے آپ کو سچائی کی پیروی کرنے سے روک لیا؟ [a]
مَیں نے اچھی کُشتی لڑی ہے، مَیں دوڑ کے اختتام تک پہنچ گیا ہوں، مَیں نے ایمان کو محفوظ رکھا ہے۔ [b]
آئیں، ہم ثابت قدمی سے اُس دوڑ میں دوڑتے رہیں جو ہمارے لئے مقرر کی گئی ہے۔ [c]

[a] گلتیوں 7:5
[b] ۲۔تیم 7:4
[c] عبرانیوں 1:12

399 قبل از مسیح میں ایک بے گناہ مرد کو سزائے موت دی گئی۔ آدمی کا نام سُقراط تھا، سزا کا طریقہ زہر۔ سُقراط کے آخری لمحات اُس کے شاگرد افلاطون سے قلم بند ہوئے ہیں:

> زہر کے پیالے کو ہونٹوں تک اُٹھا کر اُس نے بلا جھجک اور زندہ دلی سے زہر کو پی لیا۔ یہاں تک ہم جو ساتھ تھے زیادہ تر سنبھلے ہوئے تھے۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ زہر کو پی کر تہہ تک پہنچ گیا ہے تو ہم اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکے۔ مَیں بھی اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا بلکہ زار و قطار رونے لگا۔ ہاں، مَیں منہ کو ڈھانپ کر سسکتا رہا، سُقراط کے واسطے نہیں بلکہ اپنے واسطے یعنی یہ سوچ کر کہ عزیز دوست سے جدا ہو جاؤں گا۔ اور مَیں اِس میں پہلا شخص نہیں تھا بلکہ کریتو یہ دیکھ کر کہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکے پہلے ہی اُچھل پڑا تھا۔ اب مَیں بھی اُٹھا۔ جب اپلدورس جو پہلے سے لگاتار رو رہا تھا زور دار چیخیں مارنے لگا تو ہمارا دل ٹوٹ گیا۔
>
> صرف سُقراط پر اثر نہ پڑا۔ وہ بولا، ''اے عجیب مردو، یہ کیسا شور شرابہ ہے؟ مَیں نے خواتین کو اِس لئے باہر بھیجا تاکہ وہ اِس قسم کی حرکتیں نہ کریں۔ کیونکہ سنا ہے کہ مرد کو سکون سے وفات پانا چاہئے۔ مہربانی کر کے چُپ ہو جائیں اور ثابت قدم رہیں۔''
>
> اُس کے الفاظ سن کر ہم شرمندہ ہو کر رونے سے باز آئے۔ وہ ٹہلنے لگا، پھر بولا، ''میری ٹانگیں کام نہیں کر رہیں۔'' تب وہ ہدایت کے مطابق پیٹھ پر لیٹ گیا، اور جس آدمی نے اُسے زہر پلایا تھا وہ اُس کے پاؤں اور ٹانگوں پر دھیان دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے پاؤں کو دبا کر پوچھا، ''کیا آپ کو کچھ محسوس ہو رہا ہے؟'' سُقراط بولا، ''نہیں۔'' یوں آدمی نے پاؤں سے لے کر ٹانگوں تک اُسے دبا کر ہمیں دکھایا کہ

> نیچے والے اعضا ٹھنڈے اور اکڑے ہو رہے ہیں۔ پھر وہ دوبارہ ہاتھ لگا کر بولا ، "جب زہر دل تک پہنچے تب کوچ کر جائیں گے۔"
>
> ہوتے ہوتے اُس کا جسم کمر کے اردگرد ٹھنڈا ہونے لگا۔ اُس نے منہ کو ڈھانپ لیا تھا، لیکن اب اُس نے کپڑے کو اُتار کر پوچھا، "اے کریتو، لازم ہے کہ ہم صحت کے دیوتا اسکلیپیوس کے لئے قربانی چڑھائیں۔ کیا آپ اُس کو مرغ پیش کر سکتے ہیں؟ مت بھولنا، نہ۔"
>
> کریتو بولا ، "جو کچھ آپ نے فرمایا ہے مَیں ادا کروں گا۔ اَور کوئی بات؟"
>
> سُقراط نے جواب نہ دیا، اور تھوڑی دیر کے بعد کپڑے کے نیچے حرکت آئی۔ تب زہر کو پلانے والے نے کپڑا اُتار لیا۔ اُس کی آنکھیں بے حس و حرکت ہو گئی تھیں، اور کریتو نے آنکھوں اور منہ کو بند کر دیا۔
>
> یوں ہمارے دوست نے وفات پائی۔ مَیں اُس کے بارے میں سچ کہتا ہوں کہ اُس کے دور کے جن آدمیوں سے مَیں واقف ہوا ہوں اُن میں سے وہ سب سے اچھا، دانش مند اور عادل تھا۔[1]

عزیز قاری، مذکورۂ بالا الفاظ میں ہمیں ایک شریف اور بے گناہ آدمی نظر آتا ہے جس کی زندگی بے مثال تھی۔ سوال اُبھر آتا ہے کہ اگر سُقراط اِتنا شریف، اچھا اور دانش مند تھا تو اُس سے جماعت شروع کیوں نہ ہوئی؟ یسوع مسیح کی طرح ہی اُسے کسی جرم کے باعث سزائے موت نہ دی گئی۔ تو پھر فرق کس چیز میں پائی جاتی ہے؟ اِس کا جواب صرف اور صرف المسیح کے کردار سے ملتا ہے۔ بے شک سُقراط بے شمار فلاسفروں کے لئے نمونہ بن گیا، اور ہم بھی اُس کی حکمت اور اُس کے موت کے سامنے پُرسکون سلوک سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ تو بھی اُس میں وہ چیز نہیں ملتی جو مسیح میں ہے۔ چونکہ

سُقراط عام انسان تھا اِس لئے وہ ہمارا نجات دہندہ نہ بن سکا۔ اِس کے مقابلے میں مسیح کے پیروکاروں کی تعداد اُس کی موت کے بعد مزید تیزی سے بڑھنے لگی۔ کیوں ؟ اِس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسیح ابدی زندگی کا وسیلہ ہے۔ چونکہ وہ خدا کا بے گناہ فرزند ہے اِس لئے وہ صلیب پر انسان کی جگہ وہ سزا اُٹھا سکا جو گناہ گار انسان کو بھگتنا چاہئے تھا۔ اگر ہم اِس پر روشنی ڈالنا چاہیں کہ ایمان دار اِتنی جلدی سے کیوں پھیل گئے تو یہ ماننا ضروری ہے کہ خود مسیح اِس کی جڑ ہے۔ اور اگر ہم ابتدائی صدیوں میں تثلیث کے بارے میں سخت بحث مباحثہ کی تہہ تک پہنچنا چاہیں تو لازم ہے کہ مسیح کا کردار سمجھیں۔

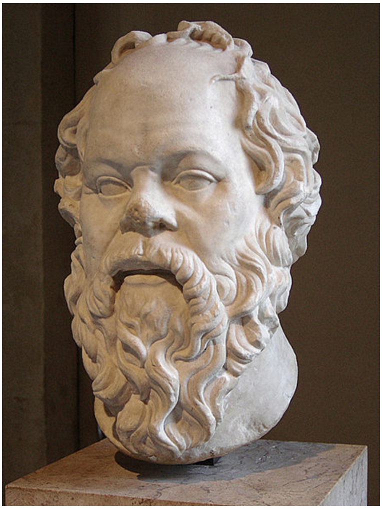
سُقراط

پھر بھی ایک لحاظ سے سُقراط مسیحیوں کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ سُقراط یونانی تھا، اور یونانی سوچ کا ٹھپا نہ صرف رومی ممالک بلکہ جدید دور پر بھی لگا ہے۔ یونان کا فلسفے، سائنس اور فنون پر اثر آج تک محسوس ہوتا ہے۔ اور سُقراط اپنے شاگردوں افلاطون اور ارسطو سمیت یونانی سوچ کا خاص نمائندہ تھا۔ لیکن وہ مسیح کے پیروکاروں کے لئے بھی مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ کس ناتے سے؟ جب مسیحی اپنے مخالفوں کے ساتھ بحث کرنے لگے تو اپنے مخالفوں کے ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ کون سے ہتھیار؟ یونانی سوچ کے۔ چنانچہ وہ اپنا ایمان یونانی لباس میں پیش کرنے لگے۔

غرض مسیح کے سرچشمے سے نکلنے والا نالا یونانی سرزمین میں سے بہتے ہوئے سمندر بن گیا۔ سرچشمہ وہی تھا، ایمان وہی رہا لیکن دریا نے یونانی ثقافت کا رنگ اپنا لیا۔ کچھ

کہیں گے کہ اِس سے دریا گدلا بلکہ گندا ہو گیا ہے، دوسرے کہ اب وہ زیادہ چمک رہا ہے۔ حقیقت بیچ میں ہی ہو گی۔ کیونکہ یونانی سوچ محض ایک وسیلہ ہے جو اچھے اور بُرے دونوں کاموں کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔

مسیح سُقراط کے راج میں —— یہ ہے قدیم کلیسیا کا ایک اہم پہلو۔ اِس کو پیشِ نظر رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن اپنے روحانی باپ دادا پر غور کرنے سے ایک اَور پہلو بھی اپنا سر اُٹھاتا ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے آئیں، ہم ایک اَور منظر کی طرف رجوع کریں۔

* * *

وہ دیکھو، ہمارے سامنے ایک تھکا ہارا آدمی ہانپتے ہوئے پہاڑی کی چوٹی پر رُک گیا ہے۔ شدید دھوپ کے باعث پسینہ جھُلسے ہوئے چہرے سے ٹپک کر اُس کی گھِسی پھٹی قمیص پر گر رہا ہے۔ وہ چادر سے پسینے کو پونچھ لیتا، پھر غور سے اُفق کو تکنے لگتا ہے۔ ''آخر اگلا شہر کہاں ہے؟'' وہ بڑبڑاتا ہے۔ اُس کی شکل معمولی سی ہے، لیکن بھڑکتی ہوئی آنکھوں سے پتا چلتا ہے کہ عام آدمی نہیں ہے۔ اُس کے دل میں ایک نہ بجھنے والی آگ جل رہی ہے جو ہر وقت آتش فشاں کی طرح زبان پر آنے کو ہے۔

اب اُس کا ساتھی بول اُٹھتا ہے، ''بھائی جان، اب ہم قریب ہی پہنچ گئے ہیں۔ صبر یار، صبر!'' یہ بھی امیر قسم کا شخص نہیں ہے، اور لمبے سفر کے ظالم ہاتھ نے اُسے بھی نہیں چھوڑا۔ ''ہائے، مَیں پیاس سے مر رہا ہوں۔''

عزیز قاری، یہ دو آدمی کون ہیں؟ کیا یہ پولس رسول اور برنباس ہیں جو کہیں خوش خبری سنانے کے لئے فلسطین سے روانہ ہوئے ہیں؟ یا پطرس رسول یا کوئی اور خاص مسیحی؟ حقیقت میں مسیحیت کی پہلی صدیوں میں اِن مردوں کی طرح بے شمار ایمان دار خوش خبری سنانے کے لئے اپنے وطن، گھروں اور عزیزوں سے نکلے۔ اِن میں یہودی اور غیر یہودی دونوں شامل تھے۔ سب کے دلوں میں ایک ہی ولولہ تھا، کہ یسوع مسیح کے بارے میں خوش خبری پھیلا کر خدا کے نام کی تمجید کریں۔ بہت دفعہ اُن کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے اِس خواہش کے کہ جو برکت خود ملی ہے دوسروں تک پہنچائیں۔

یوں ایمان کی دوڑ شروع ہوئی۔ جہاں تک راستے تھے وہاں تک ایمان دار بھی پہنچے۔ اُن کے دلوں میں عجیب سا جوش تھا، اُن کے لبوں پر ایک ہی نعرہ، ''خدا کا فرزند المسیح ہمارے لئے مُوا اور جی اُٹھا ہے۔ جو اُس پر ایمان لائے اُس کے گناہوں کو معاف کیا جائے گا، اور وہ ابد تک اُس کے ساتھ جیئے گا۔'' نہ اُن کے پیچھے فوج تھی، نہ اُن کے آگے پیش خیمہ چلتا تھا۔ جہاں وہ پہنچتے وہاں کوئی اُن کے استقبال کے لئے نہ نکلتا۔ اِس کے برعکس بہت دفعہ مقامی لوگ آگ بگولا ہو کر اُن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ کیونکہ جلد ہی معلوم ہوا کہ اِس خوش خبری سے ہمارے دیوتا خطرے میں ہیں، ہمارے قدیم رسم و رواج ختم ہو جائیں گے۔ تو بھی مسیح کے یہ سفیر مایوس نہیں ہوتے بلکہ جہاں مسترد ہوتے وہاں کی گرد جوتوں سے جھاڑ کر آگے نکلتے تھے۔ یہ سلسلہ یروشلم سے شروع ہو کر مغرب میں یورپ اور مشرق میں چین اور انڈیا تک پہنچا۔ دھڑام سے نہیں بلکہ دھیمی دھیمی آواز کے ساتھ۔

سوکھے جنگل میں تیزی سے چلنے والی یہ آگ کس طرح لگ گئی؟ یہ بات سمجھنے کے لئے درکار ہے کہ ہم نہ صرف اپنے کانوں سے سنیں بلکہ اپنے دلوں سے بھی۔ جس کے نزدیک ابتدائی کلیسیا کے واقعات محض قصے کہانیاں ہیں وہ کبھی نہیں وہ جذبات سمجھ پائے گا جن کی گرفت میں پہلے ایمان دار تھے۔ جس نے اپنی ذاتی زندگی میں کبھی روح القدس کا قوی ہاتھ محسوس نہیں کیا اُس کے لئے ابتدائی کلیسیا کی قوت اور جوش سمجھنا صیغۂ راز رہے گا۔

ابتدائی کلیسیا کا پھیلاؤ مسیح یسوع کی اپنی ہدایت سے شروع ہوتا ہے۔ آسمان پر اُٹھا لئے جانے سے پہلے یسوع مسیح نے فرمایا،

> تمہیں روح القدس کی قوت ملے گی جو تم پر نازل ہو گا۔ پھر تم یروشلم، پورے یہودیہ اور سامریہ بلکہ دنیا کی انتہا تک میرے گواہ ہو گے۔[a]

اور متی کی اِنجیل میں اِس کی مزید وضاحت ہوئی ہے،

> آسمان اور زمین کا کُل اختیار مجھے دے دیا گیا ہے۔ اِس لئے جاؤ، تمام قوموں کو شاگرد بنا کرُانہیں باپ، فرزند اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔ اور اُنہیں یہ سکھاؤ کہ وہ اُن تمام احکام کے مطابق زندگی گزاریں جو مَیں نے تمہیں دیئے ہیں۔ اور دیکھو، مَیں دنیا کے اختتام تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔[a]

شاگردوں نے یہ سن کر کیا سوچا ہوگا؟ اُن کے خیال میں دنیا کی انتہائیں کہاں تھیں؟ مجموعی طور پر اُن کی دنیا رومی ممالک پر مشتمل تھی جو مغرب میں انگلینڈ اور اسپین سے لے کر مشرق میں فلسطین تک پھیلے ہوئے تھے۔ مسوپتامیہ آج کے ایران تک بھی اُن کے علم میں تھا، کیونکہ وہاں بے شمار یہودی آبادیاں تھیں بلکہ جنوبی انڈیا میں بھی کچھ یہودی آباد تھے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک بھارت اور چین دنیا کی ایک حد تھی اور انگلینڈ دوسری حد۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایمان دار جلد ہی اِن انتہاؤں تک پہنچ گئے۔ لیکن تبلیغ ارشادِ اعظام کا صرف ایک، بیرونی پہلو ہے۔ اِس کا دوسرا اندرونی پہلو شاگردیت ہے۔ لوگوں کو نہ صرف خوش خبری پہنچانا ہے بلکہ اُنہیں تعلیم دے کر شاگرد بنانا ہے تاکہ وہ ایمان میں مضبوط رہ کر کام یابی سے ایمان کی دوڑ میں دوڑ سکیں۔

چنانچہ ایمان کی دوڑ کا ایک بیرونی اور ایک اندرونی پہلو ہے۔ بیرونی پہلو ایمان کا پھیلاؤ اور قیام ہے جبکہ اندرونی پہلو ایمان کی پہچان پر مشتمل ہے۔ ایمان دار کو دنیاوی طاقتوں سے بھی جنگ لڑنا ہے اور روحانی خطروں سے بھی۔

---

[a] اعمال 1:8
[a] متی 28:18-20

لیکن اِس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اِن پرانے قصوں پر غور کریں؟ کیا یہ کافی نہیں کہ کلامِ مقدّس پیشِ نظر رکھ کر زندگی گزاریں؟ بے شک۔ کلامِ مقدّس ہمارے ایمان کی ٹھوس بنیاد ہے۔ لیکن سوچیں۔ بے شمار مسیحیوں نے شروع سے لے کر آج تک کلام کی بنیاد پر زندگی گزاری ہے۔ پھر بھی اُن سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ کیا اچھا نہیں کہ ہم کلام کی روشنی میں اُن کی کمیوں اور کامیابیوں پر دھیان دے کر اپنی زندگی کے لئے سبق حاصل کریں؟ کیا ضرورت ہے کہ ہم اُنہی گڑھوں میں گر جائیں، جن میں گر کر بے شمار مسیحی صحیح راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم کیوں نہ اُن جالوں سے پرہیز کریں جن میں ہمارے روحانی باپ دادا اُلجھ کر ڈانواں ڈول ہو گئے ہیں؟ اور ہم کیوں نہ اُن کی خوبیوں اور کامیابیوں کی نقل کریں؟ یہ بھی ایمان کی دوڑ کا حصہ ہے۔

لیکن ایمان کی یہ دوڑ عجیب سی اور انوکھی ہے۔ اِس کو مل کر، جماعت کی صورت میں دوڑنی ہے۔ جیتنے والا وہ نہیں جو دنیاوی لحاظ سے سب سے طاقت ور اور چُست ہے بلکہ وہ جس نے دوسرے دوڑنے والوں کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے۔ سب سے بڑا وہ ہے جس نے اپنے آپ کو سب کا خادم بنا کر ہر ایک سے محبت رکھی ہے۔ لہٰذا ہم اِس پر بھی غور کریں گے کہ ہمارے روحانی باپ دادا نے اپنے ایمان پر عمل کس طرح کیا؟ کیا ہم اُن کے راہنماؤں، اُن کی عبادات، نظاموں اور نظم و ضبط کے طور طریقوں سے اپنی ترقی کے لئے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

شاید قاری یہاں تک پہنچ کر اعتراض کریں کہ مجھے اِس کی ضرورت ہی نہیں۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ آپ سے وہی غلطیاں سرزد ہو جائیں جو ہمارے بزرگوں کے لئے اُلجھنے کا باعث بن گئے ہیں۔ جو بچہ اپنے والدین کو بھول جائے وہ احمق ہے۔ اِسی طرح جو اپنے باپ دادا اور اُن کی روحانی دوڑ نظر انداز کرے وہ حماقت کا حامل ہے۔

غرض آئیں، ہم مسیحی دوڑ کے پہلے اقدام پر دھیان دے کر اِس کا ملاحظہ کریں کہ اُس نے چاروں طرف پھیلتے ہوئے کس طرح بت پرست معاشرے اور اُس کی سوچ سے نپٹ لیا؟ اور ماحول کی سوچ کا مقابلہ کرتے کرتے وہ کس طرح خود تبدیل ہوا؟

ایمان کی یہ دوڑ اسرائیل سے شروع ہوتی ہے، کیونکہ اسرائیل مسیحی کلیسیا کا اٹوٹ انگ ہے۔ ہاں، کلیسیا ابتدا سے اپنے آپ کو حقیقی اسرائیل سمجھتی آئی ہے، گو اکثر یہودیوں نے جلد ہی مسیحیوں کو رد کر کے اپنی جماعتوں سے نکال دیا۔

ایمان کا ماحول

باب 2

فلسطین: یونانی اور ارامی زبان کا چوک

پہلی صدیوں کے ایمان دار کس قسم کے ماحول میں رہتے تھے؟

جب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت فلسطین میں دو ثقافتیں اور دو زبانیں ایک دوسری سے ہاتھا پائی کر رہی تھیں۔ گو عوام نے صدیوں سے عبرانی زبان کو ترک کر کے ارامی زبان اپنائی تھی لیکن اب یونانی زبان اور کلچر کا دباؤ ہر طرف محسوس ہو رہا تھا۔ نہ صرف یونانی زبان بلکہ یونانی طرزِ زندگی، یونانی عمارتیں، یونانی لباس، یونانی سائنس اور یونانی فنون عروج پر تھے۔

یہ کس طرح ہوا؟ خاص کر ایک آدمی کا نام یونانی ثقافت کے پھیلاؤ کے ساتھ پیوستہ ہے — سکندرِ اعظم۔

سکندرِاعظم

334ق میں ایک راہنما اپنے فوجیوں کو لے کر ایشیائے کوچک میں گھُس گیا۔ اُس وقت نہ تُرک وہاں رہتے تھے نہ استنبول شہر تھا بلکہ یہ علاقہ فارس کی سلطنت کی سرحد تھا۔ راہنما کا بظاہر مقصد اپنے وطن کا بدلہ لینا تھا جس پر فارس کے بادشاہ نے سالوں پہلے حملہ کیا تھا۔ لیکن اندر سے وہ بڑے بڑے خواب دیکھتا تھا۔ منزلِ مقصود پوری دنیا پر قبضہ تھی۔

سکندرِاعظم

اُس وقت فارس کی سلطنت سُوپر پاور تھی۔ اُس کی مشرقی سرحد دریائے سندھ تھی جبکہ مغرب میں ایشیائے کوچک یعنی موجودہ دور کا ملکِ تُرکی بھی اُس میں شامل تھا۔ جنوب میں فلسطین اور مصر تک اُس کے قابو میں تھے۔ جب سکندرِاعظم نے اِس بادشاہت پر حملہ کیا تو دنیا دم بخود رہ گئی۔ یہ نوجوان جاتی جالوت دیو پر کس طرح غالب آ سکتا تھا؟ ایسا تھا جیسا کہ سری لنکا امریکہ پر جنگ کا اعلان کرے۔ پھر بھی دیو دھڑام سے گر گیا۔ دنیا آپے میں نہ رہی۔ یہ کیسا سورما ہے جو سُوپر پاور کی بے شمار اور طاقت ور فوجیوں پر غالب آیا؟ یہ تو انسان نہیں بلکہ دیوتا ہے۔ لوگ سکندرِاعظام کی پوجا کرنے لگے۔

سکندر کی بے چین روح نے اُسے ایران میں سے ہو کر برِصغیر تک پہنچایا۔ ہاں، وہ پنجاب سے آگے مشرق کی طرف بڑھنے کے لئے تڑپتا رہا، لیکن اُس کے تھکے ہارے فوجی اِس قدم کے لئے تیار نہیں تھے۔ اِس لئے وہ سندھ اور مکران سے ہو کر مغرب کی طرف واپس مڑا جہاں تھوڑی دیر کے اندر اندر فوت ہوا۔ جو ستارہ زور دار چمک دمک کے ساتھ عروج پر آیا تھا وہ جلد ہی بجھ گیا——میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ بسترِ مرگ پر۔

اگر اکیسویں صدی کی ٹھنڈی نظر سے اُس کی فتوحات کا معائنہ کریں تو سکندرِاعظم کا کیا کام پایہ دار رہا؟ کیا کیا چیز اُس کی مختصر زندگی کے بعد قائم رہی؟ آخر تو اُس کی سلطنت فارس کی سرحدوں تک محدود رہی۔ دوسرے، سکندرِاعظم کی بادشاہت اُس کی موت کے بعد قائم نہ رہ سکی بلکہ جرنیلوں میں بٹ گئی۔ تو پھر ہم کیوں سکندرِاعظم کو آج تک یاد کرتے ہیں؟

بے شک ایک وجہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے دور کے سُوپر پاور پر فتح پائی، البتہ یہ سُوپر پاور اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ لیکن تاریخی لحاظ سے سکندرِاعظم کی اہمیت اِس میں ہے کہ اُس نے یونانی ثقافت، سوچ اور زبان کا تعارف دریائے سندھ اور مصر تک کرایا۔ اُس نے نہ صرف سلطنت کے مختلف کونوں میں تقریباً 70 یونانی شہروں کی بنیاد رکھی بلکہ جہاں جہاں گیا وہاں اپنے فن کاروں، معماروں اور سائنس دانوں کو ساتھ لے گیا۔ ٹیکسلا میں بھی قدم بہ قدم سکندرِاعظم کی اِس پالیسی کا ثبوت ملتا ہے۔

”جو مَیں پسند کرتا ہوں اُسے تجھے بھی پسند کرنا ہے۔“ یہی نعرہ ہر زبردست قوم کا قول رہا ہے، اور سکندرِاعظم بھی یہی یقین رکھتا تھا۔

اُس وقت سے یونانی ثقافت اور زبان بحرِ روم کے کنارے پر واقع تمام ممالک پر حاوی ہو گئی یعنی مصر، فلسطین، ایشیائے کوچک، یونان، شمالی افریقہ اور یورپ پر۔ بعد میں جب روم اِن علاقوں کا مالک بن گیا تو اپنی ذاتی ثقافت بڑھانے کے باوجود وہ خود یونانی ثقافت کے جادو میں آ گیا۔ رومی ممالک کی مشترکہ زبان یونانی بن گئی۔ اِس ناتے سے غالب مغلوب ہوا۔ اِس کے برعکس فلسطین کے مشرق میں یونانی کا اثر اِتنا دیرپا نہ رہا۔ پارتھی بادشاہوں کے بعد یونانی زبان کا اثر رفتہ رفتہ جاتا رہا اگرچہ یونانی فنون کا اثر مختلف شکلوں میں قائم رہا۔

ابتدائی کلیسیا کا یونانی اور ارامی دل

ابتدائی کلیسیا کے لئے اِس کا کیا عملی نتیجہ نکلا؟

یونانی دیوی اتھینے ٹیکسلا میں

پہلے ایمان دار فلسطین میں رہتے تھے جس پر سے ثقافت کے دو دریا بہہ کر گزر چکے تھے — اول، اسور اور فارس کی ارامی کلچر اور زبان، دوسرے یونانی کلچر اور زبان۔ دونوں کا اثر اُس پر پڑ گیا تھا۔ ارامی اثر کے باعث مقامی زبان صدیوں سے عبرانی نہیں بلکہ ارامی تھی۔ مسیح یسوع اور اُس کے شاگردوں کی مادری زبان ارامی تھی۔ لیکن یونانی اثر کے باعث فلسطین میں یونانی بھی بولی جاتی تھی۔ اِس ناطے سے فلسطین کا ایک رُخ مشرق کے مسوپتامیہ اور دوسرا مغرب کے یونان کی طرف تھا۔[1]

مسوپتامیہ زیادہ تر ارامی زبان کا علاقہ رہا گو کچھ دیر کے لئے یونانی زبان کافی جگہوں پر بولی جاتی تھی۔ خاص کر پارتھی بادشاہ یونانی پرست تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جتنا مسافر فلسطین کے مشرق کی طرف بڑھتا جاتا اُتنا ہی ارامی زبان زیادہ اور یونانی کم بولی جاتی تھی گو یونانی فنون کا اثر ٹیکسلا تک اور ٹیکسلا سے ہو کر پورے بھارت پر پڑا۔

اِس کے مقابلے میں بحرِ روم کے ممالک میں یونانی زبان کا راج تھا، گو ساتھ ساتھ مقامی زبانیں بھی چلتی تھیں۔ ہر طرف یونانی طرز کے شہر اور بت بن گئے، ہر طرف یونانی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی، اگرچہ اکثر جگہوں پر یہ یوں سرانجام ہوا کہ مقامی

دیوتاؤں کو یونانی نام دیئے گئے۔ اور کم از کم رومی ممالک میں ہر طرف یونانی بولی جاتی تھی۔

عوام یونانی شاعر ہومر[a] کے شاہ کار اِلیَڈ[b] اور اوڈیسی[c] کو کلامِ مقدّس جیسی عزیز رکھتے تھے۔ علما افلاطون، ارسطو، اِپی قور اور رقابیت[d] کے سے فلسفے پڑھاتے تھے، اور فن کار اپنے مجسمے یونانی نمونوں پر تراشتے تھے۔ پورا معاشرہ اُس کی دل فریب کشش سے مسحور ہوا۔

یہودی دین بھی یونانی جادو میں اُلجھنے کے خطرے میں آیا۔ یاد رہے کہ ملکِ فلسطین میں کئی یونانی شہروں کی بنیاد رکھی گئی، کئی جگہوں پر مندر کھڑے کئے گئے تھے۔[2] [e] دوسری صدی قبل از مسیح میں کچھ یہودی یہاں تک یونان پرست بن گئے کہ وہ یونانی کھیلوں میں شرکت کرنے لگے۔ مسئلہ یہ تھا کہ یونانی مرد ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے وقت ننگی حالت میں کھیلتے تھے۔ نتیجے میں یہودی مرد کی ختنہ شدہ یعنی غیر یونانی حالت مشقوں میں سب پر ظاہر ہوتی تھی۔ مسئلہ حل کرنے کے لئے کچھ نے آپریشن کروا کر یہ نشان دُور کرنے کی کوشش کی۔[f]

ہم یہ پڑھ کر توبہ توبہ کہتے ہیں، لیکن کیا ہم اِن سے فرق ہیں؟ کیا ہم انگلش زبان اور تربیت ترقی کا نشان نہیں سمجھتے؟ بلکہ ملکِ پاکستان میں کتنے لوگ ہوں گے جو جان بوجھ کر اپنی مادری زبان کو بھول کر انگلش کلچر اور سوچ سے لپٹ گئے ہیں؟ دو صدیاں پہلے بھارت کا باشندہ رُعب ڈالنے کے لئے فارسی استعمال کرتا تھا جبکہ جدید دور کا آدمی

---

[a] Homer
[b] Illiad
[c] Odyssey
[d] Stoa

[e] اناجیل میں فلسطین کے یونانی شہروں کا اتحاد بنام دکپلس کا ذکر ہے (متی 4:25؛ مرقس 5:20؛ 7:31)۔ ہیرودیس کے زمانے میں اسرائیل کے شہر قیصریہ میں ایک شان دار مندر بنایا گیا جس میں دو بت تھے، ایک اَوگوستُس بادشاہ کا اور دوسرا رومہ دیوی کا۔ نیز اُس میں تماشاگاہ اور یونانی تفریح کے دیگر انتظامات تھے۔

[f] ۱۔مکابیوں 1:14-15

انگلش بولتا ہے۔ پہلی صدیوں کے رومی ممالک میں یونانی زبان کا یہی کردار تھا۔ عالِموں کی زبان یونانی تھی، نیز بادشاہی کی مختلف قومیں آپس میں بات کرتے وقت یونانی استعمال کرتی تھیں حتیٰ کہ مسوپتامیہ اور افغانستان میں یونانی بولنے والے شہر وجود میں آئے۔ جس طرح آج کی ہر اچھی اور بُری فیشن پیرس اور امریکہ سے آتی ہے اُسی طرح قدیم زمانے میں ہر فیشن یونان سے آتی تھی۔

آج کا آدمی پڑوسیوں میں حسد پیدا کرنے کے لئے لینڈ کروزر خرید لیتا یا شان دار عمارت بنوا لیتا ہے۔ اُس زمانے کا آدمی یونانی طرز کا مجسمہ یا مکان بنوا لیتا تھا۔ جدید دور کا دانش ور آدمی انگلش کی کتابیں پڑھتا ہے، اُس دور کا پڑھا لکھا شخص یونانی کتابیں پڑھتا تھا۔

عزیز قاری، کیا آپ کو خوش خبری پھیلانے میں فلسطین کی اہمیت سمجھ آ گئی ہے؟ ہم ابتدائی کلیسیا کا کردار صرف یہ ماحول پیشِ نظر رکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ عوام کی مادری زبان زیادہ تر اَرامی تھی، لیکن ساتھ ساتھ یونانی بھی چلتی تھی۔ چنانچہ فلسطینی مسیحی مشرق اور مغرب دونوں کی ثقافتوں اور زبانوں سے خوب واقف تھے، لہٰذا اُنہیں دونوں طرف خوش خبری پھیلانے میں دقت محسوس نہ ہوئی۔ تبلیغ کے لئے راستے کھلے تھے۔

قیصریہ کا رومی اُکھاڑا

ایمان کا پھیلاؤ

باب 3

مسیحی ایمان کی یہودی جڑیں

پہلے مسیحی یہودی تھے جو اپنے آپ کو حقیقی اسرائیلی سمجھتے تھے۔ اُنہیں خیال تک نہ آیا کہ ہمارا مذہب فرق ہے بلکہ وہ ایمان رکھتے تھے کہ ابرہام، اضحاق اور یعقوب کا خدا ہمارا ہی خدا ہے، کہ ہم ابرہام کے حقیقی فرزند ہیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ مسیح وہی ہستی ہے جس کا وعدہ کلامِ خدا نے بار بار کیا ہے، لہٰذا مسیح توریت کو ختم کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ اُسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے۔ اُس کی صلیبی موت بھی خدا کے اُس ارادے کی تکمیل ہے جو توریت، زبور اور انبیا کے صحائف بیان کرتے ہیں۔ ہاں، اپنی جان دینے سے اُس نے اُس نئے عہد کی بنیاد رکھی جس کی پیش گوئی یرمیاہ نبی اور حزقی ایل نبی نے کی تھی۔ غرض شروع سے ایمان دار جانتے تھے کہ گو مسیح میں ایک نئے

اور لاثانی زمانے کا آغاز ہو گیا ہے تو بھی ہمارے ایمان کی جڑ اور بنیاد وہی کلام ہے جس پر یہودی ایمان مبنی ہے۔

یوں یہودیوں اور مسیحیوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے جو آج تک موجود ہے۔ اور اگرچہ یہودی نئے عہد نامے کی کتابیں نہیں مانتے تاہم ہر مسیحی کے لئے لازم ہے کہ وہ پرانے عہد نامے کی کتابیں نہ صرف مانے بلکہ اُن کے مطالعے میں لگا بھی رہے۔ آج تک مسیحی ایمان دار سمجھتا ہے، کہ ہم حقیقی اسرائیلی ہیں، کہ قدیم اسرائیل کی تاریخ ہماری ہی تاریخ ہے۔

مسیحی کے لئے نئے اور پرانے عہد نامے کے صحائف ایک درخت سے مطابقت رکھتے ہیں: اگر پرانے عہد نامے کی کتابیں جڑ اور تنا ہیں

ہیکل کی چاردیواری کی مغربی دیوار

تو نئے عہد نامے کی کتابیں اُس کی شاخیں، پتے اور پھل ہیں۔ یہ تصانیف توریت، زبور اور انبیا کی روشنی میں ہی سمجھی جاتی ہیں۔ جس طرح قالین کے لئے تانا اور بانا دونوں ہی ضروری ہیں اُسی طرح مسیحی ایمان پرانے اور نئے عہد نامے دونوں ہی پر مبنی ہے۔ اور جتنا ایمان دار دونوں کا مل کر مطالعہ کرے اُتنا ہی اُسے روحانی قالین کے مختلف ڈیزائن نظر آئیں گے، اُتنا ہی وہ روحانی ترقی کرے گا۔

چنانچہ ابتدائی مسیحیوں کی یہی کوشش رہی کہ جہاں بھی یہودیوں کی جماعتیں ہوں اُنہیں یہ خوش خبری سنائیں کہ موعودہ مسیح کی بادشاہی آ گئی ہے، کہ مسیح میں قدیم یہودی ایمان تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ یہ حقیقت پولس رسول کی خدمت میں واضح طور پر نظر آتی ہے: گو وہ اپنے آپ کو خاص کر غیر یہودیوں کا رسول سمجھتا تھا تاہم جہاں بھی جاتا پہلے یہودی جماعتوں میں خوش خبری سناتا تھا۔ اُن کے اُسے رد کرنے پر ہی وہ غیر یہودیوں کے پاس جا کر خوش خبری سناتا تھا۔

لیکن اُس زمانے کے یہودی کہاں آباد تھے؟ اُس وقت اُن کی آبادیاں مشرقِ وُسطیٰ سے لے کر یورپ تک پائی جاتی تھیں، بلکہ تاریخی اثرات گواہ ہیں کہ وہ کم از کم بھارت تک پھیل گئے تھے۔ اِس کا سلسلہ اسوریوں سے شروع ہوا تھا جنہوں نے 722ق م میں سامریہ شہر کو تباہ کر کے شمالی ملک بنام اسرائیل کے اکثر لوگوں کو دیگر مختلف ممالک میں منتقل کر دیا تھا۔ اُن کے وارثوں یعنی بابل کے فوجیوں نے یہ کام جاری رکھ کر جنوبی ملک بنام یہوداہ کے زیادہ تر باشندوں کو دوسری جگہوں پر آباد کیا تھا۔ بعد میں گو کافی یہودی اپنے وطن میں لوٹ آئے تو بھی لاتعداد خاندان دیگر ممالک میں بکھرے رہے۔ ایک تو فلسطین میں کاروبار کے امکان محدود تھے، دوسرے بعد میں بھی فلسطین کئی قسم کے بحران کا شکار ہوتا رہا۔

مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دوسری صدی عیسوی میں روم شہر میں یہودیوں کی 11 یا 12 جماعتیں تھیں۔ پہلی عیسوی صدیوں میں مصر اور خاص کر اُس کے مرکزی شہر اسکندریہ میں دس لاکھ یہودی آباد تھے۔ کیا عجب کہ یسوع کے والدین ہیرودیس سے بچنے کے لئے مصر ہجرت کر گئے۔

رومی ممالک میں یہودیوں کا خاص کردار تھا۔ دوسری قوموں کے برعکس وہ غیر ایمانداروں سے شادی کرنے سے انکار کر کے اپنے رسم و رواج سے لپٹے رہتے تھے۔ سبت ماننا ایک مرکزی فرض تھا۔ نیز، دیگر ممالک میں بکھرے ہوئے یہودی خاص عیدوں

کے موقع پر یروشلم جایا کرتے تھے۔ اِس سے اور سالانہ ہیکل کے لئے خاص ٹیکس ادا کرنے سے اُن کا اتحاد قائم رہا۔

رومیوں اور یونانیوں کو یہودی دستور عجیب و غریب لگتے تھے۔ اُن کی نظر میں ختنہ کی رسم گھنونی اور سؤر کا گوشت نہ کھانے کا معاملہ مضحکہ خیز تھا۔ جب یہودی دیگر مذاہب اور اُن کے میلوں سے دُور رہتے تھے تو غیر یہودی سمجھتے تھے کہ یہ معاشرے سے نفرت رکھتے ہیں۔ تاہم یہودی مذہب کے کئی پہلو پُرکشش تھے۔ ایک تو توحید کا عقیدہ، پھر اُن کے اخلاقی اصول اور پاک صحائف کی قدامت قابلِ تعریف تھی۔ یہودیوں کی پاک خاندانی زندگی، مہمان نوازی، غریبوں اور مریضوں کی مدد، یہ سب کچھ دل کش اور اچھا لگتا تھا۔ یوں ہوتے ہوتے متعدد جماعتوں میں غیر یہودی شامل ہوئے جو خدا ترس کہلاتے تھے۔ اگرچہ اِس کی شرط ختنہ اور بپتسمہ تھی، لیکن دیگر ممالک کے یہودی اِس پر اِتنا زور نہیں دیتے تھے۔ وہ ہر غیر یہودی کا استقبال کیا کرتے تھے جو اُن کا ایمان قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

جب ابتدائی مسیحی مختلف جگہوں پر خوش خبری پھیلانے لگے تو متعدد خدا ترس غیر یہودی ایمان لا کر ابتدائی جماعتوں میں شامل ہوئے۔

اکثر یہودیوں کی طرح ابتدائی ایمان دار کلام کا وہ قدیم یونانی ترجمہ استعمال کرتے تھے جو ہفتادہ[a] کہلاتا ہے اور جو تیسری اور دوسری صدی قبل از مسیح میں مصر میں وجود میں آیا تھا۔ (یاد رہے کہ اُس زمانے میں عبرانی زبان یہودی عوام میں متروک ہو گئی تھی)۔

---

[a] Septuagint

باب 4

یہودی یا غیر یہودی کلیسیا؟ ابتدائی کلیسیا کی کشمکش

چونکہ پہلے مسیحی یہودی تھے اِس لئے وہ تمام یہودی رسومات ادا کرتے تھے، یہاں تک کہ شروع شروع میں وہ یروشلم کے مرکزی عبادت خانے بنام ہیکل میں جمع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ غیر یہودیوں میں خوش خبری سنانے لگے تو سوال اُٹھا کہ کیا اِن نئے ایمان داروں کو تمام یہودی رسم و رواج ماننے کی ضرورت ہے؟ کیا لازم ہے کہ وہ بھی اپنا ختنہ کرائیں، ناپاک جانوروں سے گریز کریں اور بُتوں کو قربان کیا ہوا گوشت نہ کھائیں؟

ہماری خوش نصیبی ہے کہ ابتدائی کلیسیا کے ایک عظیم گواہ نے پہلے مسیحیوں کی بدلتی سوچ قلم بند کر دی ہے۔ ڈاکٹر لوقا نے اعمال کی کتاب میں ظاہر کر دیا ہے کہ یہ موضوع ابتدائی کلیسیا کے لئے ایک دشوار اور خاردار راستہ تھا۔

کلیسیا کا پھیلاؤ

غیرقوموں کی طرف پہلا قدم اُس وقت ہوا جب دیگر یہودی مسیح کے پیروکاروں کو ستانے لگے۔ پہلی ایذا رسانی کے نتیجے میں مسیحی یروشلم سے نکل کر دوسری جگہوں بلکہ دوسرے ممالک میں پھیلنے لگے۔ اور جہاں جہاں وہ پہنچ گئے وہاں لوگوں کو جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ نیا فرقہ کیا ایمان رکھتا ہے۔ اعمال کی کتاب کے مطابق اِس ایذا رسانی کا پہلا نتیجہ سامریہ میں تبلیغ تھا۔ لگتا ہے کہ یہ قوم خوش خبری کے لئے تیار تھی، کیونکہ بے شمار افراد ایمان لائے، اور اُنہیں بپتسمہ دیا گیا۔

سامریوں کو جماعت میں شریک کرنا معمولی سی بات نہیں تھی، کیونکہ وہ یہودیوں کی شدید نفرت کا نشانہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ گو اُن کا بھی خدا پر ایمان تھا تو بھی اُن کے رسم و رواج فرق تھے، اور اُن کی مرکزی عبادت گاہ یروشلم میں موجود ہیکل سے ہٹ کر سامریہ میں تھی۔ وہ یہودیوں کی نگاہ میں بدعتی تھے۔ یہودیوں کو سنی اور سامریوں کو شیعہ کہہ لیں۔ تو پھر مسیحی ایمان داروں نے کس طرح جرأت کر کے اُنہیں قبول کیا؟ اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ روح القدس نے اِس میں اُن کی راہنمائی کی۔ سب پر اِس کی تصدیق اُس وقت ہوئی جب روح القدس اُن پر نازل ہوا۔[a]

پطرس اور کُرنیلیُس

بے شک سامریہ کا واقعہ قابلِ غور تھا، لیکن اب تک ابتدائی جماعت اِس کے منطقی نتیجے تک نہیں پہنچی تھی۔ جو حقیقت آج پوری دنیا میں پھیلی ہوئی کلیسیا میں صاف

[a] اعمال 8:4-17

صاف نمایاں ہے وہ اُس وقت ایمان داروں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اور کیا عجب، کیونکہ بچپن سے ہی اُنہیں سکھایا گیا تھا کہ غیر یہودی ناپاک ہیں، کہ اُن کے گھروں میں جانے یا اُن کے ساتھ کھانا کھانے تک سخت منع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اِس سلسلے میں ہمیں روح القدس کی خاص ہدایت قدم بہ قدم نظر آتی ہے۔ ایک تو وہ فلپس کو ایتھوپیا کے درباری کے پاس بھیجتا ہے تاکہ اُسے خوش خبری سنا کر بپتسمہ دے۔[a] دوسرے، وہ کٹر یہودی ساؤل کو تبدیل کر کے خاص کر غیر یہودیوں کو خوش خبری سنانے کے لئے مخصوص کرتا ہے۔[b] لیکن نقطۂ انقلاب اعمال کے دسویں باب میں درج ہے جہاں پطرس رویا میں ایک اُترتی ہوئی چادر دیکھتا ہے۔ چادر میں مختلف قسم کے پاک اور ناپاک جانور ہیں، اور اُسے بتایا جاتا ہے کہ ''اُٹھ، پطرس۔ کچھ ذبح کر کے کھا!'' پطرس اعتراض کرتا ہے، ''ہرگز نہیں خداوند، مَیں نے کبھی بھی حرام یا ناپاک کھانا نہیں کھایا۔'' خدا جواب دیتا ہے، ''جو کچھ اللہ نے پاک کر دیا ہے اُسے ناپاک قرار نہ دے۔'' یہی کچھ تین بار ہوتا ہے، پھر چادر دوبارہ آسمان پر واپس اُٹھا لی جاتی ہے۔

اِس کے عین بعد ایک غیر یہودی افسر بنام کُرنیلیُس کے کچھ مرد پطرس کے پاس پہنچتے ہیں۔ وہ اُسے اطلاع دیتے ہیں، ''ایک مقدّس فرشتے نے کُرنیلیُس کو ہدایت دی کہ وہ آپ کو اپنے گھر بُلا کر آپ کا پیغام سنیں۔'' یہ سن کر پطرس کو رویا کا مطلب سمجھ آتا ہے، اور وہ اُن کے ساتھ جا کر کُرنیلیُس کے گھر والوں کو یسوع مسیح کے بارے میں خوش خبری سنا دیتا ہے۔

تب لکھا ہے، ''پطرس ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ تمام سننے والوں پر روح القدس نازل ہوا۔ جو یہودی ایمان دار پطرس کے ساتھ آئے تھے وہ ہکا بکا رہ گئے کہ روح القدس کی نعمت غیر یہودیوں پر بھی اُنڈیلی گئی ہے۔''[c]

---

[a] اعمال 8:26-40
[b] اعمال 9:15
[c] اعمال 10:44-45

یوں اِس بات پر روح القدس کا ٹھپا لگ گیا کہ عیسیٰ مسیح کی نظر میں کوئی بھی قوم ناپاک نہیں۔ جس طرح پولس رسول فرماتا ہے، ''اب نہ یہودی رہا نہ غیر یہودی، نہ غلام رہا نہ آزاد، نہ مرد رہا نہ عورت۔ مسیح عیسیٰ میں آپ سب کے سب ایک ہیں۔''[a] اور دوسری جگہ پر، ''اللہ کا راز یہ ہے کہ اُس کی خوش خبری کے ذریعے غیر یہودی اسرائیل کے ساتھ آسمانی بادشاہی کے وارث، ایک ہی بدن کے اعضا اور اُسی وعدے میں شریک ہیں جو اللہ نے مسیح عیسیٰ میں کیا ہے۔''[b] اب سے بین الاقوامی کلیسیا فروغ پا سکتی ہے۔ اب سے کلیسیا جلد از جلد رومی بادشاہی کے ہر کونے میں پہنچ جاتی ہے، فلسطین سے یورپ تک بلکہ برِ صغیر سے ایشیائے وُسطیٰ اور چین تک۔ جو بیج مسیح کی صلیبی موت اور جی اُٹھنے سے بویا گیا وہ اب سے بڑھتا بڑھتا ایک بڑا اور پھل دار درخت بن سکتا ہے۔ اب کلیسیا دنیا کے اُکھاڑے میں قدم رکھنے کے لئے تیار ہے۔

بحران! غیر یہودیوں کے بارے میں رسولوں کا فیصلہ

لیکن ایک لمحے کے لئے رُکیں۔ یہ کیا طوفان ہے جو اُفق پر نظر آ رہا ہے؟ جو ایمان دار یروشلم سے نکل کر بڑے جوش سے نئی جماعتوں کی بنیاد ڈالنے میں مصروف ہیں وہ اچانک ایک نہایت خطرناک موڑ پر آ پہنچے ہیں۔ ایک آندھی جماعت کی نازک جڑ کو اُکھاڑ کر ختم کرنے والی ہے۔

کیا ہوا ہے؟ یروشلم کی ایک تبلیغی ٹیم کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ہاں، شام کے عظیم شہر انطاکیہ کے ایمان داروں کو دیکھ کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ کیوں؟ اُنہیں پتا چل گیا ہے کہ غیر یہودی ایمان داروں کا ختنہ نہیں ہوا حالانکہ ختنہ یہودی ایمان دار کا ظاہری نشان ہے۔ اُنہیں پورا یقین ہے کہ یہ غلط ہے۔ صرف اور صرف وہ

---

[a] گلتیوں 28:3
[b] افِسیوں 6:3

لوگ خدا کی قوم میں شامل ہو سکتے ہیں جو توریت کی پیروی کریں۔ چنانچہ وہ سیدھے اِس نام نہاد غلطی کو درست کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ "لازم ہے کہ آپ کا موسیٰ کی شریعت کے مطابق ختنہ کیا جائے، ورنہ آپ نجات نہیں پا سکیں گے۔"[a] اُن کے اِس نعرے سے ایمان داروں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔

پولس رسول اور برنباس یہ سن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ گو وہ خود ختنہ شدہ ہیں وہ صاف طور پر جانتے ہیں کہ یہ تقاضا پورا کرنے سے پوری خوش خبری خطرے میں آ جائے گی۔ اگر انسان توریت کے رسمی احکام کو ماننے سے نجات پاتا تو مسیح کی صلیبی موت کی کیا ضرورت ہوتی؟

بحث مباحثہ اِتنا سخت ہے کہ آخرکار یروشلم میں جماعتوں کے راہنما جمع ہو جاتے ہیں تاکہ مسئلے کا حل نکالیں۔ جو فیصلہ نتیجے میں صادر ہوا وہ اعمال کی کتاب میں درج ہے:

> ہم اور روح القدس اِس پر متفق ہوئے ہیں کہ آپ پر سوائے اِن ضروری باتوں کے کوئی بوجھ نہ ڈالیں: بُتوں کو پیش کیا گیا کھانا مت کھانا، خون مت کھانا، ایسے جانوروں کا گوشت مت کھانا جو گلا گھونٹ کر مار دیئے گئے ہوں۔ اِس کے علاوہ زناکاری نہ کریں۔ اِن چیزوں سے باز رہیں گے تو اچھا کریں گے۔ خدا حافظ۔[b]

موسوی شریعت کے پیشِ نظر یہ فیصلہ حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ یہاں صاف کہا گیا ہے کہ یہودی رسومات مجموعی طور پر غیریہودی ایمان دار کے لئے لازم نہیں ۔ پابندیوں میں نہ ناپاک جانوروں اور نہ ختنہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اخلاقی احکام جاری رہے ہیں، اگرچہ یہاں زناکاری ہی بیان کی گئی ہے جو بت پرستوں کے لئے خاص آزمائش کا باعث

---

[a] اعمال 15:1
[b] اعمال 15:28-29

تھی۔ بت کا گوشت کھانا بھی آزمائش کا باعث بن سکتا تھا، کیونکہ سمجھا جاتا تھا کہ جو گوشت دیوتا کے لئے قربان کیا جاتا ہے اُس کا میزبان دیوتا خود ہے، لہٰذا اِس قسم کا گوشت کھانے والا شخص دیوتا سے رفاقت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خون نہ کھانے کا مشورہ اِس لئے کیا گیا کہ یہودیوں کے ساتھ رفاقت بحال رہے، جن کے لئے خون کھانا بالکل منع تھا (گلا گھونٹ کر مار دیئے جانے والے جانور کے گوشت میں خون رہتا ہے)۔ یعقوب یہی وجہ پیش کر کے فرماتا ہے،

> کیونکہ موسوی شریعت کی منادی کرنے والے کئی نسلوں سے ہر شہر میں رہ رہے ہیں۔ جس شہر میں بھی جائیں ہر سبت کے دن شریعت کی تلاوت کی جاتی ہے۔[a]

اِس فیصلے نے غیر یہودی ایمان داروں کے لئے ایک راہ کھول دی جس پر وہ مختلف زمانوں میں سے گزر کر آج تک چلے آئے ہیں۔ تین نکتے اہم ہیں: اول، غیر یہودی ایمان دار کو یہودی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے، لازم ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو دوسرے ایمان داروں کے لئے تکلیف کا باعث ہو، اور تیسرے، اخلاقی احکام جاری ہیں۔

اعمال کی کتاب اور پولس رسول کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کشمکش بعد میں بھی جاری رہی۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِسی کھینچا تانی نے پولس رسول کو مسیح میں ایمان دار کی آزادی بیان کرنے پر مجبور کیا۔

یہودی مسیحیوں کی علیٰحدگی

مسیح پر ایمان رکھنے والے یہودی اِس کوشش میں لگے رہے کہ اپنے یہودی بھائیوں کو مسیحی اُمّت میں لائیں، لیکن بے فائدہ۔ جب یروشلم 70ء اور 135ء میں تباہ ہوا

[a]اعمال 21:15

تو یہودی مسیحی اِس سے بہت متاثر ہوئے، خاص کر 135ء کے بعد، جب یہودیوں کو یروشلم میں قدم رکھنے سے منع کیا گیا اور اُس کے کھنڈرات پر غیر یہودی شہر تعمیر کیا گیا۔ اِن واقعات سے غیر یہودی مسیحی اپنی یہودی جڑوں سے منقطع ہو گئے۔ یہودی مسیحی جہاں تک ممکن تھا اپنے یہودی بھائیوں سے تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن 75ء سے یہ بھی ناممکن ہوا جب یہودیوں نے مسیحیوں پر لعنت کی دعا اپنی عبادتوں کا حصہ بنا لیا: اب سے ہر عبادت میں کہا جاتا تھا کہ "ناصری اور بدعتی فرقے جلد ہی تباہ ہو کر کتابِ حیات سے مٹ جائیں۔"

اِس کے بعد بھی مسیحی یہودیوں کے ایسے گروہ رہے جو ختنہ اور موسوی شریعت کے پابند رہے، لیکن نہ مسیحی اور نہ یہودی اُمّت اُنہیں قبول کر سکتے تھے۔ غالباً اِن میں سے وہ فرقہ وجود میں آیا جو عِبیونی کہلاتا تھا۔ عِبیون کا عبرانی مطلب غریب ہے، وہی نام جو پولس رسول فلسطین کے مسیحیوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔[a] جو کچھ ہم یقین سے عِبیونی فرقے کے بارے میں کہہ سکتے ہیں وہ کم ہی ہے۔ لگتا ہے کہ موسوی شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ وہ نہیں مانتے تھے کہ مسیح کنواری سے پیدا ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یسوع کو اپنی راست بازی کے باعث بپتسمہ لیتے وقت روح القدس حاصل ہوا۔ اُن کے نزدیک وہ اُس وقت سے مسیح یعنی موسیٰ جیسا نبی تھا۔ عِبیونی پولس کے خطوط سے نفرت رکھ کر صرف متی کی اِنجیل کو کانٹ چھانٹ کر کے مانتے تھے۔

ایک اَور یہودی مسیحی فرقے کا ذکر ہے جو نصرانی کہلاتا تھا۔ وہ عِبیونیوں سے ملتا جلتا ہو گا، لیکن وہ مانتا تھا کہ مسیح کنواری سے پیدا ہوا۔[1] قدیم تصانیف میں ایک اور فرقے کا ذکر ہوتا ہے جو اِلکِسائی کہلاتا تھا اور جس کا رجحان عرفانیت کی طرف تھا۔[2]

---

[a] دیکھئے رومیوں 15:26

باب 5

خوش خبری کے پہلے مبشّر

آسمان پر اُٹھا لئے جانے سے پہلے مسیح نے شاگردوں کو تمام قوموں کو شاگرد بنانے کا اختیار دیا تھا۔[a]

بارہ رسولوں کا تبلیغی کام

ابتدائی ایمان داروں نے بڑی سنجیدگی سے اپنے آقا کے اِس فرمان پر عمل کیا۔ اُن کا پہلا قدم یہ تھا کہ اُنہوں نے قرعہ ڈال کر یہوداہ اسکریوتی کی جگہ نیا رسول مقرر کیا۔ جس طرح اسرائیل کے 12 قبیلے تھے اُسی طرح لازم تھا کہ 12 رسول بھی ہوں۔[b]

---

[a] متی 28:18-20؛ اعمال 1:8

[b] متی 19:28؛ مکاشفہ 21:14

بے شک اِن کے علاوہ بہت سے ایمان دار تھے جنہوں نے یسوع مسیح کے ساتھ وقت گزار کر اُس کی تعلیمات حاصل کر لی تھیں، اور جو اُس کی موت اور جی اُٹھنے کے گواہ تھے۔[a] لیکن یسوع مسیح نے اِن بارہ کو خاص اختیار دے کر کہا تھا کہ

> مَیں تم کو سچ بتاتا ہوں کہ جو کچھ بھی تم زمین پر باندھو گے آسمان پر بھی بندھے گا، اور جو کچھ زمین پر کھولو گے آسمان پر بھی کھلے گا۔[b]

اور گو درجِ ذیل کا حوالہ پطرس رسول سے کہا جاتا ہے لیکن درجِ بالا حوالہ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے کے مستحق ہیں کہ اِس کا اطلاق تمام 12 رسولوں پر کیا جا سکتا ہے:

> مَیں تجھے آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں دے دوں گا۔ جو کچھ تُو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بھی بندھے گا۔ اور جو کچھ تُو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر بھی کھلے گا۔[c]

رسول ایک تو یسوع مسیح کی زندگی بشمول اُس کی موت اور جی اُٹھنے کے خاص گواہ تھے۔ دوسرے، وہی اُس کی تعلیمات محفوظ رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ اِسی میں اُن کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں تھیں۔ جو تعلیمات اور مسیح کے بارے میں واقعات اُن سے سنائے گئے وہی کلیسیا کی بنیاد بن گئے۔ بعد میں جب کلیسیا پھیل کر پختہ ہو گئی اور تمام تعلیمات اور واقعات نئے عہد نامے کی صورت میں قلم بند ہوئے تو رسولوں کی ضرورت نہ رہی۔

---

[a] مثلاً لوقا 10؛ ۱۔کرنتھیوں 15:1-8
[b] متی 18:18
[c] متی 16:19

اِن بارہ رسولوں کے علاوہ نئے عہد نامے میں مزید رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ اِن کی نوعیت پہلے بارہ رسولوں سے فرق ہے۔ رسول یونانی لفظ اپاستلس[a] کا ترجمہ ہے جس کا بنیادی مطلب ''بھیجا ہوا شخص'' ہے۔ اِس ناتے سے دیگر لوگ بھی رسول کہلا سکتے تھے۔ یوں پولس رسول کہلاتا ہے،[b] اور اِسی طرح اُس کا ہم خدمت برنباس،[c] دو مرد بنام اندرُنیکس اور یونیہ،[d] اِپَفرُدِتس،[e] سلوانس اور تیمُتھیُس۔[f]

اکثر رسولوں کے بارے میں ہم پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ خوش خبری پھیلانے کے لئے کہاں کہاں گئے۔ کلامِ مقدّس خود اِس ناتے سے کم ہی بیان کرتا ہے۔ جو بات بعد کی کلیسیا کا مرکزِ خیال رہی اُس کے بارے میں کلام خاموش رہا۔ اِس کے مقابلے میں بعد کے بے شمار روایات میں یہ شک دُور نہیں رہتا کہ وہ ہر صورت میں کسی نہ کسی رسول کو اپنی کلیسیا کے ساتھ منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر رسولوں کے بارے میں روایات صدیوں کے بعد قلم بند ہوئے، اور اُن کی تصدیق مشکل سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن کم از کم یہ اِس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ رسول ارشادِ اعظم کی تکمیل میں لگے رہے بلکہ یقیناً نہ صرف رومی ممالک میں بلکہ ایشیائے وُسطیٰ اور انڈیا تک بھی پہنچے۔[1]

دیگر ایمان داروں کا تبلیغی کام

رسولوں کے علاوہ بہت سے عام ایمان دار بھی خوش خبری پھیلانے میں مصروف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولس رسول روم جانے سے کافی عرصہ پہلے روم کے ایمان داروں کو خط

---

[a] ἀπόστολος (apostolos)
[b] دیکھئے رومیوں 1:1؛ ا۔کُرنتھیوں 1:1 وغیرہ
[c] ا۔کُرنتھیوں 5:9؛ گلتیوں 9:2 بمقابلہ اعمال 13:2-3؛ 14:14
[d] رومیوں 7:16
[e] فلپّیوں 25:2
[f] ا۔تھسل 1:1 بمقابلہ 7:2

لکھ سکتا ہے۔[a] ہم نہیں جانتے کہ روم کی جماعت کس طرح شروع ہوئی، لیکن غالباً یہ کسی رسول کے پہنچنے سے پہلے ہی قائم ہوئی۔ کتابِ مقدّس میں روم کے دو ایمان داروں کا خاص ذکر ہے، اکوِلہ اور پرسکلہ۔ یہ جوڑا جس کا پیشہ خیمے بنانا ہے کبھی روم،[b] کبھی کُرِنتھس[c] اور کبھی اِفسس[d] میں رہتا ہے۔ جہاں جہاں وہ جاتے کلیسیا کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہتے ہیں۔

اپلّوس بھی اِس کی خوب صورت مثال ہے کہ رسولوں کے علاوہ بہت سے ایمان دار تبلیغی کام میں مصروف تھے۔ اپلّوس مصری شہر اسکندریہ کا رہنے والا ہے جو سفر کرکے ایشیائے کوچک کے شہر اِفسس پہنچتا ہے۔ وہاں وہ مسیح کے بارے میں تعلیم دینے لگتا ہے، لیکن چونکہ اُس کا علم نامکمل ہے اِس لئے اکوِلہ اور پرسکلہ جو اُس وقت اِفسس میں ٹھہرے ہوئے ہیں اُسے مزید تعلیم دیتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد اِفسس کے ایمان دار اپلّوس کو خدمت کرنے کے لئے یونانی شہر کُرِنتھس بھیج دیتے ہیں۔[e]

چنانچہ گو اعمال کی کتاب میں زیادہ تر سب سے اہم تبلیغ کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن مختلف اشاروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہت سارے اَور لوگ بھی تبلیغی اور تعمیری کام میں لگے رہے۔

---

[a] رومیوں 7:1
[b] اعمال 18:2-3 ؛ رومیوں 16:3-4
[c] اعمال 18: 2-3، 18
[d] اعمال 18: 19، 26؛ ا۔کُرِنتھیوں 16:19؛ ۲۔تیم 4:19
[e] اعمال 18:24-28؛ ا۔کُرِنتھیوں 1:12؛ 3:3-6، 22؛ 4:6؛ 16:12؛ ططس 3:13

باب 6

ایمان کا پھیلاؤ مشرق اور مغرب میں

مسیحی ایمان اِتنی تیزی سے پھیل گیا کہ خود ایمان داروں کو معجزانہ لگا۔ وہ تیزی سے شام، ایشیائے کوچک، یونان اور اٹلی تک پہنچ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جلد ہی رومی ممالک کی مشرقی سرحد کو عبور کر کے آگے بڑھا۔ افسوس کہ ہمیں اِس سلسلے میں رومی ممالک کے بارے میں کہیں زیادہ اطلاعات ملتی ہیں اگرچہ مشرق کی طرف تبلیغی کام کا اثر مغرب سے کم نہیں تھا۔ آیئے، پہلے ہم مشرق پر مسیحیت کے اثر پر غور کریں۔

مشرق کی کلیسیا

مشرق کے پھیلاؤ کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم پہلی جماعتوں پر غور کریں۔ تاریخ کی نظر سے دو جگہیں خاص کر نمودار ہیں، ایدیسہ اور اربیل۔

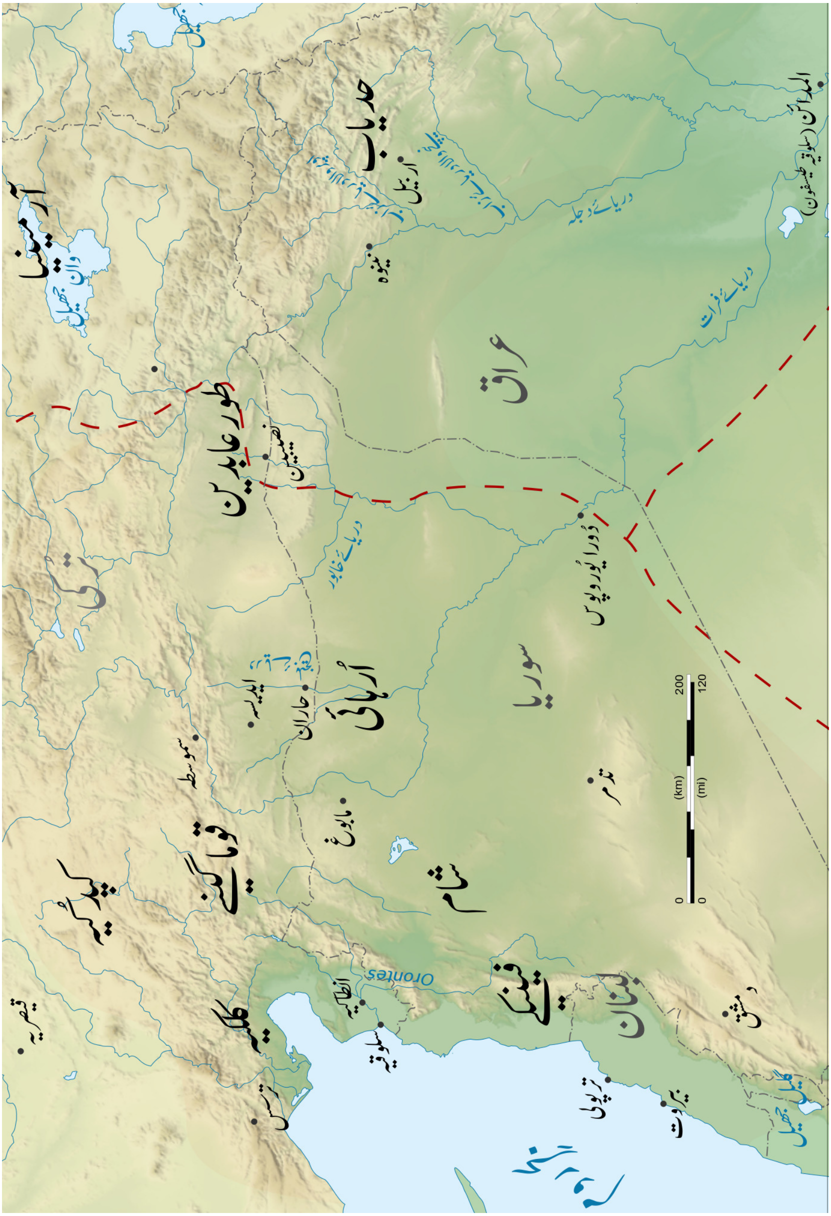

مشرقِ وُسطیٰ کا نقشہ

مشرق کی طرف بڑھنے کے پہلے اشارے

ایدیسہ

رومی بادشاہی کے مشرق میں ایرانی بادشاہی بنام پارتھیا تھی۔ پارتھیا اور روم کے درمیان ایک چھوٹی سی ریاست بنام اورہئی[a] تھی جس کا دار الحکومت ایدیسہ تھا۔[b] لگتا ہے کہ مسیحی جلد ہی اِس ملک میں پہنچ گئے۔ جو ثبوت آج تک موجود ہیں وہ سب اِس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

قدیم مؤرخ یوسیبیُّس کے مطابق ایدیسہ کی کلیسیا کا بانی مسیح کے 72 شاگردوں میں سے ایک بنام تدّی (سُریانی میں آدّی) تھا۔ اُس کے کہنے کے مطابق ایدیسہ کے بادشاہ ابگر پنجم نے لاعلاج بیماری سے شفا پانے کے لئے یسوع مسیح کو خط بھیج دیا۔ یوسیبیُّس نے بادشاہ کا خط اور یسوع مسیح سے اُس کا جواب قلم بند کیا۔ آگے وہ لکھتا ہے کہ مسیح کے اُٹھا لئے جانے کے بعد توما رسول نے تدّی کو ایدیسہ بھیج دیا جس کے نتیجے میں بادشاہ کو شفا مل گئی اور وہاں کلیسیا قائم ہوئی۔[1] بعد میں تقریباً 390ء تا 430ء اِس کہانی کو بڑھا چڑھا کر تعلیمِ ادّی[c] کا نام دیا گیا۔[2]

اگرچہ آج کل دونوں خطوں کو فرضی قرار دیئے گئے ہیں، تو بھی یہ اِس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ رسولوں کے زمانے میں ہی کلیسیا ایدیسہ میں قائم ہوئی۔ ایک تو اعمال 9:2 میں اِس کا ذکر ہے کہ عیدِ پنتکُست کے وقت جب 3,000 افراد نے بپتسمہ لیا مسوپتامیہ کے یہودی یروشلم میں حاضر تھے۔ یہ یہودی اپنے اپنے گھروں سے یروشلم میں عید منانے کے لئے آئے تھے تو ظاہر ہے کہ بعد میں اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ بے شک جہاں جہاں گئے وہاں مسیح کا پیغام بھی پھیلایا۔ اِس طریقے سے خوش خبری ایدیسہ جیسی جگہوں تک پہنچی۔ اور چونکہ نہ صرف ایدیسہ بلکہ قریب کے ملک

---

[a] Osrhoene
[b] جدید تُرکی کا مشرقی شہر Şanlıurfa
[c] Doctrine of Addai

آرمینیا اور حدیاب نے بھی تدّی کو اپنی کلیسیا کا بانی مقرر کیا اِس لئے اِس میں کم از کم یہ بات سچ ہو گی کہ کلیسیا جلد ہی وہاں قائم ہوئی۔[3]

یوسیبیُّس اِس کا ذکر کرتا ہے کہ تقریباً 197ء میں ایدیسہ کی کلیسیا نے ایک خاص مجلس منعقد کی۔[4] اور تقریباً 540ء میں مرقوم کتاب بنام تواریخِ ایدیسہ فرماتا ہے کہ 201ء میں ایدیسہ کا گرجا گھر سیلاب سے برباد ہوا۔[5]

ایدیسہ کے ساتھ توما رسول کا تعلق اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم روایات کے مطابق ایک سوداگر نے تیسری صدی میں اُس کی ہڈیوں کو جنوبی انڈیا سے لے کر ایدیسہ میں دفن کیا۔[6]

اربیل

حدیاب کا ذکر ہو چکا ہے جو ایدیسہ کے مشرق میں جدید دور کے شمالی عراق میں واقع ہے۔ اُس کا دار الحکومت اربیل تھا۔ چھٹی صدی میں اربیل کے بارے میں ایک کتاب بنام تواریخِ اربیل قلم بند ہوا جو آج تک موجود ہے۔[7] اُس میں لکھا ہے کہ ایدیسہ کے رسول ادّی نے تقریباً 100ء میں اربیل کے ایک مرد بنام پقیدہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے پہلا بشپ مقرر کیا۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ تمام تاریخی تفصیلات سچ ہیں، لیکن آج اہم ثبوت مل گئے ہیں کہ یہ اطلاع مجموعی طور پر حقیقت پر مبنی ہے۔[8] مذکورہ تصنیف میں اِس کا بھی ذکر ہے کہ 224ء میں جب ساسانی بادشاہی کا آغاز ہوا تو 20 سے زائد بشپ تھے۔

اگر پہلا بشپ واقعی 100ء میں مخصوص ہوا تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مسیحی کافی دیر پہلے وہاں پہنچ گئے تھے، ایسے مسیحی جو اعمال کی کتاب کے نمونے کے مطابق بشپ مقرر کئے بغیر عبادت کیا کرتے تھے۔ مغرب کی کلیسیاؤں کی طرح مشرق کی پہلی جماعتوں میں بھی بے شک بشپ کا منصب تھا ہی نہیں، بلکہ یہ بعد میں وجود میں آیا۔

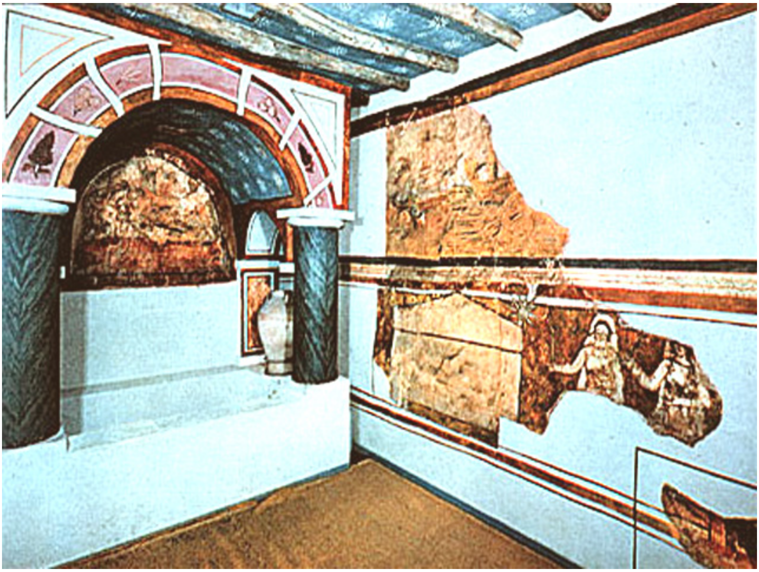

دُورا یوروپوس کا گرجا گھر

تواریخِ اربیل کے مطابق بقیدہ کے بعد کے بشپوں کے یہودی نام ہیں مثلاً سمسون، اضحاق، ابرہام، ہابل وغیرہ۔ ممکن ہے کہ یہ بات اِس کلیسیا کی یہودی جڑوں کی طرف اشارہ کرے۔[9] دیگر تحقیقات نے یہ اندازہ پختہ کر دیا ہے کہ مذکورہ علاقوں کو فلسطین کے اَرامی بولنے والے یہودیوں سے مسیح کے لئے جیتا گیا۔ بے شک خوش خبری کا پھیلاؤ یہودیوں میں شروع ہوا۔[10]

سب سے قدیم گرجاگھر

مشرق کی کلیسیا کی قدامت اِس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کا سب سے قدیم گرجا گھر مشرقی شام میں پایا گیا ہے۔ دریائے فرات کے قدیم شہر دُورا یوروپوس میں واقع یہ عمارت تقریباً 232ء میں تعمیر ہوا۔[11]

ساسانی شاہ کار طاقِ کسریٰ

مشرق کی کلیسیا کی خود مختاری

لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ سُریانی بولنے والی جماعتوں کا مرکز ایدیسہ اور اربیل سے مشرقی شہر المدائن (سلوقیہ طسیفون) میں منتقل ہوا [a] جو 224ء میں ساسانی بادشاہی کا دار الحکومت بن گیا۔ المدائن کے کھنڈرات آج تک بغداد کے قریب دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جگہ سلوقیوں کے زمانے یعنی تیسری صدی قبل از مسیح سے بغداد کے قائم ہو جانے تک نہایت اہم تھی، اِس لئے ظاہر ہے کہ یہ مسیحیوں اور یہودیوں دونوں کا مرکز بن گئی۔ آخر یہ اُس زمانے کی سب سے بڑی آبادی تھی۔ قدیم مؤرخوں کے مطابق اُس میں 6 لاکھ تک افراد آباد تھے۔[12]

[a] المدائن عربی میں مدینہ یعنی شہر کا جمع ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں دو شہروں پر مشتمل تھا۔ ایک دریائے دِجلہ کے ایک کنارے پر اور دوسرا اُس کے پار واقع تھا۔ پہلے کا نام طسیفون (Ktesiphon)، دوسرے کا سلوقیہ (Seleukia) تھا۔ المدائن حقیقت میں عربوں کا اِن دونوں شہروں کے لئے نام تھا جب اُنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اِن پر قبضہ کیا۔

ہم جانتے ہیں کہ 410ء میں المدائن میں مسیحیوں کی ایک مجلس بنام مار اسحاق کی مجلس[13] منعقد ہوئی۔ اُس میں مار اسحاق کو ساسانی بادشاہی میں موجود کلیسیاؤں کا رئیس[a] مقرر کیا گیا۔

424ء میں مار دادیشوع کی مجلس میں مشرقی جماعتوں کی پوری خود مختاری کی تصدیق کی گئی۔[14] یہ ساسانی بادشاہی میں آباد مسیحیوں کے لئے لازم تھا۔ قسطنطین کے وقت سے رومی بادشاہ مسیحی تھے جبکہ ساسانی بادشاہ زرتشت کے کٹر پیروکار رہے، اور دونوں ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ ساسانی بادشاہوں کی نظر میں مسیحی مشکوک تھے، کیونکہ خطرہ تھا کہ وہ دشمن کے ساتھ مل جائیں۔ نتیجے میں 339ء میں مسیحیوں کی شدید ایذا رسانی شروع ہوئی اور 40 سال تک جب تک شاپور دوم زندہ رہا جاری رہی۔ بعد میں بھی ایذا رسانیاں ہوتی رہیں۔ ایذا رسانی کے اِس سلسلے کو مسیحیت کی مشکل ترین ایذا رسانی قرار دیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک لاکھ نوے ہزار افراد شہید ہوئے۔[15] اِسی ماحول کے باعث لازم تھا کہ ساسانی حکومت کے ایمان دار مغرب سے ہٹ کر اپنا ہی کلیسیائی انتظام قائم کریں۔[16] اُن کا رجحان چونکہ دیوفیسیت کی طرف تھا اِس لئے مغرب سے علیٰحدگی مشکل محسوس نہ ہوا۔

یہ خود مختاری اِس میں ظاہر ہوتی ہے کہ مار اسحاق کی مجلس میں روم کا نمائندہ حاضر تھا جبکہ یہ سلسلہ بعد میں ختم ہوا۔ مار دادیشوع کی مجلس سے رومی نمائندہ نہ رہا۔ دوسری طرف دونوں مجالس ساسانی بادشاہ کے حضور ہی منعقد ہوئیں۔ ہم اِس آخری بات سے مسیحیوں کی طاقت جانچ سکتے ہیں بلکہ یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ بادشاہ نے مسیحیوں کی سیاسی اہمیت سمجھ لی تھی۔[17]

تاہم ساسانی بادشاہوں کے ساتھ تعلقات پیچیدہ رہے۔ 448ء میں یعنی مذکورہ مجلسوں کے بعد ہی ڈیڑھ لاکھ تین ہزار افراد آج کے عراقی شہر کرکوک کے قریب شہید ہوئے۔[18]

---

catholicos[a]

مشرق کی کلیسیا کی ترقی و تنزلی

ساسانی حکومت

مذکورۂ بالا مجلسوں کی فہرستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیسیا نے تمام ساسانی صوبوں میں جڑ پکڑ لی تھی۔ ایسی جماعتوں کا ذکر بھی ہے جو ساسانی ممالک سے دُور تھے۔ ایک وجہ ساسانی بادشاہوں کی ایذا رسانی تھی۔ جو ایذا رسانی شاپور دوم کے تحت ہوئی اُس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ کچھ مسیحی جنوبی انڈیا اور عرب ممالک میں ہجرت کر گئے۔ اُس وقت سے قطر میں بشپ کا ذکر ہے، اور تقریباً 390ء میں بحرین میں فارسی خانقاہ قائم ہوئی۔ اِس طرح یمن میں بھی مسیحی ایمان پھیلنے لگا۔ عرب میں مسیحی ایمان کی طرف رجحان اسلام کی آمد تک جاری رہا۔[19]

ساسانی بادشاہوں کے تحت کلیسیا نہ صرف انڈیا اور عرب ممالک میں پھیل گئی بلکہ ایشیائے وُسطیٰ سے لے کر چین تک بھی۔ 424ء میں ہرات (افغانستان) اور مرو (تُرکمنستان) میں بشپ تھے،[20] اور 497ء میں ہنوں میں خوش خبری سنائی گئی۔[21] 635ء میں کلیسیا کے مبشّر چین پہنچ گئے۔

اسلام

جب مسلمان آخری ساسانی بادشاہ کو شکست دے کر حکومت کرنے لگے تو مجموعی طور پر مسیحیوں کو ستایا نہ گیا۔ البتہ مسیحیوں کو ذمی قرار دیا گیا، اِس لئے اُنہیں جزیہ دینا پڑا۔ نیز، نئے گرجا گھر تعمیر کرنے یا علانیہ صلیب دکھانے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم خاص کر پہلی صدیوں میں کئی مسیحی بڑے عُہدے پر فائز ہوئے، کیونکہ اُن کے عالِم مشہور تھے۔[22]

اسلام کی اِن پہلی صدیوں میں مشرق کی کلیسیا انڈیا، ایشیائے وُسطیٰ اور چین کی طرف پھیلتی گئی۔ اُس کا رئیس تیمُتھیُس اول (779ء تا 820ء) اِس سلسلے میں خاص جوشیلا تھا۔ اُس کے تحت راہبوں کو دُور کے علاقوں میں بشارتی کام کرنے کے لئے

تیار کیا گیا۔ اُس وقت انڈیا، چین، تِبت اور تُرک کے قبیلوں میں جماعتیں تھیں۔ غرض مشرقی مسیحی رومی مسیحیوں کی نسبت کہیں زیادہ پھیل گئے تھے۔[23]

چین

635ء میں مشرق کی کلیسیا کا ایک مبشّر بنام اَلوپن راہِ ریشم کے ذریعے چین پہنچا۔ تین سال کے بعد چین کے بادشاہ نے مسیحی ایمان داروں کو اپنا ایمان پھیلانے کی اجازت دی۔ نیز، اُنہیں دار الحکومت میں خانقاہ قائم کرنے کی اجازت ملی۔ اُس وقت چین میں مسیحی ایمان پہلی دفعہ پھیلنے لگا۔ اِس کا پکا ثبوت ایک ستون میں ملتی ہے جو 781ء میں چین میں کھڑا کیا گیا اور جس پر مذکورہ باتوں کا ذکر کندہ کیا گیا ہے۔[24] کچھ دیر تک مسیحی مذہب کی ترقی ہوئی، لیکن نویں صدی میں مسیحی مذہب کو منع کیا گیا، اور اُس صدی کے آخر میں مسیحی چین سے غائب ہو گئے تھے۔[25]

مسیحیت دوبارہ چین میں داخل ہوا جب منگولی تیرھویں صدی میں چین پر غالب آئے۔ لیکن جب منگولی بادشاہی 1368ء میں ختم ہوئی تو مسیحی بھی دوبارہ غائب ہو گئے۔[26]

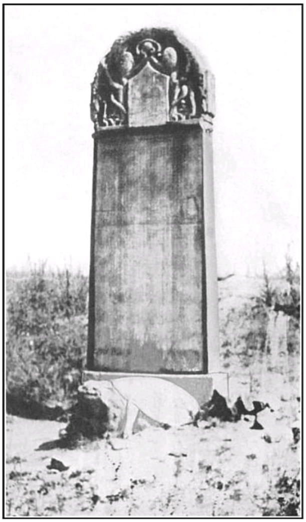
چین میں مسیحی ستون

منگولی

تیرھویں صدی کے آخر تک مشرق کی کلیسیا بہت پھیل گئی تھی۔ اُس کی جماعتیں ایشیائے وُسطیٰ، سائبیریا اور چین سے لے کر جنوبی انڈیا اور مشرقِ وُسطیٰ تک پائی جاتی تھیں۔ لگتا ہے کہ اُس کے مبشر کوریا، جاپان، فلپائن، جاوا، برما اور ہندچین تک پہنچ گئے۔

لیکن اِس کلیسیا کی تنزلی جلد ہی آنے والی تھی۔ شروع میں کچھ منگولی قبیلوں نے مسیحی ایمان قبول کیا تھا، اور عین ممکن تھا کہ باقی منگولی قبائل بھی مسیحی بن جاتے۔ لیکن پھر

تین منگولی خانوں نے اسلام کو قبول کر لیا، اور تیرھویں صدی کے آخر سے ایذا رسانیاں بڑھ گئیں۔ بے شمار گرجاگھروں کو بند کیا گیا یا مسجدوں میں تبدیل کیا گیا۔ مشرق کی کلیسیا کا ستیاناس منگولی خان تیمُر کے دور میں ہوا۔ بے شک اُس نے نہ صرف بے شمار مسیحیوں بلکہ لاکھوں مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر میں جو کلیسیا چین تک پھیلی ہوئی تھی وہ موصل، سلماس اور دیار بکر کے درمیان کے علاقے تک محدود ہو گئی۔ آج کل اِس کلیسیا کے اکثر ممبران پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔[27]

انڈیا

اعمالِ توما کی کتاب جو تیسری صدی میں قلم بند ہوئی توما رسول کے دو سفر بیان کرتی ہے۔ بے شک کتاب کی بہت سی باتیں تاریخی لحاظ سے غیر یقینی لگتی ہیں، لیکن اُس کا دعویٰ کہ توما رسول ٹیکسلا کے بادشاہ گندُفر کے دربار تک پہنچا حقیقت پر مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک تو ٹیکسلا اُس وقت پارتھی تھا۔ چونکہ مشرقِ وُسطیٰ کافی حد تک پارتھیوں کے ہاتھ میں تھا اِس لئے وہاں تک پہنچنے کے کھلے راستے تھے۔ دوسرے، ہم جانتے ہیں کہ اُس زمانے کے ٹیکسلا میں واقعی ایک بادشاہ بنام گندُفر حکومت کرتا تھا۔[28] لیکن آثارِ قدیمہ کی طرف سے کوئی یقینی اشارہ نہیں ملتا کہ کلیسیا وہاں قائم ہوئی۔[a]

جنوبی انڈیا اور خاص کر کیرلا اِس ناتے سے فرق ہے۔ کیونکہ آج تک وہاں ایسے گروہ رہتے ہیں جو مار توما مسیحی کہلاتے ہیں اور جن کی مسیحی جڑیں بلاشبہ قدیم ہیں۔ عین توما رسول کے زمانے میں وہاں تک سفر آسان ہو گیا تھا، کیونکہ پہلی صدی عیسوی میں رومیوں کو پتا چل گیا کہ برسات کے موسم میں مسافر بحیرۂ احمر سے روانہ ہو کر بحری جہاز کے ذریعے 40 دن کے اندر اندر انڈیا پہنچ سکتا ہے۔ یوں یوسیبِئُس اپنی تاریخ میں ایک مرد بنام پنتینُس[b] کا ذکر کرتا ہے جو 190ء میں مصر سے یہی راستہ اختیار

---

[a] ہو سکتا ہے کہ ٹیکسلا میں پائی گئی ایک صلیب مسیحی ہو، لیکن یہ بات مشکل سے ثابت کی جا سکتی ہے۔

[b] Pantaenus

کر کے کیرلا پہنچا۔ وہاں اُس نے مسیحی پائے۔ اُس کے مطابق یہ ایمان دار برتلمائی کے ہاتھ سے ایمان لائے تھے۔[29] مار توما کے اپنے روایات کے مطابق توما رسول کیرلا یعنی بھارت کے جنوب مشرق پہنچا۔ کئی جماعتیں قائم کرنے کے بعد وہ جنوب مغرب کے شہر مدراس کے قریب شہید ہوا۔

خود مشرق کی کلیسیا میں کئی کتابیں ملتی ہیں جو توما رسول کے انڈیا جانے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اعمالِ توما کی کتاب کا ذکر ہو چکا ہے جو تیسری صدی میں قلم بند ہوئی۔ اور چوتھی صدی کے مشہور کلیسیائی رئیس افرائیم اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے کہ توما رسول انڈیا گیا اور کہ اُس کی ہڈیاں انڈیا سے ایدیسہ لائی گئیں۔ ایدیسہ کے روایات کے مطابق ایک سوداگر توما رسول کی ہڈیاں انڈیا سے ایدیسہ لے گیا جہاں اُنہیں دفنایا گیا۔[30]

کیرلا میں بھی یہودی جماعتیں تھیں، اِس لئے غالباً بشارتی کام اُن ہی میں شروع ہوا۔ مذکورہ پنتینُس اطلاع دیتا ہے کہ مسیحیوں کے پاس عبرانی زبان میں لکھی ہوئی متی کی اِنجیل ہے۔ عبرانی سے مراد ارامی ہو گی۔ بہر حال یہ بھی یہودی جڑوں کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھی صدی میں کچھ مسیحی ساسانی بادشاہی کی سخت ایذا رسانی کے باعث ہجرت کر کے کیرلا میں آباد ہوئے۔ نویں صدی میں فارس کی کلیسیا سے ایک اَور گروہ جنوب مشرق میں منتقل ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ انڈیا کی دوسری جگہوں پر بھی مسیحی گروہ تھے، لیکن اِس کی تصدیق کرنا مشکل ہی ہے۔[31]

اِن معلومات کے علاوہ چھٹی صدی میں ایک مسافر اِس کا ذکر کرتا ہے کہ انڈیا، سری لنکا اور جزیرۂ سُقُطری میں کئی مسیحی جماعتیں ہیں۔[32]

تین غیر معمولی کلیسیائیں

آرمینیا: پہلی مسیحی ریاست

آرمینیا کی کلیسیا کے قدیم روایات کے مطابق مسیحیت کا تعارف مذکورہٗ بالا اڈّی (تدّی) سے ہوا۔ چونکہ اڈّی ایدیسہ اور اربیل کی کلیسیاؤں کا بانی بھی سمجھا جاتا تھا اِس لئے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پہلے مسیحی ایدیسہ اور اربیل سے ہو کر آرمینیا پہنچے۔ ساتویں صدی سے روایات برتلمائی رسول کو بھی کلیسیا کا بانی قرار دیتے ہیں۔[33] دل چسپ بات یہ ہے کہ آرمینیا میں بڑی یہودی آبادیاں بھی تھیں۔[34] غالباً مسیحی ایمان اِن سے ہو کر آرمینیا پہنچا۔

چوتھی صدی کی ابتدا ہی میں آرمینیا کا بادشاہ مسیحی بن گیا۔ یوں آرمینیا کو پہلی مسیحی ریاست قرار دی جاتی ہے۔ پانچویں صدی میں کلامِ مقدّس کا آرمینیائی زبان میں ترجمہ ہوا۔ سُریانی اور یونانی کے جو الفاظ اِس میں پائے جاتے ہیں اُن سے کلیسیا کی مغربی (یونانی) اور مشرقی (سُریانی) جڑیں ظاہر ہوتی ہیں۔[35] ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرمینیا کی کلیسیا نے دونوں یونانی اور سُریانی کلیسیاؤں کی روایتوں پر اپنی بنیاد رکھی۔ اِس واحد کلیسیا نے بے شمار یونانی اور سُریانی کتابوں کا ترجمہ کیا، بلکہ موجودہ زمانے میں کئی ایک قدیم مسیحی اور غیر مسیحی کتابوں کا صرف آرمینیائی ترجمہ دست یاب ہے۔ ساتھ ساتھ آرمینیا کے ایمان داروں نے اِس بنیاد پر ایک کلیسیا تعمیر کی جو لاثانی ہے۔

آرمینیا کی کلیسیا کو صرف پہلی تین مجالسِ عامہ منظور ہیں۔ اُس کا رجحان میافیسیت کی طرف رہا ہے۔[a36]

جارجیا

چوتھی صدی کی ابتدا میں آرمینیا کے پڑوس کا ملک جارجیا بھی مسیحی بن گیا۔ روایات کے مطابق شمعون مجاہد اور اندریاس رسولوں نے خوش خبری جارجیا تک پہنچائی۔[37]

---

[a] دیکھئے صفحہ 230۔

اگرچہ یہ ثابت نہیں ہو سکتا لیکن اِس طرف تاریخی اشارے ملتے ہیں کہ ایمان دار یہاں بھی جلد ہی پہنچ گئے۔[38] ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں بھی مسیحی ایمان یہودی جماعتوں سے ہو کر پہنچا، کیونکہ جارجیا میں بھی یہودی جماعتیں تھیں۔ ایک روایت کے مطابق کچھ یہودی یروشلم کی بربادی کے بعد چھٹی صدی قبل از مسیح میں وہاں ہجرت کر گئے تھے۔[39]

جارجیا کی کلیسیا خلقیدونی ہے۔[40]

ایتھوپیا

ایک قدیم روایت فرماتی ہے کہ پرانے عہد نامے میں مذکورہ ملکِ سبا سے مراد ایتھوپیا ہے اور کہ سبا کی ملکہ کا بیٹا سلیمان سے پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ اخلاقی اور تاریخی لحاظ سے غیر یقینی ہے تو بھی لگتا ہے کہ پہلی صدی میں ایتھوپیا میں بہت یہودی آباد تھے۔[41] چنانچہ کیا عجب کہ اعمال کی کتاب ایتھوپیا کے ایک خدا پرست خواجہ سرا کا ذکر کرتا ہے۔[a] شاید دربار کے اِس شخص سے پہلے بھی ایتھوپیا میں ایمان دار تھے۔ اور غالباً ایتھوپیا میں بھی پہلے ایمان دار یہودی جماعتوں میں سے تھے۔ ایتھوپیائی کلیسیا کی ایک رسم اُس کی یہودی جڑوں کی طرف اشارہ کرتی ہے: اُس کے گرجاگھروں میں عہد کے صندوق کی نقل رکھی جاتی ہے۔

ہم ایتھوپیائی کلیسیا کی پہلی صدیوں کے بارے میں کم علم رکھتے ہیں۔ اِتنا ہم جانتے ہیں کہ چوتھی صدی میں ایتھوپیا کا شاہی خاندان ایمان لایا۔ ایک ہم عصر مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ دو نوجوانوں کے وسیلے سے سرانجام ہوا جنہیں ایک بحری سفر کے دوران بحیرۂ احمر کی ایک بندرگاہ میں قید کیا گیا۔ اُنہیں دربار میں لایا گیا جہاں بادشاہ نے اُن میں دل چسپی لی۔ ہوتے ہوتے پورا خاندان مسیحی بن گیا۔ ایک نوجوان کچھ دیر کے بعد اپنے شہر صور (لبنان) واپس چلا گیا، لیکن دوسرا بنام فرومنتیُس[b] اسکندریہ گیا جہاں

[a] اعمال 8:26-39
[b] Frumentius

بشپ نے اُسے 330ء میں ایتھوپیا کا پہلا بشپ مقرر کر کے واپس بھیج دیا۔ اُس وقت سے 1974ء تک مسیحی ایمان ایتھوپیا کا سرکاری مذہب رہا۔

ایتھوپیا کی کلیسیا میافیسی ہے۔[a][42]

مغرب کی کلیسیا

نئے عہد نامے کی بنا پر ہم جانتے ہیں کہ مسیحی ایمان تھوڑے سالوں کے اندر اندر روم تک پہنچ گیا۔ اعمال کی کتاب خوش خبری کا حیرت انگیز پھیلاؤ شام، ایشیائے کوچک، یونان اور روم تک دکھاتی ہے۔ 250ء میں اٹلی میں تقریباً 100 بشپ تھے۔ وہاں سے آج کا فرانس اور اسپین قریب تھے۔ تیسری صدی تک انگلینڈ میں کلیسیا قائم ہوئی، اور 400ء تک انگلینڈ کا رومی حصہ کافی حد تک مسیحی ہو گیا تھا۔ اُس دور کا مشہور نمائندہ فلاغیُس تھا۔ جب اینگلوسیکسن نامی غیر مسیحی قبائل برطانیہ میں گھُسنے لگے تو وہ بھی رفتہ رفتہ ایمان لائے۔[43]

خوش خبری جلد ہی مصر بھی پہنچ گئی۔ اسکندریہ کے مرد اپلّوس کا ذکر ہو چکا ہے جو اسکندریہ سے سفر کر کے اِفسس میں خوش خبری سناتا ہے۔ شمالی افریقہ کی مسیحیت بھی پرانی ہے، کیونکہ 160ء میں وہاں کے کچھ ایمان دار شہید ہوئے۔ اور وہاں کا مشہور مسیحی طرطُلیان 200ء میں اِس کا ذکر کرتا ہے کہ پورا شمالی افریقہ مسیحیوں سے بھر گیا ہے: ”کل ہم وجود میں آئے، اور آج آپ کی ہر جگہ ہم سے بھر گئی ہے۔ . . صرف اور صرف آپ کے مندر ہم سے چھوڑے گئے ہیں۔“[44] طرطُلیان اور اُس کا ہم عصر ایرینیُس اسپین کے مختلف شہروں کا ذکر کرتے ہیں جن میں مسیحی جماعتیں تھیں۔[45]

---

[a] دیکھئے صفحہ 230۔

باب 7

پھیلاؤ کی وجوہات

مسیحی جماعتیں بڑی تیزی سے تمام رومی ممالک میں پھیل گئیں۔ سوال اُٹھتا ہے کہ اِس کی کیا وجوہات تھیں؟ بے شک بعد میں بہت سے لوگ بلکہ پوری قومیں مجبوراً یا اپنے ذاتی فائدے کے لئے مسیحی بن گئیں۔ لیکن پہلی صدیوں میں مسیح کی خوش خبری دوسروں تک پہنچانے والے عام لوگ تھے جن کے پاس نہ تلوار، نہ اثر و رسوخ تھا۔ اعمال کی کتاب زور دار طریقے سے اِس حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔

چنانچہ یہ ایمان کیوں اِتنی تیزی سے پھیل گیا؟ یہاں تک کہ 112ء میں ایشیائے کوچک کا ایک گورنر بنام پلینی رومی شاہنشاہ تراجان کو خط لکھ کر پوچھتا ہے کہ کیا کرے۔ کیونکہ مسیحیت نے نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات میں بھی جڑ پکڑ لی ہے۔ گورنر کے مطابق مندر خالی رہتے ہیں، اور بُتوں کو قربان کیا گیا گوشت خریدا نہیں جاتا۔[1] پلینی

اطلاع دیتا ہے کہ کچھ مسیحیوں کو سزائے موت دینے کے بعد مسیح کے بے شمار اَور پیروکاروں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اب سوال ہے کہ اِتنی بڑی تعداد کے پیشِ نظر آگے کو کیا کرنا چاہئے۔

مسیحیوں کے سخت مخالف قیلسُس کے مطابق مسیحیوں کی کامیابی کی وجہ اُن کی یگانگت اور نظم و ضبط[a] ہے۔ لیکن اُس کے نزدیک یہ یگانگت صرف دوسروں سے خوف کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔[2]

بے شک ایذا رسانی نے مسیحیوں کی یگانگت کو پختہ ہونے دیا، لیکن دیگر کئی فرقوں کی یگانگت ایذا رسانی کے تحت ٹوٹ گئی۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مسیحیوں کو مسلسل ستایا جاتا تھا۔ ایسے اوقات ضرور تھے جب مسیحیوں کو خفیہ طور پر عبادت کرنا پڑا اور اُنہیں ستایا جاتا تھا۔ لیکن ایسے اوقات بھی تھے جب وہ امن سے زندگی گزار سکتے تھے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسری صدی میں جب ایشیائے کوچک کا ایک حکمران مسیحیوں کو ستانے لگا تو اردگرد کے تمام ایمان دار شکایت کرنے کے لئے اُس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آج کل لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر ایمان لاتے ہیں اُسی طرح اُس وقت بھی مسیحیت کی ترقی کی مختلف وجوہات تھیں۔

یہودی جماعتیں

ایدیسہ اور اربیل کی جماعتیں کس طرح شروع ہوئیں؟ اعمال کی کتاب میں ظاہر ہوتا ہے کہ پولس رسول جہاں جہاں جاتا پہلے یہودی جماعتوں میں خوش خبری سناتا۔ جب یہودی یہ پیغام رد کرتے تو وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ الگ ہو کر اپنی جماعت قائم کرتا تھا۔ بے شک یہی نمونہ مشرق میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ جب سے پہلے اسرائیلیوں کو اسیر کر کے مسوپتامیہ میں منتقل کیا گیا اُس وقت سے بے شمار یہودی وہاں

---

[a] σύνθημα (sunthēma)

آباد تھے۔ فلسطین کے یہودیوں کی مادری زبان ارامی تھی، وہی زبان جو پارتھیا میں استعمال ہوتا تھا۔

ملکہ ہیلینہ کا مقبرہ

چنانچہ جس طرح یونانی زبان بولنے والے آسانی سے روم کے تمام ممالک میں خوش خبری پہنچا سکتے تھے اُسی طرح ارامی زبان بولنے والے مسیح کے بارے میں پیغام پارتھیا کے ہر کونے تک پھیلا سکتے تھے۔ یہودی جماعتیں اِس ناتے سے نہایت مفید ثابت ہوئی ہوں گی۔ یہ فطری بات تھی کہ ابتدائی ایمان دار پہلے اپنے یہودی بھائیوں کے پاس جائیں، پھر ہی غیر یہودیوں کے پاس۔

آج کل ابتدائی کلیسیا کے پھیلاؤ کو زیادہ تر مغرب یعنی یورپ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور یورپ کی نظر سے یروشلم اور فلسطین رومی بادشاہی کی مشرقی سرحد پر واقع تھے، جہاں سے پہلے ایمان دار ترقی کرتے کرتے یورپ تک پہنچ گئے۔ لیکن یہ تصور ناقص ہے۔ حقیقت میں یروشلم مغرب اور مشرق کے بیچ میں ہی پڑا تھا، اور دونوں طرف اُس کے مضبوط تعلقات تھے۔

اِس ناتے سے یہ بات نہایت مفید ثابت ہوئی کہ یروشلم رومی ممالک میں بکھرے ہوئے یہودیوں کا روحانی مرکز تھا۔ سالانہ بے شمار یہودی یورپ، شمالی افریقہ، مصر اور ایشیائے کوچک سے آیا کرتے تھے تاکہ اپنے مقدّس شہر میں پرستش کریں۔ لیکن یہ حقیقت بھولی نہ جائے کہ فلسطین کے مشرق میں بھی بے شمار یہودی جماعتیں تھیں۔ کم از کم یہوداہ کی پہلی جلاوطنی سے یہودی آج کے عراق میں آباد تھے، اور گو کچھ واپس آئے تو بھی بہت سے افراد مسوپتامیہ میں رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یسوع مسیح کے زمانے میں

مسوپتامیہ میں بہت یہودی آباد تھے، یہاں تک کہ آج کے شمالی عراق میں واقع ملکِ حدیاب کا شاہی خاندان یہودی بن گیا، اور ملکہ ہیلینہ[a] نے کچھ وقت یروشلم میں گزار کر وہاں محل تعمیر کیا۔ بعد میں ملکہ کو یروشلم کے قریب دفن کیا گیا۔ وہاں اُس کا مقبرہ آج تک دیکھا جا سکتا ہے۔[4]

غرض ابتدائی کلیسیا نہ صرف مغرب کی طرف پھیلنے لگی بلکہ شروع سے ہی مشرق کی طرف بھی۔ یہ فطری بات تھی کہ پہلے ایمان دار خوش خبری پھیلانے کے لئے مشرق کی طرف بھی جانے لگے جہاں یہودی آبادیاں جنوبی انڈیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔[5]

عالمی زبان

سُریانی زبان

پارتھیا کے ممالک ٹیکسلا تک پھیلے ہوئے تھے، اور اُس کی مرکزی زبان سُریانی یعنی اَرامی کی ایک شاخ تھی۔ فلسطین کے یہودی بھی اَرامی بولتے تھے۔ جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں، ایمان دار جلد ہی ایدیسہ، اربیل اور آرمینیا تک پہنچ گئے۔ تو کیا عجب کہ ایمان آسانی سے افغانستان اور بھارت تک پھیل سکتا تھا۔

یونانی زبان

جو حیثیت سُریانی زبان پارتھی ممالک میں رکھتی وہی حیثیت یونانی زبان رومی ممالک میں رکھتی تھی۔ اور چونکہ فلسطین میں دونوں اَرامی اور یونانی بولی جاتی تھی اِس لئے یہ علاقہ خوش خبری پھیلانے کے لئے بے مثال تھا۔

کلامِ مقدس کے دو عالمی ترجمے

یہ کوئی اتفاق نہیں کہ شروع شروع میں کلامِ مقدّس کا دو عالمی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

---

[a] Helena

سُریانی ترجمہ

اَرامی زبان بولنے والے مسیحی جلد ہی کلامِ مقدّس کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنے لگے۔ غالباً پرانے عہد نامے میں یہودیوں کا ہاتھ تھا۔ پانچویں صدی سے ترجمے کی مکمل شکل بنام پشیطہ[a] ہر جگہ استعمال ہونے لگی۔ لیکن اِس سے پہلے دیگر ترجمے موجود تھے جن میں ططیان کا ترجمہ خاص مشہور ہوا۔ ططیان نے چاروں اناجیل کو یوں ملا دیا کہ اناجیل کے واقعات اور پیغامات کو ایک ہی کتاب کی صورت میں سلسلہ وار پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ تصنیف دوسری صدی کے آخر میں اکثر جماعتوں سے استعمال ہونے لگی، اور ساتھ ساتھ مزید ترجمے بھی تھے۔[6] لیکن پانچویں صدی سے پشیطہ دوسرے ترجموں کی جگہ لینے لگی۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ پشیطہ اور کلامِ مقدّس کے دیگر سُریانی ترجمے خوش خبری کو پھیلانے میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔

یونانی ترجمہ

تیسری صدی قبل از مسیح میں پرانے عہد نامے کا وہ ترجمہ مصر میں وجود میں آیا تھا جو ہفتادہ[b] کہلاتا ہے۔ جو یہودی یونانی بولتے تھے وہ عبادت میں یہی ترجمہ استعمال کرتے تھے۔ یہ ترجمہ ابتدائی مسیحیوں کا ایک خوب صورت وسیلہ بن گیا۔ ہفتادہ رومی ممالک میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا، خواہ خوش خبری پھیلانے میں، خواہ عبادت کے لئے۔ ہاں، مسیحی ایمان دار ہفتادہ کی مدد سے مسیح کے بارے میں نبوّتیں ثابت کرنے میں اِتنے کامیاب ہوئے کہ آخرکار یہودی نئے ترجمے تیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

ہفتادہ کے ساتھ ساتھ ایمان دار اناجیل اور رسولوں کے خطوط کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ نئے عہد نامے کے اناجیل اور خطوط سب

---

[a] Peshitta
[b] Septuagint

کے سب یونانی میں قلم بند ہیں، اگرچہ کئی ایک آیات کے یونانی متن کے پیچھے اَرامی زبان اور محاورے چمکتے دکھتے ہیں۔

کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ پشیطہ کا نیا عہدنامہ یونانی متن کا ترجمہ نہیں بلکہ اُس کا اصل ہے۔ لیکن تحقیقات نے واضح طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ غلط ہے۔ پشیطہ اصل نہیں بلکہ یونانی متن کا ترجمہ ہے۔[7]

آزاد کرنے والی خوش خبری

جو شخص قدیم زمانے کی بت پرستی کے بوجھ تلے کراہتا تھا اُس کے لئے مسیحیوں کا پیغام لاثانی تھا۔ کیونکہ دیوتاؤں کو خوش رکھنا تھا، اور کوئی یقین نہیں تھا کہ آخرکار وہ پیروکار کے ساتھ کیا کچھ کریں گے۔ کیا وہ میری قربانیاں قبول کریں گے؟ اِس کے مقابلے میں مسیح کی خوش خبری ایمان لانے والے کو تسلی دیتی تھی کہ مسیح میں تیرے گناہوں کو معاف کیا گیا ہے، تُو خدا کا پیارا فرزند بن گیا ہے، اور یہ سب کچھ مفت میں۔ یہ تیرے نیک کاموں کی بنا پر نہیں بلکہ خدا کے فضل کی معرفت ہوا ہے۔ اب اِس کو قبول کرکے اُس جماعت کا ممبر بن جا جس کی منزلِ مقصود نئی زمین اور نیا آسمان ہے۔

تبدیل کرنے والی خوش خبری

چال چلن کی تبدیلی

جو صحیح ایمان لایا اُس کی زندگی تبدیل ہوئی، جس طرح پولس رسول فرماتا ہے،

> چنانچہ ہم سب جن کے چہروں سے نقاب ہٹایا گیا ہے خداوند کا جلال منعکس کرتے اور قدم بہ قدم جلال پاتے ہوئے مسیح کی صورت میں بدلتے جاتے ہیں۔ یہ خداوند ہی کا کام ہے جو روح ہے۔[a]

محبت کا اظہار

اِس ایمان کا سب سے نمایاں پہلو محبت تھی۔ جس محبت کا اظہار مسیح نے اپنی جان دینے سے کیا اُس کا معقول جواب ایمان داروں کی ایک دوسرے سے محبت تھی۔ جس طرح مسیح نے فرمایا، ''اپنے پڑوسی سے ویسی محبت رکھنا جیسی تُو اپنے آپ سے رکھتا ہے،''[a] اور ''مَیں تم کو ایک نیا حکم دیتا ہوں، یہ کہ ایک دوسرے سے محبت رکھو۔ جس طرح مَیں نے تم سے محبت رکھی اُسی طرح تم بھی ایک دوسرے سے محبت کرو۔''[b]

اور یہ محبت سب کے سامنے ظاہر بھی ہوئی۔ کیونکہ ایمان دار غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کا خیال رکھتے تھے۔ جو بھائی قید خانے میں تھا اُسے وزٹ کیا جاتا تھا، اور جسے گرفتار کر کے کان کا کام کرنے پر مجبور کیا گیا اُس کے ساتھ رفاقت رکھنا لازمی تھا۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں کان کا کام زندہ حالت میں مرنے کے برابر تھا۔

کلیسیا کی ایک خاص خدمت غریب بھائیوں اور بہنوں کی تدفین تھی۔ مہمان نوازی بھی ایمان کا ایک نشان تھا۔ مسیحی مسافر اپنے مسیحی بھائی کے ہاں کم از کم تین دن ٹھہر سکتا تھا۔ جب آہستہ آہستہ پادریوں کا نظام شروع ہوا تو بِشپ کی ایک خاص ذمہ داری ایسے مسافروں کی مہمان نوازی کرنا تھی۔

ابتدائی کلیسیا کی سخاوت مشہور تھی، اور کافی لوگ اِس سے غلط فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اِس لئے پہلی صدی کے آخر میں لکھی ہوئی تصنیف بنام تعلیمِ رُسُل (دِدَخے) ایمان داروں کو غلط فائدہ اُٹھانے والوں سے آگاہ کرتی ہے۔[8] اور ایک غیرمسیحی مصنف بنام لوقیان دوسری صدی کے آخر میں مسیحیوں کی سخاوت کا مذاق اُڑا کر ایک نیم حکیم بنام پرِگرینس[c] کا ذکر کرتا ہے جو مسیحی بن کر بِشپ مقرر کیا گیا۔ گو اُسے قید خانے میں ڈالا گیا تو بھی اُس نے ایمان داروں سے بہت نفع حاصل کیا اور آخرکار جیل سے آزاد ہو کر

[a] ۲۔کُرِنتھیوں 18:3
[a] متی 19:19 وغیرہ
[b] یوحنا 34:13
[c] Peregrinus

چلا گیا۔[9] لوقیان کے پیشِ نظر یہ آدمی مسیحیوں کی بےوقوفی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ قصہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ غیرمسیحی بھی مسیحیوں کی سخاوت خوب مانتے تھے۔

چوتھی صدی تک علانیہ گرجا گھر نہیں تھے بلکہ ایمان دار اپنے گھروں میں عبادت کیا کرتے تھے۔ تو بھی 251ء میں روم کی جماعتیں مہینے میں اِتنے پیسے جمع کیا کرتی تھیں کہ تقریباً 150 خدمت گزاروں کے علاوہ 1500 سے زائد بیواؤں اور ضرورت مندوں کو بھی سہارا دیا کرتی تھیں۔[10] طرُطلیان اِس کی تصدیق کر کے فرماتا ہے کہ جماعت میں ہر ایک اپنی جیب اور رضامندی کے مطابق کچھ نہ کچھ پیسے دیتا ہے۔ یہ پیسے خوشی منانے کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اِن سے ہم غریبوں کو کھانا کھلاتے، مُردوں کو دفناتے اور یتیموں اور بوڑھوں کی حمایت کرتے ہیں۔ جن مسافروں کا جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا ہے اُن کی ہم مدد کرتے اور ساتھ ساتھ اُن کی جنہیں مسیح پر ایمان لانے کے باعث کانوں میں، جزیروں پر یا جیلوں میں قید رکھا گیا ہے۔[11]

جب تک مسیحی ایمان حکومت کی نظر میں غیر قانونی تھا اُس وقت تک کلیسیا کو جائیداد رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن چوتھی صدی اور خاص کر 312ء سے جب قسطنطین بادشاہ نے کلیسیا کو ملکیت رکھنے کی اجازت دی کلیسیا کی جائیداد جلد ہی بڑھ گئی۔ اِس سے کلیسیا کی امدادی قوت مزید بڑھ گئی، کیونکہ اب یہ دستور بن گیا کہ لوگ اپنی موروثی ملکیت میں سے ایک حصہ کلیسیا کو دیں۔

مسیح میں ہر ایک کی قدر و قیمت

خواتین

خواتین کا ابتدائی کلیسیا میں خاص کردار تھا، اور کئی جگہوں پر وہ پہلے ایمان لائیں۔[a] قدیم زمانے میں مسیحی ایمان کا خواتین کے بارے میں پیغام لاثانی تھا۔ کیونکہ غیرمسیحیوں میں خواتین ملکیت کی حیثیت رکھتی تھیں جبکہ مسیحی ایمان رکھتے تھے کہ مرد اور عورت خدا کے سامنے برابر ہیں۔[b] مسیحی جانتے تھے کہ مرد کو اپنی بیوی سے یوں محبت رکھنی ہے جس طرح مسیح نے اپنی جان دے کر اپنی جماعت سے محبت رکھی۔[c] اور ازدواجی زندگی کی قدوسیت اور بنیادی حیثیت مسیح کے الفاظ سے محفوظ رہتی تھی۔[d] شوہر مشکل سے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا تھا۔ بے شک مرد اور عورت کے برابر ہونے سے یہ مطلب نہ نکالا گیا کہ عورت آج کی طرح ہر پیشہ اور کام کرنے کے لئے آزاد ہے۔ اب بھی وہ زیادہ تر گھریلو کام سنبھالتی تھی۔ تو بھی اُس کی قدر و قیمت مرد کے برابر تھی۔

غلام

قدیم زمانے میں انقلاب لانے والا یہ خیال کہاں سے آیا کہ تمام انسان برابر ہیں؟ ایک تو ایمان دار جانتے تھے کہ تمام انسان خدا کی صورت پر بنائے گئے ہیں،[e] اِس لئے خدا کے سامنے سب ایک جیسے ہیں۔ دوسری طرف ایمان داروں کو تنبیہ کی جاتی تھی کہ وہ دنیاوی حکومت کے تابع رہیں۔[f] اِس لئے غلام رکھنے کے نظام کو برداشت کیا جاتا تھا اگرچہ اُسے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ پولس رسول فرماتا ہے، ”ہر شخص

---

[a] مثلاً اعمال 14:16
[b] گلتیوں 28:3
[c] افسیوں 23:5
[d] متی 9-3:19
[e] پیدائش 27-26:1
[f] رومیوں 13

اُسی راہ پر چلے جو خداوند نے اُس کے لئے مقرر کی اور اُس حالت میں جس میں اللہ نے اُسے بُلایا ہے۔"[a] اِس اصول کا اطلاق غیر ایمان دار شوہر سے شادی شدہ عورت پر بھی ہوتا ہے[b] اور غلام پر بھی:

> کیا آپ غلام تھے جب خداوند نے آپ کو بُلایا؟ یہ بات آپ کو پریشان نہ کرے۔ البتہ اگر آپ کو آزاد ہونے کا موقع ملے تو اِس سے ضرور فائدہ اُٹھائیں۔ کیونکہ جو اُس وقت غلام تھا جب خداوند نے اُسے بُلایا وہ اب خداوند کا آزاد کیا ہوا ہے۔ اِسی طرح جو آزاد تھا جب اُسے بُلایا گیا وہ اب مسیح کا غلام ہے۔ آپ کو قیمت دے کر خریدا گیا ہے، اِس لئے انسان کے غلام نہ بنیں۔[c]

یہ اصول فلیمون کی کتاب میں نظر آتا ہے جس میں پولس رسول ایک غلام بنام اُنیسمس کے مالک فلیمون سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اُسے آزاد کر دے:

> اصل میں مَیں اُسے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا تاکہ جب تک مَیں خوش خبری کی خاطر قید میں ہوں وہ آپ کی جگہ میری خدمت کرے۔ لیکن مَیں آپ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مَیں چاہتا ہوں کہ جو بھی مہربانی آپ کریں گے وہ آپ مجبور ہو کر نہ کریں بلکہ خوشی سے۔[d]

بعد میں بھی اپنے غلام کو رِہا کرنا نیکی سمجھا جاتا تھا، اور کئی بار کلیسیا غلاموں کو خرید کر آزاد کرتی تھی۔ مسیح میں مالک اور غلام دونوں بھائی تھے، اور کئی غلام آزاد ہو کر بِشپ

---

[a] ا۔کُرِنتھیوں 17:7
[b] ا۔کُرِنتھیوں 16-13:7
[c] ا۔کُرِنتھیوں 23-21:7
[d] فلیمون 14-13

کے منصب تک پہنچ گئے۔ گو رومی ممالک میں غلاموں کی شادی غیر قانونی سمجھا جاتا تھا لیکن کلیسیا ہر شادی کو جائز اور قانونی مانتی تھی، چاہے آزادوں کے درمیان ہو، چاہے غلاموں کے درمیان یا آزادوں اور غلاموں کے درمیان۔

اگرچہ اِس تعلیم سے پہلی صدیوں میں غلاموں کا نظام منسوخ نہ ہوا، لیکن جو بیج اِس سے بویا گیا اُس کا بعد میں پھل پک گیا۔

راہبوں کا انتظام

ابتدائی مسیحی راہبانہ زندگی سے واقف نہیں تھے، لیکن چوتھی صدی سے یہ تحریک اُن میں عام ہو گئی۔ کچھ راہب دنیا سے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے، لیکن بہت سے راہب گروہوں کی صورت میں زندگی گزارتے تھے۔ خاص کر گروہ کی صورت میں اُن کا معاشرے پر زور دار اثر پڑ گیا۔ مشرق اور مغرب میں بے شمار خانقاہیں قائم ہوئیں۔ اِس سر چشمے سے مبشروں کا زور دار دریا بہہ نکلا، ایسے لوگوں کا جو جانتے تھے کہ ہمارا مقصد اپنی صلیب اُٹھا کر خوش خبری پھیلانا ہے۔ جہاں جہاں یہ راہب جاتے نمک اور روشنی کا باعث بنتے۔ خوش خبری کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے دیگر قوموں کو کئی چیزیں سکھائیں، چاہے کاشت کاری کے بہتر طریقے چاہے حروفِ ابجد، وہی وسیلہ جو ترقی کا اہم ترین نشان ہے۔ عام لوگ مدد کے لئے اُنہی کے پاس آیا کرتے تھے، کیونکہ اُن کا کلامِ مقدّس کے بارے میں علم، اُن کی جوشیلی دعائیں، نرم انداز اور دوسروں کے لئے پیار مشہور تھا۔[12]

عام ایمان داروں کا بے لوث حصہ

ایمان کو پھیلانے میں بے شمار عام مسیحی شامل تھے، خاص کر تاجر، سوداگر، ہنر مند اور استاد جو اپنے پیشے کے سلسلے میں دوسری جگہوں پر منتقل ہوتے تھے۔ مثلاً سیر دریا اور آمو دریا کے درمیان ایک قوم بنام سُغدی رہتی تھی جس کا مرکز سمرقند تھا۔ سُغدی

تجارت کے لئے مشہور تھے، اور کئی صدیوں کے لئے راہِ ریشم پر تجارت کے لئے مستعمل زبان سُغدی تھی۔ لگتا ہے کہ سُغدی مسیحی ایمان پھیلانے میں مرکزی کردار رکھتے تھے، اور نویں اور دسویں صدی کے کئی مسیحی دستاویزات مل گئے ہیں جو فارسی زبان اور خاص کر سُغدی زبان میں قلم بند ہیں۔[13a] علمِ آثارِ قدیمہ نے اِس بات کی تصدیق کی ہے۔[14] چنانچہ لدّاخ میں کندہ کاری مل گئی ہے جس میں سمرقند کا ایک مرد سُغدی اور تبتی زبان میں اِس کا ذکر کرتا ہے کہ وہ تِبت کے حکمران سے ملنے کے لئے جا رہا ہے۔ غالباً اِسے تقریباً 825ء میں کندہ کیا گیا۔ مشرق کی کلیسیا کے رواج کے مطابق تین صلیبیں نقش کی گئی ہیں۔[15]

مدرسے

کئی ایک مدرسے قائم ہوئے۔ سب سے مشہور مدرسے اسکندریہ، فلسطین اور انطاکیہ کے مدرسے تھے۔ مشرق کے مشہور مدرسے نِصیبین، ایدیسہ اور بغداد کے قریب کے گندی شاپُر، المدائن (جو بعد میں بغداد میں شفٹ ہوا) اور مرو میں تھے۔ اِن میں نہ صرف روحانی علوم بلکہ دیگر شعبوں میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اِس کے مقابلے میں مغرب پہلی صدیوں میں پیچھے تھا۔ وہاں یہ تعلیم بڑی دیر تک خانقاہوں اور بشپوں پر محدود رہی۔[16]

فلاح و بہبود

مشرق میں جہاں بشپ کا منصب قائم ہوتا وہاں سکول، لائبریری اور ہسپتال بھی قائم کیا جاتا تھا۔[17] مشرق کی کلیسیا کے رئیس تیمُتھیُس نے ایک بار فرمایا، "یاد رہے کہ سکول کلیسیا کے فرزندوں کی ماں اور دایہ ہے۔" لٰہذا مسیحی اپنے علم کے لئے مشہور

---

[a] خاص کر نخلستان توریان (چین کے تُرکستان) میں۔

تھے۔ اسلام کے دور میں اُنہی کے ذریعے قدیم یونانی کتابوں کا عربی ترجمہ ہوا، اور خلیفہ کے اکثر ڈاکٹر مسیحی ہوا کرتے تھے۔[18]

یہ کچھ مجموعی طور پر مغرب کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ رومی سلطنت کی تنزلی پر کلیسیا ہی یورپ کی تعلیم و تربیت کا وسیلہ بن گئی۔ ساتھ ساتھ وہی اپنی خانقاہوں کے ساتھ فلاح و بہبود کا مرکز رہی۔

راستوں کا پکا انتظام

آخر میں یہ حقیقت نظر انداز نہ کی جائے کہ رومیوں نے مشرقِ وُسطیٰ سے لے کر انگلینڈ تک، مصر اور شمالی افریقہ سے آج کے رومینیا تک پکے راستے بنائے۔ 4,00,000 سے زائد کلومیٹر کے راستے مختلف علاقوں کو ایک دوسرے سے ملاتے تھے، اور اِن کے 80,500 سے زائد کلومیٹر پکے تھے۔[19] یہی اور بحری جہازوں کا انتظام وہی گوند تھا جس بنا پر رومی بادشاہی کئی صدیوں تک قائم رہ سکی۔ ساتھ ساتھ ابتدائی کلیسیا کا دور خاص امن و امان کا دور تھا۔ کیا عجب کہ اعمال کی کتاب میں اِس کا ذکر ہے کہ پولس نسبتاً تھوڑی دیر میں فلسطین سے روانہ ہو کر ایشیائے کوچک، یونان اور روم کا دورہ کرتا ہے۔ اور یہ کوئی غیرمعمولی بات نہیں کہ اپلّوس مصر سے سفر کر کے ایشیائے کوچک اور یونان تک پہنچتا ہے۔

رومی ممالک کے مشرق میں پارتھیا تھا جو پنجاب اور افغانستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے راستوں پر ایمان دار انڈیا اور چین تک پہنچے۔ نیز، پہلی صدی عیسوی سے بحری جہاز مشرقِ وُسطیٰ سے جنوبی انڈیا جایا کرتے تھے۔

باب 8

مشرقی کلیسیا کی تنزلی کی وجوہات

بیرونی وجوہات

حکمرانوں کی دوسرے مذاہب کی طرف رجوع

چین میں مشرق کی کلیسیا کی کامیابی حکمرانوں پر منحصر تھی۔ گو اُس کا وہاں آغاز قابلِ تعریف تھا تو بھی اُس کا اثر محدود رہا، اور مسیحی ایمان اجنبی سا سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات اِس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ تاچِن[a] یعنی شام سے متعلق مذہب کہلاتا تھا۔[1] چنانچہ جب حکمرانوں نے 845ء اور 1368ء میں مسیحی مذہب کو ناجائز قرار دیا تو وہ ملکِ چین

---

[a] Ta-ch'in

سے غائب ہو گیا۔ چین کے اِتنے لوگ ایمان نہیں لائے تھے کہ حکومت کے فیصلے کے باوجود قائم رہ سکیں۔

اِسی طرح گو مشرق کی کلیسیا شروع میں منگولی قبیلوں میں کام یاب تھی، لیکن اسلام قبول کرنے پر کلیسیا کا ستیاناس ہوا۔ اِس ناتے سے مشرقِ وُسطیٰ میں مغرب کی کئی بار مداخلت نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ نام نہاد صلیبی جنگوں سے لے کر آج تک مغرب کی مداخلت کا اکثر نتیجہ مسیحیوں پر دباؤ تھا، حتیٰ کہ آج مشرقِ وُسطیٰ کے کئی ایک خطے مسیحیوں سے محروم ہونے کے خطرے میں ہے۔

اندرونی وجوہات

اندرونی وجوہات پر غور کرتے وقت لازم ہے کہ قاری کو یاد رہے کہ مغرب کے مسیحیوں نے بھی منگولیوں میں تبلیغی کام کیا۔ بلکہ چودھویں صدی میں وہ چین کے منگولی دار الحکومت خان بالق (بیجنگ) سے شروع ہو کر ایشیائے وُسطیٰ اور ایران تک پھیل گئے۔ لیکن منگولیوں کے ستیاناس کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے۔ لٰہذا ہم ہر صورت میں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ اگر مغربی کلیسیا کو مشرق میں زیادہ موقع ملتا تو وہ زیادہ کام یاب ہوتی۔ تاہم مشرق کی کلیسیا میں کچھ باتیں نظر آتی ہیں جو بے شک تبلیغی کام میں مداخلت کا باعث بن گئیں۔

عبادت میں سُریانی زبان پر اصرار

مشرقی کلیسیا کی عبادتوں میں مستعمل زبان اُس وقت کی بین الاقوامی زبان سُریانی تھی، اور وہ کلامِ مقدّس کا سُریانی ترجمہ استعمال کرتی تھی۔ یہ بات خوش خبری پھیلانے میں نہایت مددگار ثابت ہوئی۔[a] لیکن جب تیسری صدی میں ساسانی حکومت شروع ہوئی تو وہ پوری جد و جہد سے فارسی زبان اور زرتشتی مذہب کو تقویت دینے میں لگ گئی۔ تاہم

[a] دیکھئے صفحہ 73۔

اکثر مسیحی عبادتوں کی زبان سُریانی رہی۔ جب تک سُریانی زبان بادشاہی کی ہر جگہ بولی جاتی تھی اُس وقت تک یہ بات مفید رہی۔ لیکن جب فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کا راج شروع ہونے لگا تو سُریانی زبان مسیحی ترقی کے لئے رُکاوٹ کا باعث بننے لگی۔

بے شک کچھ اشارے ملتے ہیں کہ کم از کم ایسے گروہ موجود تھے جو فارسی زبان میں عبادت کیا کرتے تھے۔ کچھ تاریخی اطلاعات کے مطابق سُریانی بولنے والی خانقاہوں کے ساتھ ساتھ فارسی بولنے والی بھی آ موجود ہوئیں، اور فارسی زبان میں کلامِ مقدّس اور دیگر مسیحی تصنیفات کا ترجمہ کم از کم پانچویں صدی سے شروع ہوا۔ لگتا ہے کہ اکثر جگہوں پر کلیسیائی عبادت کے لئے سُریانی زبان استعمال ہوتی تھی جبکہ عبادت کے علاوہ ایمان دار اپنی مادری زبانیں استعمال کرتے تھے۔[2]

ہوتے ہوتے سُریانی زبان عام استعمال میں متروک ہو گئی۔ تاہم مشرق کی کلیسیا عبادت میں سُریانی استعمال کرنے پر اصرار کرتی رہی، اگرچہ لوگ اِسے اجنبی سی زبان سمجھنے لگے تھے۔ کیا عجب کہ اُسے چین میں تاچِن یعنی شام کا مذہب قرار دیا گیا۔ منگولی دربار کے بارے میں درجِ ذیل بیان میں بھی یہی کمی نظر آتی ہے۔

توہم پرستی

مشرق کی کلیسیا میں بے شمار کتابیں قلم بند ہوئیں جن کا معیار اچھا تھا۔ اُن کا سب سے مشہور مصنف افرائیم سُریانی تھا۔ ہاں، مشرق کی کلیسیا کا نشان اُس کا علم پر زور تھا۔ لیکن کئی جگہوں پر آثارِ قدیمہ کی طرف سے اشارے ملتے ہیں کہ ہوتے ہوتے علم کا معیار کم ہوتا گیا اور توہم پرستی بڑھتی گئی۔ مغرب کا ایک مسافر منگولیوں کے دربار کے ساتھ پیوستہ مسیحیوں کے بارے میں لکھتا ہے:

> وہ کچھ نہیں جانتے۔ بے شک وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں، اور اُن کے پاس سُریانی زبان کی مقدّس کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ سُریانی نہیں جانتے، اِس لئے ہمارے اُن راہبوں کی طرح تلاوت

> کرتے ہیں جو قواعد سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ سراسر بداخلاق ہیں۔ وہ ادھار دے کر حد سے زیادہ سود لیتے ہیں، ساتھ ساتھ شرابی ہیں۔ اُن میں سے۔ . . بعض کی کئی بیویاں ہیں۔ وہ سب اپنی خدمت کے لئے پیسے لیتے ہیں۔ چونکہ بال بچوں کی فکر ہے اِس لئے وہ ایمان کو بڑھانے پر نہیں بلکہ پیسے کمانے پر توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے جو عہدیدار منگولیوں کے بیٹوں کو تعلیم دے کر اِنجیل اور ایمان کے اصول کے بارے میں بتاتے ہیں وہ اپنے شریر چال چلن اور لالچ سے اُنہیں مسیحی ایمان سے دُور کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جو زندگی منگولی، بدھ مت اور بت پرست گزارتے ہیں وہ زیادہ بے گناہ ہے۔[3]

سیاست کی طرف رجحان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مشرقی مسیحیوں کو ساسانی حکمرانوں کے تحت سخت ایذا رسانیاں برداشت کرنی پڑیں۔ تو بھی اُن کا ایمان قائم رہا۔ لیکن بعد میں کلیسیائی راہنما سیاست کے میدان میں آ گئے، اور اُن کا پورا دھیان حکمرانوں کو خوش رکھنے پر لگا رہا۔ جب سیاست کلیسیا میں آ جاتی ہے تو خطرہ ہے کہ راہنماؤں کے اعمال اور فیصلے کلامِ مقدّس پر مبنی نہ ہوں بلکہ ماحول اور مجبوریوں پر۔ اِس کے ساتھ پیوستہ یہ خیال پایا جاتا تھا کہ دنیاوی کامیابی الٰہی برکت کا نشان ہے۔ جو شخص اِس طرح سوچتا ہے وہ ہمیشہ اِس کے کوشاں رہے گا کہ طاقت وروں اور عہدیداروں کو پسند آئے۔[4]

بشارت کی کمی

ہو سکتا ہے کہ مشرق کی کلیسیا تبلیغی کام کے لحاظ سے دوسری کلیسیاؤں سے آگے تھی۔ اسلام کے وجود کے بعد بھی اُس کے مبشر چین تک بشارتی کام کرتے رہے۔ لیکن لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ چنانچہ نویں صدی کا مسیحی عالمِ الکِندی شکایت کرتا ہے کہ آج کے راہب تبلیغ کرنے والے نہیں ہوتے۔[5]

باب 9

کلیسیا کی ترقی و تنزلی سے سبق

ہم قدیم کلیسیا کی ترقی و تنزلی سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

اپنے لوگوں میں خدمت

ابتدائی مسیحی پہلے اپنے لوگوں یعنی یہودیوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ اُن سے ہو کر وہ دیگر قوموں کو بھی خوش خبری سنانے لگے۔ جو تبلیغی کام کرنا چاہے وہ یہ پیشِ نظر رکھے۔ تبلیغ کا پہلا قدم اکثر میرا اپنا خاندان اور قبیلہ ہو گا، اُس کے بعد ہی دیگر قومیں۔

مقبولِ عام زبان کا استعمال

تبلیغ کا سب سے ضروری ہتھیار خدا کا کلام ہے۔ لیکن یہ ہتھیار اُس وقت تیز ہو گا جب سننے والے خدا کا کلام سمجھ سکیں۔ اِس مقصد کے تحت انگلش زبان کے لاتعداد ترجمے وجود میں آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ملکِ پاکستان میں بھی اِس کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ بے شک موجودہ پرانا ترجمہ قابلِ تعریف ہے، لیکن آج کل متن کے بہت سے حوالجات عام مسیحی سے سمجھے نہیں جاتے۔ تو ہمارے غیر مسیحی بھائی اور بہنیں یہ پڑھ کر کتنا کچھ سمجھ پائیں گے؟ خدا کا کلام زبان پر نہیں بلکہ دل میں رہنا چاہتا ہے۔ اِس کے لئے ضروری یہ ہے کہ اُس کی زبان سلیس اور صاف ہو۔ یہ ضرورت پیشِ نظر رکھ کر نیا اُردو ترجمہ بنام جیو ورژن شائع کیا گیا ہے۔

زبان کا ایک اَور پہلو بھی ہے۔ کچھ ایسے الفاظ پاکستانی کلیسیا میں عام ہو گئے ہیں جو عام معاشرے میں استعمال نہیں ہوتے۔ یہ گناہ نہیں، لیکن خطرہ یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے ہماری مذہبی زبان عجیب سی اور مصنوعی لگے۔ جو تبلیغی کام کرنا چاہے اُسے یہ حقیقت یاد رکھنا چاہئے۔

ایمان کی آزادی پر زور

ابتدائی مسیحیوں کو شدت سے ایمان کی آزادی محسوس ہوئی جب وہ دیوتاؤں اور بُت پرستی کے دباؤ سے آزاد ہو گئے۔ خدا کا فضل پانے سے اُنہیں شریعت کے دباؤ سے بھی آزادی حاصل ہوئی۔ اُن کا یہ آزادانہ کردار دوسروں کے لئے پُرکشش تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی ایسی آزادانہ زندگی گزارتے ہیں؟ کیا لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں روحانی آزادی اور اختیار مل گیا ہے؟ یہ کافی نہیں کہ ہم رٹی رٹائی باتیں دہرائیں بلکہ آئیں، پہلے ہم وہ آزادی حاصل کریں جو صرف اور صرف خدا عطا کر سکتا ہے۔ جب تک ہمیں اِس آزادی کا تجربہ نہ ہوا ہم خدا کی خوش خبری پھیلانے میں ناکام ہوں گے۔

خوش خبری کی تبدیل کرنے والی طاقت پر زور

مسیح پر ایمان نہ صرف ہمیں ازاد کر دیتا بلکہ ہمیں تبدیل بھی کرتا ہے۔ کیا ہماری زندگی روز بہ روز تبدیل ہوتی جا رہی ہے؟ کیا لوگ ہمارے چال چلن سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم فرق ہیں؟ کیا ہماری محبت دیگر لوگوں پر ظاہر ہوتی ہے؟

ہر ایک کی قدر و قیمت پر زور

ابتدائی کلیسیا میں سب بشمول خواتین اور غلاموں کے برابر تھے۔ یہ حیثیت فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھی۔ کیا ہم اپنے تعلقات سے یہ ظاہر کرتے ہیں؟ مسیح لوگوں کی قدر اِس پر مبنی نہیں کرتا کہ اُنھوں نے کیا کچھ کیا یا اُنہیں دنیا میں کتنی عزت حاصل ہے۔ کیا ہم اِس میں اپنے اُستاد اور آقا کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں؟ اگر نہیں تو کلیسیا کے اہم ترین نشان سے محروم ہو گئے ہیں۔

راہبانہ زندگی کا آپشن

قدیم کلیسیا میں راہبانہ زندگی ایک مسیحی طرزِ زندگی تھا جس سے کلیسیا کو ترقی حاصل ہوئی۔ سوال ہے کہ کیا راہبانہ زندگی ملکِ پاکستان کی کلیسیا کے لئے ایک آپشن ہے؟ سب کے لئے تو نہیں۔ لیکن اگر کوئی غیر شادی شدہ حالت میں خدمت کرنا چاہے تو کیا یہ ایک قابلِ قبول آپشن ہے؟ اور اگر ہو تو اُس کی جماعت کس طرح اُس کی حمایت اور راہنمائی کرے؟ ہم اگلے صفحات میں راہبانہ زندگی پر مزید غور کریں گے۔

عام ایمان داروں کا بے لوث حصہ

قدیم کلیسیا میں عام ایمان دار خوش خبری پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ آج بھی کلیسیا کی اندرونی مضبوطی اُس کے عام ایمان داروں پر منحصر ہوتی ہے۔ عام سے

مراد وہ ایمان دار ہیں جو بجائے پیسے لینے کے اپنا وقت اور پیسے کلیسیائی خدمت میں صَرف کرتے ہیں۔

افسوس کہ آج کل بہت سے پادری انٹرنیٹ کے ذریعے ڈونرز کھینچنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ کاش کہ اِس کے بجائے وہ اپنی جماعت کے ممبران کو تیار کرنے میں لگے رہتے۔ وہی کلیسیا کا حقیقی خزانہ ہیں، اور اُنہی کے پیسے اور خدمت قیمتی ہیں۔

تعلیم اور فلاح و بہبود پر زور

کلیسیا نے ابتدا سے ہی تعلیم کی اہمیت پہچان لی، اور وہ کبھی بھی علم سے نہیں ڈرتی تھی۔ ملکِ پاکستان کی کلیسیا نے تعلیم اور فلاح و بہبود کی اہمیت پہچان لی ہے۔

مصنف کے نزدیک بیرونِ ملک کے پیسوں نے کئی جگہوں پر معاملہ خراب کر دیا ہے۔ مسئلہ پیسے نہیں بلکہ اُن کا غلط استعمال ہے۔ نیز، جہاں پیسے مقامی جماعت سے نہیں آتے وہاں جماعت میں گڑبڑ پیدا ہونے کا بڑا خطرہ ہے۔ بیرونی پیسوں کی نسبت وہ پیسے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیں جو خود مقامی جماعت اپنے اداروں، غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور خدمت گزاروں کے لئے جمع کرتی ہے۔

موجودہ وسائل کا استعمال

قدیم کلیسیا نے اپنے زمانے کے جدید ترین وسائل استعمال کئے۔ جو سہولتیں اُس وقت حاصل تھیں اُنہیں ایمان داروں نے خوب آزمایا۔ آج پاکستان میں کئی جدید سہولتیں دست یاب ہیں۔

مثلاً دیہات میں بہت سے مسیحی ایمان سے سراسر ناواقف ہیں، اگرچہ کئی ایسی جگہوں تک نئی سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ کیا شہروں کی جماعتیں یہ راستے اپنے مسیحی بھائیوں اور بہنوں کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہیں؟

آج کل انٹرنیٹ اور سمارٹ فون عام ہو گئے ہیں۔ کیا ہم یہ سہولتیں صرف فنڈ ریزنگ کے لئے استعمال کرتے ہیں یا خدا کی خدمت کرنے کے لئے بھی؟

ایمان کا بدعت پر غلبہ

باب 10

علمِ الٰہیات کے پیش خیمے

کلیسیا کے پہلے ایمان دار یہودی تھے۔ لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ مسیح کی خوش خبری پوری دنیا کے لئے ہے۔ اِس کا نتیجہ سمجھنے کے لئے تصور کریں کہ آپ کسی کمپنی کے ملازم ہیں جو ٹوتھ پیسٹ بناتی ہے۔ یہ کمپنی آپ کو انگلینڈ بھیجتی ہے تاکہ اپنے نئے پراڈکٹ کا اشتہار کریں۔ آپ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ انگلش زبان، انگلش ثقافت بلکہ انگلش سوچ خوب سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ آپ لوگوں کی ضروریات دریافت کر کے اُنہیں سمجھائیں گے کہ میرا ہی ٹوتھ پیسٹ آپ کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ یہ سرانجام دینے کے لئے آپ کے اپنے دیس کے لئے تیار شدہ اشتہارات کو تبدیل کرنے پڑیں گے۔ مقصد تو ایک ہی ہو گا یعنی یہ کہ لوگ آپ کا ٹوتھ پیسٹ استعمال کریں۔ لیکن لباس فرق ہو گا۔

یہی کچھ مسیحیت میں ہوا۔ جب پہلے ایمان دار دوسرے ممالک میں پھیلنے لگے تو اُنہیں خوش خبری کو لوگوں کی سوچ اور ضروریات کے مطابق پیش کرنا تھا۔ اُس وقت اُنہیں خیال تک نہ آیا کہ عبادت لازماً عبرانی یا اَرامی زبان میں کرنی ہے، کہ تمام ایمان داروں کو فلسطین کی اَرامی زبان یا کلامِ مقدّس کی عبرانی زبان سیکھنی چاہئے۔ اِسی وجہ سے نیا عہد نامہ اَرامی زبان میں نہیں بلکہ یونانی زبان میں لکھی گئی۔ کیونکہ اِسی زبان کا رومی ممالک میں راج تھا، یہی زبان باشندوں کی اکثریت کو آتی تھی۔

شاید قاری اعتراض کریں، ''یہ کرنے سے تو مسیح کا مقصد اور تعلیمات تبدیل ہو گئی ہیں۔'' ہرگز نہیں۔ ہزاروں قدیم مسودوں کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ مسیح کی کہاوتیں بڑی احتیاط سے نئے عہد نامے میں قلم بند ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ کئے ایک آیات کے پیچھے ابھی تک اَرامی زبان چمکتی دمکتی ہے۔ اور جب ہم نئے اور پرانے عہد نامے کا مقابلہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ نئے اور پرانے عہد نامے کی پوری یگانگت ہے، کہ نئے عہد نامے کی گہری بنیاد پرانا عہد نامہ ہے۔ جو نئے عہد نامے کی حقیقت مان لے وہ پرانے عہد نامے کو رد نہیں کر سکتا۔ خوب صورت قالین کی طرح دونوں مل کر ایک لاثانی تصویر دکھاتے ہیں۔ جو دھیان سے دیکھے اُسے مزید بہت سے باریک باریک ڈیزائن اِس میں نظر آتے ہیں۔

اِس ناتے سے نیا عہد نامہ بعد کی مسیحی تصانیف سے فرق ہے۔ اُس کا سرچشمہ خود مسیح اور پرانا عہد نامہ، اُس کی دنیا ملکِ فلسطین ہے۔ یہ بات نہ صرف اناجیل پر صادق آتی ہے بلکہ خطوط پر بھی، گو سب سرزمینِ اسرائیل پر نہیں لکھے گئے۔

بعد کی کتابوں کی روح مختلف ہے۔ اُن میں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ اول، بہت سے غیر یہودی کلیسیا میں شامل ہو گئے ہیں اور دوسرے، یروشلم کی تباہی کے باعث اسرائیل کا یہودی ایمان داروں سے تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ بعد کے کلیسیائی بزرگ کلامِ مقدّس کے ساتھ ساتھ یونانی عالِموں کی تصانیف بھی پڑھتے ہیں۔ وہ یروشلم اور اتھینے دونوں کے وارث ہیں۔ ابرہام اُن کا روحانی باپ جبکہ افلاطون اُن کا اُستاد ہے۔

اِس ناتے سے ہم بھی نئے عہد نامے کے بعد کے ایمان داروں کی مانند ہیں۔ ہم کلامِ مقدّس کی تلاوت تو کرتے ہیں، لیکن عبرانی یا یونانی میں نہیں بلکہ اکثر اپنی اپنی مادری زبان میں۔ ساتھ ساتھ ہم جانتے ہیں کہ اپنی ثقافت اور اپنے ملک کے لئے روشنی اور نمک کے باعث بننا ضروری ہے۔ اور اِس میں کام یابی حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہمارا ایمان ماحول کا جامہ پہن لے۔

بہت دفعہ ہم یہ سوچے بغیر کرتے ہیں۔ مغرب میں اکثر جماعتیں کرسی پر بیٹھ کر خدا کی پرستش کرتی ہیں جبکہ مشرق میں بہت سے ایمان دار اپنے جوتے اُتار کر اور فرش پر بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ شرط ایک ہی ہے، کہ ہم کلامِ مقدّس کی بنیاد پر اپنے ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی گزاریں۔

رسولی بزرگ: کلیسیائی انتظام پر زور

رسولی بزرگ کون تھے؟ کیا وہ مسیح کے بارہ شاگرد تھے؟ گو نام سے تو ایسا ہی لگتا ہے، لیکن رسولی بزرگ اُنہی مصنفوں کا نام ہے جو رسول نہیں بلکہ وقت اور تعلیم کے لحاظ سے بارہ شاگردوں کے قریب ہی تھے۔ اُن کی تصانیف پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں قلم بند ہوئیں۔ یعنی وہ نئے عہد نامے کے دور کے عین بعد قلم بند ہوئیں۔

رسولی بزرگ کی تصانیف نئے عہد نامے کے قریب ہی ہیں، اور فلسفہ کی جو باتیں بعد کے بزرگوں میں ملتی ہیں وہ رسولی بزرگوں میں نہیں پائی جاتیں۔

اب تک اکثر جماعتیں چھوٹی اور بکھری ہوئی ہیں۔ اب تک کلیسیا جوان ہے۔ پہلی نسل وفات پا گئی ہے، اب دوسری اور تیسری نسل ایمان کی اچھی جنگ جوش سے لڑ رہی ہیں۔ تاہم جب ہم رسولی بزرگوں کی کتابیں پڑھتے ہیں تو وہ مزہ نہیں آتا جو نئے عہد نامے کی تلاوت سے آتا ہے۔ بے شک ہم کچھ نہ کچھ اِن تصانیف سے سیکھ سکتے ہیں،

لیکن مسیح کی آزاد کرنے والی روح اِن میں کچھ بُجھ گئی ہے۔ نجات کی جو رنگین اور خوش باش تصویر مسیح اور اُس کے شاگردوں سے کھینچی گئی اُس کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔

آیئے، ہم تفصیل سے اِن پر غور کریں۔

رسولی بزرگوں کی تصانیف

درجِ ذیل کتابیں رسولی بزرگوں کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں:

کلیمینس کا پہلا خط

96ء میں روم کی کلیسیا یہ خط کُرِنتھیوں کی کلیسیا کو لکھتی ہے جہاں مختلف فرقوں کے درمیان جھگڑا چھڑ گیا ہے۔

مرکزی مضامین: پرانا عہد نامہ راست باز زندگی کی کسوٹی ہے۔ نیز، جن منصب داروں کو رسولوں نے مقرر کیا وہ منظور ہیں۔ جو اِن منصب داروں سے مقرر کئے گئے ہیں وہ بھی منظور ہیں۔ باب 5 پولس اور پطرس کی شہادت کا ذکر کرتا ہے۔

کلیمینس کا دوسرا خط

مصنف نامعلوم ہے۔ یہ حقیقت میں خط نہیں بلکہ مختلف ہدایات پر مشتمل وعظ ہے۔

اِغناطسیوس کے سات خطوط

انطاکیہ کے بشپ اِغناطسیوس نے یہ خط قریباً 115ء تا 120ء لکھے، جب اُسے شہادت کے لئے روم بھیجا جا رہا تھا۔

مرکزی مضامین: شہادت، عرفانی بدعت کے خلاف باتیں، مقامی بشپ کے پہلے درجے پر زور۔ بشپ کے اور جماعت کے بزرگوں اور خادموں کے تابع رہنے کی ضرورت۔

پالکارپ از سمُرنہ کا خط

پالکارپ سمُرنہ[a] کا بشپ تھا۔ اُس کا فلپّیوں کے نام خط اِغناطسیوس کے خطوں کے عین بعد لکھا گیا۔ مرکزی مضامین: کلیسیا کا انتظام اور بدعت کے خلاف باتیں۔

پالکارب کی شہادت

پالکارپ کی کلیسیا نے اِس کتاب میں اُس کی شہادت کا بیان قلم بند کی۔ اُس کا مقصد شہادت کا اچھا نمونہ پیش کرنا ہے۔

برنباس کا خط

نامعلوم مصنف نے یہ خط تقریباً 130ء میں قلم بند کیا۔ برنباس مجازی تفسیر استعمال کرتا ہے۔ خاص مضمون: چونکہ اسرائیلی خدا کے ساتھ عہد کے لائق ثابت نہ ہوئے اِس لئے مسیحی اُس کے وارث بن گئے ہیں۔ وہی حقیقی اسرائیل ہیں۔

ہرماس کا چوپان

مکاشفہ کی شکل میں لکھا ہوا یہ نوشتہ روم میں تقریباً 140ء میں قلم بند ہوا۔ خاص مضمون: شدید گناہوں کے باوجود دوسری توبہ منظور ہے۔

تعلیم الرُسُل (دِداخے)

دوسری صدی کے شروع میں لکھی ہوئی یہ تصنیف نئے عہد نامے کے بعد کلیسیائی نظام کے بارے میں سب سے قدیم بیان ہے۔

پپیاس

اِس تصنیف کا اکثر حصہ گم ہو گیا ہے۔ پپیاس کا مقصد یسوع مسیح کی کہاوتیں محفوظ رکھنا ہے۔[b]

---

[a] Izmir / Smyrna

[b] دیوغنیط کے نام خط رسولی دور کا نہیں ہے۔ آج کل اُسے دلیلی کتابوں میں گنا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر رسولی بزرگوں اور نئے عہدنامے کی تعلیم ملتی جلتی ہے، تو بھی چند ایک باتوں میں فرق ہے۔

پورا زور کلیسیائی انتظام پر ہے

نئے عہدنامے کا زور مسیح اور اُس کی نجات پر ہے جبکہ رسولی بزرگوں کا پورا زور ایمان کی جماعت یعنی کلیسیا پر ہے۔ چنانچہ اُن کے خاص مضامین کلیسیا کے منصب، بدعت کی مخالفت، وعظ، کلیسیائی نظام، پرہیزگاری، شہادت، کلام کے معاملے اور دوسری توبہ کی منظوری ہیں۔

کلیسیا حقیقی اسرائیل ہے

پہلے ایمان دار اپنے آپ کو یہودی ایمان کے حقیقی نمائندے سمجھتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُنہیں یہودیوں سے رد کیا گیا اور وہ اُن سے پورے طور پر منقطع ہو گئے۔ رسولی بزرگوں کے زمانے میں یہ سلسلہ مکمل ہو چکا ہے۔ تاہم رسولی بزرگ کلیسیا کو حقیقی اسرائیل سمجھتے ہیں، اور وہ یونان پرست یہودیوں کی چند ایک باتیں کانٹ چھانٹ کر کے اپنا لیتے ہیں۔ اِن میں درجِ ذیل باتیں اہم ہیں۔

خدا ایک ہی ہے

یہودیوں کی طرح رسولی بزرگ بار بار خدا کی وحدت پر زور دیتے ہیں۔ ”خدا ایک ہی ہے“[a] اُن کا خاص نعرہ ہے۔

مسیح نجات کا واحد راستہ ہے

یہودی شریعت کو نجات اور الٰہی قبولیت کا واحد راستہ سمجھتا ہے جبکہ مسیحی کے نزدیک مسیح نجات اور الٰہی قبولیت کا واحد راستہ ہے۔ یہودی کہتا ہے کہ انسان کو صرف شریعت

---

[a] εἷς θεός (heis theos)

پر عمل کرنے سے نجات ملتی ہے جبکہ مسیحی کے نزدیک مسیح پر ایمان رکھنے سے ہی نجات ملتی ہے۔ یہ بنیادی فرق رسولی بزرگوں کی تعلیم کو تشکیل دیتا ہے۔

مسیح الٰہی ہے

نئے عہد نامے میں جو لقب مسیح کے الٰہی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں اُن پر بزرگ زیادہ زور دیتے ہیں جبکہ جو لقب اُس کے انسانی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ یوں نجات دہندہ، خدا کا بیٹا اور خداوند[a] جیسی اصطلاحات بہت ملتی ہیں جبکہ ابنِ آدم، ابنِ داؤد، نبی اور ناصرانی جیسی صفتیں کم ہی استعمال ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر کلیمینس کا دوسرا خط بڑی آزادی سے کہہ سکتا ہے، ”بھائیو، چنانچہ لازم ہے کہ ہم مسیح کے بارے میں یوں سوچیں جس طرح خدا کے بارے میں، اُس کے بارے میں جو زندوں اور مُردوں کا منصف ہے۔“[1] اور برنباس فرماتا ہے، ”ایک بار پھر دھیان دیں، یسوع انسان کا نہیں بلکہ خدا کا بیٹا ہے، وہ جو نمونے[b] کے طور پر جسم میں ظاہر ہوا۔“[2]

بعد میں یہ سوال اُٹھا کہ اگر مسیح اِتنا اہم ہے تو پھر خدا خالق کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ کیا یہ توحید سے متضاد ہے؟ کیا مسیحی دو خدا مانتے ہیں؟ لیکن رسولی بزرگوں کو یہ سوال نظر ہی نہیں آتا۔ چنانچہ اِغناطسیوس لکھ سکتا ہے، ”خدا ایک ہی ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے بیٹے یسوع مسیح کے وسیلے سے ظاہر کیا۔“[3]

مسیح اور پرانہ عہدنامہ چال چلن کی کسوٹی ہیں

ایمان دار کا چال چلن یہودی شریعت پر منحصر نہیں تھا بلکہ مسیح کے ساتھ تعلق پر۔ مسیح کے ساتھ اچھا تعلق راست باز زندگی گزارنے کے برابر تھا۔ -

[a] κύριος (kyrios)
[b] τύπος (typos)

تو بھی پرانے عہد نامے کی بنیادی حیثیت رہی، کیونکہ مسیح کی تعلیم اور زندگی کے ساتھ ساتھ شریعت کی اخلاقی ہدایات مسیحی راست بازی کی کسوٹی رہیں۔ مسیح کے کام اور تعلیم کی روشنی میں کلیسیا نے کلام میں خدا کو پسندیدہ زندگی گزارنے کے اصول پائے۔ اگرچہ پرانے عہد نامے کی رسمی ہدایات پر عمل کرنا کلیسیا کے لئے منسوخ تھا تو بھی یہ بات کبھی نہ بھولی گئی کہ مسیح پرانے عہد نامے کی تکمیل ہے۔

کلیمینس کا پہلا خط اِس کی بہترین مثال ہے جو بار بار پرانے عہد نامے سے اخلاقی اصول اخذ کرتا ہے، یہاں تک کہ باب 40 و مابعد وہ کلیسیائی انتظامیہ کے اصول بھی پرانے عہد نامے سے نکال لیتا ہے۔

مسیح میں آخرت کا زمانہ آ چکا ہے

یہودیوں کی طرح مسیحی بھی آخرت کا ایمان رکھتے تھے۔ لیکن ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اُن کے نزدیک مسیح میں آخرت کا زمانہ شروع ہوا ہے۔ کلیسیا روحانی اسرائیل بلکہ قدیم اسرائیل کی تکمیل ہے۔ اِس روحانی اسرائیل کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ عبادت میں جس کے مرکزی حصے بپتسمہ اور عشائے ربانی ہیں اور عقیدے میں۔

رسولی بزرگوں کی کمیاں اور خوبیاں

تاریخی لحاظ سے رسولی بزرگ اہم ہیں، کیونکہ وہ ہمیں کچھ باتیں دکھاتے ہیں جو بعد کی کلیسیا میں اہم ہو گئیں۔ بے شک اُن کی حد سے زیادہ تنقید کرنا مناسب نہیں۔ بلاشبہ وہ پورے دھیان اور جوش سے مسیح کی پیروی کرتے تھے بلکہ کئی باتوں میں وہ ہمارے لئے نمونے کے باعث ہیں۔ تاہم کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُن میں کچھ باتیں نظر آتی ہیں جو نئے عہد نامے سے فرق ہیں۔ اُن میں مسیحی آزادی کی روح کم پڑ گئی ہے۔

نیک کاموں پر مبنی راست بازی

ہم کہہ چکے ہیں کہ مسیح شریعت کی جگہ آ گیا ہے۔ لیکن کیا یہ دو چیزیں برابر کرنا خطرناک نہیں؟ کیا انسان اِس تعلیم کے تحت جلد ہی یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ مسیح بھی ایک قسم کی شریعت ہے؟ اور ایسا ہوا بھی۔ رسولی بزرگ صاف صاف اِس کی نمائش کرتے ہیں۔

بے شک ایمان دار اب تک اِس حقیقت کا علم رکھتے تھے کہ مسیح نے اپنی صلیبی موت سے ہمارے گناہوں کی سزا بھگت لی، اور اُس پر ایمان لانے سے ہم نجات پاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ مانتے تھے کہ ہم اپنی نجات خود حاصل نہیں کر سکتے بلکہ مسیح نے سب کچھ ہمارے لئے کر لیا ہے۔ وہ انکار نہیں کرتے تھے کہ ہماری نجات ہمارے اپنے نیک کاموں پر نہیں بلکہ خدا کے مسیح میں فضل پر مبنی ہوتی ہے۔ تاہم جب ہم رسولی بزرگوں کی تصانیف پڑھتے ہیں تو صفحہ بہ صفحہ یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک طرح کی نئی شریعت وجود میں آ گئی ہے۔

اب خدا کا فضل بپتسمے پر محدود رہتا ہے۔ گو بپتسمہ گناہوں کو دُور کرتا ہے لیکن اُس کے بعد لازم ہے کہ مسیحی مسیح کی نئی شریعت کے مطابق زندگی گزارے جو پرانی شریعت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جو لوگ یہ مقدّس زندگی گزارنے سے قاصر رہے ہیں اُنہیں ہرماس دوسری توبہ کا آپشن دیتا ہے۔ یہاں بعد کی تعلیم کی جڑ پائی جاتی ہے کہ مختلف قسم کے گناہ ہوتے ہیں، اور ہر گناہ کی اپنی اپنی توبہ ہوتی ہے۔ جہاں کلام فرماتا ہے کہ ہر گناہ انسان کو خدا سے دُور کرتا ہے، خواہ وہ کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو وہاں رسولی بزرگ کہتے ہیں، ”کچھ گناہ زیادہ سنجیدہ ہیں، کچھ ہلکے ہیں، لازم ہے کہ ایمان دار ہر گناہ کے مطابق توبہ کرے۔“

۱۔یوحنا 2:1 میں لکھا ہے، ”میرے بچو، مَیں آپ کو یہ اِس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ گناہ نہ کریں۔ لیکن اگر کوئی گناہ کرے تو ایک ہے جو خدا باپ کے سامنے ہماری شفاعت کرتا ہے، یسوع مسیح جو راست ہے۔“ نئے عہدنامے کے مطابق انسان ایمان

لانے پر بھی کامل نہیں ہوتا۔ فرق یہ ہے کہ خدا کے سامنے اُس کے گناہوں کو معاف کیا گیا ہے اور روح القدس اُس میں بستا ہے۔ یہ ہماری آزادی کا منبع ہے، اِسی وجہ سے ہم اِس دنیا میں رہتے ہوئے خوشی کے مزے لے سکتے ہیں۔ اور اِسی لئے ہماری توبہ اِس دنیا میں کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہم دن بہ دن توبہ کی روح میں چلتے ہیں۔ ہم سنجیدہ اور چھوٹے گناہوں میں امتیاز نہیں کرتے بلکہ سب کو بار بار خدا کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ بار بار ہمیں اُن سے آزاد کرے۔

اِس کے مقابلے میں ہرماس کی باتوں پر غور کریں،

> مَیں نے کہا، ''جناب، اُنھوں نے پورے دل سے توبہ کی ہے۔'' اُس نے جواب دیا، ''مَیں بھی یہ جانتا ہوں کہ اُنھوں نے پورے دل سے توبہ کی ہے۔ لیکن کیا آپ سوچتے ہیں کہ جنھوں نے توبہ کی ہے اُن کے گناہوں کو معاف کیا جائے گا؟ پورے طور پر تو نہیں۔ جو توبہ کرے لازم ہے کہ وہ اپنی جان کو ستائے اور اپنے پورے سلوک میں حلیم ہو اور کئی قسم کی تکالیف سے دبا رہے۔ پھر اگر وہ اپنے آپ پر آنے والی تکالیف کو برداشت کرے تب ہی جس نے تمام چیزوں کو خلق کر کے اُنہیں طاقت عطا کی ہے وہ بلاشبہ ترس کھا کر اُسے شفا دے گا۔''[4]

ہرماس کی یہ باتیں نئے عہدنامے سے دُور ہو گئی ہیں جہاں گناہ کی پوری معافی ملتی ہے اور جس میں ایمان دار کی پوری زندگی فضل کے تحت رہتی ہے۔ اِسی طرح ہرماس کے ایک اَور حوالے کا ملاحظہ کیجئے جس میں زناکار عورت کا ذکر ہے،

> مَیں نے اُس سے کہا، ''اگر فارغ کی گئی عورت توبہ کرے اور اپنے خاوند کے پاس واپس آنے کی خواہش رکھے تو کیا شوہر کو اُسے واپس نہیں لانا چاہئے؟'' اُس نے جواب دیا، ''بے شک۔ اگر شوہر اُسے

> واپس نہ لائے تو وہ گناہ کر کے اپنے آپ پر بڑا گناہ لائے گا۔ کیونکہ اُسے اُس گناہ گار کو واپس لانا چاہیئے جس نے توبہ کی ہے۔ لیکن بار بار نہیں۔ کیونکہ خدا کے خادموں کے لئے صرف ایک ہی توبہ ہے۔"[5]

ایک طرف یہ فرمان اچھا ہے کہ شوہر گناہ میں گری اپنی بیوی کو قبول کرے اگر وہ توبہ کرے۔ دوسری طرف ایسی شریعت پرست باتیں نئے عہد نامے سے کہیں دُور ہیں۔ وہاں خدا کا رحم ہمیں توبہ تک پہنچاتا ہے جبکہ ہرماس میں توبہ ایک نیک کام بن گیا ہے، وہی شرط جسے پوری کرنی ہے تاکہ خدا رحم کرے۔

کلیمینس کا دوسرا خط فرماتا ہے،

> گناہ سے توبہ دکھانے کے لئے خیرات دینا اچھا ہے۔ روزہ رکھنا دعا سے بہتر ہے، لیکن خیرات دینا دونوں سے بہتر ہے۔[6]

نئے عہد نامے کے مطابق ہر گناہ سے انسان کا خدا کے ساتھ تعلق بگڑ جاتا ہے، خواہ وہ کتنا ہلکا کیوں نہ ہو۔ اِس کا واحد حل توبہ اور مسیح پر ایمان ہے جس نے اپنی صلیبی موت سے ہمارے گناہوں کو مٹا دیا۔ اِس کے مقابلے میں رسولی بزرگ سنجیدہ اور ہلکے گناہوں میں امتیاز کرتے، اور ساتھ ساتھ اُنہیں دُور کرنے کے مختلف طریقے پیش کرتے ہیں۔ یہی مذکورہ آیت کا مقصد ہے۔ یوں مسیح کے صلیبی کام کے ساتھ ساتھ انسان کا نیک کام نجات کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ اِس کے مقابلے میں نئے عہد نامے کا ایمان دار جانتا تھا کہ مسیح میں مجھے خدا کی پوری قبولیت اور نجات حاصل ہو چکی ہے، اور کہ میرے نیک کاموں کا اِس میں کوئی حصہ نہیں۔ جو نیک کام مَیں کرتا ہوں وہ مَیں شکر گزاری اور خوشی کے تحت کرتا ہوں۔

اب خدا کے سامنے عزت حاصل کرنے کے طریقے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ خدا کے احکام پر عمل کرنا ہر ایمان دار کا فرض ہے، لیکن اب زیادہ نیک کام کرنے سے زیادہ عزت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہرماس فرمایا ہے،

> اگر تُو اُس سے بڑھ کر نیک کام کرے جو خدا نے فرمایا ہے تو زیادہ عزت حاصل کرے گا، اور خدا پہلے کی نسبت تیرا زیادہ احترام کرے گا۔[7]

یہ اُس تعلیم کی ابتدا ہے جو راست بازی کو ترازو سمجھتا ہے: یعنی بے شک مسیح نے مجھے نجات دی ہے، لیکن توبہ کے بعد لازم ہے کہ میرے اچھے کام بُرے کاموں سے زیادہ ہوں۔ یہاں اِس تصور کا بیج بویا گیا ہے جو بعد میں بڑا درخت بن جائے گا۔ ہاں، شہادت اِن نیک کاموں کا عروج سمجھا جاتا ہے۔ یوں ہرماس فرماتا ہے،

> سب جنہوں نے خداوند کے نام کے باعث دُکھ اُٹھایا ہے وہ خدا کے سامنے عزت کے لائق ہیں۔ اور اِن سب کے گناہوں کو معاف کیا گیا ہے، کیونکہ اُنہوں نے خدا کے فرزند کے نام کے باعث دُکھ اُٹھایا ہے۔[8]

یہاں مسیح نہیں بلکہ شہادت گناہوں کو دُور کرتی ہے۔ یہ تعلیم نئے عہد نامے سے کتنی دُور ہو گئی ہے!

اِغناطسیوس نہ صرف سمجھتا ہے کہ شہادت ایک نیک کام ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ ایک قربانی ہے۔ اِس سے بڑھ کر وہ اپنے ساتھی مسیحیوں کو اُبھارتا ہے کہ وہ اُسے اِس قربانی سے نہ روکیں،

> جنگلی جانوروں کو اکسائیں تاکہ وہ میری قبر بن کر میرے جسم کا کوئی بھی حصہ نہ چھوڑیں اور مَیں موت کے بعد کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنوں۔ تب ہی مَیں یسوع مسیح کا حقیقی شاگرد ہوں گا جب دنیا میرا جسم بھی نہیں دیکھے گی۔ مسیح سے میرے واسطے التجا کریں کہ مَیں اِن وسائل کے ذریعے (خدا کو منظور) قربانی ثابت ہو جاؤں۔[9]

مسئلہ یہ ہے کہ جتنے ہمارے نیک کام سامنے آ جاتے ہیں اُتنا ہی مسیح کی ہمارے لئے قربانی پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور آخر میں ہم میں اور دوسرے مذاہب میں کیا فرق رہے گا؟ ہم اِغناطسیوس کی زندگی اور موت کی تنقید نہیں کرنا چاہتے۔ اُس کے خط اُس کی مسیح کے لئے گہری محبت پیش کرتے ہیں۔ یوں وہ فرماتا ہے،

> لیکن میرے لئے اصلی کاغذات یسوع مسیح ہیں۔ اصلی اور اَن مٹ کاغذ اُس کی صلیب، موت، جی اُٹھنا اور اُس سے پیدا شدہ ایمان ہیں۔ اِن چیزوں میں مَیں آپ کی دعاؤں کی مدد سے راست باز ٹھہرنا چاہتا ہوں۔[10]

اِغناطسیوس کے ایمان کی بنیاد مسیح اور اُس کا نجات بخش کام ہے۔ تو بھی قاری فرق پر دھیان دیں: اِغناطسیوس نہیں کہتا کہ اب مَیں راست باز ٹھہرتا ہوں بلکہ یہ کہ موت کے وقت خدا مجھے راست باز قرار دے گا۔ بعد میں یہ خیال اہم ہو گیا، اور اِسی بنا پر قدیم کلیسیا میں بسترِ مرگ پر بپتسمہ لینا عام دستور بن گیا۔ سوچ یہ تھی کہ اُس وقت بپتسمہ لینے والا گناہ نہیں کرے گا اور یوں ابدی زندگی کے لئے پاک صاف اور پورے طور پر تیار ہو گا۔

سوال اُبھر آتا ہے کہ نیک کاموں پر زور اِتنی جلدی سے کلیسیا پر کیوں غالب آ گیا؟ لگتا ہے کہ یہ انسان کا ایک فطری رجحان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مذاہب میں نیک

کاموں پر زور دیا جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ یقین نہیں کر سکتا کہ خدا نے میرے لئے سب کچھ کیا ہے۔ یہ بات ناممکن لگتی ہے کہ خدا مجھ سے کچھ طلب نہیں کرتا، کہ وہ میرے غلط کاموں کا بدلہ نہیں لے گا۔ فطری انسان یقین رکھتا ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھنا ہے۔

ساتھ ساتھ کلیسیا میں اکثر بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو مسیحی آزادی سے خوف کھاتے ہیں، جو اِس سے ڈرتے ہیں کہ بےدین غلط فائدہ اُٹھا کر یہ تعلیم اپنے غلط کاموں کے فروغ کے لئے استعمال کریں۔

اِس میں ہمارے لئے ایک اہم سبق ہے۔ کیا ہم نے نئے عہدنامے کا آزاد کرنے والا پیغام اپنایا ہے یا ہم ابھی تک خدا کو خوش رکھنے کے چکر میں مبتلا ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ بےشمار مسیحیوں کا ایمان زیادہ تر رسولی بزرگوں کی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہے۔ کم ہی ایمان داروں نے وہ آزادی پائی ہے جو اِنجیل کا لبِ لباب ہے۔

عشائے ربانی کے مقصد میں تبدیلی

عشائے ربانی میں بھی تبدیلی آ گئی ہے، گو یہ تبدیلی ہلکی ہلکی نظر آتی ہے۔ تعلیم الرُسُل میں اُسے قربانی کہا جاتا ہے۔ اِغناطسیوس میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔[11] نیز، وہ اُسے لافانیت کی دوا قرار دیتا ہے، "زہر کا وہ علاج جو ہمیں مرنے سے روک کر ہمیشہ کے لئے یسوع مسیح کے ساتھ زندگی گزارنے دیتی ہے۔"[12] اگرچہ یہ خیال یوحنا 6: 51 و مابعد سے زیادہ آگے نہیں جاتا، لیکن اِس کا خطرہ نمایاں ہے۔ لافانیت کی دوا جیسی اصطلاحات جادو کے قریب آ جاتی ہیں۔

بعد میں اِس قسم کے خیالات مزید بڑھ گئے، یہاں تک کہ لوگ تصور کرنے لگے کہ ہم عشائے ربانی سے خدا کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یعنی جس کا حقیقی مقصد ایمان دار کی حوصلہ افزائی اور تقویت تھا وہ خدا کو متاثر کرنے کا وسیلہ بن گیا!

کیا ہماری جماعتوں میں بھی عشائے ربانی کے اصلی مقصد پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے؟ ملکِ پاکستان میں کتنے مسیحی ہیں جو اُسے گویا جادو استعمال کرتے ہیں۔

پادریت کا آغاز

نیا عہد نامہ پادریت نہیں جانتا۔ ہر جماعت کی قیادت مقامی بزرگوں سے ہوتی ہے۔ اِس کے مقابلے میں رسولی بزرگوں کے زمانے میں ہر جماعت کے مختلف منصب دار ہوتے ہیں۔ سب سے اعلیٰ عہدیدار بشپ ہے۔ اِغناطسیوس کے زمانے میں لازم ہے کہ بپتسمہ اور عشائے ربانی بشپ کی زیرِ نگرانی منائی جائے،

> دھیان دیں کہ آپ سب بشپ کی پیروی کریں، یوں جس طرح یسوع مسیح باپ کی پیروی کرتا ہے۔ بزرگ اُس کی یوں پیروی کریں جس طرح رسولوں کی۔ نیز، خادموں کا احترام کریں، جس طرح خدا نے فرمایا ہے۔ اِس کی اجازت نہ دیں کہ کلیسیا کا کوئی بھی کام بشپ کے بغیر کیا جائے۔ وہی عشائے ربانی حقیقی سمجھا جائے جس کی قیادت بشپ یا اُس کا نمائندہ کرے۔[13]

لگتا ہے کہ سب کچھ بشپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تبدیلی کیوں آئی؟ عام طور پر خیال ہے کہ عرفانیت[a] کی بدعت کے مقابلے میں لازم تھا کہ جماعت کی قیادت ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہو۔ بے شک یہ ضرورت اِس کی ایک جڑ ہو گی۔ لیکن ایک اَور وجہ بھی ہو گی جو عبادت کے متعلق تعلیم میں پنہاں ہے۔ اِس کے مطابق بشپ نہ صرف کلیسیا کا ملازم بلکہ نجات کا ذریعہ ہی ہے۔ اُسی کے ہاتھ سے نجات بپتسمہ اور عشائے ربانی کی صورت میں ملتی ہے۔ چنانچہ لوگ جلد ہی اِس کی ضرورت محسوس کرنے لگے کہ بپتسمہ اور عشائے ربانی صحیح طریقے سے سرانجام کی جائے۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 124 و مابعد۔

ہم اِس جگہ پر اِس بات پر نہ غم اور نہ خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہوا ہے سو ہوا ہے۔ لیکن ایمان داروں کی ہر نسل کو یہ سوال دوبارہ پوچھنا چاہئے کہ کیا پادریت کا انتظام جو نئے عہد نامے میں پایا نہیں جاتا فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟ نیز، یہ سوچنا چاہئے کہ اگر پادریت یا بشپ کا انتظام ہو تو اِن منصب داروں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ ضروری نہیں کہ بشپ اور پادری کا انتظام ختم کیا جائے، لیکن اگر ہم نئے عہد نامے کی روح میں زندگی گزارنا چاہیں تو لازم ہے کہ ہر بشپ اور ہر پادری حکومت کرنے کا خیال چھوڑ کر ہر ایمان دار کا خادم بنے۔ اِغناطسیوس اور پالِکارپ اِس کی اچھی مثال ہیں جنہوں نے شہادت تک خادم کی روح اپنائی تھی۔[14]

مسیح کے انسانی پہلو پر کم دھیان

اِس کا ذکر ہو چکا ہے کہ رسولی بزرگ مسیح کے الٰہی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ اِس کا مسئلہ کیا ہے؟

یہ بات بعد میں اہم بن جائے گی جب تثلیث پر بحث مباحثہ چھڑ جائے گا۔ اتھناسیُس اِس بات پر زور دے گا کہ مسیح کا انسان ہونا لازم تھا، ورنہ وہ ہماری جگہ اپنی جان نہ دے سکتا۔ اِس جگہ پر یہ کہنا کافی ہے کہ ہر زمانے کے ایمان داروں کا دھیان مسیح کی الوہیت پر رہا ہے جبکہ یہ بات جلد ہی نظر انداز کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے لئے انسان بن گیا۔ یاد رہے، مسیح کی انسانیت ہماری نجات کے لئے لازمی ہے!

دلیلی: فلسفہ کی مدد سے ایمان کا دفاع

رسولی بزرگوں کا پورا دھیان کلیسیائی انتظام پر تھا۔ لیکن دوسری صدی کے وسط سے ایسے راہنما سامنے آنے لگے جو اپنی تصانیف میں نہ صرف دیگر ایمان داروں بلکہ غیر ایمانداروں سے بھی مخاطب ہوئے۔ اُن کا مقصد ایمان کی مدافعت تھا، اور وہ یہ کرنے کے لئے یونانی فلسفہ استعمال کرنے سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ اُن کی پوری کوشش یہ دکھانا تھی کہ مسیحی ایمان سمجھ اور علوم کی روشنی میں پایہ دار اور مضبوط ہے۔

درجِ ذیل مصنف دلیلیوں میں گنے جاتے ہیں:
قوادراطُس ، اَرِسطید، یوسطین شہید، ططیان، اثینا گرس از اتھینے، مِلِطو از سردیس، اپالونیُس از روم، تھیُفلُس از انطاکیہ، دیوغنیط کے نام خط، طرطُلیان، ہرمیاس، مِنوطسیوس فیلکس۔
دلیلیوں میں سے سب سے اہم استاد یوسطین شہید، ططیان اور طرطُلیان ہیں۔

یوسطین شہید: انسان میں لوگوس کا بیج

یوسطین (قریباً 100ء تا 165ء) فلسطین میں پیدا ہوا۔ اُس کے والدین یونانی بت پرست تھے۔ جوانی میں مختلف فلسفوں کی تفتیش کے بعد وہ افلاطون کا فلاسفر بن جاتا ہے۔ ایک دن اُس کی ایک عمر رسیدہ آدمی کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے جو نبیوں اور مسیح کا ذکر کرتا ہے۔ بعد میں یوسطین گواہی دیتا ہے، "میرے دل میں فوراً آگ بھڑکنے لگی، اور نبیوں اور مسیح کے ساتھیوں کے لئے محبت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مَیں نے بوڑھے آدمی کی تعلیمات کے بارے میں سوچ سوچ کر اُس میں واحد معتبر اور فائدہ مند فلسفہ پایا۔ یوں اور اِسی بنا پر مَیں فلاسفر ہوں۔"[15]

یوسطین مسیحی بن جاتا ہے، لیکن وہ فلاسفر کا پیشہ نہیں چھوڑتا۔ اِفسس اور روم میں وہ فلسفہ کی اکیڈمی کھول لیتا ہے۔ اُس کی تین تصانیف آج تک موجود ہیں: دو مدافعتیں[a] اور "طریفو کے ساتھ مباحثہ۔"[b]

یوسطین 165ء میں روم میں شہید ہو جاتا ہے۔

ططیان: مشرق کی سبقت اور زُہد

ططیان (قریباً 110ء تا 180ء) آج کے عراق میں پیدا ہوا اور وہاں وفات پائی۔ لیکن کئے سال وہ روم میں رہا جہاں وہ یوسطین کا شاگرد بن کر ایمان لایا۔ یوسطین کی طرح اُس نے روم میں اکیڈمی کھولی۔ لیکن 172ء میں روم کی کلیسیا کے ساتھ

First and Second Apology[a]
Dialogue with Trypho[b]

ناانفاقیوں کے باعث وہ مسوپتامیہ جا کر غالباً اربیل اور گرد و نواح کے علاقے میں بسنے لگا۔

ططیان اپنی کتاب ''یونانیوں سے خطاب''[a] میں اِس پر زور دیتا ہے کہ ہر اچھی چیز مشرق سے آئی ہے، سب سے بڑھ کر مسیحی ایمان جو یونانی فلسفوں اور بت پرستی سے کہیں زیادہ قدیم اور معتبر ہے۔[16]

مشرقی کلیسیا کے لئے ططیان کا سب سے بڑا تحفہ اَرامی زبان میں وہ تصنیف ہے جس میں اُس نے چاروں اناجیل کے واقعات اور پیغامات کو ایک ہی کتاب کی صورت میں سلسلہ وار ملایا۔ یہ کلیسیا کی مضبوطی اور پھیلاؤ کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ تیسری اور چوتھی صدی میں زیادہ تر یہی کتاب عبادتوں میں استعمال ہوئی۔

لگتا ہے کہ ططیان ایک انتہا پسند قسم کے زُہد کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن آج مشکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کہاں تک اُس پر الزامات صحیح ہیں۔

طرطُلیان: کلیسیا کا وکیل

طرطُلیان (قریباً 160ء تا 225ء) قرطاجنہ میں پیدا ہوا، اور اُسے وکیل کی تربیت حاصل ہوئی۔ غالباً وہ تقریباً 40 سال کی عمر میں ایمان لایا۔

ہم طرطُلیان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے، گو اُس کی کئی تصانیف آج تک موجود ہیں۔ اِتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ غالباً 207ء میں مُنطانی بدعت[b] کی طرف مائل ہو گیا، شاید اِس لئے کہ اُسے مُنطانیوں کا نظم و ضبط پسند تھا۔ تاہم مغربی کلیسیا نے اُس کی بہت سی باتیں اپنائیں۔ اُس کے خیالات میں تیز وکیل کا انداز ملتا ہے، اور اُس نے لاطینی کلیسیا کو کئی ایک نئے قول اور اصطلاحات مہیا کیں۔ اِن میں سب سے مشہور یہ ہے کہ شہیدوں کا خون کلیسیا کا بیج ہے۔

---

[a] Address to the Greeks

[b] دیکھئے صفحہ 131 و مابعد۔

دلیلیوں کے خاص مضامین

دلیلی کن مضامین پر زور دیتے ہیں؟

مسیحیوں پرالزامات غلط ہیں

دلیلیوں کی پوری کوشش یہ ثابت کرنا ہے کہ جو الزامات مسیحیوں کے خلاف اُٹھائے جاتے ہیں وہ جھوٹ ہیں۔ نہ مسیحی خدا کا انکار کرتے ہیں، نہ وہ حکومت کے خلاف یا غیر اخلاقی کام کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس اُن کی زندگی قابلِ تعریف ہے، اور وہ حکومت کے تابع رہتے ہیں۔

مسیحی ایمان سچ ہے

دلیلی فرماتے ہیں کہ مسیحی ایمان سچ ہے۔ کیونکہ اُس کی جڑیں نہایت قدیم ہیں، بلکہ اُس میں قدیم پیش گوئیاں پوری ہو گئی ہیں۔ نیز، اُس کے پیروکاروں کی اخلاقی اور مذہبی طاقت شہادت تک مضبوط ہے۔ اُس کی تعلیم سادہ لوگوں سے بھی سمجھی جاتی ہے۔ مسیح اور اُس کے بعد کلیسیا نے معجزے دکھائے ہیں، اور شیاطین پر بھی فتح پائی گئی ہے۔

بت پرستی غلط ہے

دلیلیوں کے نزدیک بت پرستی بدروحوں کی پرستش ہے۔

کلامِ خدا (لوگوس) درمیانی ہے

اِس اہم تعلیم کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ پہلے ہم دلیلیوں کی یونانی سوچ پر غور کریں۔

کلامِ مقدس یونانی لباس میں

دلیلیوں کی جد و جہد کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی سوچ کا بھاری اثر ایمان داروں پر پڑ گیا۔ لازم ہے کہ ہم مزید اِس معاملے پر غور کریں۔

جب کلامِ مقدّس کی روشنی غیر یہودی دنیا میں پھیلنے لگی تو کیا ہوا؟ جو تبادلۂ خیال شروع ہوا اُس کا کیا نتیجہ نکلا؟ بے شک کلام نے یونانی لباس پہن لیا۔ لیکن کیا جس طرح یونانی ثقافت اور زبان نے پوری رومی بادشاہت پر قبضہ کیا اُسی طرح اُس نے کلیسیا پر بھی غلبہ پایا؟

ایک طرح سے یہ ہوا، ایک طرح سے نہیں۔ ابتدائی ایمان دار یونانی سوچ کے خطروں سے خوب آگاہ تھے۔ لٰہذا وہ پہلی صدیوں میں اِس کشمکش میں مبتلا رہے کہ کہاں تک یونانی سوچ اپنائیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اِس سے کلام کے حقائق اور ابدی اصول جاتے رہیں۔ ابتدائی کلیسیا کی یہ کُشتی اِس ناتے سے کئی ایک سبق سکھاتی ہے۔

کلامِ مقدّس اور یونانی سوچ میں کیا کیا فرق پایا جاتا ہے؟ مختصراً یونانی سوچ خدا اور انسان کے بارے میں جدید سائنس دان کی طرح سوچتی ہے۔ یونانی ٹھنڈے دل سے ہر چیز کو کھول کر اُس کے ہر پرزے کا تجزیہ کرتا ہے۔ اِس لئے قدیم زمانے کا فلسفہ اور فنون میں یونان آگے تھا۔ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفروں کا آج تک دنیا پر اثر ہے۔

اِس کے مقابلے میں کلام کا زور تعلقات پر ہے۔ یہ فرق حکمت کے تصور میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ عبرانی سوچ کے مطابق حکمت کو صرف خدا اور دیگر انسان کے ساتھ تعلقات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ حکمت کا مالک راست باز ہے۔ اور راست باز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریروں سے دُور رہ کر خدا اور دیگر انسانوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھے۔ پھر ہی شالوم یعنی سلامتی پیدا ہوتی ہے۔ اِسی طرح جو نادان ہے وہ بے دین بھی ہے، اور اُس کے خدا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات بگڑے رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس یونانی سوچ میں حکمت کا تعلقات کے ساتھ یہ اٹوٹ جوڑ نہیں تھا۔

ہم تعلقات کی یہ عبرانی سوچ مزید کھول سکتے ہیں۔ ابتدا میں انسان کا خدا کے ساتھ تعلق ٹھیک تھا، لیکن گناہ کے باعث اُس کا تعلق بگڑ گیا۔ تو بھی خدا اپنے رحم سے یہ تعلق بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اِس سلسلے میں اُس نے اپنے آپ کو اسرائیل

پر ظاہر کر کے اُسے چن لیا۔ اُس نے تعلقات کو بحال رکھنے کے لئے اسرائیل کو شریعت دی۔ اُس وقت سے اسرائیل اُس کی قوم ہے جس سے وہ محبت رکھتا اور جسے وہ تربیت دیتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلامِ مقدّس تعلقات پر زور دیتا ہے، پہلے خدا اور انسان کے درمیان تعلقات پر، دوسرے انسان کے آپس میں تعلقات پر۔ خدا کا یہ پیار بھرا تعلق یسوع مسیح میں عروج تک پہنچ گیا۔ کیونکہ اُس نے اپنی جان دے دی تاکہ انسان کا خدا کے ساتھ تعلق بحال ہو جائے۔ خدا کی نجات اُس کی مسیح میں قربت کے بغیر ناممکن ہے۔ اور جس طرح مسیح جی اُٹھا اُسی طرح تمام ایمان دار خاندان کی صورت میں جی اُٹھ کر مسیح کے ساتھ رہیں گے۔ تب شالوم (سلامتی) کی جو حالت اِس دنیا میں شروع ہوئی ہے وہ تکمیل تک پہنچے گی۔

یونانی سوچ فرق تھی۔ اُس میں خاص کر یہ تصور پایا جاتا تھا کہ دو دنیائیں ہیں: ایک مادی، فانی اور ظاہری جبکہ دوسری روحانی، غیر فانی اور غائب ہے۔ انسان مادی دنیا میں پھنسا ہوا ہے، اور اُس کا جسم چونکہ مادی ہے اِس لئے رُکاوٹ کا باعث ہے۔ انسان کی کوشش ہونی چاہئے کہ اُس کی غیر فانی روح اِس فانی دنیا سے آزاد ہو کر غیر فانی دنیا میں آ جائے۔[a]

کلامِ مقدّس کی عبرانی سوچ جسم اور روح میں اِس طرح کا امتیاز نہیں کرتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ دونوں انسان کے اٹوٹ انگ ہیں۔ انسان جی اُٹھے گا، اور اُس وقت جسم اور روح دونوں ہی جی اُٹھیں گے۔

اب ہمارے لئے اہم بات یہ ہے کہ دوسری صدی کے وسط سے اُن مسیحیوں کی وہ تعداد بڑھ گئی جو کلامِ مقدّس اور یونانی سوچ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔

---

[a] عرفانیت نے بعد میں یہ خیال مزید بڑھا کر دو نئے عناصر کا اضافہ کیا: اول، مادی دنیا سراسر بُری ہے اور دوسرے، دوسری دنیا سے ایک ہستی دنیا میں اُتر آئی ہے تاکہ انسانوں کو صحیح عرفان دے کر اِس دنیا سے نجات دے۔

کسی کو منوانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اُس کی غلطیاں ثابت کرے۔ لیکن ایک اَور پُر زور طریقہ یہ ہے کہ اُن اصولوں سے اپنا موقف ثابت کرے جن پر مخالف ایمان رکھتا ہے۔ دلیلیوں نے دونوں طریقے استعمال کئے۔ لیکن اِس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اُنہوں نے یونانی سوچ کی کئی باتیں اپنائیں۔

حقیقت میں یہ جد و جہد مسیحیوں سے پہلے ہی جاری تھی۔ ایک قوم صدیوں سے اِس میں مصروف تھی، ابرہام کی قوم جو یہودی کہلاتی تھی۔ مسیحیوں سے پہلے یہودی ہی تمام رومی بادشاہت کے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُنہی سے پرانے عہد نامے کا پہلا تعارف غیریہودیوں سے ہوا۔ تیسری اور دوسری صدی قبل از مسیح میں اُس کا یونانی ترجمہ بنام ہفتادہ قلم بند ہوا تھا، اور اِسی ترجمے کی تلاوت رومی ممالک کی اکثر یہودی جماعتوں میں کی جاتی تھی۔ ہفتادہ کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی بولنے والے یہودیوں میں سے نہ صرف عالِم بلکہ عوام بھی خدا کا کلام پڑھ سکتے تھے۔

ہفتادہ کے علاوہ یہودی ایمان کے خاص کر دو نمائندے مشہور ہوئے: یوسیفس اور فیلو۔ خاص کر فیلو کا یہودی اور مسیحی سوچ پر اثر پڑ گیا۔ لیکن اُس کا اثر سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم اُس کی تعلیم کے سرچشمے افلاطون پر دھیان دیں۔

یونانی استاد افلاطون: حقیقی دنیا اور اُس کا سایہ

پہلی صدی قبل از مسیح سے لوگوں کی سوچ میں ایک عجیب اور حیرت انگیز تبدیلی آئی: وہ قدامت پسند بن گئے۔ پہلے لوگ ترقی پسند تھے، یعنی وہ سمجھتے تھے کہ علم میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جائے گا، اور کہ ساتھ ساتھ ترقی بھی بڑھتی جائے گی۔ لیکن اب وہ مستقبل کی نام نہاد ترقی سے مایوس ہو کر قدامت پسند ہو گئے۔ وہ اپنے زمانے کے مسائل کا حل نکالنے کے لئے قدیم زمانے کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے وہ سمجھتے تھے کہ انسان کا علم بڑھتا جائے گا اور ساتھ ساتھ ترقی بھی بڑھتی جائے گی۔ اب وہ ماضی کی طرف دیکھ کر سوچنے لگے کہ قدیم زمانے کی حکمت اور دانائی ترقی کا اصلی سرچشمہ ہے۔

کیا جدید دور میں بھی یہ رجحان پایا نہیں جاتا؟ بے شک ہم سائنس کے لحاظ سے سب ترقی پسند ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ہم سائنس کے نقصانات دیکھ کر قدامت پسند ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنی جڑوں کی طرف رجوع کر کے اِس کا حل نکالنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار افراد اپنی مذہبی جڑوں پر غور کرنے لگے ہیں۔ مسلمان نئے سرے سے اسلام کے روایات کا مطالعہ کرنے لگے ہیں جبکہ ہندو اپنے ویدوں اور شاستروں کی طرف رجوع کر گئے ہیں۔ حقیقت میں انسان جدید دنیا میں بستا ہوا اپنے اندر خلا محسوس کرتا ہے۔ وہ مستقبل کی ترقی کے بارے میں مایوس ہو گیا ہے، اور یہ خلا دُور کرنے کے لئے قدیم زمانے کی طرف مُڑ گیا ہے۔

اِسی رجحان کے سلسلے میں لوگ خاص کر یونانی فلاسفر افلاطون کی طرف رجوع کرنے لگے۔ افلاطون (427ق تا 347ق) کا ایک مرکزی خیال یہ ہے کہ دو دنیائیں ہیں۔ اُس کے نزدیک جو دنیا ہمیں نظر آتی ہے وہ حقیقی نہیں بلکہ عارضی ہے۔ حقیقی دنیا مادی دنیا سے باہر ہے، اور جو چیزیں ہم دیکھ، سونگھ اور چھو سکتے ہیں وہ صرف دوسری دنیا کی حقیقی اور مکمل چیزوں کے سائے ہیں۔

اِس کی سب سے مشہور مثال غار کی تمثیل ہے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ اکثر لوگ غار میں بیٹھے ہیں، اور وہ باہر کی دنیا سے ناواقف ہیں۔ گو وہ غار میں رہتے ہیں تو بھی خوش ہیں، کیونکہ یہی اُنہیں حقیقی اور اچھا لگتا ہے۔ وہ زنجیروں میں یوں جکڑے ہوئے ہیں کہ صرف سامنے کی دیوار کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کے پیچھے ایک آگ بھڑک رہی ہے جس کی روشنی اِسی دیوار پر پڑتی ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ سائے دکھائی دیتے ہیں، ایسے لوگوں کے جو آگ اور اُن کے درمیان مختلف چیزیں اُٹھائے پھرتے ہیں۔ افلاطون فرماتا ہے کہ اکثر لوگوں کی دنیا میں یہی حالت ہے۔ جس طرح غار کے قیدی دیوار کے سائے دیکھ کر اُنہیں حقیقی سمجھتے ہیں اُسی طرح لوگ ظاہری دنیا اور اُس کی چیزوں کو حقیقی سمجھ کر خوش رہتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ آزاد ہو کر غار کے منہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جو غار سے نکل کر حقیقی دنیا کو دیکھتے ہیں وہ حقیقی دانش مند اور حکومت کرنے کے لائق ہیں۔[17]

عزیز قاری، کیا آپ جانچ سکتے ہیں کہ یہ خیالات ابتدائی کلیسیا کے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ نہیں؟ مَیں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ دو دنیائیں ہیں، ایک ظاہری اور دوسری روحانی؟ ضرور۔ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ اکثر لوگ اندھیرے میں بیٹھے ہیں؟ بے شک۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی کلیسیا نے افلاطون کے بہت سے خیالات اپنائے، گو اُس کا مقصد اَور تھا۔

اُس وقت نہ صرف کلیسیا بلکہ بے شمار بُت پرستوں نے بھی افلاطون کے خیالات اپنائے۔ اب دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگوں نے یہ خیالات کس طرح اپنائے۔ اکثر لوگوں نے سب کچھ نہ اپنایا بلکہ اُنہیں کانٹ چھانٹ کر کے استعمال کیا۔ اِسے "درمیانی افلاطونیت" کا نام دیا گیا ہے۔ ہم مجموعی طور پر درمیانی افلاطونیت کے بارے میں 5 اصول بیان کر سکتے ہیں:

الٰہی ذات دنیا سے ماورا ہے

تصور یہ ہے کہ خدا عالم گیر بادشاہ ہے جو ہر کام اپنے وزیروں کے وسیلے سے ہی کرواتا ہے۔ الٰہی ذات کسی طرح بھی اِس دنیا میں نہیں ہوتی نہ براہِ راست رابطہ اِس سے رکھتی ہے۔ جب وہ کبھی اِس دنیا میں کام کرتی ہے تو اپنی "طاقتوں" یعنی مختلف وسائل کے ذریعے۔ لہٰذا اِس فلسفے کے پیروکاروں نے اِس بات پر بہت بحث مباحثہ کیا کہ خدا کا یہ کام کس طرح اور کن کن وسائل سے سرانجام ہوتا ہے۔

الٰہی ذات وہ کچھ ہے جو دنیا نہیں ہے

چنانچہ وہ کبھی وجود میں نہیں آیا، اُسے بیان نہیں کیا جا سکتا، وہ لا تبدیل، ناقابلِ تغیر اور جذبات سے خالی ہے۔

دنیا آبشار کی طرح خدا سے نکل آئی ہے

الٰہی ذات سے نکلنے کا یہ سلسلہ ہرم نما ہے۔ دنیا کی اشیا درجہ بہ درجہ خارج ہوتی ہیں۔ جتنا یہ سلسلہ الٰہی ذات سے دُور ہو جاتا ہے اُتنی کم قدر چیزیں نکلتی ہیں۔ اور جتنا قریب کوئی چیز ہو اُتنی زیادہ اُس کی قدر ہوتی ہے۔ سب سے اوپر والے درجے پر الٰہی ذات کے ''خیالات'' یا ''تصورات'' ہیں۔ یہ ماورائے دنیا ہیں، اور اِنہی کے مطابق دنیا کی مختلف چیزوں نے تشکیل پائی۔

خدا اور دنیا کا رابطہ درمیانیوں سے ہوتا ہے

چونکہ الٰہی ذات ماورائے دنیا ہے، اِس لئے درمیانیوں کی ضرورت ہے، وہی ''تصورات'' جن کے وسیلے سے دنیا تشکیل پاتی ہے۔

مخلوق کا مقصد خدا کی مانند بننا ہے

ہرم نما دنیا کی بہت سی منزلیں ہیں، اور انسان کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ درجہ بہ درجہ، منزل بہ منزل الٰہی ذات کی طرف ترقی کرتا جائے۔ اِس کے لئے درکار ہے کہ انسان الٰہی ذات کی نقل کر کے دنیا کے جذبات اور خواہشات سے آزاد ہو جائے۔

یہودی استاد فیلو: مجازی تفسیر اور کلام (لوگوس)

فیلو کا پیش خیمہ: حکمت کے صحائف

اب دل چسپ بات یہ ہے کہ پرانے عہد نامے میں ایسی آیات ملتی ہیں جو درمیانی افلاطونیت کے خیالات کے ساتھ جوڑی جا سکتی ہیں۔ امثال ابواب 1 تا 9 میں حکمت عورت کی صورت میں پیش آتی ہے۔ امثال میں وہ فرماتی ہے،

> جب رب تخلیق کا سلسلہ عمل میں لایا تو پہلے اُس نے مجھے ہی بنایا۔
> قدیم زمانے میں مَیں اُس کے دیگر کاموں سے پہلے ہی وجود میں آئی۔

> مجھے ازل سے مقرر کیا گیا، ابتدا سے ہی جب دنیا ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نہ سمندر کی گہرائیاں، نہ کثرت سے پھوٹنے والے چشمے تھے جب مَیں نے جنم لیا۔ نہ پہاڑ اپنی اپنی جگہ پر قائم ہوئے تھے، نہ پہاڑیاں تھیں جب مَیں پیدا ہوئی۔ اُس وقت خدا نے نہ زمین، نہ اُس کے میدان، اور نہ دنیا کے پہلے ڈھیلے بنائے تھے۔ جب اُس نے آسمان کو اُس کی جگہ پر لگایا اور سمندر کی گہرائیوں پر زمین کا علاقہ مقرر کیا تو مَیں ساتھ تھی۔ جب اُس نے آسمان پر بادلوں اور گہرائیوں میں سرچشموں کا انتظام مضبوط کیا تو مَیں ساتھ تھی۔ جب اُس نے سمندر کی حدیں مقرر کیں اور حکم دیا کہ پانی اُن سے تجاوز نہ کرے، جب اُس نے زمین کی بنیادیں اپنی اپنی جگہ پر رکھیں تو مَیں ماہر کاری گر کی حیثیت سے اُس کے ساتھ تھی۔ روز بہ روز مَیں لطف کا باعث تھی، ہر وقت اُس کے حضور رنگ رلیاں مناتی رہی۔ مَیں اُس کی زمین کی سطح پر رنگ رلیاں مناتی اور انسان سے لطف اندوز ہوتی رہی۔[a]

اِس حوالے میں حکمت نہ صرف عورت بلکہ درمیانی بھی ہے۔ خدا نے اُسے تخلیق سے پہلے ہی پیدا کر کے اُس کے ساتھ دنیا کو خلق کیا۔[b]

بعد کی یہودی تصانیف میں یہ خیال مزید بڑھایا گیا۔ دوسری صدی قبل از مسیح کی کتاب یشوع بن سیراخ 24 کے مطابق حکمت خدا کے منہ سے نکل آئی، اور اُس کا تخت آسمان پر ہے۔ پھر پہلی صدی قبل از مسیح کی کتاب بنام حکمت میں حکمت خدا کی قوت کا دم یا بھاپ ہے، جو قادرِ مطلق سے خارج ہوئی اور جو اِتنی پاک ہے کہ کوئی

[a] امثال 8:22-31
[b] بمقابلہ ایوب 12:28 و مابعد۔

ناپاک چیز اُسے آلودہ نہیں کر سکتی۔[c] وہ اُس کے نور کا عکس اور بھلائی کی صورت ہے۔[d] حکمت کی اِن آیات میں ایسے الفاظ مستعمل ہیں جو افلاطونیت میں بھی استعمال ہوئے۔

فیلو کا مجازی طریقۂ تفسیر

اب ہم فیلو (قریباً 15ق تا 45ء) کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ مصر کے شہر اسکندریہ کے اِس رہنے والے یہودی نے درمیانی افلاطونیت کے لباس میں اپنا یہودی مذہب پیش کیا، اور اِس میں وہ ابتدائی کلیسیا کے لئے نمونہ بن گیا۔ فیلو نے مذکورہ یہودی تصانیف کے خیالات کو بڑھا چڑھا کر اپنی افلاطونی آنکھوں سے پرانے عہد نامے کی تفسیر کی۔ شاید قاری اعتراض کریں کہ کلامِ مقدّس میں تو افلاطون کی باتیں نظر ہی نہیں آتیں۔ بے شک ہمیں جو اصلاحِ کلیسیا کے بعد ہی دنیا میں آئے ہیں یہ بات عجیب لگتی ہے۔ لیکن افلاطونی آدمی کے لئے یہ باتیں عجیب نہیں تھیں۔ جو آدمی سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز عارضی اور سایہ ہے اور کہ حقیقی چیز ماورائے دنیا ہے وہ کلام کی ہر بات کے پیچھے بھی کوئی اَور بات ڈھونڈ نکالے گا۔

چنانچہ اگر کلام کی کوئی بات مجازی تفسیر کرنے والے کو بُری لگے تو وہ اُس کا ظاہری مطلب رد کر کے کوئی اَور مطلب نکالے گا جسے وہ ''اندرونی'' اور ''حقیقی'' قرار دے گا۔

ختنہ کی رسم اِس کی خوب صورت مثال ہے۔ یونانیوں کو ختنہ کی رسم جاہل لگتی تھی۔ اُنہیں سمجھانے کے لئے فیلو ختنے کے ظاہری اور اندرونی پہلوؤں میں امتیاز کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ظاہری ختنہ اندرونی ختنے کی طرف اشارہ کرتا ہے، دل کا وہ ختنہ جو انسان کی غیر مناسب خواہشات کو دُور کرتا اور اُسے اپنی حقیقی حالت کو جاننے دیتا ہے۔[18] اِسی طرح فیلو قربانیوں اور باقی یہودی رسومات کا بھی مجازی مطلب اخذ کرتا ہے۔

---

[c] حکمت 24:7
[d] حکمت 26:7

چونکہ فیلو اور تفسیر کا یہ مجازی طریقہ ابتدائی کلیسیا میں بھی استعمال ہوا اِس لئے لازم ہے کہ ہم بھی اِس طریقے پر غور کریں۔ مجازی یعنی مثالی تفسیر کے فوائد اور خطرے کیا کیا ہیں؟ اِس کا فائدہ ظاہر ہے۔ اگر کوئی بات مجھے متضاد یا اچھی نہ لگے تو مَیں اِس کا باطنی مطلب نکالنے سے اِس کا حل کر سکتا ہوں۔ لیکن خاص کر اصلاحِ کلیسیا کے دور سے وہ آوازیں بلند ہو گئی ہیں جنہوں نے مجازی طریقے کے خطروں سے آگاہ کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ہی رجحان اور سوچ کے مطابق اندرونی مطلب اخذ کر سکتا ہے۔ کلام کی جو بھی بات اُسے متضاد یا بُری لگے اُسے وہ یہ کہہ کر نظرانداز کر سکتا ہے کہ اِس کا اندرونی مطلب اَور ہے۔ نتیجے میں خطرہ یہ ہے کہ انسان کلام سے اپنی من مانی کے مطابق کوئی اندرونی مطلب نکالے جو کلام کے ظاہری مطلب سے کہیں دُور یا اُس کے خلاف ہو۔

یہی کچھ ہوا بھی۔ خاص کر اوریِگین کے نوشتوں میں یہی خطرہ نظر آتا ہے، جس کی کئی باتیں کلام سے کہیں دُور ہو گئیں۔ یہ اتفاق کی بات نہیں کہ فیلو کا شہر اسکندریہ مجازی تفسیر کا ابتدائی کلیسیا میں اہم مرکز بن گیا۔

فیلو کی افلاطونی تعلیم

مجازی طریقۂ تفسیر استعمال کر کے فیلو پرانے عہدنامے کو درمیانی افلاطونیت کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ افلاطون کا ایک مرکزی خیال اپنا کر فیلو کو متواتر کلام میں انسان کی خدا کے حضور پہنچنے کی آرزو نظر آتی ہے۔ اور یہ آرزو ایمان، فضل، حلیمی، دنیاوی خواہشات سے آزادی اور وجد کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ خدا کی تلاش میں رہنا انسان کا فرض ہے، لیکن خدا مشکل سے ہی پایا جاتا ہے، وہ ماورائے دنیا ہے۔

چونکہ خدا ماورائے دنیا ہے اِس لئے اُسے صرف اُس وقت جانا جاتا ہے جب خود وہ اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کرے۔ یہ کام وہ فیلو کے نزدیک مختلف درمیانی ہستیوں سے کرواتا ہے جو ابدی طاقتیں بھی کہلاتی ہیں۔ یہ ہستیاں یا طاقتیں سب ایک ہی ہستی میں

شامل ہوتی ہیں جو کلام (لوگوس)[a] کہلاتا ہے۔ کلام کے مختلف نام ہیں: خدا کی صورت، پہلے پیدا ہوا بیٹا، دوسرا خدا، تخلیق کا آلہ اور حکمت۔[b]

اِن خیالات سے فیلو نے ابتدائی کلیسیا کو وہی ڈھانچا اور اصطلاحات عطا کیں جن سے وہ اپنا ایمان یونانی لباس میں پیش کر سکے۔ مسیحیوں نے بڑی آسانی سے یہ خیال اپنا لیا کہ انسان میں خدا کے پاس پہنچنے کی آرزو ہے اگرچہ یہ مشکل ہی ہے۔ اور جلد ہی کہا گیا کہ فیلو کا بیان کردہ درمیانی بنام کلام یسوع مسیح ہے۔

دلیلیوں پر افلاطون اور فیلو کا اثر

اب ہم دلیلیوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جن میں پہلی دفعہ افلاطونیت کا خاص اثر نظر آتی ہے۔

خدا ماورائے دنیا ہے

درمیانی افلاطونیت فرماتی ہے کہ الٰہی ذات دنیا سے ماورا ہے، خدا وہ کچھ ہے جو دنیا نہیں ہے۔ دلیلی بھی یہی کچھ بیان کرتے ہیں۔ یوں اَرِسطید خدا کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ نہ پیدا، نہ خلق ہوا۔ اُس کی نہ ابتدا، نہ انجام ہے۔ وہ لافانی ہے اور مر نہیں سکتا۔[19]

اگر ایسا ہے تو اِن میں اور غیرمسیحی فلاسفروں میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ دلیلی یہ فلسفہ اپنا کر پرانے اور نئے عہدنامے کے خدا کو نہیں چھوڑتے۔ وہ کہتے ہیں، ”اسرائیل کا خدا وہی لافانی خدا ہے جو آپ بھی مانتے ہیں۔“

---

[a] λόγος (logos)

[b] بمقابلہ امثال 8:22 و مابعد

کلام (لوگوس) خدا کا درمیانی ہے

درمیانی افلاطونیت کے مطابق خدا اور دنیا کا رابطہ درمیانیوں سے ہوتا ہے۔ فیلو کلام (لوگوس)[a] کو سب سے اعلیٰ درمیانی قرار دیتا ہے۔ دلیلی یہی خیال اپنا لیتے ہیں۔ البتہ یہاں بھی وہ اِس تعلیم کو مسیحی ایمان کے مطابق تبدیل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسیح ہی یہی درمیانی بنام کلام ہے۔

قاری شاید اعتراض کریں کہ یوحنا 1 بھی مسیح کو کلام سمجھتا ہے۔ کیا اِس کے پیچھے افلاطونیت کا اثر ہے؟ جنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ناکام رہے ہیں۔ یوحنا کی اِنجیل نئے عہدنامے کی دنیا پیش کرتی ہے۔ وہ کہیں نہیں فلسفیانہ باتیں پیش کرتی، گو اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال آسانی سے افلاطونی تعلیم سے جوڑی جا سکتی ہے۔

کیا عجب کہ دلیلی یہی آیت اور امثال 8:22 کو افلاطونی معنوں میں سمجھتے ہیں۔ وہ اِن جیسی آیات کی بنا پر دکھاتے ہیں کہ خدا نے مسیح کے وسیلے سے دنیا کو خلق کیا۔ یعنی اب زور نہ صرف مسیح کے اُس نجات بخش کام پر ہے جو اُس نے دنیا میں کیا بلکہ مسیح کے اُس کام پر بھی جو اُس نے دنیا میں آنے سے پہلے بلکہ خاص کر دنیا خلق کرتے وقت کیا۔

اِس تعلیم پر زور دینے سے یہ سوال اُبھر آنے لگا کہ اگر کلام نے دنیا کو خلق کیا تو پھر باپ اور بیٹے کا کیا تعلق ہے؟ تب خدا کی وحدت کس طرح قائم رہتی ہے؟ تثلیث کے بارے میں بحث مباحثہ یہاں سے شروع ہوتا ہے، اور یہ مضمون چھیڑنا دلیلیوں کا ایک تحفہ ہے۔

لیکن مسیح کا کلام ہونے کا ایک اَور پہلو بھی تھا۔ کلام نہ صرف تخلیق کے وقت عمل کر رہا تھا بلکہ وہ موجودہ دنیا میں بھی عمل درآمد ہوتا ہے۔ یوسطین اِس رائے کے لئے مشہور ہو گیا ہے کہ کلام بیج کی صورت میں[20a] انسان میں بستا ہے، اور جن لوگوں

---

[a] logos

[a] λόγος σπερματικός (logos spermatikos)

میں وہ کام کرتا ہے اور جو اُس کے مطابق چلتے ہیں وہ مسیحی ہیں۔ لہٰذا اُس کے نزدیک نہ صرف موسیٰ بلکہ سُقراط جیسے لوگ بھی ایمان دار تھے[21] گو وہ مسیح کو نہیں جانتے تھے۔ ہاں، جو بھی سچی بات کبھی کی گئی ہو، وہ مسیحی ہے۔[22]

دلیلیوں کی خوبیاں اور کمیاں

صاف ظاہر ہے کہ دلیلیوں نے افلاطونیت کی کئی باتیں اپنائیں۔ ایک طرح سے یہ قابلِ ملامت ہے۔ جب مسیحی ایمان کو فلسفلے کی مدد سے بیان کیا جاتا ہے تو خطرہ ہے کہ آخر میں ایمان کو نقصان پہنچے۔ یوسطین کا خیال کہ ہر دانش مند غیر مسیحی بھی حقیقت میں ایمان دار ہے یہ بات ثابت کرتا ہے۔ گو یہ بات کلامِ مقدّس میں کہیں نہیں ملتی لیکن یوسطین کے فلسفے نے اُس کی آنکھوں کو اِس حقیقت کے لئے بند کر رکھا ہے۔

ایک اَور کمی دلیلیوں میں نظر آتی ہے۔ جتنا خدا، کلام اور دنیا پر دھیان دیا جاتا ہے اُتنا ہی مسیح کا نجات بخش کام پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

دوسری طرف ہر زمانے کے ایمان دار کا فرض ہے کہ وہ اپنا ایمان نئے سرے سے پیش کرے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ اور یہ کرنے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کی سوچ کے مطابق اپنا ایمان پیش کرے۔ بے شک ہر زمانے میں یہ کرنے سے کمیاں پیش آئیں گی، لیکن ساتھ ساتھ ایمان دوبارہ تازہ تازہ اور طاقت ور نظر آئے گا۔ ہم جو صدیوں کے بعد ایسے لوگوں کے خیالات پڑھتے ہیں اُن کی کمیاں خوب پہچان لیتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں ہم اکثر اپنی ذاتی کمیوں کے لئے اندھے رہتے ہیں۔ البتہ مختلف زمانوں کے ایمان داروں کی کتابیں پڑھنے سے ہم اپنی کمیوں کے لئے زیادہ حساس بن جاتے ہیں۔

دلیلیوں کا یقین غلط نہیں ہے کہ ایمان سمجھ کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں، اُنہوں نے اپنی سمجھ کی مدد سے بت پرستی اور عرفانیت کے قصے کہانیاں مسترد کیں۔ اُن کی سرتوڑ کوشش یہ دکھانا تھی کہ مسیحی ایمان سمجھ بلکہ سب سے اعلیٰ فلسفے کے مطابق ہی ہے۔

اور اُس زمانے کا سب سے اعلیٰ فلسفہ درمیانی افلاطونیت تھا۔ یہ جذب کرنے سے وہ بلاشبہ کچھ کمیوں کا شکار ہو گئے، لیکن ساتھ ساتھ وہ اُس کی خوبیاں اپنانے سے دنیا کو اپنا ایمان تازہ تازہ پیش کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ اور جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں افلاطونیت کے کئی خیالات مسیحی ایمان کے قریب ہی تھے، اِس لئے اُسے کانٹ چھانٹ کر کے استعمال کرنا آسان تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلیلی سب سے پہلے ماہرِ الٰہیات تھے۔ اِس ناتے سے وہ ہمارے لئے نمونے کے باعث ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ ہمیں آگاہ بھی کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان کبھی بھی خالی فلسفہ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ نجات کا راستہ۔ بے شک اِس کے بارے میں سوچنا کہ خدا، کلام اور دنیا ایمان کے لئے کیا حیثیت رکھتے ہیں فائدہ مند ہے۔ اور یہ خیال کرنا کہ انسان کہاں تک خدا کو پہچان سکتا ہے بُرا نہیں ہے۔ لیکن ایسے سوالات سے ہماری آنکھوں کو اُس نجات بخش کام کے لئے بند نہیں ہونا چاہئے جو مسیح میں سرانجام ہوا۔

عرفانیت: الٰہی آفتاب میں ڈوبنے کی راہ

عرفان اور عرفانیت

دوسری صدی میں ایک بدعت کلیسیا میں گھسنے لگی جو نہایت خطرناک ثابت ہوئی۔ بدعت کا نام عرفانیت تھا۔ عرفان اور عرفانیت میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ عرفان کا مطلب شناخت یا پہچان ہے، اور یہ لفظ خاص کر خدا کی معرفت یا خدا شناسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ایک قسم کا عرفان مناسب اور کلام مقدّس کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم بھی ایمان لاتے وقت خدا کو پہچان لیتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم عرفان اُن لوگوں کے لئے استعمال کریں گے جو سمجھتے ہیں کہ ہم عام ایمان داروں کی نسبت الٰہی بھیدوں کا خاص علم رکھتے ہیں، ایسا علم جو کلامِ مقدّس سے بڑھ کر ہے۔ اور عرفانیت اُن نظاموں کا نام ہے جو

دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں وجود میں آئے۔ عرفانیت کے دیگر الفاظ گیانیت اور غناستیت ہیں۔

کسی نے خوب کہا ہے، ”خدا نے اپنے بارے میں اُتنا ہی ظاہر کیا جتنا ہمیں اُس سے رفاقت رکھنے کے لئے درکار ہے۔ وہ ہمارے لئے اپنے بارے میں تمام بھید نہیں کھولتا۔ وہ اپنے مکاشفے میں بھی ایک طرح سے چھپا رہتا ہے۔“[23] اِس کے برعکس عرفانیت الٰہی ذات کے ہر بھید کا علم رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ عرفانیت کے پیروکار کس قسم کے لوگ تھے؟ وہ دلیلیوں کی طرح دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ ہمارا ایمان علوم کی روشنی میں پایہ دار اور مضبوط ہے۔ وہ بھی مختلف فلسفوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے البتہ کانٹ چھانٹ کر کے اور من گھڑت کہانیوں کے ساتھ ملا کر۔ لیکن دلیلیوں کا پورا زور اِس پر ہے کہ ہمارا ایمان سمجھ اور کائنات کے نظام کے مطابق ہی ہے جبکہ عرفانیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا ایمان دنیا سے ماورا ہے۔

جو کہتا ہے کہ میری تعلیم سمجھ اور کائنات کے نظام کے مطابق ہے اُس کے ساتھ انسان بحث مباحثہ کر سکتا ہے۔ لیکن جو کہے کہ میرا ایمان دنیا سے ماورا ہے اُس کے ساتھ بحث مباحثہ کرنا مشکل ہی ہے۔ کیونکہ عرفانی ہر اعتراض کے جواب میں کہے گا، ”آپ میری بات سمجھ نہیں سکتے، کیونکہ آپ دنیاوی باتیں کر رہے ہیں۔ مَیں تو ماورا کے بھید پیش کر رہا ہوں جو یہاں کی ظاہری اور مادی چیزوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔“ یوں عرفانیت میں ہر من گھڑت بات اور حرکت قبول ہو سکتی تھی خواہ وہ سمجھ کے کتنے خلاف کیوں نہ ہو۔ مسیحی ایسا ایمان کبھی بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اِسی وجہ سے دلیلی اِس پر زور دیتے رہے کہ ہمارا ایمان سمجھ کے خلاف نہیں بلکہ معقول ہے۔ نیز، ہمارا ایمان سب کے سامنے ہے، ہم چپکے سے غلط یا غیر اخلاقی کام نہیں کرتے۔

عرفانیت کی بنیادی تعلیم

جب ہم عرفانیت کے مختلف نظاموں پر غور کرتے ہیں تو اُن کی تفصیلات میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ اِس جگہ پر اِن پر زیادہ دھیان دینا مفید نہیں ہے۔ لیکن کچھ بنیادی اصول ہر ایک میں پائے جاتے ہیں، اور اِنہی کو ہم اپنا مرکزِ خیال بنائیں گے۔[24]

الٰہی بھیدوں کا علم

عرفانی ایک طرح سے سائنس دان کا کردار اپنا کر لگاتار خدا، دنیا اور انسان کی تحقیق کرتا رہتا ہے۔ مثلاً وہ پوچھتا رہتا ہے کہ بُرائی کہاں سے آئی اور کیوں؟ انسان کہاں سے آیا اور کس طرح؟ خدا کہاں سے آیا؟ عرفانی الٰہی ذات کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتا ہے،[a] لیکن یہ کرنے کے لئے وہ کلامِ مقدّس میں شامل باتوں سے کہیں آگے نکلتا ہے۔

تاریخی سوچ کی کمی

گو عرفانیت کی تحقیق اور پوچھنے والی روح قدیم فلاسفروں میں پائی جاتی ہے، تو بھی یہ صرف ایک ظاہری مطابقت ہے۔ جو جواب عرفانیت دیتی ہے وہ نہ تاریخ اور نہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ مثلاً وہ مسیح کی تاریخی زندگی میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی بلکہ مسیح کا نام اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔ جو عرفانیت میں تاریخی باتیں ڈھونڈے وہ ناکام رہے گا۔ کیونکہ عرفانیت کی باتیں اِس دنیا کی ہر چیز سے ماورا ہوتی ہیں۔

دیومالے کے لباس میں عرفان کا بیان

تاریخی حقیقتوں سے ہٹ کر عرفانیت سب کچھ دیوتاؤں کے قصوں کہانیوں سے بیان کرتی ہے۔

---

[a] ۱۔کُرِنتھیوں 10:2

دو متضاد اصول بڑے نظاموں کی صورت میں

عرفانیت میں دو بنیادی اصول پائے جاتے ہیں، کائنات اور نجات جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اور عرفانیت کے مختلف فرقے پوری جد و جہد کے ساتھ اِن دونوں اصولوں کو بڑے بڑے نظاموں کی صورت میں ہم آہنگ کرتے ہیں۔

دنیا کے بارے میں عرفانیت کی تعلیم

اِن اصولوں کی بنیاد پر دنیا کے بارے میں تعلیم پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے تین اہم نکتے ہیں۔

خدا سے الٰہی ہستیاں صادر ہوتی ہیں

افلاطونیت کے مطابق دو دنیائیں ہوتی ہیں، ایک اصلی اور الٰہی دنیا اور دوسری سائے کی ظاہری دنیا ۔ اِس کے برعکس عرفانیت کا خدا دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، وہ ظاہری دنیا سے بالکل الگ، ہاں اِس کے متضاد ہے۔

تو پھر دنیا کس طرح خلق ہوئی؟ پہلے اِس الٰہی ذات سے الٰہی ہستیوں کی دنیا صادر ہوئی۔ پھر ہوتے ہوتے اِن ہستیوں میں سے کچھ الٰہی ذات سے اِتنی دُور ہو گئیں کہ ظاہری یعنی مادی دنیا میں گر گئیں۔ اُس وقت سے الٰہی یعنی روحانی دنیا کی یگانگت ختم ہے، اب سے ایک محفوظ اور ایک گرا ہوا الٰہی حصہ ہے۔

مادی دنیا ادنیٰ الٰہی ہستیوں سے صادر ہوئی ہے

جو الٰہی ہستیاں عرفان کی روحانی دنیا سے گر جاتی ہیں وہ مادی اور عرفان سے محروم دنیا میں پھنس جاتی ہیں۔ اکثر فرقوں کے مطابق پہلی گرنے والی ہستی دنیا کا خالق ہے۔ یہ خالق پرانے عہد نامے کا خدا سمجھا جاتا ہے، اور عرفان کے پیروکار اُس کے روحانی باتوں سے خالی کردار پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ بات اِس سے ظاہر ہوتی ہے کہ خدا انسان کی طرح کی حرکتیں کرتا ہے، مثلاً انسان کی طرح خوشی اور غم محسوس

کرتا ہے۔ اِس ہستی[a] کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو واحد خدا سمجھتا ہے۔[b] چونکہ وہ روحانی نہیں ہے، اِس لئے روحانی دنیا کا علم نہیں رکھتا۔ اِس ادنیٰ ہستی سے مزید ہستیاں نکلی ہیں جن کے ذریعے مادی دنیا اور انسان صادر ہوئے ہیں۔ اِن کا ادنیٰ معیار اِن کی فانیت اور دنیا کے ہول ناک واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

توبھی انسان کے اندر کسی نہ کسی وجہ سے روحانی دنیا کی چنگاری محفوظ رہ گئی ہے۔ یہ چنگاری مادی دنیا اور اُس کے خدا کے متضاد ہے۔

نجات کا راستہ

عرفان کے پیروکاروں کے نزدیک پرانے عہد نامے کا ''واحد خدا'' اور نئے عہد نامے کا ''نیک خدا'' فرق ہستیاں ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ انسان میں روحانی دنیا کی چنگاری ہے، اور عرفان کا مقصد اِس دبی ہوئی چنگاری کو جگا دینا ہے تاکہ وہ اپنی اصل اور سرچشمے کا علم حاصل کر کے اِس ادنیٰ دنیا سے آزاد ہو جائے اور اپنے اصل کے پاس واپس پہنچے۔ تب وہ اُس طرح الٰہی ذات میں ڈوب جائے گی جس طرح پانی کا قطرہ سمندر میں۔ مسیح اِس عرفان کی علامت اور نمونہ ہے۔

نئے عہد نامے کی تعلیم کہ مسیح اپنی جان دے کر صلیب پر چڑھ گیا عرفانیت کو قابلِ گھن لگتی ہے۔ عرفانی کے نزدیک مسیح مشعلِ راہ ہے جو انسان کو اِس اندھیری دنیا سے چھٹکارے کی راہ دکھاتا ہے۔ اِس لئے عرفانیت یہ بات قبول نہیں کر سکتی کہ مسیح مصلوب ہوا۔ کچھ کے مطابق روحانی مسیح عارضی طور پر دنیاوی یسوع سے متحد ہوا لیکن مصلوب ہوتے وقت اُس سے آزاد ہوا۔ کچھ کے نزدیک یسوع اور شمعون کرینی نے ایک دوسرے کی شکل اپنائی، اور شمعون اُس کی جگہ مصلوب ہوا۔ کچھ کا خیال تھا کہ مسیح صرف ظاہری طور پر مصلوب ہوا (دوقیت)۔ سب کا یقین تھا کہ مسیح مصلوب نہیں ہو سکتا۔

---

[a] کچھ کے نزدیک اِس کا نام یلدا باؤتھ (yaldabaoth) ہے۔
[b] دیکھئے یسعیاہ 44:6؛ 45:5

عرفانیت کا پیروکار کیسی زندگی گزارے گا؟ وہ عرفان کے بھید اپنا کر روحانی شعور پائے گا اور ترقی کرتے کرتے کائنات کے نظام سے آزاد ہو جائے گا۔ وہ افزائشِ نسل یعنی بچے پیدا کرنے سے انکار کرے گا تاکہ اب سے روح بار بار پیدا نہ ہو جائے۔ آخر میں اِس دنیا کا فانی اور مادی کردار ختم ہو جائے گا اور الٰہی ذات کی یگانگت دوبارہ قائم ہو جائے گی۔

اکثر عرفانی اپنی چنگاری آزاد کرنے کے لئے اپنے جسموں کو دباتے یعنی زُہد کا طریقہ استعمال کرتے تھے۔ لیکن کچھ گروہوں نے اِس کے الٹ عیاشی کا نتیجہ نکالا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر مادی دنیا غلط اور فانی ہے تو ہم عیاشی سے جسم کو دبائیں گے۔

عرفانیت کہاں سے آئی؟

اب تک تحقیقات نہیں ثابت کر سکیں کہ عرفانیت کہاں سے آئی۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ مسیح کے زمانے میں یا اِس سے پہلے وجود میں آئی۔ ایسے لوگ عرفانیت کا اثر نئے عہدنامے میں دیکھتے ہیں۔ لیکن اب تک یہ بات ثابت نہ ہو سکی، کیونکہ عرفانیت کے جتنے اشارے مل گئے ہیں وہ سب دوسری صدی میں یا مابعد لکھے گئے۔[25]

عرفانیت سے سبق

عرفانیت کے مختلف فرقوں پر غور کرنا بےفائدہ ہے۔ عام آدمی اُن کی من گھڑت کہانیاں پڑھ کر جلد ہی تھک جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ پہلی صدیوں سے لے کر آج تک لاتعداد افراد عرفانیت کے جادو میں آ گئے ہیں۔ حقیقت میں اُس کا لباس بدلتا رہتا ہے، لیکن بنیادی خیالات وہی رہے ہیں۔

شاید قاری کہیں، اب بس کرو، کافی ہے۔ اِن فضول باتوں کا ہمارے ساتھ کیا تعلق؟ حقیقت یہ ہے کہ عرفانیت کی تعلیم آج تک مختلف گروہوں میں پائی جاتی ہے، خاص کر تھیوصوفی اور اہلِ تصوف میں۔ اور یہ خیال کہ انسان کے اندر الٰہی چنگاری ہے جو جسم

میں قید ہے اور جسے مختلف طریقوں سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے آج کل بھی کئی لوگوں سے رکھا جاتا ہے۔

مسیحی ایمان کے لحاظ سے عرفانیت کا کیا مسئلہ ہے؟ اول، خدا کی وحدانیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تعلیم کہ الٰہی ہستیاں الٰہی ذات سے صادر ہوتی ہیں ہمارے ایمان کے خلاف ہے۔ ایک ہی خدا ہے جس نے اپنے نیک منصوبے کے مطابق کائنات کو خلق کیا۔ نہ فرشتے یا دنیا یا انسان خدا سے صادر ہوئے، نہ وہ کسی اَور چیز سے نکلے بلکہ جہاں کچھ نہیں تھا وہاں خدا نے فرمایا تو سب کچھ وجود میں آیا۔

عرفانیت نے ایک اَور بات چھیڑی جس کا جواب دینا لازم ہے۔ اُس نے اعتراض کیا کہ پرانے عہد نامے میں خدا انسان جیسا لگتا ہے۔ مثلاً اُسے غصہ ہوتا ہے، وہ غیور[a] ہے، اُس کا چہرہ ہے وغیرہ۔ ہم اِس پہلو پر مرقیون کے ذمے مزید غور کریں گے۔[b]

کلام کے مطابق خدا نے پورے انسان کو جسم سمیت اچھا بنایا۔ البتہ گناہ میں گرنے کے بعد وہ خدا سے الگ ہو کر فانی بن گیا۔ اِس لئے مسیح نے اِس دنیا میں آ کر اپنی جان دی تاکہ اپنے اوپر ہماری جگہ سزا اُٹھا لے۔ جو ایمان لائے وہ خدا کے سامنے راست باز ٹھہرتا ہے، وہ خدا کا فرزند بن جاتا ہے۔ لیکن خالق اور مخلوق کا فرق قائم رہتا ہے۔ ہم یہ بات کبھی نہیں مان سکتے کہ انسان میں الٰہی چنگاری ہے جو چھٹکارا حاصل کر کے الٰہی ذات میں یوں ڈوب جائے جس طرح پانی کا قطرہ سمندر میں۔

ہمارے ایمان میں اِس خیال کی گنجائش ہی نہیں کہ انسان کا جسم قید خانہ ہے جس میں الٰہی چنگاری دبی ہوئی ہو۔ یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ اِس چنگاری کو جگا کر جسم سے آزاد کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ ہماری پوری انسانیت جسم سمیت جی اُٹھے گی، کہ ایک دن خدا ہمیں وہی صحت مند اور کامل انسان بنائے گا جو اِس وقت گناہ میں گرنے کے باعث ناقص اور فانی ہے۔

---

[a] خروج 5:20

[b] دیکھئے صفحہ 138 و مابعد۔

فضل کے لحاظ سے بھی ایمان دار عرفانیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم مانتے ہیں کہ انسان خود اپنی گناہ آلودہ حالت سے رِہائی نہیں پا سکتا، کہ یہ کام صرف اور صرف مسیح کی صلیبی موت سے سرانجام ہوا۔ خود ہم اپنی نجات حاصل نہیں کر سکتے، مسیح نے ہمارا کفارہ دے کر سب کچھ کیا ہے۔ اِس کے برعکس عرفانی دعویٰ کرتا ہے کہ صحیح جد و جہد اور عرفان کے ساتھ میری الٰہی چنگاری آزاد ہو کر الٰہی ذات میں دوبارہ ڈوب جائے گی۔

نتیجے میں عرفانیت کے پیروکار مسیح کا نجات بخش کام نہیں مانتے۔ اُن کے مطابق مسیح استاد کی حیثیت سے انسان کی راہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ عرفانی بھیدوں کو سمجھ کر اِس مادی دنیا سے آزاد ہو جائے۔ لیکن اُن کے نزدیک مسیح نے اپنی جان ہمارے لئے نہ دی۔ یوں وہ اُسی بات کا انکار کرتے ہیں جو مسیحی ایمان کا مرکزی عقیدہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عرفانی خیالات مسیحی مذہب پر محدود نہ رہے بلکہ کئی مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔

مانی: نور اور تاریکی کی جنگ

عرفانیت کا ایک نظام ہے جس کا ذکر کرنا لازم ہے۔ مانی (قریباً 216ء تا 276ء) کی تعلیم اِس لئے اہم ہے کہ وہ جلد ہی بین الاقوامی سطح پر آ گئی، بلکہ اُس کے پیروکار مغرب کے رومی ممالک سے لے کر چین تک پھیل گئے۔ آج یہ مذہب نابود ہو گیا ہے۔ مانویت کا عروج تیسری صدی سے ساتویں صدی تک تھا۔ ہم اُس کی دل کشی اِس سے جانچ سکتے ہیں کہ اوگسطین بھی ایمان لانے سے پہلے مانی کے جادو میں آ گیا۔

مانویت کا بانی مانی آج کے عراق میں رہتا تھا۔ اُس کی تعلیم میں زرتشتی، بدھ مت اور مسیحی عناصر پائے جاتے ہیں۔ مانی کے مطابق ابتدا میں نور اور تاریکی کی طاقتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کے نتیجے میں اِس دنیا میں اچھی اور بُری چیزوں کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ پیروکار کی کوشش یہ ہے کہ جسم میں دبی ہوئی چنگاری آزاد ہو جائے۔

برگزیدہ اور عام مانویوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ برگزیدہ کے جسم میں دبی ہوئی الٰہی چنگاری چھٹکارا پا سکتی ہے اگر وہ نظم و ضبط کے ساتھ زندگی گزارے اور افزائشِ نسل سے پرہیز کرے۔ جو برگزیدہ نہیں تھے اُنہیں امید دلائی گئی کہ اگر اچھی زندگی گزاریں تو موت کے بعد نئے جسم میں واپس آ کر برگزیدہ بنیں گے۔[26]

* * *

دوسری صدی میں نہ صرف عرفانیت کی بدعت عروج پر تھی بلکہ ایسے بدعتی گروہ بھی پائے جاتے تھے جو اپنے آپ کو ابتدائی ایمان کے اصلی پیروکار سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک باقی ایمان دار ابتدائی ایمان سے دُور ہو گئے ہیں، صرف ہم ہی اصل ایمان کے پیروکار ہیں۔ اِن میں تین گروہ شامل ہیں۔

بدعتی یہودی مسیحی: مسیح محض نبی ہے

عِبیونیوں اور نصرانیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔[a] دوسری صدی میں یہ گروہ غیریہودی مسیحیوں سے الگ ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو ابتدائی ایمان کے پیروکار سمجھتے تھے تو بھی تین بنیادی مسئلے اُن میں نظر آتے ہیں۔

مسیح کی نجات نامنظور

وہ یہ بات قبول نہیں کر سکتے تھے کہ نجات مسیح سے ہی ملتی ہے۔ اُن کے نزدیک مسیح سے زیادہ اہم پرانے عہدنامے کی شریعت ہے، وہی مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔

مسیح کا الٰہی کردار نامنظور

نتیجے میں مسیح کا الٰہی کردار ناقابلِ قبول ہے۔ اُن کی اناجیل میں مسیح ایک خاص نبی سے زیادہ نہیں ہے جسے روح القدس سے اختیار مل گیا ہے۔ یہودیت کے قریب مسیحی

[a] دیکھئے صفحہ 51۔

بدعت بنام الخسائیہ[a] اِس سے بڑھ کر مسیح کو فرشتہ سمجھتی تھی۔ یہ بدعت عرفانیت کے قریب تھی۔[27]

سوائے قربانیوں کے شریعت کے تمام فرائض ادا کرنے ہیں

یہ گروہ پولس کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ "مسیح میں شریعت کا مقصد پورا ہو گیا، ہاں وہ انجام تک پہنچ گئی ہے۔"[b] اِس کے برعکس وہ کہتے ہیں کہ مسیح میں شریعت تکمیل تک پہنچ گئی ہے، لہٰذا سوائے قربانیوں کے اُسے پورا کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ عِبیونیوں کی اِنجیل متی 17:5 کو یوں بیان کرتی ہے، "مَیں قربانیوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، اور اگر تم قربانیاں پیش کرنے سے باز نہ آؤ تو میرا تم پر غصہ بھی ٹھنڈا نہیں ہو گا۔" اِن گروہوں کے لئے مختلف چیزوں سے پرہیز گاری، غسل اور بُری نظر سے بچنے کے مختلف طور طریقے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔[28]

مرقیون از سینوپ: کلام کے دو خدا

ہر بدعت میں کوئی نہ کوئی سچی بات پائی جاتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ بدعت اِس سچائی کو غیر صحت مند حد تک بڑھا کر اور توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہے۔ مرقیون (قریباً 85ء تا 160ء) اِس حقیقت کی خوب صورت مثال ہے۔[29]

ابتدائی کلیسیا میں جب کچھ یہودی ایمان دار اصرار کرنے لگے کہ غیر یہودی ایمان دار بھی یہودی رسم و رسومات پر عمل کریں تو پولس رسول نے اُن کی سخت مخالفت کی۔ اِس مخالفت کا ایک نتیجہ اُس کی فضل کے بارے میں تعلیم ہے۔ خود مسیح نے دمشق کے سامنے اُس پر ظاہر ہو کر اُسے دکھایا تھا کہ نجات کی ایک ہی راہ ہے۔ خود مَیں نے تیرے عوض اپنی جان دی تاکہ تُو الٰہی عدالت سے بچ سکے۔ گو تُو شریعت کا کٹر پیروکار

[a] Elcesaite
[b] رومیوں 4:10

ہے تو بھی یہ ناکافی ہے۔ اِس سے تُو خدا کی عدالت سے نہیں بچے گا۔ مجھ پر ایمان لانے سے ہی تُو رِہائی پائے گا۔

پولس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شریعت بُری یا پرانا عہد نامہ ناقص ہے۔ وہ تو مانتا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ خدا کا جو راستہ پرانے عہد نامے میں بیان کیا گیا ہے وہ اچھا اور مفید تھا۔ وہ باقی ایمان داروں کے ساتھ سمجھتا تھا کہ پرانا عہد نامہ خدا کا زندہ کلام ہے جس پر ہمارا ایمان مبنی ہے۔ وہ بھی کہتا تھا کہ ہم ہی اسرائیل کے حقیقی فرزند ہیں۔ لیکن اُسے سمجھ آ گئی تھی کہ ہم شریعت کی بنا پر نجات نہیں پاتے بلکہ مسیح کی بنا پر۔

اب مرقیون نے پولس کے اِن خیالات کو توڑ مروڑ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ اِنجیل کی خوش خبری شریعت کے خلاف ہے، کہ شریعت اور پرانا عہد نامہ مسیح کی طرف راستہ نہیں بلکہ اُس کے متضاد ہے۔ اگر مرقیون کا یہ مرکزی خیال یاد رکھیں تو مرقیون کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

تین اصول مرقیون کی بدعت میں پائے جاتے ہیں۔

پرانے عہد نامے کا گھٹیا خدا

مرقیون نے پرانے عہد نامے کو رد نہ کیا۔ اُس نے پرانے عہد نامے کی گھٹیا حالت ثابت کرنے کے لئے ایک اَور طریقہ استعمال کیا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اکثر ایمان داروں میں کلام کی مجازی تفسیر حد سے زیادہ مقبول تھی، اور ہم اِس کے خطروں سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں مرقیون نے کلام کی تفسیر کرنے میں ایک اَور راستہ اختیار کیا جس سے وہ دوسری انتہا تک پہنچ گیا — اُس نے ہر قسم کی مجازی یا تمثیلی تفسیر کو رد کیا۔

مرقیون فرماتا ہے کہ گو پرانے عہد نامے کا خدا عادل ہے تاہم وہ اُس محبت سے محروم ہے جو نئے عہد نامے کے خدا کی خوبی ہے۔ اِسی لئے یہ دنیا جسے اُس نے خلق کیا اِتنی بے ترتیب ہے اور اُس میں اِتنی بُرائی پائی جاتی ہے۔ اِسی لئے وہ بیماریوں، فانی چیزوں بلکہ

موت سے بھری پڑی ہے۔ مرقیون سوال کرتا ہے کہ یہ کس طرح کا بےبس خدا ہے جس نے پہلے انسان کو آزمائش میں پڑنے دیا، پھر اُسے جنت سے نکال بھگایا؟ کیا ایسا خدا گھٹیا نہیں جو غصے ہو کر پوری دنیا کو سیلاب میں ڈوبنے دیتا، سدوم کا ستیاناس کرتا اور لاتعداد جنگیں چھیڑتا ہے؟ دوسری طرف وہ داؤد جیسے زناکار آدمی کی طرف داری کر کے اُسے معاف کرتا ہے! ایک طرف وہ اخلاقی احکام دیتا ہے، دوسری طرف اُنہیں گھنونی قربانیوں کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ اور یہ ظالم، غیرت مند اور بدلہ لینے والی ہستی ابلیس پر غالب نہیں آ سکتی! خود یہ اپنے بارے میں فرماتی ہے، ”مَیں ہی . . . بُرے حالات پیدا کرتا، مَیں رب ہی یہ سب کچھ کرتا ہوں۔“[a] اور دوسری جگہ پر، ”آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت۔“[b]

مرقیون آگے پوچھتا ہے کہ ایسا خدا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جس نے افزائشِ نسل کا اِتنا گھٹیا طریقہ قائم کیا؟ خراب درخت اچھا پھل نہیں لاتا۔[c] غرض پرانے عہد نامے کا خدا یہی خراب درخت ہے۔

اِنجیل کا محبت بھرا خدا

کیا مرقیون پرانے عہد نامے کے وہ حوالے نہیں جانتا تھا جن میں خدا کی محبت، مہربانی اور رحم کا ذکر ہے؟ ضرور۔ لیکن اُس کے نزدیک یہ خدا صرف جذباتی ہے، اُس کی محبت حقیقی نہیں ہے۔ حقیقی محبت اُسی خدا میں پائی جاتی ہے جو اِنجیل پیش کرتی ہے۔ اِنجیل کا خدا دنیا کا خالق نہیں ہے بلکہ ایک الگ ہستی جو مسیح کی شکل میں کفرنحوم میں اُتر آئی۔ مرقیون کے نزدیک مسیح اِسی خدا کی ایک صورت ہے (سبیلیت)۔ اور اِس مسیح کا حقیقی انسانی جسم نہیں تھا بلکہ وہ صرف انسان کی شکل میں ظاہر ہوا (دوقیت)۔

---

[a] یسعیاہ 7:45
[b] خروج 24:21
[c] لوقا 43:6

مرقیون فرماتا ہے کہ نہ اِس خدا کا پرانے عہد نامے کے خدا کے ساتھ کوئی تعلق ہے، نہ اِس دنیا کے ساتھ۔ اِس نے پرانے عہد نامے کے راست بازوں کو رد کیا لیکن گناہ گاروں کو قبول کر کے اُن کی روحوں کو (جسموں کو نہیں !) نجات دی۔ کس طرح ؟ صلیب پر اپنی جان دے کر اُس نے دنیا کے خالق کو تاوان یا فدیہ دیا۔

ایمانداروں کی زندگی کیسی ہونی چاہیے ؟ مرقیون کی نظر میں دنیا کے خالق کا سامنا کرنا ہے، جس کے لئے سخت نظم و ضبط اور جنسی تعلقات سے پرہیز گاری درکار ہیں۔

کلامِ مقدّس کی کانٹ چھانٹ

سوال یہ ہے کہ مرقیون نے اپنا یہ نظریہ کس طرح کلامِ مقدّس سے اخذ کیا؟ کیا اُس کی تعلیم کلامِ مقدّس سے کہیں دُور نہیں چلی گئی؟ اُس کی بنیادی غلطی کیا تھی؟

مرقیون کا مسئلہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے خیالات کو اولیت دے کر اُنہی کی روشنی میں کلامِ مقدّس کو پڑھا۔ کلام کی بہت سی باتیں اُس کی تعلیم سے مختلف تھیں۔ اُس نے جواب میں کیا کِیا ؟ کیا اُس نے اپنی تعلیم کو بدل کر کلامِ مقدّس سے ہم آہنگ کیا؟ ہرگز نہیں بلکہ اُس نے وہ کچھ کیا جو بدعت کا نشان ہے — اُس نے کلام کو تبدیل کیا۔ اول، اُس نے پرانے عہد نامے کی باتیں اِس طریقے سے بے معنی بنا دیں کہ اُنہیں دنیا کے گھٹیا خدا کی باتیں قرار دیا۔ لیکن یہ ناکافی تھا، کیونکہ نئے عہد نامے کی بہت سی باتیں بھی اُس کی تعلیم کی مخالفت کرتی ہیں۔ نتیجے میں جو بھی حوالہ اُسے ناپسند تھا اُسے مرقیون نے کاٹ ڈالا ۔ چنانچہ اُس نے صرف لوقا کی اِنجیل اور پولس کے 10 خطوں کو قبول کیا۔ لیکن یہ تصانیف بھی اُسے پورے طور پر منظور نہیں تھیں بلکہ اُسے اِن کی بُری طرح کانٹ چھانٹ کرنی پڑی تاکہ سب کچھ اُس کی تعلیم سے ہم آہنگ ہو جائے۔

مرقیون کا عرفانیت سے فرق

مرقیون عرفانیت کے قریب ہے، تو بھی اُس کی تعلیم فرق ہے۔

- مرقیون نے نہ عرفانیوں کی طرح لمبے لمبے قصے کہانیاں سنائیں، نہ اُن کی بنا پر بڑا نظام کھڑا کیا۔

- نہ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ میرا کلام سے بڑھ کر علم ہے، نہ کبھی عرفانیوں کی طرح نام نہاد بھید پیش کئے۔

- اُس نے مجازی تفسیر استعمال نہ کی۔

کیا مرقیون اصلاحِ کلیسیا کا پہلا نمائندہ تھا؟

کچھ آزاد خیال لوگوں نے اِن باتوں کی بنا پر مرقیون کو اصلاحِ کلیسیا کا پہلا نمائندہ قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو جلد ہی بنیادی اختلافات نظر آتے ہیں۔ گو اُس نے ایک طرح سے کلام سے بڑھ کر بھید پیش نہ کئے، تاہم اُس نے پورا کلام قبول نہ کیا بلکہ اُس کے بہت سے حوالے رد کر کے کلام سے بالکل فرق تعلیم کھڑی کی۔ اور گو اُس نے پولس رسول اور اصلاحِ کلیسیا کے بزرگوں کی طرح اِنجیل کی خوش خبری پر زور دیا تو بھی اُسے اِنجیل کی آزادی حاصل نہ ہوئی۔ اُس نے شریعت کو رد کر کے اُس کی جگہ اپنی ہی شریعت کھڑی کی۔

مرقیون سے سبق

پورے کلام کو اولیت دینا لازم ہے

جدید زمانے میں کئی آوازیں مرقیون کی تعریف میں بلند ہو گئی ہیں۔ کیونکہ انسان فطری طور پر کلامِ مقدّس کی ہر بات کو مشکل سے قبول کر سکتا ہے۔ بے شک اکثر لوگ ایسے حوالوں کو کاٹنے سے گریز کرتے ہیں جو اُن کے لئے ناگوار ہیں۔ زیادہ تر وہ اُنہیں صرف نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن مرقیون کی تعلیم ہمیں اِس سے آگاہ کرتی ہے کہ ہم کہاں تک پہنچ سکتے ہیں جب پورے کلامِ مقدّس کو اولیت نہیں دیتے۔

واحد خدا کا انسان کے ساتھ گہرا رشتہ ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ عرفانیت نے پرانے عہد نامے کی ایک بات چھیڑی جو مرقیون نے جاری رکھی۔ اُن کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ پرانے عہد نامے میں خدا انسان سے مطابقت رکھتا ہے۔ یوں اُسے غصہ آتا ہے، وہ غم و خوشی، دُکھ اور سکھ محسوس کرتا ہے، وہ غیور ہے بلکہ انتقام بھی لیتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اگر وہ قادرِ مطلق ہوتا تو وہ کیوں آدم اور حوا کو پہلے آزمائش میں پڑنے دیتا اور بعد میں اُنہیں باغِ عدن سے نکال دیتا؟

حقیقت میں اِن بدعتوں کا خدا کے بارے میں تصور کلام کی گواہی سے فرق ہے۔ عرفانیت اور مرقیون کی نظر میں خدا دنیا اور انسان سے بالکل الگ ہے۔ وہ انسان کے سے جذبات نہیں رکھتا۔ اگر ہم اِس قسم کی سوچ اپنائیں تو کبھی خدا کے بارے میں کلام کی تعلیم سمجھنے نہیں پائیں گے۔ کیونکہ کلام کے مطابق خدا کا انسان سے گہرا تعلق ہے، یوں نہیں کہ انسان میں ایک چنگاری مقید ہے جو ترقی کرتے کرتے الٰہی ذات کے آفتاب میں ڈوب جائے گی۔ ہرگز نہیں، بلکہ یوں کہ کائنات کے خالق نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ انسان کو سختی سے کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی صورت پر کوئی بھی چیز نہ بنائے، لیکن خود خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ مسیح میں یہ تعلق باپ اور بیٹے کا تعلق ہے۔ انسان کبھی نہیں خدا بنے گا یا پانی کے قطرے کی طرح الٰہی سمندر میں ڈوب جائے گا۔ خدا ہمیشہ ہی خالق اور انسان ہمیشہ ہی مخلوق رہے گا۔ تاہم اُن کا آپس میں گہرا رشتہ ہے، صورت اور فرزند کا۔

یہ ایک انوکھی اور سمجھ سے باہر بات ہے کہ قادرِ مطلق خدا یہ رشتہ قائم کر کے ہماری فکر کرتا ہے۔ اور اِسی فکر کی بنا پر وہ ٹھنڈا نہیں رہ سکتا جب ہماری غلط حرکتیں دیکھتا ہے۔ وہ ہماری بُرائیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا بلکہ ہمیں صحیح راہ پر لانا چاہتا ہے۔ باپ کی طرح وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کے فرزند رشتہ منقطع کریں۔ اِس ناتے سے کلامِ مقدّس ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت کی بنا پر جذبات جائز اور حق بجانب ہیں۔

پرانے اور نئے عہد نامے کا ایک ہی خدا ہے

کچھ ایمان داروں کا رجحان زیادہ تر نئے عہد نامے کی طرف ہے۔ لیکن اگر ہم نئے عہد نامے کی گہرائیوں میں جانا چاہیں تو لازم ہے کہ پرانے عہد نامے کا مطالعہ کریں۔ تب ہی ہمیں پتا چلے گا کہ دونوں عہدوں کی ایک ہی جڑ، ایک ہی سرچشمہ ہے۔

نیز، ہم پرانے عہد نامے کی تلاوت سے خدا کے کردار کے بارے میں بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔کس کا دل شکر اور تمجید سے لبریز نہیں ہوتا جب وہ خدا کی انسان کے لئے محبت دیکھتا، جب اُسے سمجھ آتی ہے کہ اسرائیل کتنی بار بھٹک گئی اور خدا اُسے کتنی دفعہ واپس کھینچ لایا۔ کون ہکا بکا نہیں رہتا جب اُسے پتا چلتا ہے کہ شریعت کا کیا مقصد ہے اور کہ مسیح میں وہ کس طرح تکمیل تک پہنچی۔ غرض، پرانے عہد نامے کو پڑھتے پڑھتے اُسے یقین آتا ہے کہ پورے کلام کا ایک ہی خدا ہے، کہ ہر حوالے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔

مُنطانس: روح القدس پر انتہا پسند زور

بدعتی یہودی مسیحیوں نے خدا باپ پر زور دے کر خدا بیٹے کو رد کیا جبکہ مرقیون نے خدا بیٹے پر زور دے کر خدا باپ کو رد کیا۔ اِن کے برعکس مُنطانس نے روح القدس کو اولیت دے کر خدا باپ اور بیٹے کو کم اہمیت دی۔ بے شک مُنطانس کا مقصد اچھا تھا، کیونکہ وہ روح القدس کی ہدایت کے تحت زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ یہ کوشش انتہا پسند حد تک لے گیا۔[30]

دوسری صدی کے وسط سے مُنطانس ایشیائے کوچک میں وجد کی حالت میں آ کر نبوّتیں پیش کرنے لگا۔ دو نبیہ بنام پرِسکا اور مکسِملہ[a] اُس کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ بہت ایمان دار اُن کے پیچھے ہو لئے، لیکن بہت سے اُن کے خلاف بھی ہوئے۔ ایک قابلِ اعتراض بات یہ تھی کہ وہ بت پرست پجاریوں کی طرح وجد میں آتے تھے۔ نیز، لگتا ہے کہ

Prisca and Maximilla[a]

مُنطانس یہ نہیں کہتا تھا کہ ''خدا فرماتا ہے'' بلکہ ''مَیں فرماتا ہوں۔'' مثلاً روایت کے مطابق وہ کہہ سکتا تھا، ''مَیں باپ، بیٹا اور فرقلیط ہوں'' اور ''مَیں خداوند خدا قادرِ مطلق ہوں جو انسان میں اتر آیا۔'' ایسی باتیں کفر لگتی تھیں۔

مُنطانس کی تعلیم کی کُنجی آخرت کا خیال ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آخرت قریب ہی ہے، اِس لئے ہمیں اِس کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ کس طرح ؟ اِس کے لئے روح القدس کی ہدایت رویاؤں، پیش گوئیوں، غیرزبانوں اور معجزوں کے ذریعے درکار ہے۔

روح القدس مُنطانس کے لئے مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ حقیقت میں اُس نے ابتدائی کلیسیا کے ایک پہلو پر زور دیا جو جائز تھا اور جو دوسری صدی عیسوی میں کافی حد تک دب گیا تھا۔ ابتدائی کلیسیا میں روح القدس کا کام رویاؤں، پیش گوئیوں، غیرزبانوں اور معجزوں سے ظاہر ہوا، اور یہ چیزیں دوسری صدی میں کم ہی ہو گئی تھیں۔

مُنطانیت تین باتوں پر زور دیتی ہے:

مُنطانی نبوتوں کو کلام پر ترجیح

مُنطانس کے پیروکار اُس کام کو کلام اور کلیسیائی رسم و رواج پر ترجیح دیتے تھے جو اُن کے نبی کرتے تھے۔ جو باتیں مُنطانیت کے نبی فرماتے تھے وہ کلام سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔

نظم و ضبط اور پرہیز گاری پر زور

ایمانداروں کی حالت مخصوص ہے۔ لہٰذا ایمان داروں کا فرض ہے کہ دوسروں سے الگ ہو کر نظم و ضبط اور پرہیز گاری کی زندگی گزاریں۔ مُنطانی اِس میں کافی سختی کرتے تھے۔ ایک وجہ کہ طرطُلیان نے مُنطانس کو قبول کیا یہ تھی کہ وہ عام کلیسیا کی ڈھیلی حالت سے تنگ آ گیا تھا۔

روح کے زمانے کی آمد

مُنطانیت کے مطابق پرانا عہد نامہ خدا باپ کا زمانہ اور نیا عہد نامہ خدا بیٹے کا زمانہ تھا۔ اب دوسری صدی میں روح القدس کا زمانہ آ گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اُس کے پیروکار سمجھتے تھے کہ ایشیائے کوچک میں تحریک کا مرکز نیا یروشلم ہے۔

مُنطانس سے سبق

مُنطانس میں ہمیں ایک سچائی نظر آتی ہے اور ایک خطرہ بھی۔ سچائی یہ ہے کہ جب ایمان دار روح القدس کا کام نظر انداز کرتے ہیں تو وہ فتح یاب زندگی نہیں گزار سکتے۔ مُنطانس دوسری صدی میں اِسی کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مُنطانی سنجیدگی سے فتح یاب زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اُن کے روح پر زور نے اُنہیں ڈھیلی اخلاقی زندگی سے آگاہ کر کے اُنہیں اچھی زندگی گزارنے کی تحریک دی۔

بے شک آج کی کلیسیا میں بھی رویاؤں، پیش گوئیوں اور معجزوں کے لئے جگہ ہونی چاہئے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہر بات اور کام کلام کے مطابق ہو۔ افسوس کہ مُنطانس کی کئی باتیں کلام کے خلاف لگتی ہیں۔ آج بھی جو کلیسیائیں پیش گوئیوں، معجزوں، غیر زبانوں اور رویاؤں پر حد سے زیادہ زور دیتی ہیں وہ اکثر کلام سے دُور ہونے کے خطرے میں ہیں۔ اُنہیں روحوں کو جانچنے کی خاص ضرورت ہے۔ کس طرح ؟ ہر بیان اور کام کلام کی تیز روشنی میں لانے سے۔

بدعت پر غلبہ : قدیم کلیسیا کے تین ستون

دوسری صدی کے وسط سے مسیحی اُمّت ختم ہونے کے خطرے میں تھی۔ باہر سے اُس کی سخت ایذا رسانی ہو رہی تھی جبکہ اندر سے لاتعداد بدعتیں اُسے ہر طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اِتنے فرقے بن گئے تھے کہ لگتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں ابتدائی ایمان کا چراغ بجھ جائے گا۔ اُس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ صحیح ایمان بدعتوں پر غالب آئے گا یا نہیں ۔ یوں ایمان داروں کا سخت دشمن قیلسُس بدعتوں اور صحیح ایمان

کے فرقوں میں امتیاز نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسیحی ایمان کا خاص نشان پارٹی بازی ہی ہے۔ اور واقعی خطرہ تھا کہ ہر ایک اپنی من مانی کے مطابق نجات کی تعلیم توڑ مروڑ کر چلے۔

ایمانداروں نے اپنے دفاع میں کیا کیا؟ اُنہوں نے تین ستون کھڑے کئے، جن کی بنیاد پر ایمان داروں کی اکثریت آج تک چلتی آئی ہے: مسلمہ الہامی صحیفوں کی تصدیق، ایمان کا عقیدہ اور کلیسیا کے منصب۔

کچھ آزاد خیالوں نے اِس بات کا منفی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ شروع میں ایمان داروں کا ایمان زیادہ صحیح اور آزاد تھا۔ اُن کے نزدیک گو شروع میں نہ کلیسیا کا کوئی منصب تھا، نہ کوئی عقیدہ، لیکن ہوتے ہوتے ایمان دار بے لچک ہو گئے، رفتہ رفتہ خوش خبری کی آزادی ختم ہو کر ایک نئی شریعت میں تبدیل ہو گئی، اور ساتھ ساتھ پادریت کا انتظام بھی قائم ہوا۔ ایسے عقیدے بھی وجود میں آئے جو ابتدائی کلیسیا کی آزادی سے مطابقت نہیں رکھتے۔

ایک حد تک یہ سچ بھی ہے۔ لیکن تحقیقات نے ہمیں کچھ اَور سکھایا ہے۔ آیئے ہم مذکورہ تین ستونوں پر غور کریں۔

نئے عہد نامے کی تصدیق

اگر عقیدہ ایمان کا نچوڑ ہے تو کلامِ مقدّس اُس کا دستاویزی ثبوت، اُس کی سند ہے۔ ابتدائی ایمان داروں کے نزدیک پرانا عہدنامہ خدا کا کلام تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اُنہوں نے مسیح کی زندگی اور تعلیم کے بارے میں روایات بھی محفوظ رکھیں۔ رسولوں کے کچھ خط بھی مقبولِ عام ہو گئے۔

لیکن کتابوں کا یہ مجموعہ کس طرح پاک کلام کا حصہ بن گیا؟ یہ سمجھنے کے لئے درکار ہے کہ ہم دوسری صدی کے ایمان داروں کا حال سمجھیں۔

تصدیق کی وجہ

ایمان دار ایمان رکھتے تھے کہ پرانا عہد نامہ خدا کا کلام ہے جس میں مسیح یسوع کے بارے میں وعدے کئے گئے ہیں۔ یہ وعدے مسیح میں پورے ہوئے، اِس لئے اُس کی زندگی اور موت کے واقعات تعلیمات سمیت محفوظ رکھنے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے چار اناجیل اور ساتھ ساتھ رسولوں کے ایسے خط محفوظ رکھے جو مسیح کے کام اور تعلیمات پر روشنی ڈالتے تھے۔ تاہم اُنہوں نے دوسری صدی کے آخر تک اُنہیں خدا کا کلام قرار نہ دیا۔ یہ نہیں کہ وہ اُن کے نزدیک مرکزی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی اہمیت اُن کے ذہن میں سراسر صاف تھی، کیونکہ وہ رسولوں کے دور سے محفوظ رکھے گئے تھے۔ ساتھ ساتھ اُنہیں پکا یقین تھا کہ یہ صحیفے پرانے عہد نامے کی باتوں کی تصدیق اور تکمیل کرتے ہیں۔ تو پھر اِن تصانیف کی تصدیق کرنے کی کیا وجہ تھی؟

جس ملک میں برف پڑتی ہے وہاں کسی کو منوانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ برف کیا چیز ہے۔ لیکن جہاں برف کبھی نہیں پڑتی وہاں تفصیل سے بیان کرنا پڑتا ہے کہ برف کی کیا کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔

یہی دوسری صدی کے ایمان داروں کا حال تھا۔ پہلے اُنہیں یہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اناجیل اور باقی صحیفے ایمان کا حصہ ہیں۔ پرانا عہد نامہ اُس مکان کی بنیاد اور دیواریں تھا جس کی چھت نیا عہد نامہ تھا۔ جسے ایک بار پورا مکان نظر آیا اُس نے کبھی نہیں انکار کیا کہ چھت مکان کا حصہ نہیں ہے، کہ نیا عہد نامہ الہامی نہیں ہے۔ دونوں چیزیں تانے بانے کی طرح ایک دوسری کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں۔

لیکن پھر بدعتوں کی طوفانی موجیں ایمان داروں پر دھاوا بولنے لگیں، اور ایمان داروں کو ایمان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تب وہ نئے عہد نامے کے مقبول صحیفوں کی فہرست تیار کرنے لگے۔

خاص کر مرقیون جیسے لوگوں کی حرکتوں نے کلیسیا کو یہ فہرست تیار کرنے پر مجبور کیا۔ مرقیون نے پرانے عہد نامے کو گھٹیا قسم کے خالق کی پیداوار قرار دیا تھا۔ لیکن اُس

نے نہ صرف پرانے عہد نامے کو رد کیا بلکہ نئے عہد نامے کی صحیفوں سے ایسی چیزیں نکال لیں جو اُسے ناپسند تھیں۔ اُس کے اِس عمل سے ابتدائی ایمان داروں کی یہ تعلیم خطرے میں آ گئی کہ مسیح اور اُس کا نجات بخش کام پرانے عہد نامے کی تکمیل ہے۔ اِسی حملے کے جواب میں ایمان دار مسلمہ صحیفوں کی فہرست تیار کرنے لگے۔

لیکن غور کریں کہ کس نے مسلمہ کتابوں کی فہرست تیار کی۔ کیا یہ کوئی بادشاہ یا خلیفہ تھا، کوئی بشپ یا پادری؟ ہرگز نہیں! حقیقت میں کسی بھی نام کا ذکر نہیں ہوا بلکہ یوں لگتا ہے کہ ایمان داروں میں کافی حد تک اتفاق تھا۔ کسی کے ہاتھ کی ضرورت نہیں تھی جو لوگوں کو یہ کتابیں قبول کرنے پر مجبور کرے۔

پہلی صدیوں کی آزادی اِس میں بھی نظر آتی ہے کہ کہیں یہ کوشش نظر نہیں آتی کہ ایک ہی مسودہ چن کر باقی سب کو جلا دے۔ ایمان داروں کو اِس کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ اُن کا ایمان پختہ تھا۔ چنانچہ آج تک اُس زمانے کے ہزاروں مسودے ملتے ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ جو تھوڑا تھوڑا فرق اُن میں پایا جاتا ہے وہ بھی یہی بات ثابت کرتا ہے کہ اگرچہ کسی نے سب کو ایک ہی مسودے کی نقل کرنے پر مجبور نہ کیا تاہم جو صحیفے آج ہمارے سامنے ہیں وہ مضبوط روایات کی بنیاد پر قلم بند ہوئے ہیں۔

200ء سے پہلے روم میں مرقوم مسودے کا جو پرزہ مُرتوروی پرزہ کہلاتا ہے ایسی فہرست کا پہلا ثبوت ہے۔ اِس سے پہلے بے شک ایرینئیُس اور پپیاس جیسے بزرگ اپنی تصانیف میں مختلف کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اُن میں فہرست کی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ مُرتوروی پرزے کی فہرست کافی حد تک موجودہ نئے عہد نامے سے ملتی جلتی ہے، اور وہ پہلی بار ایسی کتابیں رد کرتا ہے جو رسولوں کے زمانے میں قلم بند نہ ہوئیں، مثلاً ہرماس اور مختلف بدعتی کتابیں۔

پھر مشرق میں 367ء میں اثناسیُس آج کے تمام 27 کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد روم بھی اِس کی تصدیق کرتا ہے۔

عقیدے کے ساتھ نئے عہد نامے کی تشکیل و تصدیق ابتدائی کلیسیا کا سب سے عظیم کام ہے۔ اِس کا کیا نتیجہ نکلا؟

پرانے اور نئے عہد نامے کا معجزانہ اتفاق

ہم کہہ چکے ہیں کہ مسلمہ کتابوں کی فہرست بدعتوں کی مدافعت کے لئے تیار ہوئی۔ ایمان داروں نے یہ کتابیں نہ صرف تاریخی کتابوں کا حصہ بنا لیا بلکہ اُنہیں پرانے عہد نامے کے ساتھ جوڑ کر کلامِ مقدّس کا حصہ قرار دیا۔ اور جب ایسا ہوا تو ایک حقیقت زور سے اُبھر آئی جس نے مرقیون اور عرفانیت کی باتوں کو سراسر جھوٹ ثابت کر دیا: دونوں حصوں کی یگانگت سامنے آئی بلکہ اِس مضبوط اور متحد گواہی کی روشنی میں عرفانیت کی کہانیاں من گھڑت اور احمقانہ ثابت ہوئیں۔ بدعت کی دُھند کلام کی تیز روشنی میں اُڑ گئی۔

مکمل کلام کی دست یابی

شروع میں سب کے پاس نئے عہد نامے کی تمام سچائیاں دست یاب نہیں تھیں۔ اب وہ نئے عہد نامے کے خزانے سے ایمان کے ہر پہلو کے بارے میں سیکھ سکتے تھے۔

مختلف گواہوں کے منہ سے مسیح کا عظیم کردار

نئے عہد نامے نے یہ بات محفوظ رکھی کہ مختلف صحیفے مل کر مسیح کے کردار کی گواہی دیں۔ جو مسیح مرقس 18:10 میں فرماتا ہے کہ تُو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ وہی ہے جو یوحنا 46:8 میں کہتا ہے، ”کیا تم میں سے کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے؟“ پولس کا خداوند وہی ہے جو عبرانیوں کے خط میں سردار کاہن کا کردار رکھتا ہے۔ جو ۲۔کُرنتھیوں 9:12 میں پولس سے ہم کلام ہوا وہی ہے جو مکاشفہ 17:1 میں یوحنا رسول پر ظاہر ہوا۔ اِس کے علاوہ پرانا عہد نامہ بھی مسیح کے کردار پر روشنی ڈالتا

ہے۔ یوں مسلمہ صحیفوں کی فہرست سے ہمارے لئے ایسے مواد محفوظ رکھے گئے ہیں جن سے مسیح کا عظیم کردار مختلف پہلوؤں سے اور گہرائیوں تک روشن ہو جاتا ہے۔

کلام کی روشنی میں عقیدے کی طرف رجحان

مسلمہ کتابوں کی فہرست تیار کرنے کا مقصد وہ حقیقت دکھانا تھا جو مسیح میں ظاہر ہوئی۔ یہ دکھانا تھا کہ خدا نے دنیا کی ابتدا سے اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کر کے نجات کی راہ تیار کی، وہ راہ جو مسیح میں تکمیل تک پہنچی۔ عرفانیت اور دیگر بدعتوں کے برعکس یہ راہ حقیقت پر مبنی ہے، یہ نہ صرف من گھڑت کہانی یا خالی فلسفہ ہے۔

اب تک ایمان داروں کا زور اِس پر تھا کہ کلام حقیقت میں کیا کیا بیان کرتا ہے۔ لیکن اب سے ایمان دار اپنی یونانی سوچ کی روشنی میں اِس پر غور کرنے لگے کہ سچا ایمان کیا ہے؟ اب سے وہ پوری کوشش سے کلام کی روشنی میں عقیدے کے بارے میں سوچنے لگے۔

ایمان کا عقیدہ

آزاد خیالوں کی نظر میں دوسری صدی میں پادریوں نے اِنجیل کی سادہ سی سچائیوں سے دُور ہو کر ایمان کا ایسا عقیدہ تیار کر رکھا جس نے ایمان داروں کو ابتدائی کلیسیا کی آزادی سے محروم کر دیا۔ اور جن لوگوں کو ہر طرف سازشیں نظر آتی ہیں وہ ایسی نظریات سن کر خاص خوش ہو جاتے ہیں۔

لیکن دوسری صدی کی تصانیف کچھ اَور دکھاتی ہیں۔ تحقیقات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اُس زمانے کے ایمان داروں نے پرانے اور نئے عہدنامے پر مبنی ایمان کا خلاصہ اِس لئے لکھا کہ ایمان دار بدعتوں سے بچیں۔ یہ حقیقت مثال کے طور پر فرانس کے بزرگ ایرینئیُس اور افریقہ کے وکیل طرطُلیان کی کتابوں میں خوب نظر آتی ہے۔

بدعت اُس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان پورے کلام کا لحاظ نہیں کرتا بلکہ کچھ مبہم سے حوالجات نکال کر اِن کی بنا پر ایسا نظریہ کھڑا کرتا ہے جو کلام کی پوری گواہی

کے خلاف ہے۔ لٰہذا بزرگوں کی پوری کوشش یہ دکھانا تھی کہ کلام کی روشنی میں ایمان کا خلاصہ کیا ہے، کیا کیا باتیں صحیح ایمان کے اصول اور بنیاد کہلاتی ہیں۔

ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ پادریوں کے سازشی گروہ نے مل کر ابتدائی تعلیمات کی کانٹ چھانٹ کرکے کوئی عقیدہ تیار کر رکھا جو اُن کی مرضی کے مطابق ہو۔ پہلے تو ایسا کوئی گروہ تھا نہیں۔ دوسرے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایک ہی عقیدہ وجود میں آیا بلکہ مختلف بزرگوں نے مختلف جگہوں پر ایمان کا خلاصہ قلم بند کیا۔ اور تیسرے، یہ عقیدے کلام سے ہٹ کر نہیں بلکہ کلام کی بنیاد پر قائم ہوئے۔

عرفانیت کے ساتھ جنگ میں ہم عقیدے کا فائدہ خوب جانچ سکتے ہیں۔ اِس کے وسیلے سے بزرگوں نے دکھایا کہ پورے کلام کی ایک ہی گواہی، ایک ہی مقصد اور ایک ہی ایمان ہے۔ کائنات کلام کے مطابق ایک اچھی چیز ہے، ایسی چیز نہیں جس سے آزاد ہونا چاہئے۔ واحد خدا ہے جس کا منصوبہ اچھا ہے، اور کہیں نظر نہیں آتا کہ گھٹیا قسم کے بُرے دیوتا نے دنیا کو خلق کیا۔ نیز، کلام کی روشنی میں مسیح واقعی مجسم اور مصلوب ہوا۔ اِسی بنیاد پر ہمیں نجات ملتی ہے۔ غرض، اُنہوں نے صاف ظاہر کیا کہ عرفانیت کلام کو صرف توڑ مروڑ کر استعمال کر سکتی ہے۔ جو کلام کی پوری گواہی پر دھیان دے اُسے جلد ہی بدعت کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔

یہی طریقہ ہر زمانے میں صحیح ایمان کی کسوٹی رہا ہے۔ ہم بھی اگر ایمان میں ترقی کرنا چاہیں تو لازم ہے کہ کلام کی پوری گواہی کے مطابق چلیں۔ اِس میں پہلے ایمان داروں کے عقیدے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں صحیح ایمان کی بنیادی باتوں کی یاد دلاتے ہیں۔

دوسری صدی کے عقیدے کیسے تھے؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ کوئی نئی بات پیش نہیں کرنا چاہتے بلکہ مختصر طور پر وہ کچھ جو ابتدا سے ہی سکھایا گیا ہے۔ درجِ ذیل کی مثال یہ بات ثابت کرتی ہے۔

عقیدے کی ایک مثال

بدعتوں کے خلاف اپنی تصنیف میں ایرینئیُس فرماتا ہے،

> گو کلیسیا ہماری پوری دنیا میں انتہاؤں تک بکھری ہوئی ہے لیکن اُس نے رسولوں اور اُن کے شاگردوں سے یہ ایمان پایا ہے:
>
> وہ اُس واحد خدا اور قادرِ مطلق باپ پر ایمان رکھتی ہے جس نے آسمان و زمین، سمندر اور جو کچھ اُن میں ہے خلق کیا۔
>
> نیز، وہ اُس واحد مسیح یسوع پر ایمان رکھتی ہے جو خدا کا فرزند ہے اور ہماری نجات کی خاطر انسان بنا۔
>
> نیز، وہ اُس مقدّس روح پر ایمان رکھتی ہے جس نے انبیا کے وسیلے سے خدا کے منصوبوں اور آمدوں کا اعلان کیا۔ اُسی نے اُن کی معرفت فرمایا کہ مسیح آئے گا، کنواری سے پیدا ہوگا، دُکھ سہے گا اور مُردوں میں سے جی اُٹھے گا۔ اُسی نے اُن کی معرفت ظاہر کیا کہ خدا کا پیارا مسیح یسوع جو ہمارا خداوند ہے جسم سمیت آسمان پر اُٹھایا جائے گا، جہاں سے وہ تمام کائنات کو جمع کرنے اور تمام انسانوں کو زندہ کرنے کے لئے باپ کے جلال کے ساتھ واپس آئے گا تاکہ ہر گھٹنا اَن دیکھے باپ کی مرضی کے مطابق مسیح یسوع ہمارے خداوند خدا، نجات دہندہ اور بادشاہ کے سامنے جھکے، خواہ وہ گھٹنا آسمان پر، زمین پر یا اِس کے نیچے ہو، اور تاکہ ہر زبان تسلیم کرے کہ وہ خداوند ہے اور وہ سب کی مناسب عدالت کرے۔
>
> وہ شیطانی روحوں، خدا کے احکام کو توڑنے والے باغی فرشتوں، بے دینوں، ناانصافوں، ناراستوں اور توہین کرنے والوں کو کبھی نہ بجھنے والی آگ میں بھیجے گا، لیکن راست بازوں اور مقدّسوں کو جو اُس کے احکام پر چلتے اور اُس کی محبت میں زندگی گزارتے آئے ہیں، خواہ شروع

> سے خواہ توبہ کرتے وقت سے، اُنہیں وہ اپنے فضل کے مطابق لافانی زندگی اور ابدی جلال مہیا کرے گا۔[31]

گو یہ عقیدہ کسی مجلس میں نہیں لکھا گیا، لیکن یہ اُن عقیدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بعد میں بین الاقوامی مجلسوں میں وجود میں آئے اور جو آج تک ایمان داروں کی اکثریت سے مانے جاتے ہیں۔

ایمان کی بنیادی باتیں پیش کرنے کا ایک گہرا مقصد ہے۔ ایرینئیُس کہنا چاہتا ہے کہ یہ تمام باتیں ہمارے ایمان میں شامل ہیں، اور ہم اِن میں سے ایک کو بھی نہیں رد کر سکتے۔ جو سچائی کی اِن تمام باتوں میں سے ایک بھی قبول نہ کرے وہ بدعت کی طرف جا چکا ہے۔ یہی ایمان کا لبِ لباب ہے جس کی کسوٹی پر ہم ہر بات جانچ سکتے ہیں۔

کلیسیا کے منصب

بدعتوں کے خلاف تیسرا ستون بشپ کا نظام تھا۔ آج تک یہ قائلیت پائی جاتی ہے کہ ابتدائی کلیسیا پوری آزادی سے اور منصب کے بغیر چلتی تھی جبکہ دوسری صدی میں یہ آزادی پادریت کی قید میں آ گئی۔ اب سے مسیح کی جگہ کلیسیا زیادہ اہم ہو گئی، اب سے بشپ اہم کردار ادا کرتے، ہاں کلیسیا ماں کی حیثیت اپنا کر نجات کا واحد وسیلہ بن گئی ہے۔ یوں سب کچھ منصب داروں کے کنٹرول میں آ گیا ہے۔

لیکن یہ خیال حد سے زیادہ منفی ہے۔ بشپوں کے نظام کا مقصد کلیسیا کو مضبوط کرنا تھا۔ جب مختلف قسم کی بدعتیں ایمان داروں پر حملہ کر رہی تھیں تو بشپ اِس کا ضامن تھا کہ کلیسیا خدا کے راستے پر چلتی رہے۔

یہ معاملہ بہتر سمجھنے کے لئے آیئے ہم بشپ کے نظام کے ایک خاص نمائندے پر غور کریں۔

قبریانس: بشپ کی زیرِ نگرانی یگانگت

تیسری صدی کا بزرگ قبریانس (وفات قریباً 258ء) پوری لگن کے ساتھ بشپ کے نظام کو بڑھانا چاہتا ہے۔ اُس کا یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ جس کی ماں کلیسیا نہیں اُس کا باپ خدا نہیں ہو سکتا۔[32] قبریانس نے یہ بھی فرمایا کہ کلیسیا سے باہر نجات نہیں ملتی۔[33]

ایسے بیانات سے وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ ابتدائی ایمان داروں کے نزدیک تو کلیسیا وہاں تھی جہاں مسیح اُن کے درمیان تھا۔ کیونکہ مسیح نے فرمایا تھا، ”جہاں بھی دو یا تین افراد میرے نام میں جمع ہو جائیں وہاں مَیں اُن کے درمیان ہوں گا۔“[a] یوں مقامی جماعتیں ایک آسمانی حقیقت کا اظہار ہیں۔ قبریانس کے مخالف اپنے دفاع میں یہی حوالہ پیش کرتے تھے۔ قبریانس اِس کا انکار نہیں کرتا لیکن جواب میں کہتا ہے کہ مسیح کا زور اتفاق پر ہے۔ کیونکہ آیت 19 میں مسیح فرماتا ہے، ”اگر تم میں سے دو شخص کسی بات کو مانگنے پر متفق ہو جائیں تو میرا آسمانی باپ تم کو بخشے گا۔“[34]

چنانچہ اتفاق کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن اتفاق کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ قبریانس کے نزدیک بشپ جماعت کا نمائندہ ہے، اِس لئے لازم ہے کہ ایمان دار اُس کے تحت ہو کر کلیسیا کے ساتھ ایک ہو جائے۔ یعنی اتفاق اور یگانگت صرف بشپ کے تابع رہنے میں پائی جاتی ہے۔[35] پطرس اِس کا اچھا نمونہ ہے۔ جو اختیار اُسے دیا گیا[b] وہ ہر بشپ کو حاصل ہے۔[36]

غرض قبریانس کے نزدیک جہاں بشپ ہے وہاں جماعت ہے۔ اور چونکہ بشپ کلیسیا کا نمائندہ ہے اِس لئے اُسی کے ہاتھوں نجات ملتی ہے لہٰذا کلیسیا سے باہر نجات نہیں ملتی۔ بپتسمہ اور عشائے ربانی اُسی کے ہاتھوں دینی ہے۔ بشپ وہی بنیاد ہے جس پر کلیسیا تعمیر ہوتی ہے۔ اُس کی ذمہ داری مروجہ ایمان اور کلیسیائی فرائض کی حفاظت ہے۔

---

[a] متی 20:18
[b] متی 18:18؛ یوحنا 17:21

بشپوں کی آپس میں یگانگت ایک معجزہ ہے جو روح القدس قائم رکھتا ہے اور جو کلیسیا کی آسمانی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔[37]

یاد رہے کہ قبریانس اِس حق میں نہیں ہے کہ پاپائے روم اول درجہ رکھے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام بشپ مل کر کلیسیا کی قیادت کرتے ہیں۔

اِس تعلیم کا عام ایمان دار کے لئے کیا نتیجہ نکلا؟ اگرچہ قبریانس اب تک یہ بات مانتا ہے کہ کلیسیا حقیقت میں آسمانی ہے تاہم اُس کے خیالات کلیسیا کی ظاہری شکل پر زور دیتے ہیں۔ اب سے جو شخص نجات ملنا چاہے لازم ہے کہ وہ ظاہری کلیسیا کے وسیلے سے یہ کام کروائے، کہ وہ بشپ کے تابع ہو جائے۔ کیونکہ وہی کلیسیا کا نمائندہ اور نجات کا وسیلہ ہے۔ اُسی میں کلیسیا ظاہر ہوتا ہے۔ اب سے یہ بات دب جاتی ہے کہ جہاں بھی دو یا تین افراد مسیح کے نام میں جمع ہو جائیں وہاں مسیح اُن کے درمیان ہو گا۔ اِس کی جگہ یہ بات آ گئی ہے کہ جہاں بھی بشپ ہے وہاں کلیسیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ مسیحی بشپ سے علیٰحدہ ہو کر عبادت کریں۔ جو کلیسیائی رفاقت میں شریک نہیں ہوتے اُنہیں نجات نہیں ملتی۔ بات ختم! چنانچہ قبریانس کہہ سکتا ہے کہ جو شاخ درخت سے الگ ہو جائے اُسے رس نہیں ملتا۔[38]

قبریانس سے سبق

غرض جو رجحان اِغناطسیوس میں پایا جاتا ہے اُس کا زور قبریانس کے زمانے میں کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ تاہم یہ کہنا کہ بشپوں اور منصب داروں کے ''قبضہ گروپ'' نے ایمان داروں کو ایک طرح کے قید خانے میں ڈال دیا حد سے زیادہ منفی ہے۔ قبریانس مشکل ترین حالات کا سامنا کر رہا تھا، اور بشپ کے نظام کا مقصد بے شک اچھا تھا۔ صحیح تعلیم، عبادت اور یگانگت پر زور قابلِ تعریف تھا۔

قبریانس بشپ کے نظام پر اِتنا زور کیوں دیتا ہے؟ ایک وجہ کلیسیا کی حالت ہو گی جس میں کئی قسم کے لوگ آ گئے تھے۔ ابتدائی کلیسیا کی جماعتیں نہیں رہی تھیں جن

میں اکثر ایمان دار سنجیدہ تھے۔ لٰہذا قبریانس پورا زور بشپ پر دیتا ہے تاکہ کم از کم کلیسیا کا مرکزی حصہ یعنی تعلیم اور عبادت پاک صاف رہے۔

دوسرے، سخت ایذا رسانیوں کے باعث جماعتوں میں افرا تفری مچ گئی تھی۔ بے شمار لوگوں نے ایذا رسانی کے دوران اپنا ایمان رد کیا تھا اور اب دوبارہ کلیسیا کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ سوال اُٹھا کہ کیا اِنہیں دوبارہ قبول کرنا چاہئے، اور اگر قبول کریں تو کس طرح ؟ اِس صورتِ حال میں لازم تھا کہ کم از کم بشپ مل کر جماعتوں میں دوبارہ صحیح تعلیم اور عبادت قائم کریں۔

ساتھ ساتھ یہی معاملہ پارٹی بازی کا باعث بن گیا تھا۔ جب اُن لوگوں کو معاف کیا گیا جنہوں نے ایذا رسانی کے وقت اپنے ایمان کا انکار کیا تھا لیکن اب معافی مانگ رہے تھے تو کچھ لوگ کلیسیا سے جدا ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں کو معافی حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ قبریانس جواب میں فرماتا ہے کہ کلیسیا نجات کا واحد وسیلہ ہے، یوں ہم سے جدا ہونا غلط ہے۔

گو یہ تعلیم نئے عہدنامے سے دُور ہو گئی ہے لیکن قبریانس کی باتوں میں سچائی بھی پائی جاتی ہے۔ جو حد سے زیادہ متی 18 : 20 پر زور دے کر دوسرے مسیحیوں سے الگ ہو جائے اُس کی کلیسیا کے بارے میں سوچ ناقص ہے۔ جو سوچے کہ مَیں دیگر مسیحیوں سے الگ رہ کر ایمان رکھ سکتا ہوں اُس کا ایمان ہمیشہ کمزور رہے گا۔ ہر ایمان دار کو کسی جماعت کا ممبر ہونا چاہئے۔ مسیحی رفاقت ہماری تربیت، تقویت اور جواب دہی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ ایمان داروں کی ہر نسل کو یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا ایسا نظام مفید یا نقصان دہ ہے؟ اگرچہ کلیسیا نے اُس وقت اِس نظام کی ضرورت محسوس کی، لیکن کیا آج اِس کی ضرورت ہے؟ یا کیا اِس میں تبدیلی آنی چاہئے؟ جو بھی فیصلہ لوگ کریں، کلام ہمیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ ابتدا میں یہ نظام نہیں تھا اور کہ جو بھی منصب ہو سب مسیح میں بھائی اور بہنیں ہیں۔

باب 11

باپ، بیٹے اور روح کی کیا حیثیت ہے؟ عقیدۂ تثلیث کی تشکیل

تثلیث کا خیال کلامِ مقدّس میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اب لوگ اُسے واضح اور جامع طور پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ یہ سلسلہ عرفانیت کے مخالفوں سے شروع ہوا اور عقیدۂ نقایہ میں تکمیل تک پہنچ گیا۔

عرفانیت کے جواب میں علم الٰہیات کا آغاز

دوسری صدی میں عرفانیت کا طوفانی سیلاب ایمان داروں پر پھوٹ پڑا، اور کافی دیر تک خطرہ تھا کہ کلیسیا اُس کی زد میں آ کر ڈوب جائے۔ لیکن عین وقت پر کلیسیا کے

دو پہلوانوں نے کھڑے ہو کر اِن کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا۔ اُن کے نام ایرینئیُس اور طرطُلیان تھے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ دلیلیوں میں علمِ الٰہیات کا آغاز پایا جاتا ہے۔ لیکن دلیلی زیادہ تر بُت پرستوں سے مخاطب ہو کر اپنے ایمان کی مدافعت کرتے ہیں۔ اِس لئے اُن کی کتابوں کا رنگ کلیسیائی نہیں ہے، بلکہ خود وہ اپنے آپ کو مسیحی فلاسفر سمجھتے ہیں۔

عرفانیت کے مخالف ایرینئیُس اور طرطُلیان علمِ الٰہیات کا یہ آغاز بہت آگے تک لے جاتے ہیں۔ وہی صحیح طور پر علمِ الٰہیات کے بانی ہیں، کیونکہ وہ ایمان کے اصولوں کو با ترتیب اور جامع صورت میں پیش کرتے ہیں۔ بعد کی مغربی کلیسیا اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتی ہے۔ طرطُلیان کی کئی اصطلاحات اور قول آج تک مشہور ہیں جبکہ نجات کی راہ کے بارے میں جو خیالات ایرینئیُس نے بیان کئے وہ حال کی کلیسیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔

دلیلیوں کے برعکس عرفانیت کے مخالف بزرگ غیر مسیحیوں سے کم اور ایمان داروں سے زیادہ مخاطب ہوتے ہیں۔[a] اُنہی کو وہ اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کلیسیا عرفانیت کی تعلیم کے باعث اندر سے کھوکھلی ہو جانے کے خطرے میں ہے۔ لٰہذا لازم ہے کہ اُس کے ممبر صاف طور پر اپنے ایمان کے اصول جانیں۔ کیا عجب کہ یہ بزرگ ایمان کا عقیدہ تیار کرنے پر خاص دھیان دیتے تھے۔ کیونکہ عقیدے میں جامع صورت میں ایمان کے اصول پائے جاتے ہیں۔ اُسے یاد کرنے سے عام ایمان دار ہر وقت ایمان کی کسوٹی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے۔

اب تک کلیسیا نے علمِ الٰہیات کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، کیونکہ کلام کا سادہ سا بیان اُس کے لئے کافی تھا۔ لیکن جب عرفانیت نے اُس پر حملہ کیا تو لگتا ہے کہ اُس نے کلیسیا کو علمِ الٰہیات کا ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ خود عرفانی

---

[a] بے شک ایک طرح سے طرطُلیان دلیلی بھی ہے، کیونکہ وہ بت پرستوں کے سامنے ایمان کی مدافعت بھی کرتا اور ساتھ ساتھ عرفانیت کی بھی مخالفت کرتا ہے۔

اپنے خیالات باترتیب اور بڑے بڑے نظاموں کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ کلام کے سادے سے ایمان کی نسبت یہ زیادہ دل کش اور معقول لگتے تھے، کیونکہ یہ وعدہ کرتے تھے، ''ہم گہرے بھیدوں کی کُنجی رکھتے ہیں، ہم آپ کو تفصیل سے نجات کا پورا راستہ بتاتے ہیں۔ جہاں کلامِ مقدّس خاموش رہتا ہے وہاں بھی ہم بہت کچھ کا انکشاف کرتے ہیں۔ ہماری کہانیوں اور نظریات کا پورا نظام دیکھ کر آپ قائل ہو جائیں گے کہ ہم سچے ہیں۔''

آج کی نظر سے ہم سمجھتے ہیں کہ عرفانیت غیرمعمولی تھی جبکہ کلیسیا کا ردِعمل معمولی اور عام تھا۔ لیکن حقیقی صورتِ حال اِس کے اُلٹ تھی۔ عرفانی راستہ اُس زمانے میں عام اور معمولی تھا۔ وہی معقول اور مناسب لگتا تھا جبکہ ایرینیُس اور طرطُلیان کے سے جواب نئے اور غیرمعمولی تھے۔ عرفانی ایک چھوٹے سے گروہ پر محدود نہیں تھے بلکہ وہ زبردست تحریک کی صورت میں کلیسیا پر ٹوٹ پڑے، اُن کے حملوں کے تحت کلیسیا کے بند ہر طرف ٹوٹنے کو تھے۔ لہٰذا علمِ الٰہیات کی اشد ضرورت تھی۔ اِس کوشش کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تثلیث کے عقیدے کو بھی فروغ دیا گیا۔

تاہم اِن بزرگوں نے اِس پر دھیان دیا کہ عرفانیت کے جواب میں اُس کے طور طریقے استعمال نہ کریں۔ اُنہوں نے مروجہ ایمان سے 'برتر' عرفان پیش کرنے سے گریز کیا اور اپنے خیالات مروجہ ایمان پر محدود رکھے۔ صرف کلام اُن کی کسوٹی تھی۔ وہ اِس سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں تھے، گو وہ جانتے تھے کہ یہ موت تک جنگ ہے۔ یا تو ہم جیتیں گے یا کلیسیا ختم ہو جائے گی۔

ایرینیُس ازلیوں: ایمان کی بہ تدریج راہ

ایرینیُس (وفات قریباً 202ء) ایشیائے کوچک کے شہر سمُرنہ (ازمیر) میں پیدا ہوا، لیکن وہ جنوبی فرانس میں بشپ بنا۔ ایرینیُس پالِکارپ سے واقف تھا۔ گو وہ فرانس میں

رہتا تھا اُس کی مادری زبان اور سوچ یونانی تھی۔ اُس نے پانچ جلدوں پر مشتمل تصنیف بنام ''بدعتوں کے خلاف''[a] میں عرفانیت کے مختلف گروہوں کا سامنا کیا۔

ایرینئیُس نے کس طرح مسیحی ایمان کی مدافعت کی؟ اُس کے طریقے سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ایمان حقیقت پر مبنی ہے

عرفانیت کی کہانیاں فرضی ہیں، ایسی باتیں جو نہ تاریخی ہیں نہ کبھی سرانجام ہوئیں۔ اِس لئے ایرینئیُس اُنہیں غلط قرار دیتا ہے۔ اِس کے برعکس کلامِ مقدّس حقیقی اور سچا ہے۔ جو کچھ اُس میں قلم بند ہوا ہے وہ فرضی نہیں بلکہ واقعی سرانجام ہوا ہے۔ لٰہذا جو بات کلام پر مبنی ہوتی ہے وہ سچی ہے۔ مسیحی ایمان اِس لئے صحیح ہے کہ وہ سچی باتوں پر مبنی ہوتا ہے۔[1]

آج ہمیں یہ بات فطری اور معمولی سی لگتی ہے کہ مسیحی اپنی باتیں کلام کی بنیاد پر رکھے۔ لیکن یاد رہے کہ ہماری سوچ ایرینئیُس جیسے بزرگوں کے اصرار کا نتیجہ ہے۔ عرفانیت کے عروج پر یہ بات اِتنی فطری اور مقبولِ عام نہیں تھی۔

انسان اپنی عقل سے خدا کا کلام سمجھ سکتا ہے

عرفانیت کا ایک مرکزی خیال یہ تھا کہ انسان کی عقل ناقص ہے، اور لازم ہے کہ عرفان کے ماہر عرفانیت کے بھید کھولیں۔ اِس کے برعکس ایرینئیُس دکھاتا ہے کہ جو باتیں خدا نے اپنے کلام میں ظاہر کی ہیں اُنہیں انسان اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے۔ بے شک ایسے حوالجات پائے جاتے ہیں جن کا مطلب صاف نہیں ہے، لیکن اُن کا مطلب کلام سے ہٹ کر نہیں کھولنا چاہئے بلکہ کلام کے صاف حوالجات کی روشنی میں پڑھنا ہے۔ نیز، کلام میں ایمان کی مرکزی باتیں سب کے سب واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اِس ناتے سے ایرینئیُس کلام کی لفظی تفسیر کو اُس کی مجازی تفسیر پر ترجیح دیتا ہے۔[2]

[a] لفظی ''نام نہاد عرفان کی غلطی کا انکشاف اور شکست''

خدا انسان کے قریب ہی رہتا ہے

عرفانیت اپنی کہانیوں سے یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ الٰہی ذات کا کائنات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ مادی دنیا سے نہایت دُور اور الگ رہتی ہے۔

ایرینئیُس یہ خیال آسانی سے رد کر سکتا ہے، کیونکہ یہ کلام کے سراسر خلاف ہے۔ کلام میں الٰہی ذات کی دنیا اور کائنات سے قربت خوب چمک اُٹھتی ہے، بلکہ گناہ کرتے وقت اور بسترِ مرگ پر بھی انسان اپنے خدا کے قریب رہتا ہے۔[3] کلام کی سچائی کی بنا پر خدا کی قربت کا عروج اُس وقت ہوا جب خدا بیٹا انسان بنا۔[4]

کلام کی سچی باتوں کی روشنی میں یہ عرفانی دعویٰ کہ پرانے عہدنامے کا خدا گھٹیا قسم کا دیوتا ہے جھوٹ نکلتا ہے۔ اِس کے برعکس خدا خالق کی ذات سے ہی مسیح یسوع کی صورت نکلتی ہے۔ ہاں، کائنات کا نظام نجات کا نظام ہے اور خدا کی انسان کے ساتھ راہ نجات کی راہ ہے۔ غرض خدا خالق کا کام اور نجات کا کام فرق چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں۔ دونوں واحد خدا کے کام ہیں۔

کلام میں نجات کی بہ تدریج راہ پیش کی گئی ہے

عرفانیت کا کہنا تھا کہ پرانے اور نئے عہدنامے کے خدا فرق ہیں۔ اُن کے کام بالکل فرق ہیں۔ جو کام خالق کرتا ہے وہ اُس کام سے جو مسیح میں ہوتا ہے سراسر فرق ہے۔

ایرینئیُس فرماتا ہے کہ نہیں، پرانے اور نئے عہدنامے کا ایک ہی خدا ہے۔ لیکن کس طرح؟ کیا خدا کے یہ مختلف کام ایک دوسرے کے خلاف نہیں لگتے؟ کیا جو خدا مسیح میں ظاہر ہوتا ہے وہ پرانے عہدنامے کی شریعت کے خدا سے فرق نہیں لگتا؟

جواب میں ایرینئیُس ایک بات بیان کرتا ہے جو آج تک ٹھوس اور مناسب ثابت ہوئی ہے۔ وہ نجات کی بہ تدریج راہ کا خیال پیش کرتا ہے۔ نجات کی بہ تدریج راہ کا کیا مطلب ہے؟ ایرینئیُس کے نزدیک خدا کے مختلف پہلو اور کام اِس لئے نظر آتے ہیں کہ نجات کی راہ بہ تدریج ہے۔ بے شک کلام میں خدا کے مختلف پہلو اور کام نظر

آتے ہیں، لیکن اِن کے پیچھے ایک ہی خدا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خدا نے اپنی ذات اور نجات کی پوری راہ ایک ہی وقت انسان پر ظاہر نہ کی بلکہ درجہ بہ درجہ۔ نجات کی راہ ایک سلسلہ ہے، جس میں مختلف مرحلوں پر مختلف باتیں سکھائی گئی ہیں۔ مختلف مرحلوں کا یہ سلسلہ انسان کی تربیت کے لئے ضروری تھا۔ اِن مرحلوں کی نشان دہی خدا کے انسان کے ساتھ عہدوں سے ہوتی ہے، مثلاً آدم، نوح اور اسرائیل کے ساتھ عہدوں سے۔ مسیح کی صلیبی موت اِن عہدوں کا عروج اور تکمیل ہے۔ یہ خدا کا انسان کے ساتھ آخری اور حتمی عہد ہے۔[5]

ایرینئیُس کا پورا دھیان اِس پر ہے کہ بیٹا ازل سے ہی باپ کے ساتھ کارفرما ہے،[6] کہ نجات کی یہ تدریج راہ سے دونوں ہی کا انکشاف ہوا۔[7] اِس میں وہ دلیلیوں سے فرق ہے۔ کیونکہ دلیلیوں کا زور اِس پر ہے کہ خدا بیٹا باپ سے صادر ہونے کے بعد ہی دنیا میں کارفرما ہوا جبکہ ایرینئیُس کا زور اِس پر ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں ہی ازل سے ایک ہیں اور دونوں ہی ازل سے کارفرما ہیں۔ اِس میں اُس نے ایک اہم روحانی پہلو پر توجہ دلائی۔

خدا باپ نے نجات کی یہ تدریج راہ میں اپنے آپ کو بیٹے اور روح القدس کے وسیلے سے ظاہر کیا۔[8] چنانچہ مصنف کہہ سکتا ہے کہ خدا بیٹے نے تخلیق کرتے وقت باپ کو ظاہر کیا،[9] لیکن یہ بھی کہ باپ نے اپنے آپ کو بیٹے کے ذریعے فرشتوں، اسرائیل کے باپ دادا اور نبیوں پر ظاہر کیا۔[10] نجات کی راہ کا عروج اُس وقت ہوا جب خدا کا کلام مجسم ہوا۔[11] اِس ناتے سے مسیح خدا کا ظاہری پہلو ہے۔ ایرینئیُس کے اِس خیال میں ہم تثلیث کے عقیدے کی ایک جڑ پاتے ہیں۔ اِس سے بڑھ کر اِن خیالات میں ایرینئیُس اثناسیُس کا استاد ثابت ہوتا ہے۔

مسیح میں پہلا آدم بحال ہو گیا ہے (خلاصہ)

عرفانیت نے دنیا کی تخلیق اور نجات کی راہ کو لاتعلق کر دیا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جواب میں ایرینئیُس پوچھتا ہے کہ خدا مسیح میں انسان کیوں بنا؟

پیدائش کے پہلے باب میں لکھا ہے،

> خدا نے کہا، ”آؤ اب ہم انسان کو اپنی صورت پر بنائیں، وہ ہم سے مشابہت رکھے۔ وہ تمام جانوروں پر حکومت کرے، سمندر کی مچھلیوں پر، ہَوا کے پرندوں پر، مویشیوں پر، جنگلی جانوروں پر اور زمین پر کے تمام رینگنے والے جانداروں پر۔“ یوں خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا، خدا کی صورت پر۔ اُس نے اُنہیں مرد اور عورت بنایا۔[a]

ایرینئیُس درجِ بالا حوالے کی بنا پر فرماتا ہے کہ انسان کو خدا کی صورت پر بنایا گیا، بلکہ اُسے آزاد مرضی بخشی گئی تاکہ مزید خدا کی مانند بنتا جائے۔[12] لیکن گناہ میں گرنے کے باعث یہ صورت بگڑ گئی ہے۔ اب سے انسان خدا سے مشابہت نہیں رکھ سکتا، کیونکہ وہ گناہ اور موت کی زد میں آ گیا ہے۔ تو بھی خدا نے نجات کی بہ تدریج راہ کے ذریعے اپنا انسان کے لئے مقصد پورا کیا۔ مسیح کے وسیلے سے اُس نے انسان کی بگڑی ہوئی صورت بحال کر کے تکمیل تک پہنچائی۔ کس طرح ؟ اِس سے کہ خدا کا کلام (لوگوس) انسان بن گیا۔ جس میں پہلا آدم ناکام رہا اُس میں مسیح انسان بن کر کامیاب ہوا۔ پہلا آدم بگڑا ہوا تھا، لیکن یہ دوسرا آدم کامل ہے۔ اِس لئے وہ پہلے آدم کی بگڑی ہوئی صورت بحال کر کے اُسے تکمیل تک پہنچانے کے قابل تھا۔[13] اب انسان روح القدس کے ذریعے خدا سے مشابہت رکھ سکتا ہے۔[14]

---

[a] پیدائش 1:26-27

ایرینئیُس صاف دکھاتا ہے کہ خدا بیٹے کا مجسم ہونا انسان کی نجات کے لئے لازم تھا۔ کیونکہ مسیح صرف حقیقی انسان کی حیثیت سے ابلیس کے انسان پر قابو پر غالب آ سکتا اور صرف حقیقی خدا کی حیثیت سے فانی انسان کو لافانی زندگی کی طرف لے جا سکتا تھا۔[15] یوں ایرینئیُس عرفانیت کا منہ بند کر کے دکھاتا ہے کہ تخلیق اور نجات کے پیچھے دو مخالف الٰہی طاقتیں نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک ہی خدا کے کام ہیں۔ یہ خدا اپنے آپ اور نجات کی راہ کو بہ تدریج انسان پر ظاہر کرتا آیا ہے۔ دوسرے آدم کی معرفت اُس نے انسان کی بگڑی ہوئی صورت بحال کر کے اُسے تکمیل تک پہنچائی۔

خلاصے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات جامع اور مکمل طور پر دہرائی جائے۔ درجِ بالا تعلیم کو اِس لئے خلاصے کی تعلیم[a] کہا جاتا ہے کہ خدا انسان کی تخلیق دہرا کر مسیح میں اُس کی جامع اور مکمل شکل وجود میں لایا۔ یعنی دوسرے آدم مسیح میں پہلے آدم کی صورت کو دوبارہ قائم کر کے تکمیل تک پہنچائی گئی۔[16]

ایرینئیُس سے سبق

ایرینئیُس کی مذکورہ باتیں ہمارے لئے بھی مرکزی اہمیت رکھتی ہیں۔

ایمان کی بنیاد کلام ہی ہے

ایمان کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہونی چاہئے۔ اور حقیقت کا منبع کلام ہی ہے۔ شاید ملکِ پاکستان میں کم ہی لوگ کلام کے خلاف بات کریں۔ تاہم خطرہ ہے کہ کچھ باتیں ایمان کا حصہ بن جائیں جو کلام پر مبنی نہیں ہوتیں۔ جب بھی کوئی دعویٰ کرے کہ خدا نے مجھے فلاں فلاں بات دکھائی ہے تو ہر ایمان دار کا فرض ہے کہ کلام کی روشنی میں بھائی کی بات کو پرکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان فطری طور پر بہت سچائیوں کے لئے اندھا رہتا ہے۔ وه ہمیشہ اپنے ذاتی خیالات کو کلام کی سچائیوں سے ملانے کے خطرے میں

---

[a] recapitulation theory

رہتا ہے۔ جب ہم دیگر ایمان داروں کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں تو وہ ہماری حفاظت کا باعث بنتے ہیں۔ وہ ہمیں غلط خیالوں میں اُلجھنے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

کلام عقل سے سمجھا جاتا ہے

اُن لوگوں سے خبردار جو کلام کے نام نہاد بھید پیش کرتے ہیں۔ خدا نے اپنا کلام یوں پیش کیا ہے کہ نجات کی مرکزی باتیں عام شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

مسیح میں خدا قریب آ گیا ہے

خدا کی قربت واقعی ایک انوکھا خیال ہے جس کے ساتھ ہمیں لپٹنا چاہئے۔ الٰہی ذات ہمارے اِتنا قریب ہے کہ اُس نے مسیح میں ہمارے لئے سب کچھ کر لیا۔ اِس کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم اپنی کوششوں کی بنا پر اُس تک پہنچیں، کیونکہ خود وہ ہمارے پاس آیا ہے، خود اُس نے نجات کا دروازہ کھول کر سب کو اُس میں اندر آنے کی دعوت دی ہے۔

نجات کی راہ بہ تدریج ہے

نجات کی بہ تدریج راہ کلام اور خدا کی یگانگت سمجھنے کے لئے نہایت مفید ہے۔ اِس سے پورے کلام کا پورا نقشہ نظر آتا ہے۔ تب ہی ہم پرانے اور نئے عہد نامے کی ایسی باتیں سمجھ پاتے ہیں جو واقعی کئی دفعہ پہلی نظر میں ایک دوسری کی متضاد لگتی ہیں۔ پہلے اور دوسرے آدم کا خیال بھی اِس میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

طرُطلیان: ایمان کا وکیل

اگرچہ ایرینیُس جنوبی فرانس میں بستا تھا تو بھی وہ یونانی تھا۔ تاریخی لحاظ سے طرُطلیان (قریباً 160ء تا 225ء) لاطینی مغرب کا پہلا اہم بزرگ ہے۔ طرُطلیان کے کئی خیالات ایرینیُس کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ اِس جگہ پر ہم صرف وہ کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں جو ایرینیُس سے فرق ہے۔

اُمّت سے محفوظ رکھی ہوئی سچائی ایمان کی پختہ بنیاد ہے

طرُطلیان پوچھتا ہے کہ ہمیں کس طرح یقین آتا ہے کہ ہمارا ایمان صحیح ہے؟ جواب میں وہ فرماتا ہے کہ صرف اور صرف اُمّت سے محفوظ رکھی ہوئی سچائی یقینی ہے۔ اِسی بنیاد پر ہمارا ایمان پختہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ بھی ہے کہ طرُطلیان عرفانیت اور دیگر فلسفوں کے کلام سے دُور پہنچانے والے خیالات کا سخت دشمن ہے۔ کیونکہ یہ اُمّت اور اُس سے محفوظ رکھے ہوئے کلام کے متضاد ہیں۔

اُمّت کی سچائی کا ایک پہلو اُس کا عقیدہ ہے۔ طرُطلیان پورا زور ایمان کے عقیدے پر دیتا ہے۔ اِس میں وکیل کا کردار نظر آتا ہے جو ہر صورت میں اپنے ایمان کی سچائی دکھانا چاہتا ہے۔[17]

ایمان کی مدافعت میں جامع بیانات

وکیل کی حیثیت سے طرُطلیان نے مختصر اور جامع جملوں سے اپنی بات کی مدافعت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ یہی نعمت ایمان کے بیان میں بھی استعمال کرتا ہے۔ نتیجے میں اُس کے بہت سے محاورات اور اصطلاحات اُمّت کے روایات میں شامل ہوئی ہیں۔ اُسی نے فرمایا کہ ”مسیحیوں کا خون بیج ہے۔“[18] یہ جملہ درجِ ذیل صورت میں مشہور ہو گیا ہے، ”شہیدوں کا خون کلیسیا کا بیج ہے۔“

طرُطلیان نے علمِ الٰہیات کا پورا نظام نہ لکھا۔ جو باتیں ہم پر آئی ہیں وہ خاص کر اصطلاحات ہیں، ایسے جامع الفاظ جو ایمان کو صاف صاف اور مختصر بیان کرتے ہیں۔

تثلیث کی بارے میں تعلیم

طرُطلیان تثلیث کے عقیدے کو فروغ دیتا ہے۔ اُس کے مطابق ازل سے خدا کی ذات میں موجود کلام کائنات سے پہلے بیٹے کی صورت میں خدا باپ سے صادر ہوا۔ اُسی کے وسیلے سے باپ نے کائنات کو خلق کیا۔[19] اور جس طرح کلام ازل سے باپ میں موجود تھا اُسی طرح روح القدس ازل سے کلام میں موجود تھا۔[20] پنتکُست کے

موقع پر روح القدس بیٹے سے صادر ہوا۔[21] باپ، بیٹا اور روح القدس ذات کے لحاظ سے ایک ہیں، لیکن درجے کے لحاظ سے تین۔ وہ ایک دوسرے سے اِتنے فرق ہیں جتنا سورج کی کرن اور سرا سورج سے۔[22]

تثلیث کا لفظ (trinitas) پہلی دفعہ طرطلیان سے استعمال ہوا۔[23] طرطلیان پہلی بار جامع طور پر تثلیث فی التوحید کی اصطلاح بیان کرتا ہے۔ اور وہ پہلی بار خدا کی وحدت اور تثلیث کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق الفاظ جوہر (substantia) اور اقنوم (persona) کی اصطلاحات سے پیش کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ خدا کا ایک جوہر اور تین اقانیم ہیں۔[24]

مسیح کے بارے میں تعلیم

طرطلیان مسیح کے نجات بخش کام کا بھید متضاد باتوں سے بیان کر سکتا ہے:

> خدا کا بیٹا مصلوب ہوا ہے۔ یہ شرم والی بات نہیں ہے کیونکہ ہے شرم والی بات۔ خدا کا بیٹا فوت ہوا ہے۔ یہ یقینی بات ہے، کیونکہ غیر یقینی ہے۔ اُسے دفنایا گیا اور وہ جی اُٹھا۔ یہ پکی بات ہے کیونکہ ناممکن ہے۔[25]

یونانی کے لئے ایسی باتیں جاہلیت کا ثبوت تھیں، کیونکہ اُس کے نزدیک خدا دُکھ نہیں سہہ سکتا۔ لیکن ایسی ہی باتوں سے ایمان کے بھید بیان کئے جا سکتے ہیں۔

طرطلیان مسیح کی ذات کے بارے میں پکا نظام پیش نہیں کرتا، لیکن وہ اِس پر زور دیتا ہے کہ مسیح کے انسانی اور الٰہی پہلو الگ الگ ہیں۔ اُس کے مطابق ہمیں نہیں کہنا چاہئے کہ دونوں مل کر ایک تیسری چیز بن گئے ہیں جو نہ پورے طور پر خدا اور نہ پورے طور پر انسان ہو۔[26]

گناہ کا انسان پر اثر

تمام انسان گناہ گار کیوں ہیں؟ طرُطلیان کا جواب: وجہ آدم کا پہلا گناہ ہے۔ خدا کی حکم عدولی کرنے سے گناہ لاعلاج بیماری کی طرح لگ گیا، یوں کہ آدم کے تمام فرزند سے بھی لگا رہتا ہے۔ اُس وقت سے انسان کی فطرت بگڑی ہوئی ہے۔[27]

طرُطلیان فرماتا ہے کہ جس طرح آدم کے جسم سے بچے پیدا ہوئے اُسی طرح اُس کی روح سے بچوں کی روحیں بھی پیدا ہوئیں، اور یوں ہی اُس کی روح نسل درنسل منتقل ہو جاتی ہے۔ روح کے ساتھ ساتھ اُس کی گناہ آلودہ فطرت بھی ہر انسان میں منتقل ہو جاتی ہے۔[28] اِس تعلیم کو traducianism کہا جاتا ہے۔

یہ اوگسطین کی موروثی گناہ کی تعلیم کے قریب ہے، لیکن نہ طرُطلیان یہ کہتا ہے کہ گناہ انسان کی فطرت کا حصہ بن گیا ہے نہ یہ کہ انسان گناہ میں یوں جکڑا ہوا ہے کہ خود اِس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔[29] بعد میں اِس تعلیم کو کلیسیا کی اکثریت سے رد کیا گیا۔

خدا کا فضل

چونکہ طرُطلیان وکیل ہے اِس لئے وہ اِس پر زور دیتا ہے کہ خدا منصف ہے جس کے آئین کے مطابق انسان کو چلنا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ لوقا 15 میں بیان کردہ مصرف بیٹا بت پرستی سے توبہ کرنے والے کی اچھی مثال ہے، کیونکہ توبہ کرنے سے اُس نے خدا کے منصفانہ تقاضوں کو پورا کر کے اُسے خوش کر رکھا ہے۔[30] لیکن اُس کے نزدیک الٰہی آئین پر مبنی تعلق ایمان لانے پر ختم نہیں ہوتا۔ گو بپتسمہ لینے سے انسان کے گزرے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اُسے روح القدس ملتا ہے، لیکن یہ صرف مسیحی زندگی کے آغاز میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اب سے ایمان دار کو خدا کی شریعت پوری کرنی ہے، اُسے ثواب حاصل کرنا ہے تاکہ آسمانی مکانوں میں قبول ہو جائے۔ کیونکہ نیک کام کرنے سے انسان خدا کو اپنا قرض دار بنا کر اُسے قبول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔[31]

طرُطلیان کے نزدیک بپتسمہ کے بعد ایمان کا انکار کرنا ایک ایسا لاعلاج گناہ ہے جو انسان شاید ہی اپنے آپ کو سخت سزا دینے سے دُور کر سکے۔[32]

طرُطلیان سے سبق

زندہ دلی سے ایمان کا دفاع

جو شخص ملکِ پاکستان میں رہتا ہے وہ عام طور پر وکیلوں سے دُور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن طرُطلیان ہمیں دکھاتا ہے کہ جو وکیل خلوص دلی سے کلیسیا کی خدمت کرنا چاہے وہ اُس کی مضبوطی کا باعث بنتا ہے۔

طرُطلیان اپنے آپ کو کلیسیا کا وکیل سمجھتا ہے۔ اور جو نعمتیں اُسے حاصل ہوئی ہیں اُنہیں وہ ایمان داروں کی مدافعت میں خوب استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ اُس دور کے مسیحی کم ہی تھے تو بھی وہ اپنے ایمان اور اپنی کلیسیا پر علانیہ فخر کرتے تھے۔ اُنہیں پروا نہیں تھی کہ اکثریت میری باتوں کو حماقت سمجھتی ہے بلکہ وہ بڑی زندہ دلی سے اپنا ایمان بیان کرتے تھے۔ اِس کے لئے وہ لڑنے تک تیار تھے، ہاتھا پائی سے نہیں بلکہ الفاظ سے۔

مسیحی ایمان کا صاف اقرار

آج کل کئی ایمان دار سمجھتے ہیں کہ اپنا ایمان فلسفیانہ رنگ دے کر دوسروں کو منوانا ہے۔ دیگر کئی گروہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنا ایمان اکثریت کے مذہب کا رنگ دے کر دوسروں کو منوانا ہے۔ ایک لحاظ سے اُن کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ ہمیں اپنا ایمان ایسے الفاظ میں پیش کرنا چاہئے جو غیرمسیحی سمجھ سکیں۔ لیکن اگر ہمارا ایمان ہوتے ہوتے مسلم یا بدھمت یا ہندو لگے تو دال میں کچھ کالا ہے۔ طرُطلیان ایسے خطرے میں نہیں ہے۔ وہ اپنا ایمان کھُلے طور پر پیش کرتا ہے، اور اِس سے نہیں ڈرتا کہ لوگ اُسے احمق قرار دیں۔

ایمان کا جامع بیان

طرطُلیان کے جامع بیانات مشہور ہو گئے ہیں۔ کون یہ قول نہیں جانتا کہ شہید کا خون کلیسیا کا بیج ہے؟ وکیل کی حیثیت سے طرطُلیان سمجھتا ہے کہ اگر لوگوں کو متاثر کرنا ہے تو مختصر اور جامع الفاظ میں، ایسی باتوں سے جو بعد میں سننے والوں کے کانوں میں بجتی رہیں۔ ہمارے خدمت گزار اِس میں طرطُلیان سے سیکھ لیں کہ پیغام اور تقریر کا اثر اُس کی لمبائی سے تولا نہیں جاتا بلکہ اُس کے معیار سے۔ دو جامع جملے آدھے گھنٹے کی باتونی تقریر سے کہیں بہتر ہیں۔ پیغام کی جو باتیں لوگ سالوں بعد یاد کرتے ہیں وہی مفید ہیں۔

فضل اور گناہ کے بارے میں طرطُلیان کی تعلیم ہم جوں کی توں قبول نہیں کر سکتے، کیونکہ کلام کی روشنی میں یہ کچھ ناقص ثابت ہوئی ہے۔ لیکن طرطُلیان اِس میں قابلِ تعریف ہے کہ وہ بار بار کلام کے بھید جامع الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہے۔ نتیجے میں اُس کی اصطلاحات پوری کلیسیا کا خزانہ بن گئی ہیں۔ ہمارا فرض بھی یہ ہے کہ نئے اور تازہ تازہ الفاظ میں ایمان کے بھید بیان کرنے میں کبھی تھک نہ جائیں۔

اسکندریہ کی کلیسیائی عرفانیت

مصری شہر اسکندریہ یونانی علوم کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہ اتفاق کی بات نہیں کہ یہودیوں کا افلاطونی عالِم فیلو اسکندریہ کا باشندہ تھا۔ اب یہ شہر جلد ہی کلیسیا کا اہم مرکز بن گیا۔ دوسری اور تیسری صدی میں وہ کلیمینس اور اورِغین جیسے بزرگوں کے باعث مشہور ہو گیا۔

بدعتی عرفانیت نے اسکندریہ میں خاص زور پکڑ لیا تھا۔ کئی قسم کے فرقے اُس میں سرگرمِ عمل تھے۔ لہٰذا اُن سے نپٹنے کی اشد ضرورت تھی۔ اب دل چسپ بات یہ ہے کہ اسکندریہ کا عرفانیت سے نپٹنے کا طریقہ دونوں مغربی بزرگوں ایرینیُس اور طرطُلیان سے کہیں فرق ہے۔ کس طرح؟

ایرینئیُس اور طرطُلیان ہرقسم کی عرفانیت کے خلاف ہیں جبکہ اسکندریہ کے بزرگ اپنے آپ کو حقیقی عرفانی سمجھتے ہیں۔ یہ دکھانے کے لئے وہ قدیم یونانی سوچ اور ثقافت کو کافی حد تک اپنا لیتے ہیں۔

مغرب کے بزرگ ایرینئیُس اور طرطُلیان اصرار کرتے ہیں کہ عرفانیت اور مسیحی ایمان ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ اُن کے نزدیک عرفان صرف ایمان کا دوسرا نام ہے، لہٰذا عرفانیت کی کلام سے دُور باتیں غلط ہیں۔

اسکندریہ کا نکتہ نگاہ مختلف ہے۔ گو وہاں کے ایمان دار بھی بدعتی عرفانیت کے سخت خلاف ہیں، لیکن اُن کا اُس پر غالب آنے کا طریقہ فرق ہے۔ وہ عرفانیت کا خیال قبول کرتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ ساتھ عرفان بھی ضروری ہے، لیکن اصرار کرتے ہیں کہ اِس عرفان کو ہمیشہ ہی ایمان اور کلامِ مقدّس کی بنیاد پر رہنا ہے۔ ایمان دار حقیقی عرفان کا پیروکار ہے، اور وہ ایمان لانے کے بعد بھی روحانی عرفان میں بڑھتا رہتا ہے۔

عرفانیت کے فرقوں نے اپنے خیالات کے مختلف نظام تیار کئے تھے، ایسے نظام جو کائنات کی تخلیق سے لے کر دنیا اور انسان کا پورا مقصد بیان کرتے تھے۔ اسکندریہ کے ایمان دار جواب میں اپنے ہی خیالات کے نظام کھڑے کرتے ہیں۔ یہ کرنے کے لئے وہ قدیم یونانی ثقافت اور فلسفوں سے مدد لیتے ہیں۔ اِس میں وہ ایرینئیُس اور طرطُلیان سے بہت فرق ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان پوری دنیا کے لئے ہے، لہٰذا لازم ہے کہ ہم کائنات کا ہر پہلو ایمان کی روشنی میں بیان کریں۔ اِس میں اُن کی اسکندریہ کے فلاسفر فیلو سے قربت نظر آتی ہے جس نے یہی کچھ یہودی ایمان کے لئے کیا تھا۔

کلیمینس از اسکندریہ: حقیقی عرفانی کی کلامِ خدا سے تربیت

کلیمینس (قریباً 150ء تا 215ء) اِن نئے خیالات کا پہلا نمائندہ ہے۔ شاید وہ اتھینے میں پیدا ہوا۔ جوانی میں بت پرستی کو رد کر کے وہ یونان، ایشیائے کوچک، فلسطین

اور مصر میں مختلف عالموں کا شاگرد بن گیا۔ اِن میں اسکندریہ کا بزرگ پنطینُس[a] بھی تھا۔ علاوہ از ایں ہم کلیمینس کے بارے میں کم ہی جانتے ہیں سوائے اِس کے کہ وہ اسکندریہ میں ٹک کر کلیسیا میں مسیحی ایمان کے کورس پڑھانے لگا۔

کلیمینس نہ صرف کلامِ مقدّس کے حوالے دیتا ہے بلکہ وہ اُن کا اندرونی مطلب پیش کرنے پر بھی دھیان دیتا ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک ایمان دار کو نہ صرف کلامِ مقدّس کی بیرونی سچائیاں اپنانا چاہئے بلکہ اُسے اُن کا اندرونی مطلب اخذ کر کے روحانی عرفان میں بھی ترقی کرنا چاہئے۔

دلیلیوں کا پورا زور اِس پر تھا کہ ہمارا ایمان دنیاوی علوم کی روشنی میں احمقانہ نہیں بلکہ قابلِ قبول ہے۔ اِن کے برعکس کلیمینس اپنے ایمان کی مدافعت کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا، کیونکہ اُسے یقین ہے کہ علوم اور ایمان میں پوری یگانگت اور اتفاق ہے۔ اُس کی چند ایک باتوں پر توجہ فرمائیے۔

کلامِ خدا کا دنیا کی تخلیق و تربیت میں ہاتھ

کلیمینس دلیلیوں کی طرح مسیح کو کلامِ خدا (لوگوس) قرار دیتا ہے جس کے وسیلے سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ لیکن دلیلی اِس بات سے زیادہ تر مسیح کا الٰہی پہلو دکھانا چاہتے ہیں جبکہ کلیمینس عرفانیت کے جواب میں کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

عرفانیت نے دعویٰ کیا تھا کہ کائنات گھٹیا قسم کے خدا کی پیداوار ہے اور اِس لئے بنیادی طور پر ناقص ہے۔ اُس کے نزدیک مسیح کا ظہور مادی دنیا کے متضاد ہے، اور انسان کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مسیح کی مدد سے اِس مادی دنیا سے آزاد ہو جائے۔

کلیمینس جواب میں فرماتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خدا اور کائنات میں یگانگت ہے۔ کس طرح؟ کلامِ خدا یعنی مسیح کے وسیلے سے۔ دلیلیوں نے پہلی دفعہ یوحنا 1 کا حوالہ دے کر اِس پر زور دیا تھا کہ کلامِ خدا کے وسیلے سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ اب

---

[a] Pantaenus

کلیمینس یہ بات بڑھا کر کہتا ہے کہ ہر جگہ موجود یہ کلام پوری دنیا کا حکمران ہے، اور کائنات کی ہر چیز (یعنی نہ صرف مسیحی چیزیں) اُس کے تابع ہے۔[33]

کلامِ خدا انسانیت کو تربیت بھی دیتا رہتا ہے۔ جس کلام کا وعدہ پرانے عہد نامے میں کیا گیا اور جس کا اندازہ فلسفے نے لگایا تھا وہ مسیح میں ظاہر ہو کر پوری انسانیت کو اندر سے تربیت دیتا اور تبدیل کرتا ہے۔ یوں جو گناہ پر غالب آئے اُس کی پوری زندگی ثقافت سمیت تبدیل ہو جاتی ہے۔[34]

حقیقی عرفانی کی کلامِ خدا سے تربیت

حقیقی عرفانی کون ہے؟ کلیمینس کا جواب افلاطون کے دو خیالات پر مبنی ہے:

- خدا تمام اشیا کا پیمانہ ہے، وہی منزلِ مقصود جس کے پاس پہنچنا ہر چیز کی کوشش ہونی چاہئے۔[35]

- خدا تمام کائنات کا تربیت دینے والا ہے۔[36]

کلیمینس سمجھتا ہے کہ کلامِ خدا یہی تربیت دینے والا ہے جس کے پاس پہنچنا ہر چیز کی کوشش ہونی چاہئے۔ ''خدا کی طرح ہونا''[37] انسان کا مقصد ہے۔ یہ بات نہ صرف ایمان داروں کے محدود گروہ پر صادق آتی ہے بلکہ پوری ثقافت اور پوری دنیا پر۔

درجِ بالا باتیں کلیمینس کی تین کتابوں میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اُن کے نام ''یونانیوں کو نصیحت،''[a] ''تربیت دینے والا''[b] اور ''متفرق مجموعہ''[c] ہیں۔

مزید تین خیال اِن تصانیف میں اہمیت رکھتے ہیں:

Protreptikos pros Hellēnas[a]
Paidagōgos[b]
Strōmateis[c]

کلامِ خدا کا نیا گیت انسان پر غالب آ کر اُسے توبہ تک پہنچاتا ہے

پہلی کتاب میں مصنف قاری کو مسیحی ایمان پر قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سلسلے میں توبہ کا نیا پہلو اُبھر آتا ہے۔ کلیمینس کے مطابق توبہ اُس وقت ہوتی ہے جب کلامِ خدا کا "نیا گیت" اِنسان پر غالب آ کر اُس کی گہری خواہشات اور ضروریات پوری کرتا ہے۔ تب خود انسان سے یہ گیت اُبھر آتا ہے۔ غرض، توبہ کا زور اِس پر نہیں ہے کہ انسان اپنی گناہ آلودہ زندگی سے پچھتا کر خدا کے پاس آئے بلکہ اِس پر کہ جو گہری آرزو انسان رکھتا ہے وہ توبہ ہوتے وقت پوری ہو جائے۔[38]

کلامِ خدا کے کردار کے مطابق چلنا ہے

دوسری کتاب میں بھی کلیمینس نئی باتیں چھیڑتا ہے۔ اب تک ایمان کا فرض یہ تھا کہ مسیح کی ہدایات پر چلے۔ کلیمینس اِس کا انکار نہیں کرتا، لیکن وہ پورا دھیان اِس پر دیتا ہے کہ ایمان دار دنیا کے تربیت کرنے والے کلامِ خدا کے کردار کے مطابق ہی چلے۔

کلام کے کردار پر زور اِس طرح پہلے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ ہر عمل میں یہ پوچھنا ہے کہ کیا یہ کلامِ خدا کے کردار کے مطابق ہے؟ نہ صرف ظاہری ہدایات پر عمل کرنا ہے بلکہ پوری زندگی کو کلام کے کردار سے مطابقت رکھنی چاہئے۔ لٰہذا لازم ہے کہ ہم نہ صرف مسیح کی ہدایات پر ظاہری طور پر عمل کریں بلکہ کلامِ خدا کا کردار سمجھ کر اُس کے اندرونی مقاصد پر عمل کریں۔

دولت مند نوجوان کی تمثیل کی تفسیر[a] اِس تعلیم کی خوب صورت مثال ہے۔ کلیمینس فرماتا ہے کہ لازم نہیں کہ امیر مسیح کے پیچھے ہو لینے کے لئے اپنی تمام دولت چھوڑے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے دولت سے آزاد ہو جائے۔ "وہ جا کر اپنے آپ کو کلام (لوگوس) کے تابع کرے جو اُس کا تربیت کرنے والا ہے۔"[39]

---

[a] مرقس 17:10 وما بعد

عرفان کی تلاش ایمان دار زندگی کا لازمی حصہ ہے

آخری تصنیف میں کلیمینس حقیقی عرفانی کی تصویر پیش کرتا ہے (خاص کر چھٹی اور ساتویں کتاب میں)۔

اُس سے پہلے یہ خیال سرِ عام تھا کہ ایمان لانے پر انسان متلاشی نہیں رہتا۔ جو اِس سے آگے مزید تلاش کرے وہ بدعت یا گناہ میں گر جائے گا۔ اِس کے برعکس کلیمینس کے نزدیک حقیقی عرفانی ایمان لانے کے بعد بھی خدا کی تلاش میں رہتا ہے۔ اِس میں کلیمینس ایک طرح سے بدعتی عرفانیت کی یہ بات اپنا لیتا ہے کہ انسان عرفان کی تلاش میں رہتا ہے۔[40]

حقیقت میں وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے کہ انسان خدا کا دوست بنے، کہ وہ اُس کے پاس آئے جو اُس سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان کا مقصد ہے کہ وہ خدا کی قربت میں رہنا اور چلنا سیکھے۔[41]

اُس کی نظر میں انسان کا سب سے نچلا روحانی درجہ غیر مسیحی ہے جبکہ جو ایمان لائے وہ درمیانی روحانی درجے پر آ جاتا ہے۔[42] لیکن ایمان دار مزید ترقی کرنے سے ہی کاملیت اور پوری آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ عرفان کی اِس حالت میں وہ متی 5: 8 کے مطابق خدا کو دیکھتا اور دنیا کی بے چینی سے آزاد ہو کر خدا کے سامنے خاموشی سے مسلسل دعا کرتا رہتا ہے۔[43]

کلیمینس سے سبق

عرفان میں ترقی کی ضرورت

عرفان کے بارے میں کلیمینس کا خیال دل چسپ اور مفید ہے۔ اکثر لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جب ہم توبہ کرکے مسیح کو قبول کریں تو بات ختم۔ اب سے ہمیں صحیح سمجھ اور ایمان حاصل ہے تو اَور کیا چاہئے؟ اور پھر وہ کئی دفعہ دوبارہ گناہ میں پھنس

کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ سوال بھی کرنے لگیں کہ اگر مَیں ایمان لایا تو کیوں دوبارہ گناہ میں گر گیا ہوں؟

اِس جگہ پر عرفان کا خیال مناسب ہے۔ ایمان کی ابتدا عرفان کی تکمیل نہیں بلکہ اُس کا آغاز ہے۔ ایمان لانے کے بعد ہم خدا کے ساتھ چلنے اور کلام کو پڑھنے سے عرفان میں ترقی کرتے ہیں۔ اور یہ نہ صرف ظاہری باتوں میں ترقی ہے بلکہ روحانی باتوں میں بھی، ایسی باتوں میں جو پرانے آدم پر غالب آنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔

جب انسان ایمان لائے تو وہ نہ سوچے کہ اب مَیں کامل ہوں، اب مجھے خدا کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بے شک اب سے ہم اُس کے پیارے فرزند ہیں۔ لیکن جس طرح بچے ترقی کرتے کرتے بالغ اور سمجھ دار ہو جاتے ہیں اُسی طرح لازم ہے کہ ہم ایمان لانے کے بعد بھی خدا کی مرضی تلاش کرتے رہیں تاکہ روحانی طور پر بالغ اور سمجھ دار بن جائیں۔ تب ہی ہماری سب سے گہری آرزوئیں اور ضروریات پوری ہو جائیں گی۔

پوری دنیا میں مسیح کا ہاتھ

کلیمینس کلامِ خدا کا پوری دنیا میں ہاتھ دیکھتا ہے۔ لوگوس کے وسیلے سے دنیا خلق بھی ہوئی اور اُس کی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اِس کے پیچھے کلیمینس کا پورا یقین ہے کہ مسیحی ایمان پوری دنیا کے لئے ہے۔ اور یہ خیال غلط نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات کہ دنیا کی تخلیق خدا بیٹے کے ذریعے ہوئی کلام میں کئی جگہوں پر ملتی ہے۔[a]

ہم مسیح کا تربیت کرنے والا کردار بھی کلام سے اخذ کر سکتے ہیں۔ اناجیل میں اُس کی ہدایات صفحہ بہ صفحہ ہم سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ اور عبرانیوں 1:6 میں لکھا ہے،

---

[a] دیکھئے یوحنا 1:3؛ کُلسّیوں 1:16؛ رومیوں 11:36؛ عبرانیوں 1:2۔

> اِس لئے آئیں، ہم مسیح کے بارے میں بنیادی تعلیم کو چھوڑ کر بلوغت کی طرف آگے بڑھیں۔

یہ حقیقت ہمارے لئے تسلی کا باعث ہے کہ پوری دنیا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے کلام کے وسیلے سے وہ آج بھی لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ حقیقی کنٹرول اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور کیا یہ تسلی کا باعث نہیں کہ ہماری تربیت ہمارے خداوند کے ہاتھ میں ہے؟ تربیت کا یہ کام بھی فضل پر مبنی ہے، کیونکہ جو کچھ ہم اپنی کمزور طاقت سے سرانجام دیتے ہیں وہ ناقص ہے۔

اندر ہی اندر سے تربیت حاصل کرنے کی ضرورت

ہم تربیت کے اِس سلسلے میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں؟ کلیمینس جواب دیتا ہے کہ مسیح کے کردار کے مطابق زندگی گزارنے سے۔ یہ واقعی ایک معقول اور مفید خیال ہے۔ کیونکہ مسیح کی زندگی اور موت پر تکنے سے ہی ہم اُس کے مطابق بن جاتے ہیں۔ یہ اُس کے نمونے پر چلنے سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ محض مسیح کی ظاہری زندگی کے مطابق چلنا ناکافی ہے بلکہ ہمیں اُسے دل میں اپنا کر اندر ہی اندر سے تبدیل ہونے کی ضرورت ہے۔

کلیمینس کا ہدایات کے اندرونی مطلب پر زور بھی ایک قابلِ غور پہلو ہے۔ کئی لوگ ظاہری طور پر کلام کی ہدایات پوری کرتے ہیں جبکہ اندرونی طور پر وہ مسیح سے کہیں دُور رہتے ہیں۔

ایک مثال پر توجہ فرمایئے۔ افریقہ میں ایک مسیحی جرنیل ملازمت چھوڑ کر راہب بننا چاہتا تھا۔ جب اوگسطین کو یہ پتا چلا تو اُس نے اُسے ملازمت کو چھوڑنے نہ دیا۔ کیوں؟ ظاہری طور پر افسر کا مقصد اچھا تھا۔ لیکن وہ جرنیل کی حیثیت سے کلیسیا کی حفاظت کے لئے ضروری تھا۔[44] ظاہری طور پر ملازمت چھوڑنا ٹھیک تھا، لیکن اندرونی طور پر اُس کا جرنیل رہنا ایک بہتر خدمت تھی۔

اِسی طرح مسیح کی ہدایت کہ امیر جا کر سب کچھ بیچ ڈالے ظاہری طور پر ہر امیر پر صادق نہیں آتی۔ بے شک وہ اندرونی طور پر غریب بنے، وہ اپنے مال سے لپٹا نہ رہے۔ لیکن شاید وہ امیر ہونے کے باعث مسیح کی زیادہ خدمت کر سکے۔

اِس ناتے سے مسیحی زندگی گزارنا ہر ایک کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ ہمیں بار بار خدا سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ میری زندگی کے لئے تیری مرضی کیا ہے؟ گو کلام کی روحانی سچائیاں سب کے لئے ایک ہی ہیں تاہم کافی معاملوں میں روحانی باتوں کا عملی نتیجہ ہر ایک کے لئے فرق فرق ہو گا۔

لیکن خبردار! کلام کا اندرونی مطلب نکالنے سے خطرے بھی پیش آتے ہیں۔ خطرہ وہی ہے جو مجازی تفسیر کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ایسا اندرونی مطلب نکالیں جو ظاہری مطلب کے خلاف ہو۔ ہم اِس سے کس طرح بچ سکتے ہیں؟ گناہ سے دُور رہنے سے، روح القدس میں مسیح اور دوسرے ایمان داروں کے ساتھ چلنے اور کلام کے تابع رہنے سے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسا اندرونی مطلب ظاہری مطلب کے خلاف ہو۔ مثال کے طور پر کلام فرماتا ہے کہ زنا نہ کرنا۔ اگر ہم اِس سے یہ اندرونی مطلب نکالیں کہ حقیقت میں زنا کرنا جائز ہے تو دال میں کچھ کالا ہے۔

دل میں نیا گیت درکار ہے

کلیمینس فرماتا ہے کہ توبہ مسیح کا نیا گیت ہے جو ہم پر غالب آ جاتا ہے۔ تب یہ گیت ہماری زندگی میں اُبھرنے لگتا ہے۔ یہ دل کش خیال ہمیں یاد دلاتا ہے کہ توبہ ہمارا نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ وہی ہمارے اندر یہ سلسلہ شروع کرتا ہے۔ جس طرح نوحہ میں لکھا ہے، ”اے رب، ہمیں اپنے پاس واپس لا تاکہ ہم واپس آ سکیں۔ ہمیں بحال کر تاکہ ہمارا حال پہلے کی طرح ہو۔“[a] اور یہ سلسلہ یوں پیش آتا ہے کہ ہمارے اندر سے ایک نیا گیت اُبھر آتا ہے، خدا کی حمد و ثنا کا گیت۔ یہ ایسا گیت ہے جو نہ

[a] نوحہ 21:5

صرف ایمان لاتے وقت نکلتا ہے بلکہ جو زندگی کے آخر تک ہمارے لبوں پر رہتا ہے، ہاں جو روز بہ روز زور پکڑتا جاتا ہے۔

مسیح کی انسانیت لازمی ہے

ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ کچھ باتیں خطرے کے باعث بن سکتے ہیں اگر غلط سمجھی جائیں۔ خطرہ ہے کہ اُمّت میں نام نہاد عرفانیوں کا مخصوص گروہ پیدا ہو جائے جو اپنے آپ کو دوسرے مسیحیوں سے برتر سمجھیں۔

نیز، مصنف کا رجحان دوقیت[a] کی طرف ہے، کیونکہ اُس کے نوشتوں میں یوں نہیں لگتا کہ مسیح حقیقی طور پر انسان بن گیا۔[45] مسیح کی الوہیت کے ساتھ ساتھ لازم ہے کہ ہم اُس کی انسانیت بھی مانیں۔ اِس پر بعد میں مزید غور کیا جائے گا۔

اورِغین: بدعت کے کنارے پر مسیحی عرفانیت

اورِغین (185ء تا 254ء) اسکندریہ میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اُسے مسیحی والد سے تربیت حاصل ہوئی۔ 202ء میں اُس کا والد شہید ہوا۔ یوسیبیُّس فرماتا ہے کہ خود اورِغین جوش میں آکر شہید بننے کے لئے کھڑا ہوا، لیکن اُس کی ماں نے اُس کے کپڑے چھپا کر اُسے روک دیا۔ اب 17 سالہ نوجوان خاندان کا واحد سہارا تھا، اور وہ روزی کمانے کے لئے استاد بن گیا۔

203ء سے وہ کلیسیا میں مسیحی ایمان کے کورس پڑھانے لگا، وہی کام جس میں پہلے کلیمینس مصروف تھا۔ کچھ دیر کے بعد اورِغین نے اپنی قیمتی کتابیں بیچ ڈالیں تاکہ دوسروں کے پیسوں سے خود مختار ہو جائے۔ اب وہ اِنہی پیسوں کی بنا پر پرہیزگاری کی زندگی گزارنے لگا۔ ایک روایت کے مطابق اُس نے متی 12:19 کی بنا پر اپنے آپ کو خواجہ بھی بنایا، لیکن خود وہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے وقت ایسا عمل غلط قرار دیتا

[a] دیکھئے صفحہ 128۔

ہے۔ اُس کی راہبانہ زندگی کے باعث اُسے ''فولادی'' کا نام دیا گیا۔ دن کے وقت وہ لوگوں کو پڑھاتا جبکہ رات کے اکثر دوران کلام کے مطالعے میں لگا رہتا تھا۔

اورِغین نے جلد ہی محسوس کیا کہ عرفانیوں اور فلاسفروں کو جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی باتوں کا مطالعہ کرے۔ اِس مقصد کے تحت وہ درمیانی افلاطونیت کا مشہور غیرمسیحی عالِم امونیُس کا شاگرد بن گیا۔ اُسی دوران اُن مرکزی باتوں کی تشکیل ہوئی جو اُس کے نوشتوں میں قلم بند ہیں۔

تقریباً 222ء سے وہ بے شمار کتابیں لکھنے لگا۔ ایک مال دار دوست کی مدد سے سات سے زائد مقرر نویس اُس کی باتیں لکھنے میں لگ گئے، اُتنے ہی کاتب اُنہیں قاریوں کے لئے تیار کرتے رہے، اور کئی ایک خواتین اُن کی نقل کرنے میں لگی رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً 2000 نوشتے اُس سے قلم بند ہوئے۔ لیکن چونکہ اُسے بعد میں بدعتی قرار دیا گیا اِس لئے بہت سے گم ہو گئے ہیں۔

اپنے علم کے باعث اُسے کئی ممالک میں بلایا گیا۔ مصر سے باہر لوگ اُسے کلیسیائی بزرگ سمجھنے لگے۔ یہ بات اسکندریہ کے بشپ کو پسند نہ آئی، اور دونوں کے درمیان جھگڑا چھڑ گیا۔

نتیجے میں اورِغین 231ء میں فلسطین کے شہر قیصریہ میں جا بسا۔ وہاں وہ پہلا مسیحی بنا جو علمِ الٰہیات کے ساتھ ساتھ پورے غیرمسیحی علوم پڑھاتا تھا۔ حقیقت میں گو وہ یونانی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، تاہم اُنہیں خوب استعمال کرتا تھا، اور افلاطونیت کا اُس پر کافی اثر پڑا۔

249/250ء کی سخت ایذا رسانی میں وہ گرفتار ہوا اور شدید تشدد کے تحت نہایت زخمی ہوا۔ اِس کے باوجود اُس نے اپنے ایمان کا انکار نہ کیا۔ گو وہ کچھ دیر کے بعد آزاد ہوا، لیکن زخموں کے باعث اُس نے 254ء میں وفات پائی۔[46]

اورِغین کی باتوں پر دھیان کرتے وقت اچھا ہے کہ اُس کی زندگی یاد رہے۔ وہ اپنی کلیسیا کی خدمت کرنا چاہتا تھا، بلکہ وہ اپنی جان دینے کے لئے تیار تھا۔ اُس کی پرہیز گاری اور دن رات کی جد و جہد قابلِ تعریف ہے۔

اورِغین نے کلیمینس کی سی تعلیم مزید بڑھا کر ایک طرح سے عروج تک پہنچائی، البتہ اِس سے اُس تعلیم کی کمیاں اور مسئلے بھی زیادہ سختی سے سامنے آتے ہیں۔

کلام کا عالِم

اورِغین پہلا عالِم تھا جو نہ صرف کلام کی تفسیر میں بلکہ اُس کی نظام سازی میں بھی ماہر تھا۔ اُس کی تعریف میں ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہاں ایک عالِم ہے جس نے کلام کا لحاظ کرکے ایمان کا پورا ڈھانچا تیار کیا۔ اُس کا نوشتہ بنام ''ابتدائی اصول''[a] یہ بات خوب دکھاتا ہے۔ اُس میں مصنف کلام کی روشنی میں اپنا فلسفیانہ نظام کھڑا کرتا ہے۔

کلام کے سلسلے میں دو باتیں اُس کے نزدیک اہم ہیں، صحیح متن اور اُس کی تفسیر۔

کلام کے متن کا عالِم

چونکہ اورِغین نے کلام کی تفسیر پر بہت زور دیا اِس لئے کلام کا متن بھی اُس کے لئے اہمیت رکھتا تھا۔ متن کا صحیح مفہوم اُس کے لئے اِتنا اہم تھا کہ اُس نے شش خانہ متن[b] کی کتاب تیار کی جس میں پرانا عہدنامہ چھ کالموں میں قلم بند ہوا۔ پہلے اور دوسرے کالم میں عبرانی اور یونانی حروف کا متن تھا جبکہ دیگر چار کالموں میں مختلف ترجمے درج تھے۔

تفسیر کا عالِم

اورِغین نے وہی مجازی طریقہ اپنایا جو فیلو استعمال کر چکا تھا۔ اکثر حوالوں کی تفسیر میں وہ معنوں کے کم از کم دو یا تین مختلف درجے دیکھتا ہے، کئی حوالوں میں چار بھی اخذ کرتا

Latin: De Principiis; English: On First Principles[a]
Hexapla[b]

ہے۔ البتہ اُس کی تفسیروں میں ہمیں مجازی تفسیر کی کمی خوب دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ گو اُس کا یقین ہے کہ کلام کی ہر بات الہامی ہے تو بھی مجازی تفسیر کے باعث وہ بہت سی ایسی باتیں نکال لیتا ہے جو کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ کیوں؟ اِس لئے کہ مجازی طریقے میں اِتنی لچک ہے کہ لفظی مطلب سے ہٹ کر باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔ یوں اورِغین کلام سے اپنی فلسفیانہ تعلیم اخذ کرتا ہے اگرچہ یہ متن میں کہیں نظر نہیں آتی۔

یشوع کی تفسیر سے ایک مثال لیجئے۔ یشوع 10 میں پانچ بادشاہ بھاگ کر غاروں میں چھپ جاتے ہیں۔ اورِغین کے نزدیک یہ بادشاہ پانچ جسمانی حواس یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کے نمائندے ہیں۔ اِن ہی سے ہر انسان گناہ میں گر جاتا ہے۔ یہ کہ وہ غاروں میں چھپ گئے اِس طرف نشان دہی ہے کہ جسم (یعنی غار) میں ڈالے جانے کے بعد حواسِ خمسہ جسمانی جذبات میں مگن ہو کر خدا کی نہیں بلکہ صرف جسم کی خدمت کرتے ہیں۔[47]

نظام سازی کا ماہر

اورِغین کی نظام سازی خاص کر اُس کی تصنیف ''ابتدائی اصول'' میں نظر آتی ہے۔ لیکن چونکہ اُسے بدعتی قرار دیا گیا اِس لئے مذکورہ کتاب کی جو صورتِ حال ہم تک پہنچ گئی ہے اُس میں زیادہ قابلِ مذمت حوالجات کو مٹایا گیا ہے۔ تاہم تحقیقات نے اُس کی دیگر کتابوں اور اُس کے مخالفوں کے بیانات سے اُس کی تعلیم دوبارہ معلوم کر لیا ہے۔

اورِغین اُمّت کے عقیدے کو اپنے تمام بیانات کی بنیاد قرار دیتا ہے، اگرچہ اُس کے نزدیک عقیدہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ صحیح عرفان کے حصول سے ایمان دار عقیدے سے کہیں آگے بڑھ سکتا ہے۔ اِس عرفانی نظام کے مرکزی نکتے کیا ہیں؟

تخلیقِ دنیا سے پہلے ہی مخلوقات پیدا ہوئیں

مصنف فرماتا ہے کہ خدا خالق بھی ہے اور باپ بھی، لیکن ساتھ ساتھ وہ اِس دنیا سے ماورا بھی ہے (درمیانی افلاطونیت)۔ یوں وہ وہی کچھ ہے جو دنیا نہیں ہے یعنی

اصل کے بغیر، اَن دیکھا، جذبات اور ضروریات سے خالی اور سمجھ سے باہر۔[48] اُس کی قدرت صرف اُس کی راستی سے محدود ہے۔[49]

اورِغین کے نزدیک الٰہی ذات کے تین اقانیم ہیں۔ بیٹا باپ کے اور روح القدس بیٹے کے تابع ہے۔ بیٹا ازل سے مولود[a] یعنی باپ میں موجود ہے، اور اُس کی اور باپ کی مرضی ایک ہی ہے۔ کائنات کی تخلیق سے پہلے بیٹا باپ سے صادر ہو کر تمام مخلوقات کا پہلوٹھا بن گیا۔ تمام مخلوقات اُسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ کس طرح؟ یوں کہ بیٹے نے روح القدس کو پیدا کر کے اُسی کے وسیلے سے تمام مخلوقات پیدا کیں۔[50] یہ مخلوقات ایسی ہستیاں تھیں جن کا جسم نہیں تھا بلکہ جو خالص ذہن[b] تھیں۔ یہ کچھ دنیا کی تخلیق سے پہلے ہی سرانجام ہوا۔[51]

گناہ سے ظاہری دنیا وجود میں آئی

بیٹا اور باپ کی مرضی ایک ہی ہے۔ اِس کے مقابلے میں تخلیقِ دنیا سے پہلے پیدا ہوئی مذکورہ ذہنی ہستیوں کو مرضی کی آزادی دی گئی۔ یہ ذہنی ہستیاں سب اپنی مرضی کے مطابق چل کر گناہ میں گر گئیں۔ ہر ایک اپنے اپنے گناہ کے مطابق خدا سے دُور ہو گئی، کچھ زیادہ دور، کچھ کم۔ گناہ میں گرنے سے یہ ذہنی ہستیاں روحیں[c] بن گئیں سوائے یسوع کے جو بیٹے یعنی کلامِ خدا کے ساتھ متحد ہوا۔[52] اُنہیں قابو میں پانے کے لئے خدا نے بیٹے کے ذریعے مادی دنیا بنائی۔[53]

اب سے تین مختلف "علاقے" ہیں۔ سب سے اوپر جہاں ستارے ہیں وہ روحیں رہتی ہیں جو خدا سے کم دُور ہوئیں۔ اِن میں فرشتے شامل ہیں۔[54] آسمان کے نیچے سب سے

---

[a] دلیلی سمجھتے تھے کہ کلام (لوگوس) دنیا کو خلق کرنے کے مقصد سے تثلیث سے صادر ہوا۔ اِس کے مقابلے میں یہ کہنے سے کہ بیٹا ازل سے مولود ہے اورِغین پہلی دفعہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ تین اقانیم ازل سے تثلیث میں موجود ہیں۔ جس حقیقت کی طرف ایرینیُس دوسرے پہلو سے بڑھ گیا تھا (دیکھئے صفحہ 158) اُسے اورِغین اپنی تعلیم کی بنا پر بیان کرتا ہے۔

[b] (logikos) λογικός; (nous) νοῦς

[c] (psychē) ψυχή

دُور روحیں یعنی ابلیس اور شیاطین ہوتی ہیں۔[55] زمین پر وہ روحیں بستی ہیں جن کی محبت ٹھنڈی ہو گئی تھی اور جو نتیجے میں انسان بن گئیں۔[56] فرشتے اور شیاطین اُنہیں جیتنے کے لئے لڑتے رہتے ہیں۔ یوں جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ خدا کی عدالت اور تربیت کے تحت ہوتا ہے، اور انسان ثابت قدم رہنے اور پاک صاف ہو جانے سے درجہ بہ درجہ خدا کے پاس واپس پہنچ سکتا ہے۔[57]

کلامِ خدا اور یسوع متحد ہوئے

خدا کا بیٹا یعنی کلامِ خدا تخلیقِ دنیا سے پہلے اُس واحد ذہنی ہستی بنام یسوع سے متحد ہوا جس نے گناہ نہیں کیا تھا۔ جس طرح لوہا آگ کے ساتھ ایک ہو کر سرخ ہو جاتا ہے اُسی طرح کلام نے یسوع میں سرایت کی۔ پھر یسوع نے کنواری مریم کے ذریعے انسانی جسم اپنا لیا، ایسا جسم جو خدا نے مقدّس بنایا تھا۔

کلام اور انسان یوں متحد ہوئے کہ وہ یسوع میں الگ الگ رہے۔ خود کلام دُکھ نہیں سہتا تھا بلکہ صرف یسوع کا انسانی پہلو۔ اور کلام نہ صرف مسیح میں تھا بلکہ ساتھ ساتھ پہلے کی طرح پوری کائنات میں کارفرما تھا۔ نیز، وہ مسیح کا اِس دنیا میں انسانی وجود بھی تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اِس کا عروج مسیح کا جی اُٹھنا تھا جب وہ مکمل طور پر جلالی اور الٰہی ہوا۔[58]

سب کچھ بحال ہو جائے گا

مسیح سب کو سب کچھ ہو گیا ہے تاکہ خدا سب میں سب کچھ ہو جائے۔ اورِغین درمیانی افلاطونیت کی طرح تصور کرتا ہے کہ جو کچھ آبشار کی طرح خدا سے نکل آیا ہے وہ ترقی کرتے کرتے آخر میں خدا کے پاس واپس پہنچے گا۔ آخرکار سب کچھ ابلیس اور شیاطین سمیت بحال ہو جائے گا۔ یہ صرف یوں ہو سکتا ہے کہ دنیا بار بار وجود میں آ جائے۔ اِس طریقے سے روحوں کو بار بار پاک صاف ہو جانے کا موقع ملتا ہے، اور آخر میں سب کچھ بحال ہو کر خدا کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔[59]

مختلف درجے کے ایماندار ہوتے ہیں

اورِغین ایمان داروں میں امتیاز کرتا ہے۔ سادہ ایمان دار سمجھتے ہیں کہ خدا خالق اور منصف ہے اور کہ مسیح مریضوں کا علاج کرنے آیا ہے[60] جس نے اپنے آپ کو انسان کی جگہ قربان کیا تاکہ اپنی جان سے ابلیس کو تاوان دے کر انسان کو آزاد کرے۔ عام ایمان دار اِس گروہ میں شامل ہیں۔[61]

لیکن اِن کے علاوہ حقیقی روحانی کلیسیا کے مقدسین بھی ہوتے ہیں۔ اِس گروہ کے لوگ روح القدس میں کلامِ خدا کی تربیت اور قربت سے عرفان اپنا کر مسیح کی مانند بنتے جاتے ہیں۔[62] کلیسیا میں یہ دونوں گروہ شامل ہیں۔

اورِغین سے سبق

اورِغین کلیسیا کا پہلا بڑا عالِم ہے۔ اُس میں یونانی علوم اور ایمان کا پختہ اتحاد ہے۔ خاص کر اُس کی متن پر محنت قابلِ تعریف ہے۔ کیونکہ لازم ہے کہ ہمیں کلام کے متن پر پورا اعتبار ہو اور کہ ہم اپنا ایمان دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

تاہم اُس کے خیالات پر غور کر کے سوال اُبھر آتا ہے کہ کیا وہ ایمان کی بنیاد پر رہ گیا ہے؟ گو وہ کلامِ مقدّس کے حوالجات دیتا رہتا ہے تو بھی بہت سی باتیں کلام سے بڑھ کر ہیں۔ کیوں؟ اِس لئے کہ وہ درمیانی افلاطونیت کی عینک پہن کر کلام کو پڑھ لیتا ہے۔ تفسیر کا مجازی طریقہ اِس میں اُس کی مدد کرتا ہے۔ کیونکہ اِس سے وہ ایسی باتیں اخذ کر لیتا ہے جو لفظی طور پر کہیں بھی نظر نہیں آتیں۔

اُس کی غلطیاں سمجھنا لازمی ہے، کیونکہ آج تک بہت سے لوگ اورِغین کے سے نمونے پر چلتے آئے ہیں۔

خالق کا نیک کردار

اورِغین کے خیالات کا مقصد اچھا ہے۔ عرفانیت نے مادی دنیا اور اُس کے خالق کو گھٹیا قرار دیا تھا۔ اِن کے برعکس اورِغین کلیمینس کی طرح فرماتا ہے کہ سب کچھ ایک

ہی الٰہی ذات سے پیدا ہوا۔ یہ الٰہی ذات نیک ہے، اور اُس کا دنیا کو بنانے کا مقصد بھی اچھا ہے۔ کیونکہ اِس سے وہ انسانی روحوں کو تربیت دے کر دوبارہ اپنے پاس واپس لانا چاہتی ہے۔

تخلیقِ دنیا ایمان کا اٹوٹ حصہ ہے

لیکن اورِغین درمیانی افلاطونیت کی سوچ رکھتا ہے البتہ اُسے مسیحی جامہ پہنا کر۔ اور یہ افلاطونی خیال کہ سب کچھ آبشار کی طرح الٰہی ذات سے نکل آیا ہے اور اُسی میں واپس آئے گا کلام کی گواہی کے خلاف ہے۔ کائنات خدا سے نہیں نکلی بلکہ اُس سے خلق ہوئی۔ جہاں کچھ نہیں تھا وہاں اُس کے حکم پر دنیا وجود میں آئی۔ بے شک اورِغین مانتا ہے کہ سب کچھ کلامِ خدا سے پیدا ہوا۔ تاہم اُس کی درمیانی افلاطونیت سے قربت اُسے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ سب کچھ آبشار کی طرح الٰہی ذات سے نکلی ہے۔ اور یہ بھی افلاطونیت کے مطابق ہے کہ آخرکار سب کچھ شیاطین سمیت پاک صاف ہو کر دوبارہ خدا کے ساتھ ایک ہو جائے گا۔ اِس کے برعکس کلام فرماتا ہے کہ آخرت کے بعد بھی خالق اور مخلوق میں فرق رہے گا۔ یہ خیال کہیں نہیں ملتا کہ سب کچھ پاک صاف ہو کر دوبارہ خدا کے ساتھ ایک ہو جائے گا بلکہ ابدی سزا کا ذکر کئی حوالوں میں ملتا ہے، گو کلام کا زور خدا کے فضل اور محبت پر ہے۔

پہلے گناہ کا عمل بھی افلاطونی سوچ کے تحت تبدیل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اورِغین کے نزدیک گناہ کا سلسلہ باغِ عدن میں شروع نہ ہوا بلکہ تخلیقِ دنیا سے پہلے ہی۔

فلسفہ کا فائدہ اور نقصان

اورِغین کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت سی باتیں پیش کرتا ہے جو کلام میں بیان نہیں کی گئیں۔ یہ حقیقت مسیح کے بارے میں تعلیم پر بھی صادق آتی ہے۔ تو بھی ہم اُسے پورے طور پر رد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو باتیں اُس نے مسیح کے بارے میں پیش کیں وہ بعد میں تثلیث اور مسیح کے عقیدوں کی تشکیل کے لئے اہم بن گئیں۔ یوں نہیں

کہ اُس کی تعلیم اپنائی گئی بلکہ یوں کہ اُس کی باتوں نے عقیدوں کے لئے راستہ دکھایا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے ترتیب وار نظام کی صورت میں اور تفصیل سے تثلیث اور مسیح کا کردار بیان کیا۔

مختلق درجوں کے ایماندار نامنظور

یہ خیال کہ کلیسیا میں عرفانیوں کا خاص دائرہ ہوتا ہے قابلِ مذمت ہے۔ بے شک سمجھ اور عرفان کے لحاظ سے ایمان داروں میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اُن میں امتیاز کرنا ہمارا کام نہیں۔ البتہ اورِغین کم از کم عام ایمان داروں کو کلیسیا میں شامل سمجھتا ہے۔

صلیبی موت کی بنیادی اہمیت

نیز، لگتا ہے کہ عرفان پر زور دینے کی وجہ سے اورِغین مسیح کی صلیب پر قربانی کو وہ مرکزی اہمیت نہیں دے سکتا جو اُسے حاصل ہے۔ ورنہ وہ نہ فرماتا کہ مسیح کی قربانی نچلے درجے کے ایمان داروں کی خاصیت ہے۔ یہ بات اِس میں بھی نظر آتی ہے کہ اُس کے نزدیک انسان کو مسیح کی صلیبی موت سے پوری نجات نہیں ملتی بلکہ اُس متواتر تربیت سے جو دنیا کے بار بار وجود میں آنے سے ملتی رہتی ہے۔ آخر میں مسیح کی قربانی کی کیا ضرورت ہے اگر الٰہی ذات کے پاس آنے کا مرکزی طریقہ عرفان اور تربیت ہے؟

غرض، اورِغین میں کافی باتیں پائی جاتی ہیں جو تنقید کے لائق ہیں۔ تاہم مناسب نہیں کہ اُس کی حد سے زیادہ نکتہ چینی کریں۔ کیونکہ وہ ایک زمانے میں رہتا تھا جب یہ چیزیں تازہ تازہ تھیں۔ یہ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جیتے جی بدعتی نہ ٹھہرا۔ دوسرے، اُس نے تثلیث اور مسیح کے کردار کے بارے میں بحث مباحثہ کا راستہ تیار کیا۔ کیونکہ بعد میں جب آریُس کی بدعت پھیلنے لگی تو ایمان کا دفاع کرنے والوں نے اُس کی باتوں سے مدد لی، اگرچہ اُس کا پورا نظام آخرکار بدعتی قرار دیا گیا۔

لگتا ہے کہ اورِغین نے علمِ الٰہیات کے جتنے راستے نکالے اُتنے ہی مسئلے بھی کھڑے کئے۔ اُس میں کئی عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں، اور جو سوالات اُس نے پیدا کئے اُن کے جواب دینے میں بعد کی نسلیں مصروف رہیں۔ کیونکہ خود اورِغین کے اکثر جواب مقبول نہ ہوئے۔

بدعتی توحید پر لوگوس کی تعلیم کا غلبہ

دوسری صدی کے اختتام پر توحید پر زور

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوسری اور تیسری صدی میں ایمان دار کا خدا کی ذات پر دھیان بڑھنے لگا۔ چنانچہ لوگ اِس پر بحث کرنے لگے کہ اگر خدا ایک ہی ہے تو باپ، بیٹے اور روح القدس کے کیا کیا کردار ہیں؟ نیز، اِن کا کائنات کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ایرینیُس نے نجات کی بہ تدریج راہ کی تعلیم سے اِس کا جواب دیا جبکہ اسکندریہ کے بزرگوں نے کلامِ خدا (لوگوس) کی تعلیم سے اِس کا حل نکالا۔ اِس سے کلام کا ایک پہلو تیزی سے چمکنے لگا جو اب تک زیادہ سامنے نہیں آیا تھا یعنی خدا کی وحدت میں کثرت۔

ساتھ ساتھ دوسری صدی کے اختتام سے ایک اَور رجحان بھی شروع ہوا۔ اب لوگ توحید پر زور دینے لگے۔ یہ کیوں؟ عرفانیت کے مطابق پرانے عہدنامے کا "واحد خدا" اور نئے عہدنامے کا "نیک خدا" فرق ہستیاں ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جواب میں کلیسیا اِس پر اصرار کرنے لگی کہ ایک ہی خدا ہے، اور کہ اِسی کے وسیلے سے دنیا کی تخلیق بھی ہوئی اور نجات کی راہ بھی تیار ہوئی۔

لیکن اگر ایک خدا ہے تو اُس کا کیا کردار ہے؟ آخر دیگر کئی ایک مذاہب ایک ہی اعلیٰ الٰہی ہستی کی تعلیم دیتے ہیں، گو اُس کے تحت دیگر الٰہی طاقتیں ہوتی ہیں۔ کیا مسیح اور روح القدس بھی ایسی الٰہی ہستیاں ہیں جو خدا کے تحت کام کرتی ہیں؟ اور اگر نہیں تو کیا وہ الٰہی ذات میں شامل یا مخلوقات ہیں؟

یہ بال کی کھال نکالنے والی بات نہیں تھی، بلکہ ایمان دار کی نجات اِس پر مبنی ہے۔ اگر مسیح حقیقی معنوں میں الٰہی ذات نہ ہو تو پھر اُس کی صلیب پر قربانی کس طرح ہمارے لئے نجات کا باعث بن سکتی ہے؟ عام آدمی اپنی جان دینے سے کسی دوسرے کو نجات نہیں دے سکتا، چاہے وہ کتنا پاک صاف کیوں نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف اگر وہ الٰہی ذات ہو تو توحید کس طرح قائم رہتی ہے؟

چنانچہ کلیسیائی بزرگ بڑے دھیان کے ساتھ اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے لگے۔ سوال یہ تھا کہ ہم کلامِ خدا یعنی مسیح کا کردار کس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح کا نجات بخش کام قائم رہے اور ساتھ ساتھ توحید ختم نہ ہو جائے یعنی کہ دو یا تین خدا نہ ہوں؟

تبنیت اور سبیلیت نے اُنہیں اِس کا ٹھوس جواب دینے پر مزید مجبور کر دیا۔ کیونکہ اِن بدعتوں نے وعدہ کیا کہ ہم نے اِس سوال کا سادہ سا حل نکالا ہے، ہماری تعلیم اپنانے سے آپ دو خداؤں کی تعلیم سے بچے رہیں گے۔

تبنیت بولی، ”مسیح صرف انسان ہے، لٰہذا خدا ایک ہی ہے۔“

سبیلیت نے فرمایا، ”مسیح خدا کی دوسری صورت ہے، لٰہذا خدا ایک ہی ہے۔“

جواب میں کلیسیا کے بزرگوں نے توحید پر زور دیا۔ لیکن کلیسیائی سطح پر بھی ایک بڑی تبدیلی آئی۔ اورِغین جیسے لوگ بہت سی باتیں کر سکتے تھے جو کلامِ مقدّس میں نظر نہیں آتیں، کیونکہ اُن کے انفرادی خیال زیادہ تر کلیسیائی سطح پر نہیں آئے تھے۔ نیز، چونکہ یہ باتیں نئی نئی تھیں، اِس لئے وہ ایک طرح سے آزادی سے اپنے خیالی گھوڑے دوڑا سکتے تھے۔ لیکن اب اورِغین کے شاگرد بشپ بن کر اُس کے خیالات پوری اُمّت میں پھیلانے لگے۔ چنانچہ اب سے اُس کی تعلیم دوسروں کی تعلیم کے ساتھ ٹکرانے لگی۔ اب سے یہ نہ صرف کسی کا انفرادی خیال رہی بلکہ اُس کا کلیسیا پر بھاری اثر پڑ گیا۔

منفی طور پر یہ ہوا کہ آخرکار اورِغین کی کئی باتوں کو رد کر دیا گیا۔ لیکن مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ اورِغین کی کلامِ خدا کے بارے میں تعلیم بدعتی خطروں سے پاک صاف ہو کر تبنیت اور سبیلیت پر غالب آنے میں مددگار ثابت ہوئی۔

تبنیت کی توحید: مسیح کو بیٹا بنایا گیا

تبنیت کا لفظی مطلب ”اپنا بیٹا (بِن) بنانا، متبنّٰی بنانا“ ہے۔ تبنیت کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مسیح خدا نہیں بلکہ انسان ہے جسے خدا نے اپنا بیٹا بنا دیا۔ یعنی وہ روح القدس کی مدد سے معجزے اور دیگر عظیم کام کرنے کے قابل بن گیا۔

تھیُودوط چمڑا رنگنے والے کی مثال لیجئے۔ وہ فرماتا ہے کہ

- سب کچھ واحد خدا سے خلق ہوا۔
- یسوع خدا کے ارادے سے کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پہلے وہ عام سا انسان تھا گو دین کے لحاظ سے کامل۔ لیکن جب یوحنا نے اُسے بپتسمہ دیا تو روح القدس اُس پر آ گیا، اور وہ مسیح بن کر عظیم اور معجزانہ کام کرنے لگا۔
- چنانچہ مسیح خدا نہیں بلکہ ایک عظیم انسان ہے جس نے خدا کے قوی کام کئے۔
- نہ کلامِ خدا (لوگوس) ازل سے خدا میں تھا، نہ وہ خدا باپ سے صادر ہوا۔ نہ وہ تخلیق کا وسیلہ بنا اور نہ مجسم ہوا۔[63]

توحید کو محفوظ رکھنے کے لئے تبنیت سادہ سا حل نکال لیتی ہے۔ وہ یسوع کو صرف انسان ٹھہراتی ہے، البتہ ایسا انسان جسے خدا نے معجزے کرنے کا اختیار دیا اور جسے اُس نے موت کے بعد آسمان پر اُٹھا لیا۔

یہ خیال کہ مسیح صرف بااختیار انسان ہے کلام کی گواہی کے سراسر خلاف ہے۔ نیز، اگر ایسا ہوتا تو وہ کس طرح ہماری نجات کا باعث بن سکتا؟ کلیسیا نے بڑی سختی سے یہ بدعت رد کر دی۔

سبیلیت کی توحید : خدا کی تین صورتیں ہیں

سبیلیت بھی توحید کے نام میں کلامِ خدا کا خیال دُور کر لیتی ہے۔ لیکن تبنیت کے برعکس وہ مسیح کو انسان نہیں بلکہ خدا کی دوسری صورت قرار دیتی ہے۔

اِس تعلیم کا بانی سبیلیُس تھا۔ اُس کے مطابق خدا نے باپ کی صورت میں کائنات کو خلق کیا اور بیٹے کی صورت میں مسیح کا نجات بخش کام سرانجام دیا۔ مسیح کے جی اُٹھنے کے بعد وہ روح القدس کی صورت میں نازل ہوا۔[64]

توحید کو محفوظ رکھنے کے لئے سبیلیت تبنیت کے اُلٹ بات پیش کرتی ہے۔ مسیح انسان نہیں بلکہ خدا کی دوسری شکل ہے۔ روح القدس خدا کی ایک تیسری شکل ہے۔ لیکن یہ بات بھی کلام کے خلاف ہے۔ باپ، بیٹے اور روح القدس میں صاف فرق نظر آتا ہے۔ خدا باپ صلیب پر نہ مُوا بلکہ بیٹا ہی۔ غرض، سبیلیت کی تعلیم ناقابلِ قبول ہے۔

پولس از سمیساط کی توحید : یسوع لوگوس کا مقدِس ہے

پولس از سمیساط انطاکیہ کا بشپ تھا۔ اُس پر نہ صرف بدعت کا الزام لگایا گیا۔ لگتا ہے کہ اُس کی زندگی بھی ٹھوکر کا باعث بن گئی تھی۔ اُس کے مخالفوں نے اُس پر الزام لگایا کہ اُس نے ناجائز دولت جمع کی ہے، نیز وہ مغرور اور دنیاوی ہے۔ اُس نے خطبہ دینے کے لئے کلیسیا میں اونچی جگہ تیار کر رکھی ہے، اور جو اپنے رومالوں کو لہرا کر اُسے شاباش نہ کہیں اُن کی وہ بے عزتی کرتا ہے۔ اُس نے اپنے گھر میں دو خواتین رکھی ہیں، اور وہ باقی خادم الدین کو بھی یہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ غرض لگتا ہے کہ اُس نے امیر حکمران کا سا رویہ اپنا لیا تھا۔[65]

272ء میں پولس از سمیساط کو بڑی مشکل سے کرسی سے ہٹایا گیا۔ تعلیم کے لحاظ سے اُس کی بدعت تبنیت اور سبیلیت سے کچھ فرق ہے۔ لیکن وہ بھی خدا کی وحدت

کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اِس کے لئے وہ کلامِ خدا (لوگوس) کی اپنی تعلیم پیش کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک

- لوگوس واحد خدا میں یوں بستا ہے جس طرح انسان میں عقل۔
- لوگوس ازل سے خدا سے مولود ہے، لہٰذا اُسے بیٹا ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بیٹا الگ اقنوم نہیں ہے۔
- خدا کے ازلی ارادے کے مطابق یسوع انسان کی حیثیت سے کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے وقت لوگوس یسوع میں آ موجود ہوا۔ کس طرح ؟ یسوع مقدِس کی حیثیت رکھتا تھا جس میں لوگوس جا بسا۔
- لوگوس نے اِس انسان یسوع میں یوں سرایت کی کہ وہ خدا باپ کی مرضی کے ساتھ ایک ہو کر معجزے کرنے اور انسان کو نجات دلانے کے قابل بن گیا۔[66]

پولس از سمیساط کی تعلیم ایک قسم کی تبنیت ہے۔ اُس کی توحید کو محفوظ رکھنے کی فکر قابلِ تعریف ہے، لیکن اُس کے حل سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کلامِ خدا انسان یسوع میں یوں بستا ہے جس طرح مقدِس میں تو کیا مسیح نے صرف انسان کی حیثیت سے دُکھ اُٹھایا؟ اگر ایسا ہے تو پھر وہ کس طرح ہمارے لئے نجات کا باعث بن سکا؟

پولس از سمیساط فرماتا ہے کہ کلامِ خدا مسیح سے پہلے نبیوں میں کام کرتا تھا۔ اور لگتا ہے کہ مصنف کے نزدیک کلام اُن میں یوں بستا تھا جس طرح مسیح میں۔ تو کیا مسیح سب سے عظیم نبی سے زیادہ ہے کہ نہیں ؟

پولُس از سمیساط پورا زور مسیح کی انسانیت پر دیتا ہے، اور وہ پوری کوشش سے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ خود مسیح کا کوئی الٰہی پہلو نہیں ہے، لٰہذا اُس کے مطابق کلامِ خدا مسیح سے بالکل الگ ہے، گو وہ اُس میں بستا ہے۔ وہ مسیح کا حصہ نہیں ہے۔

یہ سوچ انطاکیہ کی تعلیم کا پیش خیمہ ہے، گو بعد میں انطاکیہ کے نمائندوں نے سختی سے اُس کے خیالات رد کئے۔

کلیسیا لوگوس کی تعلیم سے مدد لیتی ہے

اِس کا ذکر ہو چکا ہے کہ دوسری اور تیسری صدیوں کے بزرگ خدا کی وحدت میں کثرت کا بیان کرنے لگے۔ جواب میں توحید پر زور دینے والی بدعتوں نے شور مچایا کہ الٰہی ذات میں کثرت نہیں ہو سکتی۔ اِس ردِعمل نے کلیسیا کی آنکھوں کو اِس کے لئے کھول دیا کہ الٰہی ذات میں کثرت یعنی تثلیث ہمارے ایمان کا لازمی ستون ہے۔ چنانچہ اُس وقت سے تثلیث کے بارے میں بحث مباحثہ چھڑ گیا۔ یہ کش مکش 325ء تک جاری رہی جب عقیدۂ نقایہ قلم بند ہوا۔

بدعتوں پر غلبہ پانے کے لئے کلیسیا نے کلامِ خدا (لوگوس) کی تعلیم سے مدد لی۔

آریُس پر غلبہ

ابتدائی کلیسیا میں ایمان کا اقرار سادہ سا اور انفرادی تھا۔ مثلاً لوگ کہا کرتے تھے کہ ''یسوع (موعودہ) مسیح ہے'' یا ''یسوع خدا کا بیٹا ہے۔'' جب ایمان دار عرفانیت کا سامنا کرنے لگے تو اِس سادہ اقرار کی جگہ ایمان کا تفصیلی عقیدہ آ گیا۔ اب سے ایمان دار نہ صرف اپنا انفرادی اقرار بلکہ ایمان کی وہ تمام بنیادی باتیں پیش کرتا تھا جو اُمّت ناقابلِ گریز سمجھتی تھی۔ اِس سلسلے میں ہم ایرینئیُس کے عقیدے پر دھیان دے چکے ہیں۔[a]

---

[a] دیکھئے صفحہ 146 و مابعد۔

چوتھی صدی میں عقیدے کی نوعیت مزید تبدیل ہوئی۔ اُس وقت قسطنطین نے مسیحی ایمان کو قبول کیا۔ نتیجے میں 313ء میں مسیحیت کو جائز مذہب قرار دیا گیا، اور 380ء یا 381ء میں اُسے رومی بادشاہت کا واحد مذہب قرار دیا گیا۔

یہ اتفاق کی بات نہیں کہ اُس وقت وہ عقیدے تیار ہوئے جو آج تک مسیحیت کی اکثریت مانتی ہے۔ یہ عقیدے کیوں اِتنے پائے دار ثابت ہوئے؟ ایک طرف بادشاہت کے امن و امان کے لئے ضروری تھا کہ پوری کلیسیا کا ایک ہی عقیدہ ہو۔ لٰہذا بادشاہ نے کلیسیائی بزرگوں پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ ایسا عقیدہ تیار کریں جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ دوسری طرف خود کلیسیا نے بدعتوں کے ساتھ جنگ لڑتے لڑتے عقیدے کی اشد ضرورت محسوس کی۔ اِن مجبوریوں کی بھٹی میں وہ عقیدے تیار ہوئے جو آج تک قائم رہے ہیں۔ اِن کی نوعیت پہلے عقیدوں سے فرق ہے کیونکہ یہ بین الاقوامی سطح پر آ گئے ہیں۔ اِسی وجہ سے یہ دنیا بھر ایمان کی کسوٹی بن گئے ہیں۔

اِن میں 325ء اور 381ء کے عقیدے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، وہ عقیدے جنہوں نے آریت کے جواب میں تشکیل پائی۔ ہاں، 60 سال کے دوران آریت کے خیالات سے جنگ کرنے سے ہی کلیسیا تثلیث فی التوحید کا عقیدہ صاف بیان کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ کس طرح کا آدمی تھا جس نے کلیسیا میں اِتنی ہل چل مچائی؟

آریُس کی زندگی

آریُس (قریباً 250ء تا 336ء) اسکندریہ کا خادم تھا۔ روایت کے مطابق وہ لمبا سا اور دُبلا پتلا تھا۔ اخلاقی طور پر وہ ٹھوکر کا باعث نہیں تھا اگرچہ طبیعت کچھ سخت تھی۔ عوام اُسے عزیز رکھتے تھے۔ لیکن تقریباً 318ء میں اُس کا اسکندریہ کے بشپ سکندر کے ساتھ جھگڑا چھڑ گیا جب آریُس نے سکندر کے ایک پیغام کی تنقید کر کے کہا کہ ایک وقت تھا جب خدا بیٹا نہیں تھا، یعنی وہ ازل سے نہیں تھا۔ آریُس تقریباً 336ء میں فوت ہوا، لیکن جھگڑا جاری رہا۔[67]

اگر آریُس اکیلا ہوتا تو جھگڑا جلد ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن اُس کے مختلف ممالک میں بہت ساتھی تھے، اِس لئے یہ بدعت پوری کلیسیا کے لئے خاص خطرے کا باعث بن گئی۔

آریُس: خلق کیا گیا لوگوس مسیح کی روح ہے

آریُس کیا فرماتا ہے؟

خدا ماورائے دنیا ہے

اُس کے نزدیک خدا وہ کچھ ہے جو کائنات نہیں ہے، یعنی اُس کی ابتدا نہیں، وہ کبھی وجود میں نہ آیا، اُسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اور وہ لا تبدیل ہے (اِس میں آریُس یونانی فلسفے سے متفق ہے)۔ چنانچہ اُس کے اقانیم نہیں ہو سکتے۔ کلامِ خدا (لوگوس) بھی اقنوم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ اور حکمت صرف الٰہی ذات کی صفتیں ہیں۔

لوگوس یعنی بیٹا تخلیقِ دنیا سے پہلے خلق ہوا

آگے وہ فرماتا ہے کہ خدا کی صفت سے الگ ایک اَور کلامِ خدا (لوگوس) ہے جو بیٹا بھی کہلاتا ہے۔ بیٹا خدا سے صادر نہ ہوا بلکہ مخلوق ہے، ایک عظیم ترین فرشتہ جسے خدا نے تخلیقِ دنیا سے پہلے بنایا اور جس کے ذریعے خدا نے کائنات کو خلق کیا۔[a] دیگر مخلوقات کی طرح بیٹا بھی ازل سے نہیں ہے بلکہ ایک وقت تھا جب وہ نہیں تھا۔

لوگوس یعنی بیٹا یسوع کی روح کی جگہ آ گیا

آریُس اصرار کرتا ہے کہ یہ بیٹا یعنی کلامِ خدا ایک جسم کے ساتھ متحد ہوا جس کی روح نہیں تھی، یوں کہ کلامِ خدا (لوگوس) روح کی جگہ آ گیا۔ بیٹا ثابت قدم رہا، اِس لئے باپ نے اُسے اپنے فضل سے وہ اختیار دیا جس کے باعث اُسے خدا کہا جاتا ہے، اگرچہ وہ حقیقی معنوں میں خدا نہیں ہے۔

[a] دیکھئے امثال 8:22

مسیح نمونے کا باعث ہے

نتیجے میں مسیح ہماری نجات کا وسیلہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمارے لئے نمونے کا باعث ہے۔[68]

آریُس کا مسئلہ

آریُس بھی توحید پر زور دینا چاہتا ہے۔ اِسی مقصد کے تحت وہ کلامِ خدا (لوگوس) کا خیال قبول تو کرتا ہے، لیکن یوں کہ کلامِ خدا یعنی بیٹا خدا میں شامل نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ نیز، خود مسیح کلامِ خدا نہیں بلکہ صرف اُس کی روح کلامِ خدا ہے۔ اگر مسیح حقیقی معنوں میں خدا نہیں تھا تو پھر وہ ہمارے لئے کس طرح نجات کا باعث بن سکتا تھا؟ جوں ہی آریُس نے اپنی یہ تعلیم پیش کی تو نہی سخت بحث مباحثہ چھڑ گیا۔ آریُس کے رویے نے کلیسیائی آگ میں تیل ڈال دی، کیونکہ خود اُس نے اپنے آپ کو حق بہ جانب سمجھ کر دوسری ہر تعلیم کو بدعت قرار دیا۔ اِس رویے سے کلیسیا صاف صاف جواب دینے پر مجبور ہوئی۔

سوال یہ تھا: کیا مسیح صرف نجات کی تعلیم دے کر مشعلِ راہ ہے جس طرح آریُس فرماتا تھا یا وہ خود ہی نجات ہے؟ کیا مسیح صرف خدا اور دنیا کے درمیان ایسی مخلوق ہے جو نہ خدا اور نہ ہی انسان ہے؟ یا کیا خدا نے "مسیح کے وسیلے سے اپنے ساتھ دنیا کی صلح کرائی"؟[a] کیا مسیح صرف اِس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ اُس نے تخلیق کے کام میں حصہ لیا اور کہ وہ ہمارے لئے اچھے نمونے کا باعث ہے؟ یا کیا وہ ہماری نجات کا وسیلہ بھی بن گیا؟ اِن سوالات کا جواب دینے میں 60 سال گزر گئے۔

ہم آریت کی جنگ تین مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- عقیدۂ نقایہ تک (318ء تا 325ء)
- عقیدۂ نقایہ کی ظاہری شکست (325ء تا 361ء)

[a] ۲۔کرِنتھیوں 19:5

- عقیدۂ نقایہ کی فتح (361ء تا 381ء)

عقیدۂ نقایہ تک (318ء تا 325ء)

کلیسیائی جھگڑا اسکندریہ سے شروع ہوکر پوری کلیسیا میں پھیل گیا۔ سخت بحث مباحثہ کے بعد 325ء میں نقایہ کی مجلس میں وہ عقیدہ تیار ہوا جس سے کلیسیائی یگانگت بحال ہوئی اور آریُس کو بدعتی قرار دیا گیا۔ اگرچہ خود قسطنطین نے عقیدہ تیار نہ کیا، لیکن اُسی نے یہ مجلس منعقد کی، اور اُسی نے اصرار کیا کہ پارٹیاں یہ عقیدہ تکمیل تک پہنچائیں۔

عقیدۂ نقایہ (325ء): مسیح اور باپ کا ایک ہی جوہر

عقیدۂ نقایہ آریت کے جواب میں قلم بند ہوا۔ اُس میں لکھا ہے،

> ہم ایمان رکھتے ہیں ایک ہی خدا قادرِ مطلق باپ پر، جو تمام دیکھی اور اَن دیکھی چیزوں کا خالق ہے۔
>
> ہم ایمان رکھتے ہیں ایک ہی خداوند یسوع مسیح پر، جو خدا کا بیٹا ہے، باپ سے مولود اکلوتا، یعنی باپ کے جوہر سے، خدا سے خدا، نور سے نور، حقیقی خدا سے حقیقی خدا، مخلوق نہیں بلکہ مولود۔ اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔ اُس کے وسیلے سے تمام چیزیں بنیں، آسمان کی ہوں یا زمین کی۔ وہ ہم آدمیوں اور ہماری نجات کے واسطے اُتر آیا اور مجسم ہوکر انسان بنا۔ اُس نے دُکھ اُٹھایا اور تیسرے دن جی اُٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا۔ وہ زندوں اور مُردوں کی عدالت کے لئے آنے والا ہے۔
>
> ہم ایمان رکھتے ہیں روح القدس پر۔[69]

نقایہ کے مطابق بیٹا حقیقی خدا اور باپ سے مولود ہے۔اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر[a] ہے۔ ایسے بیانات سے صاف کہا گیا ہے کہ بیٹا مخلوق نہیں بلکہ الٰہی ذات ہے، کہ بیٹا نہ صرف خدا کی مانند بلکہ خود خدا ہے۔

یہ خیال کہ مسیح کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے بعد میں بہتوں کے لئے ٹھوکر کا باعث بن گیا۔ بعد کی کلیسیائی کش مکش اِسی جملے پر چھڑ گئی۔[70]

عقیدۂ نقایہ کی بظاہر شکست (325ء تا 361ء)

یاد رہے کہ مشرق میں اکثر بزرگ اورِغین کے شاگرد تھے، اور وہ اورِغین کی یہ تعلیم چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ الٰہی ذات میں تین اقانیم ہیں۔ اُن کے نزدیک نقایہ کا مذکورہ جملہ اقانیم کا خیال رد کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ابھی تک آریُس کی طرف مائل رہے۔ نتیجے میں عقیدۂ نقایہ کے باوجود اُن کے اور اسکندریہ کے نئے بشپ اتھناسیُس کے درمیان کھینچا تانی جاری رہی۔ جب تک قسطنطین زندہ تھا عقیدۂ نقایہ کو چھیڑا نہ گیا۔ لیکن 337ء میں جب فوت ہوا تو جھگڑا زور سے شروع ہوا۔ بات اِس لئے کئے گنا زیادہ سنجیدہ ہو گئی کہ حکمران کلیسیائی معاملوں میں مداخلت کرنے لگے۔

سیاسی دباؤ کے باعث اسکندریہ کا بشپ اتھناسیُس جو نقایہ کے حق میں تھا جلاوطن ہو کر روم چلا گیا جہاں روم کا بشپ مغربی کلیسیا سمیت اُس کا حامی بن گیا۔ اُس وقت روم اور اسکندریہ کی کلیسیائیں اتحادی بن گئیں۔ تاہم حکومت کی سیاسی پالیسیوں کے باعث نقایہ کی اِس پارٹی کو دبایا گیا۔ خود اتھناسیُس غائب ہو گیا۔ 360ء میں لگتا تھا کہ نقایہ کا عقیدہ ختم ہے۔

لیکن یہ فتح اندر سے کھوکھلی تھی، کیونکہ جلد ہی نقایہ کے مخالفوں کی آپس میں نااتفاقیاں ظاہر ہوئیں، اور وہ تین فرقوں میں بٹ گئے۔ وہ صرف اِس میں متفق رہے کہ نقایہ کا یہ بیان غلط ہے کہ بیٹے کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔[b]

---

[a] (homoousios) ὁμοούσιος
[b] (homoousios) ὁμοούσιος

- پہلا فرقہ صاف صاف آریت کے حق میں تھا۔ اُس کے نزدیک بیٹے کا اور باپ کا ایک جوہر نہیں ہے۔[a]

- دوسرا فرقہ آریت کے قریب تھا۔ اُس کے نزدیک مسیح صرف باپ کی مانند ہی ہے۔[b] اتحاد کے نام میں وہ مسیح کے جوہر کے بارے میں ہر بیان منع کرتے تھے۔ قسطنطین کے جانشین قسطانطیُس کو یہ پارٹی منظور ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بادشاہت میں امن و امان چاہتا تھا۔ چونکہ عقیدۂ نقایہ شدید جھگڑے کا باعث بن گیا تھا اِس لئے بادشاہ نے اُسے رد کیا۔ اِس کے بجائے دوسری پارٹی کا بیان زیادہ معقول لگتا تھا، کیونکہ وہ اِتنا لچک دار اور وسیع تھا کہ زیادہ تر ایمان دار اِس کے تحت آ سکتے تھے۔ بادشاہ نے اندازہ لگایا کہ اِسی سے جھگڑا زیادہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔

- تیسرا فرقہ آریت سے زیادہ دُور تھا۔ اُس کے نزدیک بیٹا جوہر کے لحاظ سے باپ کی مانند ہی ہے۔[c] گو یہ فرقہ نقایہ کے زیادہ قریب تھا، لیکن اُس کی فکر یہ تھی کہ نقایہ تین اقانیم کا انکار کرتا ہے، ہاں کہ اُس میں سبیلیت کا خطرہ پایا جاتا ہے۔

- اِن تین فرقوں سے الگ چوتھا فرقہ نقایہ کے حق میں تھا۔

عقیدۂ نقایہ کی فتح (361ء تا 381ء)

لگتا تھا کہ نقایہ کا عقیدہ ختم ہے، کیونکہ بادشاہ نے 360ء میں اُسے منسوخ کر کے مذکورہ دوسرے فرقے کی تعلیم جائز قرار دیا تھا۔ تاریخ کے اِس نازک موڑ پر ایک واقعہ

[a] ἀνόμοιος (anhomoios)
[b] ὅμοιος (homoios)
[c] ὁμοιούσιος (homoiousios)

ہوا جس سے پورے حالات تبدیل ہوئے۔ 361ء میں مسیحیت کا مخالف یولیان مرتد بادشاہ بن گیا۔ چونکہ وہ کلیسیائی باتوں میں مداخلت نہیں کرتا تھا اِس لئے کلیسیا کو صلح کرانے کا سنہری موقع مل گیا۔ نتیجے میں 362ء میں اثناسیُس اسکندریہ میں صلح کی مجلس منعقد کرنے میں کام یاب ہوا۔ اثناسیُس کا عظیم کردار اِس میں نظر آتا ہے کہ اُس نے پہچان لیا کہ بنیادی طور پر عقیدۂ نقایہ کے حامی اور مذکورہ تیسرا فرقہ متفق ہیں۔ لہٰذا وہ سمجھوتا کرنے کے لئے تیار تھا۔ نتیجے میں دونوں پارٹیاں متحد ہو جانے میں کام یاب ہوئیں۔

اسکندریہ کی مجلس میں فرمایا گیا کہ تین اقانیم کی تعلیم منظور ہے اگر یہ نہ کہا جائے کہ ذات کے تین جوہر ہیں یا کہ تین خدا ہیں۔ اِس سمجھوتے سے اقانیم کا جو خیال تیسرا فرقہ لازمی سمجھتا تھا نقایہ کی تعلیم میں داخل ہوا۔ ہاں، اب تین اقانیم کے بارے میں کپدُکیہ کے بزرگوں کی تعلیم کے لئے راستہ کھل گیا کہ ذات کا ایک جوہر اور تین اقانیم ہیں۔ نتیجے میں کلیسیا کی تثلیث فی التوحید کے بارے میں تعلیم مزید مضبوط ہو گئی۔

اسکندریہ کی مجلس کا ایک اَور نتیجہ نکلا۔ اُس میں پہلی دفعہ یہ مانا گیا کہ روح القدس کا اور باپ کا بھی ایک ہی جوہر ہے۔ اور اِس کا مقصد ظاہر ہے۔ جو کڑوی نااتفاقی خدا بیٹے کے کردار کے بارے میں پیدا ہوئی تھی اُس سے بچنا تھا۔ اثناسیُس جانتا تھا کہ اگر اِس بات پر جلد ہی اتفاق نہ ہو جائے تو کلیسیا میں دوبارہ جھگڑا شروع ہو جائے گا، اِس بار روح القدس کے بارے میں۔

اِس سمجھوتے سے نقایہ کی پارٹی اِتنی مضبوط ہوئی کہ 381ء میں قسطنطنیہ کی مجلسِ عامہ میں عقیدۂ نقایہ کی تصدیق ہوئی۔[a] 71

---

[a] یاد رہے کہ نقایہ کا جو عقیدہ اکثر کلیسیاؤں میں استعمال ہوتا ہے اُس کا پورا نام نقایہ اور قسطنطنیہ کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ 451ء کے عقیدے میں شامل کیا گیا، اور گو ایک دو باتیں فرق ہیں لیکن اصلی عقیدۂ نقایہ سے ملتا جلتا ہے۔

اَتّھاسیُس : انسان کو لافانی بنانے کے لئے مسیح انسان بن گیا

قسطنطین بادشاہ کے وقت سے مسیحی ایمان حکومت کا معاملہ بن گیا تھا۔ بادشاہ کئی دفعہ کلیسیائی جھگڑوں میں مداخلت کرنے لگا۔ چونکہ کلیسیائی تنازع بادشاہت کے امن اور اتحاد کے لئے خطرناک تھا اِس لئے لازم تھا کہ مسیحیت کے بڑے مرکزوں کے بیچ میں اتفاق رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے آریت کے تنازع میں مداخلت کی۔ لیکن اگر بادشاہت کی مرضی پوری ہوتی تو نقایہ کا عقیدہ آریت کے زیادہ قریب ہوتا۔ کیونکہ حکومت کی کوشش یہ رہی کہ امن کے نام میں آریُس اور اُس کے سب سے سخت مخالف اتھاسیُس کو رد کر کے ایسا عقیدہ قلم بند کرے جو سب سے زیادہ لوگوں کو شامل کرے۔

کیا وجہ ہے کہ ایسا نہ ہوا؟ یہ خاص کر ایک آدمی کا کام تھا یعنی اتھاسیُس از اسکندریہ (296ء تا 373ء) کا جسے اپنے ایمان کے باعث بار بار وطن سے نکالا گیا لیکن جو بڑے عزم کے ساتھ اپنے ایمان پر قائم رہا۔ اتھاسیُس ہمیں آج بھی یاد دلاتا ہے کہ کلیسیا کی یگانگت صرف اور صرف ایمان کی سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایمان دار یگانگت کے نام میں کلام کی سچائی کی کانٹ چھانٹ کریں۔ اُمّت کی حقیقی یگانگت صرف اور صرف سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ اتھاسیُس اِس ناتے سے ایرینیُس کی بنیاد پر چلتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایرینیُس نے عرفانیت کا سامنا کیا تھا، ایسی تعلیم کا جس نے کائنات کی دنیا بُری قرار دے کر انسان کی اِس سے آزادی اپنے ایمان کا مرکز بنا دیا تھا۔ ایرینیُس نے جواب میں کیا کِیا تھا؟ اُس نے کلامِ مقدّس کو ایمان کی کسوٹی بنا کر خدا کے بارے میں وہ کچھ بیان کیا تھا جو اُس میں قلم بند ہے۔ یہ کرنے سے خدا باپ اور مسیح کے کردار خود بہ خود سامنے آئے۔

عرفانیت نے خالق کو گھٹیا قسم کا دیوتا قرار دیا تھا، لیکن کلام کی تیز روشنی میں اُس کا عظیم کردار سامنے آیا۔ مسیح کا جو کردار عرفانیت نے پیش کیا وہ نمونے اور مشعلِ راہ

سے زیادہ نہیں تھا، لیکن کلام میں حوالہ بہ حوالہ اُس کے نجات بخش کام زور سے نظر آئے۔ غرض کلام کی تیز دھوپ میں عرفانیت کی گھنی دُھند بکھر گئی۔

یہی کچھ اتھاناسیُس کے زمانے میں دہرایا گیا۔ جہاں عرفانیت نے خدا باپ کا کردار گھٹیا قرار دیا وہاں آریت نے خدا بیٹے کا کردار خدا سے کم ٹھہرایا۔ دونوں اپنے اپنے زمانے کے مروجہ فلسفوں کی بنا پر اپنے نکتۂ نگاہ تک پہنچ گئے تھے جبکہ ایرینیُس اور اتھاناسیُس کا ایمان کلام پر مبنی تھا۔ کلامِ مقدّس پر ہی اصرار کرنے سے وہ اُمّت کو ایمان کی طرف واپس لائے۔ کیونکہ دونوں نے پہچان لیا کہ کلام سے دُور کھینچنے والی اِن نظریات سے وہ نجات جاتی رہے گی جو مسیح کی صلیبی موت سے ملتی ہے۔

آ یئے ہم اتھاناسیُس کے مرکزی خیالوں پر نظر ڈالیں۔ چونکہ اُس کے نزدیک ہر تعلیم کو کلامِ مقدّس کی کسوٹی پر رکھنا ہے اِس لئے ایمان کی تین چیزیں لازمی ہیں:

خدا باپ اور بیٹا جوہر اور رُتبے کے حساب سے ایک ہیں

اتھاناسیُس کے نزدیک خدا نہ صرف سب سے اعلیٰ ہستی یا اصول ہے بلکہ باپ ہی ہے۔[72] سب سے اعلیٰ چیز باپ کی الوہیت نہیں ہے بلکہ یہ کہ خدا باپ ہے۔ اور چونکہ وہ باپ ہے اِس لئے بیٹا بھی الٰہی ذات میں شامل ہے، یعنی دونوں کا ایک ہی جوہر ہے گو دونوں میں صاف طور پر امتیاز کرنا ہے۔ یوں بیٹا نہ صرف الٰہی ذات سے صادر ہوا بلکہ وہ ازل سے اُس میں موجود بھی ہے۔ تو بھی اتھاناسیُس کا مطلب یہ نہیں کہ باپ اور بیٹا ایک ہی خدا کی دو مختلف صورتیں ہیں (بمقابلہ سبیلیت)۔[73]

لوگوس انسانیت کو اپنا کر موت پر غالب آیا

ایرینیُس کی طرح اتھاناسیُس اِس سوال کا جواب دینا چاہتا ہے کہ خدا کیوں انسان بن گیا؟

وہ فرماتا ہے کہ خدا کی نجات دینے والی راہ اُس کے کردار پر مبنی ہے۔ خدا راست اور نیک ہے۔ چونکہ وہ راست ہے اِس لئے لازم ہے کہ گناہ میں گرے ہوئے انسان

کو سزائے موت دے۔ لیکن دوسری طرف اُس نے اپنی نیکی کے باعث انسان کو اپنی لافانی صورت پر بنایا ہے۔ اِس تضاد کو دور کرنے کے لئے لازم ہے کہ کلامِ خدا (لوگوس) انسانیت کے ساتھ ایک ہو جائے۔ صرف اِسی سے خدا کی راستی اور نیکی میں پائے جانے والا تضاد دُور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کلامِ خدا نے مجسم ہو کر یسوع کی انسانیت کو اپنا لیا۔ اِس جلالی اور الٰہی ذات کے باعث مسیح نئی انسانیت کا پہلا پھل بن کر موت میں سے گزر گیا۔ غرض اتھناسیُس کا مرکزِ خیال یہ ہے کہ مسیح صرف انسان کی حیثیت سے موت کی سزا اُٹھا سکا اور صرف خدا کی حیثیت سے اُس پر غالب آ سکا۔[74]

اتھناسیُس کے نزدیک کلامِ خدا نے مجسم ہوتے وقت یسوع کی انسانیت کو یوں مکمل طور پر اپنایا کہ جو بھی خاصیت مسیح کو حاصل ہے وہ کلامِ خدا کو بھی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ وہ دُکھ بھی اُٹھاتا ہے۔[75]

مسیح کی فتح سے فانی انسان لافانی بن گیا

انسان کے گناہ میں گرنے سے پہلے بلکہ ازل سے خدا نے نجات کا منصوبہ رکھا تھا۔ کیونکہ نجات کا منصوبہ نہ صرف اِس لئے وجود میں آیا کہ انسان کو اِس کی ضرورت ہے بلکہ اول اِس لئے کہ خدا نیک ہے۔[76]

اتھناسیُس پہلا کلیسیائی بزرگ ہے جو پولس رسول کا خیال اپنا لیتا ہے کہ مسیح نے انسان کی جگہ گناہ کی سزا برداشت کی۔ یعنی انسان بننے سے کلامِ خدا پر گناہ اور موت کی وہ لعنت آ گئی جس کے حق دار تمام انسان تھے۔ انسان کی حیثیت سے اُس نے اُسے برداشت کیا جبکہ خدا کی حیثیت سے وہ اُس پر غالب آ گیا۔[77]

اتھناسیُس کے مطابق انسان مسیح کے نجات بخش کام سے "الٰہی" یعنی لافانی بن جاتا ہے۔[78] اِس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام انسان خود بہ خود اِن معنوں میں الٰہی بن جاتے ہیں، کیونکہ یہ سلسلہ ایمان پر مبنی ہوتا ہے۔ نیز، گو ایمان دار کو اِس دنیا میں ہی ابدی زندگی حاصل ہے تو بھی وہ دنیا میں رہتے ہوئے روحانی جنگ میں مبتلا رہتا ہے۔ جب

خدا کے پاس ہو گا تب ہی "خدا کو دیکھے گا۔"[79] اثناسیُس نے ایمان دار کی یہ جد و جہد ظاہر کرنے کے لئے 'حیاتِ انتونی' لکھی۔

اثناسیُس سے سبق

الہٰی ذات میں باپ اور بیٹے کا گہرا تعلق

اثناسیُس کی تصانیف میں خدا نہ صرف ایک پھیکی سی نظریہ ہے بلکہ اُس کی راست، نیک اور محبت بھری ذات سامنے آ جاتی ہے۔ خدا نہ صرف انسان سے دور اور الگ تھلگ حکمران ہے بلکہ اُس کی قربت اِس میں اُبھر آتی ہے کہ اُس نے ازل سے انسان کی نجات کا منصوبہ رکھا تھا۔ اِس ذات میں باپ اور بیٹے کا ایک ہی جوہر ہونا لازم ہے۔

انسانیت اپنانے سے ہی مسیح نے ہمیں نجات دلائی

مسیح صرف انسان کی حیثیت سے موت کی سزا اُٹھا سکا اور صرف خدا کی حیثیت سے اُس پر غالب آ سکا۔ صرف اِس سے خدا کی راستی اور اُس کی نیکی کا تقاضا پورا ہو سکتا تھا۔

اُنسانیت اپنانے سے ہی مسیح نے ہمیں لافانی بنا دیا ہے

خدا کی جس لافانی صورت پر انسان بنایا گیا وہ مسیح میں بحال ہو گیا۔ یوں وہ ہمیں خدا کے قریب لایا۔ اِس سے اَور ہمیں کیا چاہئے؟ ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا مفید ہے کہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے ہم ایک جنگ میں مبتلا رہتے ہیں، جس کے لئے جد و جہد کرنا لازم ہے۔

یوں اثناسیُس نقایہ کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے، بلکہ وہ خوب دکھاتا ہے کہ خدا باپ اور بیٹے کی جو ذات کلامِ مقدّس میں بیان ہوا ہے وہ ہماری نجات کے لئے لازم ہے۔

مرسیلس از انقرہ: تثلیث کا عارضی ظہور ہے

اثناسیُس کی طرح مرسیلس (وفات قریباً 374ء) بھی عقیدۂ نقایہ کے حق میں لڑتا تھا۔ لیکن آریت کے خلاف اُس کا جواب فرق تھا۔ آریُس نے کہا تھا کہ کلامِ خدا (لوگوس)مخلوق ہے۔ یہ رد کرنے کے لئے مرسیلس ایرینیُس کا خیال اپنا لیتا ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے ظاہر کیا۔

مرسیلس فرماتا ہے کہ ابتدا میں خدا کا ایک ہی اقنوم تھا۔ کلامِ خدا (لوگوس) اور روح القدس صرف اُس کی ''طاقتیں'' ہیں جن سے وہ دنیا میں کام کرتا ہے۔ چنانچہ کلامِ خدا باپ سے صادر ہوا تاکہ دنیا کو خلق کرے اور بعد میں مسیح میں مجسم ہوا۔ اِسی طرح روح القدس مسیح کے جی اُٹھنے کے بعد ہی باپ اور بیٹے سے صادر ہوا۔[a] لیکن مرسیلس کے نزدیک آخرت کے دن بیٹا اور روح پہلے کی طرح باپ کی ذات میں شامل ہو جائیں گے، جس طرح پولس فرماتا ہے،

> جب سب کچھ مسیح کے ماتحت کر دیا گیا تب فرزند خود بھی اُسی کے ماتحت ہو جائے گا جس نے سب کچھ اُس کے ماتحت کیا۔ یوں خدا سب میں سب کچھ ہو گا۔[b]

تب دوبارہ ایک ہی اقنوم ہو گا۔ غرض مرسیلس کی تثلیث عارضی اور غیر حقیقی ہے۔ مرسیلس کا مقصد قابلِ تعریف تھا، لیکن اُس کی تعلیم ناقص ہے۔ اُس کے مخالفوں نے اُسے سبیلیت کا پیروکار قرار دیا، اور اِس میں سچائی ہے۔ کیونکہ باپ، بیٹا اور روح صرف خدا کی مختلف صورتیں لگتی ہیں۔ اور چونکہ وہ عقیدۂ نقایہ کے حق میں تھا، اِس لئے اِس عقیدے کے تمام نمائندوں پر سبیلیت کا شک پڑ گیا۔[80]

---

[a] یوحنا 22:20
[b] ۱۔کُرِنتھیوں 28:15

نتیجے میں کلیسیا نے سختی سے اُس کی تعلیم بدعتی قرار دی۔ یہ تعلیم یہ بھی دکھاتی ہے کہ کپڈُکیہ کے بزرگوں کی تین اقانیم کے بارے میں تعلیم کتنی ضروری تھی۔

کپڈُکیہ کے تین بزرگ: تین اقانیم کا ایک ہی جوہر

اِس کا ذکر ہو چکا ہے کہ اسکاندریہ کی مجلسِ عامہ میں (362ء) تین اقانیم کی تعلیم منظور ہوئی تھی۔ نقایہ کے عقیدے کی تصدیق کے ساتھ ساتھ یہ بھی مانا گیا تھا کہ جس طرح بیٹے کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے اُسی طرح روح القدس کا اور باپ کا بھی ایک ہی جوہر ہے۔ یہ تعلیم بڑھا کر کپڈُکیہ کے تین بزرگوں نے تثلیث فی التوحید کے عقیدے کو وہ شکل دی جو آج تک مقبولِ عام رہی ہے۔ اُن سے یہ جامع بیان مشہور ہوا کہ تین اقانیم کا ایک ہی جوہر ہے۔ اِس پر مزید دھیان دینے کی ضرورت ہے۔[81]

تثلیث ایک بھید ہے جو صرف کلام کھول سکتا ہے

اورِغین ایمان کو علوم کی روشنی میں لایا تھا، یوں کہ اُس نے سادہ ایمان اور اعلیٰ عرفان میں امتیاز کیا تھا۔ اِس کا خطرہ یہ تھا کہ نام نہاد اعلیٰ عرفان کلام پر مبنی ایمان سے فرق چیز بن جائے۔ اور یہ خطرہ اورِغین کی تعلیم میں پایا بھی جاتا ہے۔ اِس کے برعکس کپڈُکیہ کے بزرگ انسانی سمجھ کو ایمان کی حکومت کے تحت لائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ الٰہی ذات ایک ایسا بھید ہے جو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ اپنی سمجھ کو ایمان کے تحت لا کر وہ اُسے بیان کر سکتا ہے۔ انسان کی محدود سمجھ ایمان کی کسوٹی نہیں بن سکتی بلکہ لازم ہے کہ کلام پر مبنی ایمان انسان کی سمجھ کو الٰہی بھیدوں کے لئے کھولے۔[82]

اورِغین کی طرح آریُس نے بھی اپنی عقل ایمان کی کسوٹی بنا ڈالی تھی۔ کیونکہ اُس نے کہا تھا کہ عقل کے مطابق خدا ایک ہے، اِس لئے ناممکن ہے کہ بیٹا الٰہی ذات ہو۔ جواب میں کپڈُکیہ کے بزرگوں نے فرمایا کہ خدا ناقابلِ سمجھ یعنی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن کلام میں ہمیں ایمان کی وہ کسوٹی ملتی ہے جس کی بنا پر ہم ایک حد تک

اُسے سمجھ سکتے ہیں۔ اُس میں خدا کی ناقابلِ سمجھ ذات تثلیث کی قابلِ سمجھ صورت میں انسان پر ظاہر ہوئی ہے۔ گو خدا کا جوہر[a] ناقابلِ سمجھ ہے لیکن تین اقانیم[b] اِس کا قابلِ سمجھ ظہور ہیں۔[83]

تو پھر یہ تثلیث کس طرح بیان ہو سکتی ہے؟ اورِغین کے ساتھ مقابلہ کرنے سے اِن بزرگوں کا خیال زیادہ صاف نظر آتا ہے۔

تینوں اقانیم ازل سے الٰہی ذات میں موجود ہیں

اورِغین کی تعلیم کے مطابق سب کچھ آبشار کی طرح الٰہی ذات سے صادر ہوا ہے۔ چنانچہ بیٹا باپ سے اور روح بیٹے سے صادر ہوا۔ پھر اِنہی کے وسیلے سے دنیا پیدا ہوئی۔ آبشار کے اِس تصور کے مطابق خدا اور دنیا میں صاف فرق نظر نہیں آتا۔ یہ بات اِس میں بھی نظر آتی ہے کہ آخرکار سب کچھ الٰہی ذات میں واپس لوٹ آئے گا۔ کپڈُکیہ کے بزرگوں نے یہ خیال رد کر کے کہا کہ تین اقانیم الٰہی ذات سے صادر نہیں ہوئیں بلکہ وہ ازل سے الٰہی ذات میں موجود ہیں۔

خدا کی ذات اور ظہور میں امتیاز

کپڈُکیہ کے بزرگ تثلیث کو دو پہلوؤں سے دیکھتے ہیں، پہلے ذات کے پہلو سے اور دوسرے ظہور کے پہلو سے۔[84] ذات کے پہلو سے ہر اقنوم کی اپنی خصوصیت ہے۔ یوں باپ مولود نہیں ہے، بیٹا مولود ہے اور روح القدس بیٹے کے ذریعے باپ سے صادر ہوا۔ بیٹا صلیب پر مُوا جبکہ نہ باپ اور نہ روح القدس موئے۔ لیکن یہ خصوصیات ایسی نہیں ہیں کہ کوئی بھی اقنوم دوسرے کے تابع یا اُس پر منحصر ہو۔ سب برابر، سب ایک ہی جوہر کے ہیں۔

---

[a] οὐσία (ousia)
[b] ὑπόστασις (hypostasis)

ظہور کی نگاہ سے تثلیث ایک ہی ہے۔ نتیجے میں خدا کے ہر کام میں پوری تثلیث یعنی تینوں اقانیم شریک ہیں۔ بیٹا باپ اور روح کے ساتھ ہی نجات دہندہ ہے، روح باپ اور بیٹے کے ساتھ ہی کائنات کا انتظام چلاتا ہے، باپ بیٹے اور روح کے ساتھ ہی انسان کی نئے سرے سے پیدائش سرانجام دیتا ہے۔ یہ کلام کے مطابق بھی ہے۔[a85]

اِس تعلیم سے بزرگ تین خداؤں کے خطرے سے بھی اور سبلیت (خدا کی تین صورتیں) سے بھی بچ جاتے ہیں۔

کپدُکیہ کے بزرگوں سے سبق

یہ حقیقت کہ الٰہی ذات ایک بھید ہے ہمیں اِس سے محفوظ رکھتی ہے کہ ہم خدا کے بارے میں ایسی باتیں کریں جو انسان کی عقل سے باہر ہیں۔ جو کچھ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں وہ کلام میں درج ہے۔ ہر اقنوم کے بارے میں جو خصوصیات ہم بیان کر سکتے ہیں وہ سب کے سب کلام میں درج ہیں۔ خدا نے اُتنا ہی ہم پر ظاہر کیا جتنا ایمان کے لئے درکار ہے۔ اِس سے آگے جانا مفید نہیں بلکہ خطرناک ہے۔ اورِغین کی مثال دکھاتی ہے کہ ایسا کرنے سے بدعت کا خطرہ ہے۔

نیز، اِس بیان سے کہ ایک ہی جوہر کے تین اقانیم ہیں ہمیں ایمان کا ایک جامع اور مختصر فارمولا عطا کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ خدا کے ظہور کے بارے میں خیال سے ایک عملی نتیجہ نکلتا ہے۔ بزرگوں کے نزدیک جب بھی خدا ظاہر ہوتا ہے تو باپ، بیٹا اور روح القدس یعنی پوری تثلیث حاضر ہوتی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ ایمان دار زندگی کے ہر پہلو میں پوری تثلیث کا ذاتی ہاتھ جان سکتا ہے، خواہ وہ دنیا کے حالات، کلیسیا کی صورتِ حال یا انسان کے آپس میں تعلقات پر غور کرے۔ انسان ایسے ایمان کی بنا پر خدا کا ہاتھ اُس کی سزا دینے والی راستی اور نیکی میں، مسیح کی زندگی اور دُکھ میں اور دل کی حرکتوں میں پہچان سکتا ہے۔

---

[a] دیکھئے متی 28:11 بمقابلہ یوحنا 44:6 اور ا۔کُرنتھیوں 3:12۔

چنانچہ تثلیث فی التوحید کی یہ تعلیم نہ صرف ایک خشک نظریہ ہے بلکہ یہ ایمان دار کی پوری زندگی میں سرایت کرتی ہے۔ ایمان دار محسوس کرتا ہے کہ میری پوری زندگی بلکہ پوری دنیا اِس الٰہی ذات سے گھری ہوئی ہے۔ اِس عملی پہلو کی وجہ بھی ہے۔ حقیقت میں اِس کی جڑیں بزرگوں کے فلسفے میں نہیں بلکہ اُن کے گہرے ایمان اور عبادت میں پائی جاتی ہیں۔

عقیدۂ تثلیث کا مقصد

کلامِ مقدّس کی حدود (یعنی نیا اور پرانا عہدنامہ) مقرر کرنے سے تعلیم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اِسی بنیاد پر تثلیث کا عقیدہ تشکیل پا کر کپدُکیہ کے بزرگوں کے زیرِ نگرانی تکمیل تک پہنچ گیا۔

جدید دور میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ غیر ضروری ہے۔ اُن کے نزدیک چونکہ تثلیث فی التوحید یونانی سوچ کی پیداوار ہے، اِس لئے ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔ لیکن کلیسیا کی تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ ایسی نظریات حقیقت سے کہیں دُور ہیں۔ ایسے لوگ نظر انداز کرتے ہیں کہ تثلیث کا عقیدہ گو یونانی ماحول اور زبان میں پیدا ہوا تو بھی اصلی یونانی سوچ سے میلوں دُور ہے۔ یہ کیوں؟

ہمیں اِس کا جواب مسیح کے الٰہی کردار میں ملتا ہے۔ 113ء میں رومی حکمران پلینی نے ایشیائے کوچک کے کچھ مسیحیوں کو گرفتار کر کے اُن کی تعلیم معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے اُن کا جرم اِس میں پایا کہ وہ مسیح کی الوہیت پر اصرار کرتے ہیں۔ جب اُس نے دو خادماؤں کی تفصیل سے پوچھ گچھ کی تو جو باتیں معلوم ہوئیں وہ اُس کے نزدیک بُری قسم کی توہم پرستی تھیں۔ یہی مسیحی ایمان کے بارے میں یونانی بت پرستوں کی سوچ تھی۔ کیونکہ جس طرح پولس رسول نے فرمایا،

> اِس کے مقابلے میں ہم مسیحِ مصلوب کی منادی کرتے ہیں۔ یہودی اِس سے ٹھوکر کھا کر ناراض ہو جاتے ہیں جبکہ غیر یہودی اِسے بےوقوفی قرار دیتے ہیں۔ لیکن جو اللہ کے بُلائے ہوئے ہیں، خواہ وہ یہودی ہوں خواہ یونانی، اُن کے لئے مسیح اللہ کی قدرت اور اللہ کی دانائی ہوتا ہے۔[a]

بے شک یونانی سوچ کے مطابق کچھ بڑی بڑی شخصیات دیوتا بن سکتی تھیں، لیکن ایسے نام نہاد مجرم کو سجدہ کرنا یونانیوں کے نزدیک حماقت تھی۔ تاہم مسیحی ایمان کا مرکز یہی بات رہی ہے کہ مصلوب کیا ہوا انسان بنام یسوع الٰہی ذات بھی ہے۔ مختلف قسم کی مخالفت کے باوجود یہی کچھ حقیقی کلیسیا کی خصوصیت رہی ہے جس کا وہ انکار نہیں کر سکتی۔

دوسرے، اگر کلیسیا یونانی سوچ کے عین مطابق اپنا عقیدہ تیار کرتی تو وہ بلاشبہ کوئی نہ کوئی بدعت اپناتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بدعتیں تثلیث کی مخالف تھیں۔ عرفانیت نے تثلیث کی توحید کا انکار کر کے کہا کہ خدا خالق گھٹیا قسم کا دیوتا ہے جبکہ مسیح اور روح وہی مشعلِ راہ ہیں جن کی ہدایت کے ذریعے انسان مادی دنیا سے رِہا پا سکے۔ اِس کے برعکس تبنیت اور آریت نے بیٹے اور روح کی الوہیت کو رد کیا جبکہ سبیلیت نے تثلیث کی تعلیم کو یوں ختم کیا کہ باپ، بیٹا اور روح ایک ہی خدا کی مختلف صورتیں رہے۔

اِن کے برعکس کلیسیا نے پہلی صدیوں کے مختلف دل کش فلسفوں اور مذہبوں کا سختی سے سامنا کر کے ایسا عقیدہ تشکیل دیا جو کلام کے مطابق تھا۔ معجزہ یہ ہے کہ یہ بے شمار کلیسیائی بحرانوں کے باوجود سرانجام ہوا۔ اور تثلیث کی یہ تعلیم نہ صرف ایک اَور یونانی فلسفہ بن گئی بلکہ تثلیث فی التوحید کے عقیدے میں خدا کا وہ عظیم کردار

---

[a] ۱۔کرِنتھیوں 1:23-24

سامنے آتا ہے جو کلامِ مقدّس میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ جلالی اور زندہ خدا سامنے آتا ہے جو پاکیزہ اور راست ہونے کے ساتھ ساتھ گناہ آلودہ انسان سے محبت رکھتا ہے۔

تثلیث کی جو تعلیم چوتھی صدی میں تکمیل تک پہنچی اُس نے یہ خیال چھوڑ دیا کہ باپ، بیٹا اور روح القدس ظہور یا رُتبے کے لحاظ سے فرق ہیں۔ اب سے خدا کی ذات اور اُس کے ظہور میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اب سے اورِغین کی تعلیم کہ سب کچھ آبشار کی طرح خدا سے صادر ہوا ہے اور اُس کی طرف دوبارہ رجوع کرے گا ناقابلِ قبول ہے۔ تثلیث اور دنیا کے درمیان صاف فرق ہے، لیکن ساتھ ساتھ دنیا کے ہر کام میں خدا کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اور چونکہ اب ہم تثلیث کا ہاتھ دنیا کے ہر کام میں دیکھ سکتے ہیں اِس لئے دنیا نہ صرف منفی چیز ہے۔ یہ نہ صرف وہ جگہ ہے جہاں انسانی روحوں کو پاک صاف کر کے تربیت دی جاتی ہے (اورِغین) بلکہ ایسی جگہ جہاں خدا نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے اور جس میں وہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

* * *

اُس وقت کلیسیا میں ایک نیا سوال اُبھرنے لگا۔ اگر تثلیث اور اِس دنیا میں صاف فرق ہے تو پھر مسیح کا کیا کردار ہے؟ اگر بیٹا دوسرا اقنوم ہے تو پھر وہ کس طرح انسان ہو سکتا ہے؟

باب 12

مسیح کی کیا حیثیت ہے؟ عقیدۂ مسیح کی تشکیل

مسیح کی حیثیت پر نیا دھیان

چوتھی صدی تک کلیسیا کا دھیان زیادہ تر اِس پر تھا کہ خدا کا دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور اُس کا پورا زور اِس پر رہا کہ خدا خالق ہے۔

کلام کے مطابق خالق اور مخلوق کا اتحاد ہے گو گناہ سے رخنہ بیچ میں آ گیا۔ غیر مسیحی خالق اور مخلوق کی یہ سوچ نہیں رکھتے تھے۔ ہم غیر مسیحیوں کا یہ رجحان بدعتوں میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی کوشش یہ رہی کہ خدا کی الوہیت اور اُس کے تخلیق کے کام کے

درمیان خلا پیدا کریں۔ یوں عرفانیت نے خدا خالق کو گھٹیا قسم کا دیوتا قرار دے کر کہا کہ انسان کی روح کو مادی دنیا سے آزاد ہو کر الٰہی ذات کے پاس واپس آنا ہے۔ دوسری طرف آریت کا خدا دنیا سے ماورا ہے، جبکہ بیٹا مخلوق بھی ہے اور تخلیق کا وسیلہ بھی۔ چنانچہ کیا عجب کہ کلیسیا نے بڑے عزم کے ساتھ خدا خالق اور اُس کی مخلوقات کے اتحاد پر زور دیا۔ تثلیت کے عقیدے نے اِس کے جواب میں تشکیل پائی۔ اُس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ تخلیقِ دنیا سے لے کر آج تک خدا کا راست اور نیک ہاتھ باپ، بیٹے اور روح القدس کے ظہور میں دکھائی دیتا ہے۔

جب تثلیث کا عقیدہ تکمیل تک پہنچا تو لوگوں کا رجحان خود بہ خود مسیح کے کردار کی طرف مائل ہوا۔ سوال یہ تھا کہ ایک طرف مسیح خدا کا بیٹا اور تثلیث کا اقنوم ہے۔ دوسری طرف اُس نے انسان بن کر اپنی جان ہمارے لئے دی۔ تو پھر اُس کا کیا کردار ہے؟ اُس کا صلیب پر نجات دینے والا کام صرف اِس لئے موثر تھا کہ وہ الٰہی ہے۔ لیکن خدا کس طرح مر سکتا ہے؟ نیز، مسیح میں ایک الٰہی اور ایک انسانی پہلو ہے۔ لیکن اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

دھیان دیں کہ کلیسیا نے یہ نہ کہا کہ یسوع انسان تھا جو ترقی کرتے کرتے الٰہی ذات بن گیا۔ نہیں، اُمّت کو یسوع مسیح کی انسانی زندگی میں شروع سے لے کر آخر تک اُس کا الٰہی کردار نظر آیا۔ بلکہ اُس کے کردار پر غور کرتے کرتے نئے عہد نامے کا ایک مرکزی خیال نئے سرے سے اُبھر آیا۔ خیال یہ تھا کہ مسیح آسمانی انسان بھی ہے اور نئی تخلیق کا پہلا پھل بھی،[a] وہ واحد ہستی جو انسان اور الٰہی ذات ہونے کے باعث ہی نجات دیتا ہے۔ جب اِس پر بحث ہونے لگی تو سوال اُٹھا کہ انسان اور خدا کس طرح مسیح میں متحد ہو سکتے ہیں؟ مسیح میں خالق اور مخلوق کا اتحاد وجود میں تو آیا، لیکن کس طرح؟ چوتھی صدی سے اِس سوال پر خوب بحث چھڑ گئی۔

---

[a] ۱۔کرِنتھیوں 20:15 و مابعد؛ رومیوں 12:5 و مابعد؛ افسیوں 16:4

اپولینار: غیر مخلوق لوگوس مسیح کی روح ہے

اپولینار (وفات 390ء) سے وہ زمانہ شروع ہو جاتا ہے جب لوگ تثلیث کے عقیدے کی نسبت زیادہ تر مسیح کے کردار پر غور کرنے لگے۔ تثلیث کا عقیدہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا، لیکن اب تک یہ بات صاف نہیں تھی کہ مسیح کیا حیثیت رکھتا ہے؟ وہ کس ناتے سے انسان اور کس ناتے سے خدا ہے؟ اپولینار پہلا شخص تھا جس نے یہ مضمون چھیڑا۔ ہم اُسے بدعتی میافیسیت کا پہلا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپولینار کے وقت سے بدعت اور حقیقی ایمان کی حدود معلوم کرنا مشکل بن جاتے ہیں۔ اپولینار کی مثال لیجئے۔ گو وہ عقیدۂ نقایہ کو مانتا تھا تو بھی اُس کے مسیح کے کردار کے بارے میں خیالات بدعتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہم عصروں نے اُس کی تعلیم کو بدعت قرار دینے میں بہت دیر لگائی۔

اپولینار کی تعلیم کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اِس سوال کا جواب اُس وقت سامنے آتا ہے جب ہم اُس سے پہلے کی تعلیم پر غور کرتے ہیں۔ اُس سے پہلے زیادہ تر لوگ کلامِ خدا (لوگوس) کی الوہیت اور یسوع کی انسانیت میں صاف امتیاز کرتے تھے۔ چنانچہ اثناسیُس نے کہا کہ کلامِ خدا نے یسوع کی انسانیت کو اپنا لیا، جبکہ کچھ نے کہا کہ کنواری کا بیٹا کلامِ خدا کا وسیلہ ہی ہے۔ یہاں تک کہ اورِغین کے مطابق یسوع کی انسانیت لوگوس کی غیر حقیقی صورت ہے۔

ایسے نظریات اپولینار کو سراسر غلط لگتے تھے۔ کیوں؟ اُسے کلامِ مقدّس کی ایک حقیقت نئے سرے سے معلوم ہوئی تھی جو چھپ گئی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ نئے عہد نامے میں کہیں بھی مسیح کا کردار دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ وہ ایک ہی شخصیت ہے۔ یسوع کی انسانیت نہ صرف کلامِ خدا کی غیر حقیقی صورت ہے بلکہ مسیح خدا ہی ہے۔ جب ہم مسیح کو دیکھتے ہیں تو نہ صرف دیکھتے ہیں کہ اُس میں خدا ہے بلکہ یہ کہ وہ خود خدا ہے۔

اپولینار اِس بات پر زور دینے میں حق بہ جانب تھا۔ اور اِس ناتے سے وہ میافیسیت کا بانی ہے۔ میافیسیت کا مطلب ایک ذات ہے (میا+ فیسِس = ایک ذات)۔[a] اپولینار کی میافیسیت بدعتی تھی، لیکن قاری کو یاد رہے کہ میافیسیت کی جائز شکل بھی ہے۔ لازم ہے کہ ہم اُس کی تعلیم کی انتہا پسند شکل اور اسکندریہ کی جائز میافیسیت میں امتیاز کریں۔

اپولینار نے اپنی میافیسی تعلیم کی بنیاد خاص کر کلام کے دو حوالجات پر رکھی، یوحنا 1:14 (کلام یعنی لوگوس مجسم ہوا) اور فلپّیوں 2:5 و مابعد (مسیح انسان بن گیا)۔ اپولینار سوال کرتا ہے کہ کلامِ خدا کس طرح انسان بن گیا؟ ایسا تو نہیں کہ کلامِ خدا اور یسوع کی انسانیت مسیح میں الگ الگ رہتے ہیں (بمقابلہ انطاکیہ کی تعلیم)۔ نہیں، بلکہ یوں کہ دونوں مسیح میں ایک ذات بن گئے۔ اِس کا خلاصہ اور جامع بیان ''کلامِ خدا (لوگوس) کی مجسم ہوئی ایک ہی ذات''[1] ہے۔

لیکن یہاں سے اپولینار کی بدعت شروع ہو جاتی ہے۔ اُس کے نزدیک دو مکمل اور ذات کے حساب سے فرق چیزوں سے ایک انسان تشکیل نہیں پا سکتا۔ لٰہذا مسیح کی انسانیت اور الوہیت دو مکمل چیزیں نہیں بلکہ مسیح کے دو مختلف حصے ہیں۔ کس طرح؟ یوں کہ لوگوس یسوع کی روح کی جگہ آ گیا ہے، یعنی اُس حصے کی جگہ جو انسان کے ارادے اور قیادت کا مرکز ہے۔[2] غرض مسیح حقیقی انسان نہیں ہے۔ اور مسیح میں لوگوس یوں انسانیت کے ساتھ ایک ہو گیا ہے کہ پوری انسانیت الٰہی بن گئی ہے۔[3] اِس لئے مناسب ہے کہ ہم مسیح کی انسانیت کو بھی سجدہ کریں، اور اِسی لئے کنواری مریم حقیقی معنوں میں ''خدا کو جنم دینے والی'' ہے۔[4]

دھیان دیں کہ اِس میں اپولینار کی تعلیم آریُس کی تعلیم سے ملتی جلتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آریُس کے نزدیک کلامِ خدا مخلوق ہے جبکہ اپولینار اُسے غیر مخلوق قرار دیتا ہے۔

---

[a] اِس کے لئے لفظ monophysitism بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن چونکہ خود مسافیسی کلیسیائیں یہ لفظ اپنے لئے استعمال نہیں کرتیں اِس لئے مصنف کا مشورہ ہے کہ اِس سے کترایا جائے۔

اپولینار کے نزدیک لوگوس کا اِس طرح مجسم ہونا لازم تھا تاکہ انسان کو کائنات سمیت نجات مل جائے۔ مسیح میں الوہیت انسانیت کے ساتھ ایک ہو کر ہمیں زندہ کر دیتی ہے، بلکہ یہ الوہیت ہمارے لئے نجات بخش خوراک کی حیثیت رکھتی ہے۔[5] ایسے کئی بیانات میں اپولینار اِس پر پورا زور دیتا ہے کہ مسیح کے نجات بخش کام کا مقصد انسان کی فانیت کو دُور کرنا ہے۔[6] یہی زور بنیادی طور پر میافیسیت میں پایا جاتا ہے۔

اپولینار کا مسئلہ

اپولینار فخر کر سکتا تھا کہ مَیں نے مسیح کی انسانیت اور الوہیت کا معاملہ حل کر دیا ہے۔ میری تعلیم کے مطابق مسیح کی ایک ہی ذات میں الوہیت اور انسانیت دونوں پائی جاتی ہیں۔ نیز، یہ کلام کے مطابق ہے کہ خدا نہ صرف مجسم ہوا بلکہ ہمارے لئے ہی مجسم ہوا۔ مجسم ہونے کا مقصد ہی انسان کی نجات تھی۔ تو پھر اُس کی تعلیم کیوں بدعتی قرار دی گئی؟

جب ہم اپولینار کے مسیح پر نظر ڈالتے ہیں تو اُس کی انسانیت کم اور الوہیت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ کلامِ خدا نے یسوع کی انسانیت کو یوں جذب کر لیا ہے کہ اُس کی انسانیت غائب ہو گئی ہے۔ غرض اپولینار کا خیال دوقیت[a] کے قریب آ جاتا ہے۔ اپولینار کہہ سکتا ہے کہ مسیح کی انسانیت چادر کی طرح ہی ہے جس میں کلامِ خدا لپٹا ہوا ہے۔[7] اور ایسا ہی ہے: کلامِ خدا کی نسبت یسوع کی انسانیت ہلکی پھلکی لگتی ہے۔

یہ بات ایک مرکزی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گریغوری از نزیانزنے ایک جُملہ کسا جو اِس ناتے سے نہایت اہم ہے: جو کچھ اپنایا نہ گیا اُسے نجات حاصل نہ ہوئی۔[8] یعنی لازم تھا کہ کلامِ خدا پوری انسانیت کو اپنائے، ورنہ پورے انسان کو نجات نہ ملتی۔ چونکہ روح انسانیت کا اٹوٹ حصہ ہے اِس لئے لازم تھا کہ لوگوس اُسے بھی اپنائے۔ اِسی بنا سے پورے انسان کو نجات ملتی ہے۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 128۔

یہی وجہ ہے کہ آبائے کلیسیا نے اصرار کیا کہ مسیح کی الوہیت اور انسانیت دونوں مکمل تھیں۔ لازم ہے کہ مسیح مکمل انسان اور مکمل خدا ہو۔ مسیح میں خالق مخلوق کے ساتھ ایک ہوا، اور یہ حقیقت اپولینار کی تعلیم میں صحیح طور پر بیان نہیں ہوتی۔ اُس کے مطابق خالق نے مسیح میں مخلوق کو یوں اپنا لیا کہ مخلوق دب گئی۔ نتیجے میں نجات کا راستہ جادو سے مطابقت رکھتا ہے۔ یعنی کچھ یوں لگتا ہے کہ جس طرح کلامِ خدا نے انسانیت کو جذب کر کے دبایا اُسی طرح خدا مسیح میں جادو کی طرح انسان کو چھوتے ہی نجات دیتا ہے۔

انطاکیہ: مسیح کی دو الگ الگ ذاتیں

اپولینار اور انطاکیہ کا اختلاف

اپولینار کی تعلیم میافیسی تھی۔ یعنی وہ مسیح کی ایک ہی ذات مانتا تھا۔ اب دل چسپ بات یہ ہے کہ اُس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انطاکیہ کا ایک فرقہ وجود میں آیا جو اِس کے اُلٹ سکھاتا تھا۔ اُسے دیوفیسی کہا جاتا ہے۔ دیوفیسی کا مطلب دو ذاتیں ہے (دیو + فیسِس = دو ذاتیں)۔ کیونکہ اُس کا کہنا تھا کہ مسیح کی دو الگ الگ ذاتیں ہیں۔ مسیح کی الوہیت اور انسانیت الگ الگ ذاتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انطاکیہ کا نکتۂ نگاہ اپولینار سے فرق ہے۔ اپولینار کا پورا زور کلامِ خدا کے نازل ہونے پر ہے جبکہ انطاکیہ کا پورا دھیان ابنِ آدم کے اُٹھا لئے جانے پر ہے۔

انطاکیہ کی تعلیم سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم اُس کے طریقۂ تفسیر اور راہِ نجات کے بارے میں سوچ پر دھیان دیں۔

انطاکیہ کا طریقۂ تفسیر

لفظی تفسیر

اورِگین اور اسکندریہ کے باقی علما مجازی تفسیر کے ماہر تھے۔ اِن کے برعکس انطاکیہ کے علما لفظی تفسیر کے قائل تھے۔ جہاں اسکندریہ ہر حوالے کے لفظی مطلب کے پیچھے کئی مجازی معنی نکالتا تھا وہاں انطاکیہ کا پورا دھیان حوالے کے لفظی مطلب پر رہا۔ اُس کے پیروکار متن کے قریب رہ کر اُسے سیاق و سباق اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں سمجھنا چاہتے تھے۔[9]

اصل و سایہ کی تفسیر

پہلی نظر میں تفسیر کا یہ طریقہ ہمارے قریب لگتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اِس کی ایک بڑی وجہ اُن کی دیوفیسی تعلیم تھی۔[10] اسکندریہ کے علما کی طرح وہ بھی قائل تھے کہ کلام کے لفظی معنوں کے اندر روحانی حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ صرف طریقہ فرق تھا۔ جہاں اسکندریہ مجازی طریقہ استعمال کرتا تھا وہاں انطاکیہ اصل و سایہ کی تفسیر سے کام لیتا تھا۔ اِس کے مطابق کلام کی کچھ باتیں دوسری باتوں کی طرف اشارہ کرتی یعنی اُنہیں منعکس کرتی ہیں۔

دھوپ میں ہر چیز کا سایہ ہوتا ہے۔ اور جب ہم کوئی چیز آئینے کے سامنے رکھتے ہیں تو وہ اُس میں منعکس ہوتی ہے۔ اِسی طرح انطاکیہ کے نزدیک کلام کی کچھ چیزوں کا سایہ یا عکس دوسرے حوالجات میں ملتا ہے۔ یوں ہی کلام کے کچھ واقعات، پیش گوئیاں اور شخصیات دیگر واقعات، پیش گوئیوں اور شخصیات کا سایہ یا عکس ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر میکا 1:4 و مابعد اور 5:1-2 کے وعدے اول تو اپنے زمانے میں پورے ہوئے۔ لیکن اِس کے علاوہ یہ پیش گوئیاں مسیح میں بھی پوری ہوئیں، گو پرانے عہد نامے کے بزرگ اور نبی یہ نہیں جانتے تھے۔ غرض تفسیر کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔

پہلی سطح پر پرانے عہدنامے کے وعدے اپنے زمانے میں پورے ہوئے جبکہ دوسری سطح پر وہ نئے عہدنامے میں تکمیل تک پہنچے۔

اصل و سایہ کی تفسیر کے مطابق نئے عہدنامے کے کئی واقعات اور افراد پرانے عہدنامے میں منعکس ہوئے ہیں۔ مثلاً زرُبابل مسیح کو منعکس کرتا ہے، اور ابرہام کا ایمان مسیحی ایمان کا سایہ ہے، گو خود ابرہام کو یہ معلوم نہیں تھا۔ جس طرح عبرانیوں 10:1 میں قلم بند ہے، یہ چیزیں آنے والی اچھی اور اصلی چیزوں کی نقلی صورت اور سایہ ہیں۔ لیکن یوں کہ اشارہ کرنے والی چیز میں وہ حقیقت چھپی ہوئی ہے جسے وہ منعکس کرتی ہے۔

اِس تعلیم کے مطابق موجودہ مسیحی اور کلیسیائی زندگی میں بھی اِس قسم کی منعکس کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کلیسیا اور اُس کی عبادت آسمانی دنیا کی طرف اشارہ ہیں۔ وہ اُس کا سایہ یا عکس ہیں۔

تھیُودور از مپسویسطیہ انطاکیہ کی تعلیم کا اعلیٰ نمائندہ ہے۔ اُس کے نوشتوں سے دنیا اور نجات کی راہ کے بارے میں درجِ ذیل خیالات سامنے آتے ہیں۔

دوسرے آدم میں کائنات کی بحالی

تھیُودور سکھاتا ہے کہ خدا نے دنیا کو جسم کی صورت میں خلق کیا۔ یہ جسم دیکھی یعنی مادی اور اَن دیکھی یعنی روحانی مخلوقات پر مشتمل ہے۔ دیکھی اور اَن دیکھی مخلوقات کو جوڑنے کے لئے خدا نے انسان کو بنایا، کیونکہ انسان جسم اور روح کا مالک ہونے کے باعث دونوں شعبوں میں شریک ہے۔ انسان دیکھی اور اَن دیکھی چیزوں کی کڑی ہے، اُسی کے وسیلے سے دونوں میں ہم آہنگی اور یگانگت قائم رہتی ہے۔

لیکن جب انسان اپنی مرضی سے گناہ میں گر گیا تو یہ ہم آہنگی اور یگانگت ٹوٹ گئی۔ نتیجے میں نہ صرف انسان بلکہ پوری کائنات کو ہم آہنگ اور بحال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دونوں کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے ایک خاص انسان درکار تھا، ایسا انسان

جو خدا کے ساتھ ایک ہو گیا ہے۔ لیکن خالق اور مخلوق میں سختی سے امتیاز کرنا ہے، اِس لئے میافیسی تعلیم کہ لوگوس مسیح کی انسانیت اپنا کر اُس کے ساتھ ایک ذات بن گیا رد کرنی ہے۔ نہیں، ازل سے موجود بیٹا یعنی کلامِ خدا یسوع سے پیوست ہوا، ایک ایسے انسان سے جو روح القدس کی قدرت اور کنواری مریم سے پیدا ہوا تھا۔ خدا کے ساتھ پیوستہ یہ انسان بنام مسیح نے دیکھی اور اَن دیکھی چیزوں کے درمیان کڑی کو بحال کر کے انسان کے لئے گناہوں اور موت پر غالب آنے والی راہ کھول دی۔[11]

نجات کے دو زمانے

تھیُدور نجات کے دو زمانوں میں امتیاز کرتا ہے۔ پہلا زمانہ پہلے آدم کا ہے جبکہ دوسرا دوسرے آدم یعنی مسیح کا ہے۔ اِس دنیا میں ہوتے ہوئے کلیسیا دونوں زمانوں کی درمیانی حد پر ہے۔ ایک طرف وہ اب تک پرانے آدم کے زمانے میں ہے جبکہ دوسری طرف وہ روح کے وسیلے سے مسیح کے ساتھ پیوست ہونے سے دوسرے زمانے میں شریک ہے۔ بپتسمہ کلیسیا اور اِس دوسرے زمانے میں شامل ہونے کا وسیلہ ہے۔

انسان کی آزاد مرضی

انطاکیہ کے نزدیک گناہ گار انسان آزاد مرضی کا مالک ہے، یعنی وہ آزادی سے نجات کی راہ چن سکتا ہے۔ اِس میں انطاکیہ فلاغیُس کی تعلیم کے قریب ہے۔ اِس میں بھی وہ فلاغیُس کے قریب ہے کہ انسان کی موت گناہ کے باعث نہیں بلکہ کائنات کے نظام کے مطابق ہی ہے، اگرچہ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت گناہ کی سزا ہے جس پر مسیح غالب آیا۔

مسیح کی دو الگ الگ ذاتیں (دیوفیسیت)

تھیُدور از مپسویسطیہ یہ خیال رد کرتا ہے کہ کلامِ خدا (لوگوس) مسیح کی روح کی جگہ آ کر اُس کی انسانیت کے ساتھ ایک ہو گیا۔ اُس کے نزدیک کلامِ خدا مسیح پر یوں نازل نہ

ہوا بلکہ مسیح کی انسانیت کو اُٹھا کر لوگوس کے جلال میں شریک کر لیا گیا۔ لٰہذا وہ دونوں ذاتوں کو یوں بیان کرتا ہے، ''لوگوس اور وہ انسان جسے اُٹھا کر اپنا لیا گیا[a] ہے۔''

اِس سے وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ مسیح کی انسانیت نہ صرف اُس کی الوہیت کا ظاہری اور بیرونی پہلو ہے (دیکھئے اپولینار) بلکہ مسیح کی الوہیت اُس کی انسانیت کا اَن دیکھا اور اندرونی پہلو ہے۔ یعنی زور مسیح کی انسانیت پر ہے۔ مسیح کی دو ذاتیں ہیں، ایک الٰہی اور ایک انسانی ذات، جو ایک دوسری سے الگ الگ رہتی ہیں گو وہ مسیح کی شخصیت میں ایک ہیں۔[12]

یہ ذاتیں کیا نوعیت رکھتی ہیں؟ جو مسیح اپولینار نے پیش کیا تھا اُس کی نہ الوہیت، نہ انسانیت مکمل تھی۔ اِس کے برعکس تھیُدور فرماتا ہے کہ مسیح کی دونوں ذاتیں خود مختار اور مکمل ہیں۔ انسانیت کے حساب سے مسیح ہمارے جوہر کا ہے جبکہ الوہیت کے حساب سے باپ کے جوہر کا۔ یہ ذاتیں دونوں ہر طرح سے خود مختار اور مکمل ہیں، یعنی مرضی کے لحاظ سے بھی۔

اِس سے تھیُدور اُس خطرے سے بچنا چاہتا ہے جو اپولینار کی تعلیم میں پنہاں ہے یعنی اِس سے کہ نہ مسیح کی انسانیت مکمل ہے نہ اُس کی الوہیت۔ کیونکہ اگر دونوں ذاتیں مکمل نہیں ہیں تو پھر مسیح کس طرح ہمارا نجات دہندہ بن سکتا ہے؟ جس طرح کہا جا چکا ہے، جو کچھ اپنایا نہ گیا اُسے نجات حاصل نہ ہوئی۔ نیز، چونکہ پہلا آدم اپنی مرضی سے گناہ میں گر گیا اِس لئے لازم تھا کہ دوسرا آدم یعنی مسیح اپنی مرضی سے گناہ پر غالب آئے۔

اپولینار اور اُس سے پہلے اَتھاسیُس نے اِس پر زور دیا تھا کہ خدا انسان بن کر مصلوب ہوا۔ چنانچہ ایمان دار اِس الٰہی انسان سے وابستہ ہونے سے نجات پاتا ہے۔ اِس کے برعکس انطاکیہ کا زور مصلوب ہوئے الٰہی انسان پر نہیں بلکہ آزاد مرضی کے حامل انسان یسوع پر ہے۔ اُن کے نزدیک لازم تھا کہ یسوع روح اور جسم کے لحاظ سے مکمل انسان

[a] ἀναληφθέντος (analēphthentos)

ہو، ورنہ وہ ہمیں نجات نہ دے سکتا۔ یہی مکمل انسان لوگوس کے ساتھ پیوست ہو کر اپنی آزاد مرضی سے گناہ اور موت پر غالب آ گیا۔ یعنی یسوع انسان کی حیثیت سے ہی غالب آ گیا، گو اُس نے یہ کچھ الٰہی ذات کی شرکت میں اور اُس کے تابع کیا۔[13] اِس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کلیسیا براہِ راست مسیح کی الٰہی ذات میں شریک نہیں ہوتی بلکہ صرف اُس کی انسانی ذات میں۔ مسیح کی الٰہی ذات میں شرکت اُس کی انسانی ذات کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔[14]

یسوع برتن کی طرح لوگوس سے مالامال ہوا

یہ دو ذاتیں کس طرح ایک ہو گئیں اگر وہ سراسر الگ الگ ہیں؟ اِس کے جواب میں تھیُدور ایک اَور خیال پیش کرتا ہے۔

خدا کا کلام نبیوں میں بس کر کام کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ "بسنا" مسیح سے فرق تھا، کیونکہ وہ بیٹے کی حیثیت سے اُس میں جا بسا۔ یسوع برتن کی طرح اُس کی الٰہی ذات سے یوں مالامال ہوا کہ وہ الٰہی ذات کے پورے جلال میں شریک ہوا۔ غرض لوگوس نے یسوع کی پوری انسانیت میں سرایت کی، اگرچہ دونوں ذاتیں الگ الگ رہتی ہیں۔ وہ ایک ہو گئیں گو ایک دوسری کے ساتھ ملائی نہ گئیں۔[15]

مسیح کی شخصیت میں دونوں ذاتیں ایک ہیں

تھیُدور کس طرح دو الگ الگ ذاتوں کا تصور نئے عہد نامے کی گواہی سے ہم آہنگ کرتا ہے کہ مسیح ایک ہی شخصیت ہے؟ کیا اُس کا یہ خیال کہ یسوع برتن کی طرح کلامِ خدا سے مالامال ہوا اِس طرف اشارہ نہیں کرتا کہ اُس کے نزدیک مسیح میں الٰہی اور انسانی ذاتیں حقیقت میں ایک نہیں بلکہ صرف تعاون کے لحاظ سے ایک ہیں؟ اسکندریہ نے یہی اعتراض کیا بلکہ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تھیُدور نے مسیح کو دو شخصیات میں تقسیم کر لیا ہے۔

یہ خطرہ تھیُدور کے نوشتوں میں نظر بھی آتا ہے۔ لیکن تھیُدور کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دونوں ذاتیں ایک شخصیت میں متحد ہیں، اور یہ اتحاد حقیقی ہے، کیونکہ ہم اُسے سجدہ کرتے ہیں۔ اگر اُس کے ذہن میں مسیح کی دو شخصیات ہوتیں تو وہ کہتا کہ صرف مسیح کی الٰہی ذات کو سجدہ کرنا ہے۔

انطاکیہ کی خوبیاں اور خامیاں

تھیُدور ہمیں اورِغین کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ دونوں کلام کی تفسیر کے ماہر تھے، دونوں نے کلام کی بنیاد پر مسیح اور دنیا کا پورا فلسفہ کھڑا کیا۔ یہاں تک کہ دونوں کو وفات کے بعد بدعتی قرار دیا گیا۔

مسیح کی پوری انسانیت لازمی ہے

تھیُدور کا ایک خیال مسیح کے بارے میں بحث مباحثہ کے لئے مفید ثابت ہوا۔ اپولینار کی تعلیم میں مسیح کی پوری انسانیت کم ہی نظر آتی ہے جبکہ تھیُدور نے اِس پر اصرار کیا کہ مسیح کی انسانیت بھی مکمل تھی۔ اگر لوگوس مسیح کی روح کی جگہ آتا تو مسیح کی انسانیت پوری نہ ہوتی۔ اِس لئے ضروری ہے کہ مسیح کی انسانیت اور اُس کی الوہیت پوری ہوں۔ اِس ناتے سے انطاکیہ کی دیوفیسیت نے مسیح کی ایک حقیقت پر روشنی ڈالی جس کے بغیر مسیح کے بارے میں تعلیم ناقص ہے۔

مسیح کی الوہیت کم ہی نظرآتی ہے

انطاکیہ کی کمزوری اِس میں تھی کہ اُس کا مرکزی خیال مسیح کی انسانی ذات تھی گو وہ لوگوس کی الٰہی ذات سے پیوست ہوا۔ انطاکیہ کا پورا زور مسیح کی انسانیت پر تھا، اِس لئے اُسے کلام کی یہ بات کم ہی نظر آئی کہ خدا مجسم ہو کر انسان بن گیا، دیکھئے فلپّیوں 2 اور یوحنا 1۔ میافیسیت کی یہ تعلیم کہ خدا مجسم ہو کر انسان پر ظاہر ہوا انطاکیہ کی تعلیم میں

نظر نہیں آتی۔ اِس کی بجائے صرف مسیح کی انسانیت دکھائی دیتی ہے جبکہ اُس کی الوہیت اَن دیکھی اور اندرونی قرار دی جاتی ہے۔ تو پھر یہ الوہیت آخرکار کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اِس لحاظ سے خطرہ یہ ہے کہ یسوع صرف ایک اعلیٰ قسم کا نبی سمجھا جائے۔ اگر کلامِ خدا نبیوں میں بھی آ بسا اور مسیح میں بھی تو پھر اُن میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟ ایسے سوالات اُبھر آئے جب اسکندریہ نسطوریُس کے خلاف لڑنے لگا۔

دونوں ذاتوں میں حد سے زیادہ امتیاز

قورلوس نے بعد میں ایک خیال پیش کیا جو یہ کمی کافی حد تک پوری کر سکتا ہے۔ اُس نے فرمایا کہ مسیح کی الٰہی ذات کو انسانی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں جبکہ اُس کی انسانی ذات کو الٰہی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اِس تعلیم سے دونوں ذاتیں ایک دوسری کے قریب ہی آ جاتی ہیں۔[a] لیکن انطاکیہ یہ خیال نہیں مان سکتا تھا۔ نتیجے میں دونوں ذاتیں حد سے زیادہ ایک دوسری سے دُور لگتی ہیں۔ سوال ہے کہ آخرکار نجات کا کام کس طرح سرانجام ہوا اگر دونوں ذاتیں اِتنی سختی سے الگ الگ رہتی ہیں؟ جب خالق (یعنی الٰہی ذات) اور مخلوق (یعنی انسانی ذات) میں اِتنی سختی سے امتیاز کیا جاتا ہے تو نجات کس طرح ممکن ہے؟

بغداد کے خلیفہ نے ایک بار مشرق کی کلیسیا کے بطریق تیمُتھیُس اول سے سوال کیا، ”کیا خود خدا مر سکتا ہے؟“ بطریق نے اپنی دیوفیسی تعلیم کے مطابق جواب دیا، ”خدا کا بیٹا اپنی الوہیت کے مطابق نہ مُوا بلکہ ہماری ذات کے مطابق۔“[16] یہ جواب دیوفیسی تعلیم کا عملی نتیجہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسیح کی الوہیت کا صلیبی موت میں کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔ تب یہ شرط کس طرح پوری ہوئی کہ جو کچھ اپنایا نہ گیا اُسے نجات حاصل نہ ہوئی؟

---

communio idiomatum[a]

غرض گو انطاکیہ کے اُستادوں نے سختی سے یہ الزام رد کیا کہ وہ پولس از سمیساط کے پیروکار ہیں تاہم یہ شک دور نہیں ہوتا کہ پسِ پردہ کی سوچ اُس کے قریب ہی ہے۔

موروثی گناہ کا انکار اور انسان کی آزاد مرضی پر اصرار

دو مزید باتیں قابلِ اعتراض ہیں۔ اول، انطاکیہ یہ نہیں مانتا کہ ہر انسان کو میراث میں گناہ ملتا ہے۔ دوسرے، وہ سکھاتا ہے کہ گناہ گار انسان کی مرضی آزاد ہے۔ اِس لئے اُس نے خوشی سے فلاغیُس اور اُس کی بدعتی تعلیم قبول کی۔

کیا مسیح کی ایک یا دو ذاتیں ہیں؟ نقایہ سے خلقیدون تک

اپولینار اور تھیُدور نے میافیسیت اور دیوفیسیت کی بنیاد رکھی۔ جب پانچویں صدی میں مسیح کے کردار پر بحث مباحثہ چھڑ گیا تو اِنہی دو اُستادوں کے خیالات اہم رہے۔

لیکن جب ہم اِس کا مقابلہ تثلیث پر بحث کے ساتھ کرتے ہیں تو ایک اہم فرق نظر آتا ہے۔ یہ معاملہ حد سے زیادہ سیاست کی زد میں آ گیا، اور اول درجہ حاصل کرنے کی جو کھینچا تانی قسطنطنیہ، اسکندریہ اور روم کے درمیان تھی اُس کا بڑا اثر بحث مباحثہ پر پڑا رہا۔ ساتھ ساتھ اِن شہروں کے نمائندے نسطوریُس، قورلوس اور لیو اعظام اپنے اُستادوں کا روحانی اور ذہنی معیار نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گو نسطوریُس کو دو مجالسِ عامہ (431ء اور 451ء) میں بدعتی ٹھہرایا گیا تاہم آج کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ نسطوریُس بدعتی نہیں تھا۔ اِس کا تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔[17]

کلیسیا کا سیاست میں دخل

کلیسیا چوتھی صدی میں پہلی مرتبہ سیاست اور حکومت میں شامل ہو گئی۔ کلام کے مطابق سیاست میں شرکت کلیسیا کے روحانی اختیار کے لئے خطرے کا باعث ہے، اور جو کچھ چوتھی صدی سے ہوا وہ اِس کی خوب تصدیق کرتا ہے۔[a]

نقایہ کی مجلسِ عامہ اِس ناتے سے فرق تھی، کیونکہ اُس وقت تک ایمان کی سچائی آبائے کلیسیا کا مرکزِ خیال تھا۔ لیکن 380ء میں بادشاہ تھیُدوسیُس اول نے بت پرستی کی جگہ مسیحیت کو ملک کا علانیہ مذہب قرار دیا۔ اِس سے کلیسیا کو رومی حکومت اور سیاست میں شریک ہونے کا راستہ کھل گیا۔ یہ اتفاق کی بات نہیں کہ 386ء میں پہلی بار بدعتیوں کو سزائے موت دی گئی۔

پانچویں صدی میں انطاکیہ، اسکندریہ، روم اور قسطنطنیہ کی خاص کلیسیائی اہمیت سامنے آتی ہے۔ اُن کے اپنے اپنے مدرسے قائم ہوئے ہیں جو بڑے زور سے اپنی اپنی تعلیم پر ڈھٹے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ الگ الگ فرقے بن جاتے ہیں۔ اب سے یہ فرقے اور اُن کے زبردست بشپ سیاست کے میدان میں آ کر ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسیح کے کردار کے بارے میں عقیدے عقیدۂ نقایہ کی نسبت فرق نوعیت رکھتے ہیں۔ حکمران کی مداخلت بھی بڑھ گئی، کیونکہ کلیسیاؤں کی نااتفاقی رومی ممالک کے امن کے لئے خطرے کا باعث تھی۔ چنانچہ اُس کا پورا دھیان اِس پر رہا کہ تمام رعایا ایک ہی ایمان رکھے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ ساتویں صدی میں مصر کے میافیسیوں نے خوشی سے مسلمانوں کا استقبال کیا۔ کیونکہ وہ رومی بادشاہ سے تنگ آ گئے تھے جو اُنہیں امن کے نام میں دباتا رہا تھا۔

---

[a] دیکھئے متی 4:1 و مابعد؛ 20:24 و مابعد؛ 23:11-12؛ لوقا 52:1؛ یوحنا 18:36؛ رومیوں 12:2 اور 13:1۔

دوسروں کو اپنے تحت کرنے کی کوشش

شروع میں کلیسیا کے تین اہم مرکز تھے، انطاکیہ، روم اور اسکندریہ۔ لیکن قسطنطنیہ کی مجلسِ عامہ (381ء) نے مقرر کیا کہ کلیسیائی سطح پر روم اول ہے، جبکہ قسطنطنیہ دوسرے نمبر اور اسکندریہ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ اور خلقیدون کی مجلسِ عامہ (451ء) میں قسطنطنیہ کو روم کے برابر بنایا گیا۔ اِس کے پیچھے بادشاہ کا ہاتھ تھا جو اپنے نئے دار الحکومت قسطنطنیہ کو کلیسیائی مرکز بنانا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ قسطنطنیہ نیا شہر تھا جس کی کوئی کلیسیائی اہمیت نہیں تھی اِس لئے یہ فیصلہ روم اور اسکندریہ دونوں کے لئے ٹھوکر کا باعث تھا۔

مسیح کے کردار کے بارے میں بحث مباحثہ پر غور کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھنی ہے کہ خاص کر اسکندریہ کی پوری کوشش قسطنطنیہ کے رُتبے اور بشپ کو نیچے کرنا تھی۔ جب نسطوریُس قسطنطنیہ کا بشپ بن گیا تو اسکندریہ کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ قسطنطنیہ کا رُتبہ تھی۔

نسطوریُس سے چھڑا ہوا تنازع (428ء تا 433ء)

نسطوریُس تھیُدور از مپسویسطیہ کا شاگرد تھا۔ جس وقت اُسے قسطنطنیہ کا بشپ بنایا گیا کنواری مریم کے بارے میں بحث چھڑ گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا ہم مریم کو 'خدا کو جنم دینے والی'[a] کہہ سکتے ہیں؟ اورِغین کے وقت سے یہ لقب مریم کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن شروع میں اُس کا مطلب کلامِ مقدّس کے مطابق ہی تھا۔ اِس سے یہ سچائی بیان کی جاتی تھی کہ چونکہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اِسی لئے مریم 'خدا کو جنم دینے والی' ہے۔ یعنی مرکزِ خیال مریم نہیں بلکہ مسیح کی الوہیت تھا۔ لیکن اپولینار کے وقت سے یہ لقب بہت سے لوگوں کے ذہن میں مریم کی الٰہی حیثیت کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ وہ سمجھنے لگے کہ مریم عام انسان نہیں بلکہ دیوی جیسی ہے۔

---

[a] θεοτόκος (theotokos)

یہ غلط بات دیکھ کر کچھ لوگ اعتراض کرنے لگے کہ نہیں، مریم 'خدا کو جنم دینے والی' نہیں بلکہ 'انسان کو جنم دینے والی' ہے۔ بشپ بنتے ہی نسطوریُس نے اعلان کیا کہ دونوں پارٹیاں بدعت کا شکار ہیں۔ مریم کے لئے صحیح لقب 'مسیح کو جنم دینے والی' ہے۔ یہ اُس کی دیوفیسی تعلیم کے عین مطابق تھا، کیونکہ دیوفیسی کہتا ہے کہ مریم نے خدا کے ساتھ پیوستہ انسان یسوع کو جنم دیا جو مسیح کہلاتا ہے۔

جب اسکندریہ کے بشپ قورلوس کو نسطوریُس کا یہ فیصلہ معلوم ہوا تو اُس نے آگ بگولا ہو کر اپنی میافیسی تعلیم کے باعث نسطوریُس کا فیصلہ رد کیا۔ معاملہ حل کرنے کے لئے 431ء میں اِفسس کی مجلسِ عامہ منعقد ہوئی۔[a]

یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ جو شہر پولس رسول کے زمانے میں ارتمس دیوی کی اشد پوجا کرتا تھا وہ نسطوریُس کے زمانے میں مریم کی پرستش کا مرکز بن گیا تھا۔ نسطوریُس کے آنے پر اِفسس کے راہنما نے مقامی لوگوں کو یوں اُس کے خلاف اکسایا کہ نسطوریُس کی حفاظت کے لئے فوجی دستے بلائے گئے۔

جب روم اور انطاکیہ کے وفدوں کے آنے میں دیر لگی تو قورلوس نے اُن کا انتظار نہ کیا بلکہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی اسکندریہ کے باقی نمائندوں کے ساتھ نسطوریُس کو بدعتی ٹھہرایا۔ جب انطاکیہ کے نمائندے پہنچے تو اُنہوں نے اپنی ہی طرف سے قورلوس کو نامنظور قرار دیا جبکہ روم کے نمائندے قورلوس کے ساتھ متحد ہوئے۔

یہ بگڑے ہوئے حالات دیکھ کر رومی بادشاہ نے جھگڑنے والوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نسطوریُس، قورلوس اور اِفسس کے راہنما کو گرفتار کیا۔ لیکن نسطوریُس اپنی طرف سے استعفا دے کر چلا گیا، جبکہ قورلوس غالباً رشوت کی بڑی رقم دے کر آزاد ہوا اور فتح کے نعرے لگا لگا کر اسکندریہ واپس گیا۔

اِس ناگوار معاملے نے ظاہر کیا کہ ہر بشپ ساز بازی، سیاست اور لوگوں کو دبانے سے دوسروں پر غالب آ سکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ متاثر شخص نسطوریُس تھا، جسے کئی بار

EphesusCouncil431[a]

جلاوطن کیا گیا۔ وفات پانے تک وہ اپنی بحالی کی اُمید رکھتا رہا، لیکن بے فائدہ۔ ساتھ ساتھ ایسی باتوں سے متفق نہ ہونے والے دیوفیسی رومی بادشاہت سے نکلنے لگے۔

روحانی لحاظ سے نسطوریُس کی تعلیم کو بدعت قرار دینا ایک الم ناک واقعہ تھا۔ افسوس کہ پانچویں صدی میں اتھاسیُس جیسا کلیسیائی راہنما نہیں تھا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ دونوں پارٹیاں مل کر مسیح کے بارے میں ایسا عقیدہ قلم بند کرتیں جس سے صاف ہوتا کہ نہ انطاکیہ کی دیوفیسیت کو پولس از سمیساط کی بدعت منظور ہے، نہ اسکندریہ کی میافیسیت کو اپولینار کی بدعت۔ لیکن چونکہ 431ء کی مجلس قورلوس کے قبضے میں تھی اِس لئے ایسا نہ ہو پایا۔ نہ صرف یہ بلکہ قورلوس نے سختی سے تقاضا کیا کہ نسطوریُس انطاکیہ کی تعلیم کو سراسر رد کرے۔ اِس سے سمجھوتا کا راستہ مشکل ہی ہوا۔

قورلوس کی کوششوں کے باوجود 431ء کی مجلس کے فیصلے پائے دار ثابت نہ ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ مجلس کو مخالفوں کی صلح کرانے کے لئے منعقد ہوئی تھی، جبکہ قورلوس کی حرکتوں نے اِس کے اُلٹ پیدا کیا تھا۔ لہٰذا رومی حکومت مطمئن نہ ہوئی، اور اُس نے سکون کا سانس نہ لیا جب تک قورلوس سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھا۔ 433ء میں قورلوس کو اِفسس کا ایک نیا عقیدہ پیش کیا گیا، اور وہ اُسے منظور کرنے پر مجبور ہوا۔

433ء کے عقیدے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کا مقصد میافیسیت اور دیوفیسیت میں سمجھوتا ہے۔ یہ پورا کرنے کے لئے وہ 431ء کے میافیسی عقیدے کو یوں انطاکیہ کی دیوفیسی تعلیم کے ساتھ ملا دیتا ہے کہ دونوں اپنے بدعتی پہلوؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگرچہ اِس سمجھوتے کے پیچھے بادشاہ تھا، جو دونوں پارٹیوں کو صلح پر مجبور کرنا چاہتا تھا تو بھی یہی عقیدہ بعد کے عقیدۂ خلقیدون کی بنیاد بن گیا۔

ظاہر ہے کہ سمجھوتا ہونے کے باعث نہ انطاکیہ اور نہ اسکندریہ اِس سے پوری طرح خوش ہوئے۔ قورلوس اور اُس کے ساتھی معاملے سے اِس طرح نپٹے کہ عقیدے کو میافیسی معنوں میں سمجھے۔ یوں یوطخیس کی بدعتی میافیسیت کے لئے راستہ تیار ہوا۔

نسطوریُس: مسیح کے دو اقانیم

مجموعی طور پر نسطوریُس نے مسیح کے بارے میں کوئی نئی بات پیش نہ کی بلکہ وہ کچھ جو اُس کے استاد تھیُدور از مپسویسطیہ نے اُسے سکھایا تھا۔[18] لیکن نسطوریُس سیاست کی چکنی چپڑی راہوں سے سراسر ناواقف تھا۔ جب مریم کے کردار کے بارے میں بحث مباحثہ چھڑ گیا تو اُس نے حکمتِ عملی سے کام نہ لیا۔ اگر وہ کسی اَور زمانے میں ہوتا تو شاید یہ تمام معاملہ جلد ہی حل ہو جاتا۔ لیکن الم ناک بات یہ ہے کہ اسکندریہ پہلے سے قسطنطنیہ اور اُس کے خلاف تھا۔ چنانچہ جوں ہی اُس نے مریم کے بارے میں کہا کہ وہ 'خدا کو جنم دینے والی' نہیں بلکہ 'مسیح کو جنم دینے والی'[19] ہے توں ہی اسکندریہ کے بشپ نے اُس پر الزام لگایا کہ نسطوریُس کے نزدیک مسیح خالی انسان ہے، بلکہ وہ دو مسیحیوں کی تعلیم دیتا ہے (یعنی ایک الٰہی مسیح اور ایک انسانی مسیح)۔

مسیح میں یسوع کی دونوں ذاتیں ایک ہیں

لیکن نسطوریُس اپنی دیوفیسی تعلیم کے مطابق کچھ اَور کہنا چاہتا تھا۔ دیوفیسیت کے مطابق مسیح میں دو الگ الگ ذاتیں ہیں، ایک الٰہی اور دوسری انسانی۔ نسطوریُس فرماتا ہے کہ مریم نے خدا کے ساتھ پیوستہ انسان یسوع کو جنم دیا جو مسیح کہلاتا ہے۔ اِس لئے مذکورہ دونوں پارٹیوں کی رائے غلط ہے، کیونکہ 'خدا کو جنم دینے والی' کے لقب سے یوں لگتا ہے کہ مسیح صرف خدا ہے جبکہ 'انسان کو جنم دینے والی' کے لقب سے لگتا ہے کہ مسیح صرف انسان ہے۔ نسطوریُس کے نزدیک لقب 'مسیح' میں یسوع کی دونوں ذاتیں شامل ہیں۔

سختی سے دونوں ذاتوں میں امتیاز کرنا ہے

نسطوریُس کے نزدیک لازم ہے کہ دونوں ذاتیں خودمختار اور ایک دوسری سے الگ رہیں۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسری سے ملائیں یا مکمل نہ سمجھیں تو اپولینار یا آریت کے خطرے میں آ جائیں گے۔ چنانچہ الٰہی اور انسانی ذات میں سختی سے امتیاز کرنا ہے،

کیونکہ ممکن نہیں کہ لافانی خدا اور فانی انسان ایک ہوں۔ دونوں ذاتیں یسوع کی پیدائش سے ہی موجود تھیں۔

یسوع کی انسانیت کو جلال میں اٹھا لیا گیا

مریم نے مسیح کی پیدائش میں کیا کردار ادا کیا؟ وہ صرف یسوع کی انسانیت کا وسیلہ بن گئی جبکہ کلامِ خدا (لوگوس) کا یسوع کی انسانیت کے ساتھ پیوست ہونا اُس سے سرانجام نہ ہوا۔ پیدا ہوتے وقت یسوع کی مکمل انسانیت کو لوگوس کے جلال میں اُٹھا لیا گیا۔[20] وجہ: مَیں ایسے خدا کو سجدہ نہیں کر سکتا جو پیدا ہوا، مُوا اور دفن ہوا۔[21]

مسیح کے دو اقانیم

نسطوریُس ایک بات میں تھیُودور سے آگے بڑھتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ جس طرح مسیح تثلیث کا ایک اقنوم[a] ہے، اُسی طرح اُس کی دو ذاتیں بھی الگ الگ اقانیم ہیں۔ اِس سے نسطوریُس یہ نہیں کہنا چاہتا کہ تثلیث میں چار اقانیم ہیں یا کہ دو مختلف مسیح ہیں۔ وہ اِس سے صرف اِس پر زور دینا چاہتا ہے کہ دونوں ذاتیں الگ الگ، خودمختار اور مکمل ہیں۔[22] اُس کے نزدیک 'مسیح،' 'خداوند' اور 'بیٹا' جیسے القاب ظاہر کرتے ہیں کہ مسیح ایک ہے۔ اِن کے مقابلے میں رومیوں 1:3-4 اور فلپّیوں 2:5 و مابعد دکھاتی ہیں کہ دونوں ذاتیں الگ الگ رہتی ہیں۔ نسطوریُس کہتا ہے، ''مَیں ذاتوں کو الگ الگ سمجھتا ہوں لیکن سجدہ کرتے وقت وہ ایک ہوتے ہیں۔''[23][b]

یسوع کی انسانیت پر غیرصحت مند زور

جب ہم نسطوریُس کی تعلیم دیوفیسیت کے سیاق و سباق میں دیکھتے ہیں تو وہ غلط نہیں ہے۔ یہ کہنا اُس کے نکتۂ نگاہ سے غلط نہیں تھا کہ مسیح پیدا ہوتے وقت دو ذاتوں کا

---

[a] πρόσωπον (prosōpon)

[b] لفظی مَیں ذاتوں کو الگ الگ کرتا ہوں، لیکن سجدے میں اُنہیں ایک کرتا ہوں۔

مالک تھا۔ اور جب ہم دھیان دیتے ہیں کہ لوگوں کی مریم کے بارے میں سوچ کلامِ مقدّس سے کہیں دُور ہو گئی تھی بلکہ وہ کئیوں کے لئے دیوی جیسی تھی تو نسطوریُس کی تعلیم مزید معقول لگتی ہے۔

البتہ جب ہم اِس پر غور کرتے ہیں کہ نسطوریُس کتنے زور سے 'خدا کو جنم دینے والی' کے لقب کے خلاف کھڑا ہوا تو سوال اُبھر آتا ہے کہ کیا اُس کے سامنے زیادہ تر مسیح کی انسانیت تو نہیں ہے؟ اور اُس کا پورا زور اِس پر ہے کہ دونوں ذاتیں ایک دوسری سے بالکل الگ الگ ہیں جبکہ مسیح کا ایک ہونا کم ہی نظر آتا ہے بجائے اُس وقت کے جب انسان اُسے سجدہ کرتا ہے۔

اگر وہ قورلوس کی بات مانتا کہ مسیح کی الٰہی ذات کو انسانی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں جبکہ اُس کی انسانی ذات کو الٰہی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں تو یہ کمی کافی حد تک پوری ہوتی۔ لیکن یہ بات ماننا اُس کی دیوفیسی تعلیم کے خلاف تھا، جس کے مطابق خالق (یعنی الٰہی ذات) اور مخلوق (یعنی انسانی ذات) میں سختی سے امتیاز کرنا ہے۔

قورلوس: کلیسیائی میافیسیت کا بانی

قورلوس کی تعلیم کچھ پیچیدہ ہے، کیونکہ بحث مباحثہ کے جواب میں وہ بدلتی رہی۔[24] اگرچہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قورلوس بڑا سیاسی تھا، تاہم اُس کے خیالات نہ صرف سیاسی ہونے کے باعث بدلتے رہے۔ اور گو اِن کی جڑیں اپولینار اور اثناسیُس میں پائی جاتی ہیں، تاہم اُس نے اِن کی بنیاد پر خیالوں کا نیا ڈھانچا کھڑا کیا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اپولینار کی تعلیم میافیسیت کی بدعتی شکل ہے۔ اِس کے مقابلے میں قورلوس نے میافیسیت کی کلیسیائی شکل تیار کر کے میافیسی کلیسیا کی بنیاد رکھی۔

اثناسیُس اور اپولینار کا اثر

قورلوس کس ناتے سے اثناسیُس کا شاگرد ہے؟ اثناسیُس کے نزدیک کلامِ خدا (لوگوس) نے مجسم ہوتے وقت یسوع کی انسانیت کو یوں مکمل طور پر اپنایا کہ جو بھی خاصیت مسیح

کو حاصل ہے وہ کلامِ خدا کو بھی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ وہ دُکھ بھی اُٹھاتا ہے۔ قورلوس نے یہ تعلیم اپنائی جس کا مرکزی خیال اپولینار کی طرح خدا کے نازل اور مجسم ہونا تھا۔ اِس ناتے سے مرکزی حوالجات یوحنا 14:1 اور فلپّیوں 6:2 و مابعد تھے جنہیں عقیدۂ نقایہ کے اِن الفاظ سے جوڑا گیا کہ ''اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے . . . وہ . . . مجسم ہوا اور انسان بنا۔''[25]

لیکن اثناسیُس کے ساتھ ساتھ قورلوس نے اپولینار کے کچھ خیالات بھی اپنائے، گو وہ غلطی سے سمجھتا تھا کہ یہ اثناسیُس کے ہیں۔ خاص کر اپولینار کا یہ قول اُس کے لئے اہم بن گیا کہ ''لوگوس کی مجسم ہوئی ایک ہی ذات'' ہے۔[a] تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قورلوس اپولینار کا پیروکار تھا۔ اُن میں کیا فرق ہے؟

مسیح میں دو مکمل ذاتیں ایک ہو گئی ہیں

اپولینار کے مطابق لوگوس مسیح کی روح کی جگہ آ گیا ہے جبکہ اُس کا جسم انسانی ہے۔ یعنی مسیح کی الوہیت اُس کی روح پر اور اُس کی انسانیت جسم پر محدود رہتی ہے۔ مسیح کی انسانیت وہ مقدِس ہے جس میں کلامِ خدا اپنے کاموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ نہ الوہیت مکمل ہے، نہ انسانیت۔

لیکن قورلوس ایسا نہیں سوچتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ پورا لوگوس یسوع کی پوری انسانیت کے ساتھ ایک ہو گیا۔ یعنی انسانیت میں روح اور جسم دونوں شامل ہیں۔[26] اِس میں وہ دیوفیسیوں کے ساتھ متفق ہے۔ اپولینار اعتراض کرتا ہے کہ دو مکمل اور ذات کے لحاظ سے فرق چیزوں سے ایک انسان تشکیل نہیں پا سکتا۔ اِس کے برعکس قورلوس فرماتا ہے کہ مسیح کی ایک ذات دو مختلف ذاتوں کے اتحاد سے پیدا ہوئی ہے۔

غرض قورلوس کی تعلیم میں مسیح مکمل طور پر خدا اور ساتھ ساتھ مکمل طور پر انسان ہے۔ تو پھر مسیح کی الوہیت اور انسانیت کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

---

[a] دیکھئے صفحہ 211۔

ایک طرف تو قورلوس اعتراض کرتا ہے کہ انطاکیہ کی دو ذاتیں صرف ارادے کے لحاظ سے ایک ہیں، اور وہ اِس پر زور دیتا ہے کہ مسیح ایک ہی ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ اپولینار کی بدعت سے کترانا چاہتا ہے جس نے مسیح کی الٰہی اور انسانی ذات کو یوں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا کہ نہ اُس کا الٰہی پہلو، نہ انسانی پہلو مکمل رہ گیا۔ جواب میں وہ دو باتیں پیش کرتا ہے۔

ہر ذات دوسری ذات میں موجود ہوتی ہے

الٰہی ذات انسانی ذات میں اور انسانی ذات الٰہی ذات میں ہوتی ہے۔ وہ یوں ایک ہیں کہ مسیح کی ایک ہی شخصیت ہے، لیکن ایسا نہیں کہ کلامِ خدا صرف مسیح کی روح کی جگہ آ گیا ہے۔

ہر ذات کو دوسری کی خصوصیات ملتی ہیں

مسیح کی الٰہی ذات کو انسانی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں جبکہ اُس کی انسانی ذات کو الٰہی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں۔[a27] چنانچہ لوگوس 'مصلوب ہوا خدا' ہے گو وہ اپنی ذات کے مطابق لافانی ہے۔ اِسی طرح مسیح کی انسانی ذات معجزے وغیرہ کر سکتی ہے گو وہ اپنی ذات کے مطابق فانی ہے۔ (یہ خیال پہلے تین کپدُکی بزرگوں کے بیانِ تثلیث میں بھی پایا جاتا ہے۔)

میافیسیت یا دیوفیسیت؟ اسکندریہ اور انطاکیہ کا تضاد

قورلوس اور نسطوریُس میں نظر آنے والا فرق وہی فرق ہے جو اسکندریہ اور انطاکیہ میں موجود ہے۔ پہلا میافیسیت، دوسرا دیوفیسیت کا قائل ہے۔

قورلوس کا زور مسیح کی ایک ہی ذات پر ہے، یوں کہ کلامِ خدا نے مجسم ہو کر یسوع کی انسانیت اپنائی۔ اِس کے مطابق ازلی بیٹا یسوع کی صورت میں یوں انسان پر ظاہر

---

communicatio idiomatum[a]

ہوا کہ انسان مسیح کے ابدی زندگی بخشنے والے خون میں شریک ہو سکتا ہے۔ اِس تعلیم میں عشائے ربانی مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔

قورلوس کی کمزوری اِس میں ہے کہ مسیح کی الٰہی اور انسانی ذات اِتنے زور سے ایک ہو گئی ہیں کہ الٰہی ذات دُکھ اُٹھانے کے باعث مکمل طور پر الٰہی نہیں لگتی جبکہ انسانی ذات کی مکمل انسانیت بھی کم ہی نظر آتی ہے۔ غرض ایک حد تک اپولینار کے خطرے اُس میں موجود رہتے ہیں۔ غالباً قورلوس اِسی لئے اِتنا مقبولِ عام ہو گیا کہ کلیسیائی میافیسیت کے علاوہ بدعتی میافیسیت کے پیروکار بھی اُس کی تعلیم اپنے معنوں میں سمجھ کر قبول کر سکتے تھے۔

اِس کے برعکس انطاکیہ کی نظر خدا کے مجسم ہونے پر نہیں بلکہ زمین پر چلنے والے مسیح اور اُس کی الٰہی اور انسانی ذات پر ہے۔ اُس کا زور بپتسمے اور اُس کے اثرات پر ہے۔ دو ذاتوں کے بارے میں اُس کی تعلیم اسکندریہ کی نسبت زیادہ کھلے ذہن اور وسیع لگتی ہے۔ تو بھی ہم تھیُودور اور نسطوریُس کی مثال سے دیکھ چکے ہیں کہ اُس کی تعلیم نے مسئلے حل کرنے کے باوجود زیادہ تر نئے مسئلے کھڑے کئے۔

انطاکیہ اور اسکندریہ دونوں اِس میں متفق ہیں کہ ایمان کے لحاظ سے مسیح ایک ہے جبکہ سمجھ کے لحاظ سے اُس کی الٰہی اور انسانی ذاتوں میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن قورلوس پورا زور اِس پر دیتا ہے کہ ہم ایمان میں مجسم ہوئے خدا کو سجدہ کریں جبکہ اپنی سمجھ سے اُس کی دو ذاتوں میں امتیاز کرنا ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں انطاکیہ فرماتا ہے کہ پہلے مسیح کی دو الگ ذاتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، تب ہی ہم ایمان میں مسیح کے ایک ہی اقنوم کو سجدہ کریں گے۔ شک یہ رہتا ہے کہ مسیح صرف ایک خاص قسم کا نبی ہے۔

اِفسس (433ء) سے خلقیدون (451ء) تک

اِفسس کا اتحادی عقیدہ (433ء) کچھ دیر کے لئے کام یاب رہا۔ لیکن جب لوگ اتحاد کے نام میں وہ کچھ چھوڑتے ہیں جو اُنہیں سچ لگے تو یہ اتحاد دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور ایسے سمجھوتے کا ایک نشان یہ ہے کہ ہر ایک اُسے اپنے معنوں میں سمجھتا ہے۔

جب اسکندریہ کا بشپ قورلوس فوت ہوا تو نیا بشپ دیوسقورس فوراً میافیسیت کے حق میں لڑنے لگا۔ قورلوس کی نسبت یہ بشپ کئی گنا زیادہ زبردست تھا۔ اُسے اپنے مقاصد پورے کرنے کا سنہری موقع مل گیا جب قسطنطنیہ کے خادم یوطخیس کو 448ء میں بدعتی ٹھہرایا گیا۔

یوطخیس کو کیوں بدعتی قرار دیا گیا؟ وہ کلیسیائی میافیسیت کی اُن حدود سے کہیں آگے نکل گیا تھا جو قورلوس نے مقرر کی تھیں۔ اُس نے تو مان لیا کہ مسیح کی دو ذاتیں ہیں۔ لیکن قورلوس کے برعکس اُس نے کہا کہ یہ دو ذاتیں صرف مجسم ہونے تک الگ الگ رہیں۔ جب سے مسیح انسان بن گیا اُس کی ایک ہی ذات ہے۔ اِس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مجسم ہوئے خدا کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے، لیکن مجسم ہوئے خدا کا اور ہمارا انسانی جوہر ایک نہیں۔ یعنی مسیح کی انسانیت اور ہماری انسانیت میں فرق ہے۔

جب مسیح کی اور ہماری انسانیت فرق ہیں تو پھر مسیح کس طرح ہمیں نجات دلا سکتا ہے؟ گریغوری از نزیانز کا جُملہ یہاں بھی مفید ثابت ہوتا ہے، ”جو کچھ اپنایا نہ گیا اُسے نجات حاصل نہ ہوئی۔“

جواب میں 448 کی مذکورہ مجلس نے یوطخیس کے خلاف فرمایا،

> ہم اقرار کرتے ہیں کہ مسیح مجسم ہونے کے بعد دو ذاتوں سے ہے، گو ایک اقنوم [a] میں۔ ہم ایک ہی مسیح ، ایک ہی بیٹے اور ایک ہی خداوند کا اقرار کرتے ہیں۔[28] [b]

یوطخیس کو رد کرنے سے یہ بات زور سے سامنے آئی کہ اب سے میافیسیت کی انتہا پسند شکل نامنظور ہے۔ اب سے یہ تعلیم ناقابلِ قبول ہے کہ الٰہی ذات نے یسوع کی انسانیت کو یوں جذب کر لیا کہ مسیح کی پوری انسانیت نہ رہی۔

جب یوطخیس اپنے دفاع میں شور مچانے لگا تو دیوسقورس نے فائدہ اُٹھا کر 449ء میں اِفسس میں مجلسِ عامہ منعقد کرنے کی اجازت لی۔ یہ مجلس 'ڈاکوؤں کی مجلس' کے نام سے مشہور ہوئی، کیونکہ دیوسقورس نے نمائندوں کو اپنے موقف پیش کرنے نہ دیا بلکہ اُن پر اِتنا شدید دباؤ ڈالا کہ اُس کی ہر مرضی مانی گئی۔

یاد رہے کہ نہ صرف انطاکیہ دیوفیسی تھا بلکہ روم بھی مغرب سمیت یہ تعلیم رکھتا تھا۔ پاپائے روم لیو اعظم کو خاص فکر تھی کہ 449ء کی مجلس مغربی موقف کا لحاظ کرے، اِس لئے اُس نے اپنے نمائندے کے ہاتھوں خط بھیج کر یوطخیس کی تعلیم رد کی۔ اب ہوا یہ کہ دیوسقورس نے خط کو سیدھے نامنظور قرار دے کر ہونے نہ دیا کہ اُسے مجلس میں پڑھا جائے۔ نتیجے میں یوطخیس اور اُس کی تعلیم کو منظور ٹھہرایا گیا۔

لگتا تھا کہ اب میافیسیت پوری کلیسیا پر غالب آ گئی ہے۔ غالباً مشرق کی اکثریت میافیسی سوچ رکھتی بھی تھی۔ لیکن یہ فتح اندر سے کھوکھلی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ دیوسقورس نے حکومت اور مغرب کے بغیر اپنے مقاصد پورے کئے تھے۔

حقیقت میں اپنے تُرش رویے سے دیوسقورس نے اپنے آپ کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اُس کے حکمرانہ سلوک کے بارے میں سن کر مغرب کو سخت غصہ آیا۔ ایسا رخنہ پیدا ہوا جو نہ صرف کلیسیا بلکہ رومی بادشاہت کے لئے بھی خطرے کا باعث بن گیا۔ چنانچہ جب حکومت 450ء میں بدل گئی تو نئے حکمران دیوسقورس کو ہٹانے اور روم سے سمجھوتا کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجلس سے پیدا ہوا

---

[a] ὑπόστασις (hypostasis) اور πρόσωπον (prosōpon)

[b] اِس سے نسطوریُس کی یہ تعلیم بھی رد کی گئی کہ مسیح کے دو اقانیم ہیں۔

تفرقہ ناقابلِ قبول ہے، اور اگر یہ بحال نہ ہو جائے تو بادشاہت کا امن و امان خطرے میں ہے۔

اِس مقصد کے تحت 451ء میں خلقیدون کی مجلسِ عامہ منعقد ہوئی جس میں دیوسقورس اور یوطخیس کو جلاوطن کر دیا گیا جبکہ قورلوس کی میافیسیت لیو کی دیوفیسیت کے ساتھ جوڑی گئی۔ نتیجے میں ایسا عقیدہ بن گیا جس کا مقصد زیادہ تر منفی تھا۔ کیونکہ اُس کا پورا دھیان اِس پر تھا کہ دونوں پارٹیوں کے خطروں سے بچے رہے، کہ نہ میافیسیت اور نہ ہی دیوفیسیت کی بدعتی شکل میں اُلجھنے کا خطرہ رہے۔

لیکن شاید یوطخیس کی تعلیم غالب آتی اگر پاپائے روم لیو اعظم اپنا خط نہ لکھتا۔

لیو کا خط: مسیح کی پستی میں خالق اور مخلوق ایک ہو گئے ہیں

لیو کے خط میں لاطینی مغرب اور یونانی مشرق میں ایک خاص فرق نظر آتا ہے۔ مغرب یونان کے فلسفیانہ انداز میں دل چسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ اُس سے بڑھ کر جو کلامِ مقدّس میں لکھا ہے کچھ نہیں بیان کرنا چاہتا تھا۔[29]

لیو مسیح کی دو ذاتوں کے بارے میں فرماتا ہے، ”دونوں ذاتوں میں سے ہر ایک دوسری کی رفاقت میں وہ کچھ کرتی ہے جو اُس کی خصوصیت ہے، یعنی کلام (لوگوس) وہ کچھ سرانجام دیتا ہے جو کلام کا کام ہے اور انسانی ذات وہ کچھ جو انسانی ذات کا کام ہے۔“[30]

گو یہ انطاکیہ کی دو ذاتوں کے بارے میں تعلیم کی طرح لگتا ہے تو بھی فرق ہے۔ کیونکہ اِس کے پیچھے مسیح کے بارے میں فرق تصور ہے۔ مغرب کا زور اِس پر ہے کہ خدا اپنے آپ کو صلیب تک پست کر کے خدا اور انسان کا درمیانی بن گیا۔[a] یہ درمیانی نہ صرف الٰہی اور انسانی تھا (مشرق) بلکہ اُس میں خالق اور مخلوق ایک ہو گئے ہیں۔ خالق اور مخلوق مسیح میں کس طرح ایک ہو سکتے ہیں؟ کلام کا مجسم ہو کر پست ہونے سے۔[31] یونانی مشرق یہ بھی مانتا تھا کہ مجسم ہوتے وقت خدا نے اپنے آپ کو پست کر دیا۔ لیکن اگر

---

[a] دیکھئے ۱۔تیم 5:2 اور فلپّیوں 6:2 و مابعد۔

ہم غور سے دیکھیں تو وہاں کے تصور میں یہ 'پستی' مجسم ہوتے ہی دُور ہو جاتی ہے، اور یسوع کی انسانیت خدا اور اُس کے جلال میں شامل کی جاتی ہے۔ یعنی اُس کی انسانیت کم ہی اور الوہیت حد سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اور یہ کچھ انطاکیہ اور اسکندریہ دونوں کی تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسکندریہ میں خدا مجسم ہوتے ہی یسوع کی انسانی ذات کے ساتھ ایک ہو گیا ہے جبکہ انطاکیہ میں انسانی ذات کو اُٹھا کر الٰہی ذات کے ساتھ پیوست کیا گیا ہے۔

لیو تو مان لیتا ہے کہ مجسم ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ یسوع کی انسانیت کو خدا کے جلال میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن اُس کا پورا زور اِس پر ہے کہ خدا اپنے آپ کو پست کر کے انسان بن گیا۔ یعنی پورا زور مسیح کی انسانیت پر ہے، کیونکہ خدا اور گناہ گار انسان کے درمیان خلا صرف درمیانی یعنی مسیح اور اُس کے نجات بخش کام سے دور ہو سکتی ہے۔ اِس درمیانی کی دو مکمل ذاتیں لازم ہیں۔ یوں مسیح خدا کی حیثیت سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے جبکہ انسان کی حیثیت سے وہ صلیب پر اپنی جان انسان کی نجات کے لئے دیتا ہے۔[32]

مسیح کی پیروی کرنا بھی اِس تعلیم کے ماتحت آ جاتی ہے۔ یونانی ایمان دار اکثر سمجھتا تھا کہ مجھے جتنا ہو سکے خدا کی مانند بننا ہے (افلاطون)۔ لیکن مغربی ایمان دار سمجھتا تھا کہ مجھے مسیح کی مانند بننا ہے جس نے اپنے آپ کو پست کر کے اپنی جان میرے لئے دی۔

غرض گو اسکندریہ اور روم دونوں خدا کے تجسم پر خاص دھیان دیتے ہیں، لیکن قورلوس اِس پر زور دیتا ہے کہ مسیح کی الٰہی اور انسانی ذاتیں ایک ہیں جبکہ لیو اِس پر اصرار کرتا ہے کہ درمیانی ہونے کے باعث لازم ہے کہ مسیح کی دو الگ ذاتیں ہوں۔

لیکن روم کا نکتۂ نگاہ انطاکیہ کی دیوفیسیت سے بھی فرق ہے۔ انطاکیہ سمجھتا ہے کہ یسوع کی انسانیت کو اُٹھا کر الٰہی ذات کے ساتھ پیوست کیا گیا ہے، اور وہ مسیح کی انسانیت میں چھپی ہوئی الٰہی ذات کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس کے برعکس روم

مسیح کی انسانیت پر زور دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ ا۔ تیم 5:2 کے ساتھ "وہ انسان مسیح یسوع ہے" کہہ سکتا ہے۔[33]

عقیدۂ خلقیدون (451ء): میافیسیت اور دیوفیسیت کا سمجھوتا

'ڈاکوؤں کی مجلس' میں اسکندریہ کا مقصد نہ صرف یوطخیس کی بحالی تھا۔ وہ اِس سے بڑھ کر زبردستی پوری رومی بادشاہت کو اپنی انتہا پسند میافیسیت ماننے پر مجبور کرنا چاہتی تھی۔ اِس ناتے سے رومی بادشاہ کے تحت منعقد ہونے والی مجلسِ خلقیدون کی اشد ضرورت تھی۔

خلقیدون کی مجلس سمجھتی تھی کہ ہم نقایہ سے بڑھ کر بات پیش نہیں کر رہے۔ لٰہذا اُس نے جان بوجھ کر اپنا عقیدہ عقیدۂ نقایہ کی تشریح قرار دیا۔ تاہم وہ نقایہ کے بعد قدیم کلیسیا کا سب سے اہم عقیدہ ہے۔ جہاں نقایہ تثلیث فی التوحید کی تعلیم کے لئے مرکزی اہمیت رکھتا ہے وہاں خلقیدون عقیدۂ مسیح کے لئے اہم ہے۔

جو جذبات اور تماشے اِس مجلس میں ظاہر ہوئے وہ دکھاتے ہیں کہ مسیح کے کردار کے بارے میں کلیسیائی اتفاق کتنا ضروری تھا۔ کلیسیائی اتفاق اور یگانگت ہی رومی حکومت کا مقصد تھا جب اُس نے مشرق کے سب سے بڑے کلیسیائی راہنما دیوسقورس کو کرسی سے ہٹا کر انطاکیہ کی کمزور پارٹی کو روم کے بشپ کی مدد سے بحال کر دیا۔ اور اِسی مقصد کے تحت روم کے بشپ لیو کا خط قبول کیا گیا اگرچہ دیوسقورس نے اُسے رد کیا تھا۔ ہاں، اگر بادشاہ تمام پارٹیوں کو مجبور نہ کرتا تو عقیدۂ خلقیدون مشکل سے ہی منظور ہوتا۔ آخر میں وہ صرف اُس وقت منظور ہوا جب مغرب سے جدائی کا خطرہ سامنے آیا۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اُس زمانے میں لوگ اِس معاملے میں اُتنے ہی جذباتی تھے جتنے آج ملکِ پاکستان میں توہینِ رسول کے سلسلے میں۔ نہ صرف پادری یا بشپ مسیح کے کردار میں دل چسپی لیتے تھے بلکہ عوام بھی۔ نائی اور موچی بھی مسیح کی الوہیت اور انسانیت کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں تھی جب مصر کے

13 بشپوں نے کہا کہ بہتر ہے آپ ہمیں یہیں مار دیں، اِس سے پہلے کہ مصر کے عوام ہمیں لیو کے خط پر دست خط کرنے کے لئے پھانسی دیں۔[34]

لیکن بادشاہ جانتا تھا کہ یا تو اسکندریہ کا بشپ دوسروں کو اپنی انتہا پسند میافیسیت قبول کرنے پر مجبور کر کے بادشاہت اور کلیسیا کی یگانگت ختم کرے گا یا حکومت تمام پارٹیوں کو سمجھوتا کرنے پر مجبور کر کے یہ یگانگت محفوظ رکھے گی۔ اب سے منظور عقیدہ رکھنا بادشاہ کے تابع رہنے کے برابر تھا، اور عقیدے کو رد کرنا بغاوت کا مترادف تھا۔ نتیجے میں یہ رومی بادشاہت کا عقیدہ بن گیا جبکہ اِس سے ناخوش کلیسیائیں یعنی دیوفیسی اور میافیسی کلیسیائیں بادشاہت سے الگ ہونے لگیں۔

تاہم یہ کہنا غلط ہے کہ عقیدۂ خلقیدون غلط تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ آج تک اکثر کلیسیاؤں سے منظور نہ ہوتا۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ رومی بادشاہ نے کلیسیاؤں کو کلامِ مقدّس سے ہٹ کر عقیدے کو منظور کرنے پر مجبور کیا۔ نہیں، اُس نے اُنہیں صرف اِس پر مجبور کیا کہ وہ ایمان داروں کا اتحاد اور یگانگت پیشِ نظر رکھ کر کلام کی سچائی پر مبنی عقیدہ تیار کریں۔ بے شک یہ سمجھوتا تھا، تاہم عقیدۂ خلقیدون دیوفیسیت اور میافیسیت کی انتہاؤں سے کترا کر ایسی سچائیاں پیش کرتا ہے جو کلامِ مقدّس پر مبنی ہیں۔ آیئے ہم اِس اہم عقیدے پر غور کریں،

> مقدّس آبائے کلیسیا کی پیروی میں ہم سب مل کر تعلیم دیتے ہیں کہ درجِ ذیل باتوں کا اقرار کرنا لازم ہے:
>
> ہمارا خداوند یسوع مسیح وہی ایک اَور واحد بیٹا ہے جس کی الوہیت کامل اور انسانیت کامل ہے، جو حقیقی خدا اور حقیقی انسان ہے، ایسا انسان جس کی ذی اِدراک روح [a] اور جسم دونوں ہی ہیں۔ الوہیت کے لحاظ سے اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے جبکہ انسانیت کے لحاظ سے اُس کا اور ہمارا ایک ہی جوہر ہے۔ سب باتوں میں وہ ہماری مانند ہے سوائے گناہ کرنے میں۔ الوہیت کے لحاظ سے وہ ازل سے باپ سے مولود ہے

جبکہ انسانیت کے لحاظ سے وہ آخری دنوں میں ہمارے واسطے اور ہماری نجات کی خاطر کنواری مریم سے پیدا ہوا، جو مسیح کی انسانیت کے لحاظ سے خدا کو جنم دینے والی تھی۔

اِسی ایک اور واحد مسیح کو، جو بیٹا، خداوند اور اکلوتا ہے یوں جان لیا گیا کہ اُس کی دو ذاتیں ہیں،[b] ایسی ذاتیں جو نہ ایک دوسری کے ساتھ ملائی ہوئی، نہ ہی تبدیل ہوئی ہیں، ایک دوسری سے نہ الگ،

[a] ψυχή λογική (psychē logikē)

[b] لفظی دو ذاتوں میں جان لیا گیا

> نہ علیٰحدہ ہوئی ہیں۔ البتہ ذاتوں میں جو فرق ہے وہ اتحاد کے باعث ہرگز موقوف نہیں، بلکہ ہر ذات کی انفرادی خاصیت محفوظ رہ کر ایک ہی شخصیت[a] اور ایک ہی اقنوم[b] میں متحد ہے۔ مسیح نہ دو شخصیات[a] میں بٹ گیا، نہ منقسم ہوا بلکہ وہ وہی ایک اَور واحد بیٹا ہے جو اکلوتا، کلامِ خدا (لوگوس) اور خداوند یسوع مسیح ہے۔
> شروع سے ہی نبیوں نے اُس کے بارے میں یہ کچھ سکھایا، بلکہ خود یسوع مسیح نے ہمیں یہ تعلیم دی جبکہ آبائے کلیسیا کے اقرار نے اِسے ہمارے سپرد کر دیا ہے۔[35]

اِس عقیدے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فرماتا ہے کہ مسیح کیسی ہستی ہے جبکہ دوسرا حصہ بیان کرتا ہے کہ اِسے کس طرح سمجھنا چاہئے۔

> **مسیح کیسی ہستی ہے؟**
>
> - ہمارا خداوند یسوع مسیح وہی ایک اَور واحد بیٹا ہے
> - جس کی الوہیت کامل اور انسانیت کامل ہے (یعنی دونوں ذاتیں مکمل ہیں)، جو حقیقی خدا اور حقیقی انسان ہے۔ اپولینار کے خلاف کہا جاتا ہے کہ انسان کے لحاظ سے اُس کی روح اور جسم دونوں ہی ہیں۔
> - الوہیت کے لحاظ سے اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے جبکہ انسانیت کے لحاظ سے اُس کا اور ہمارا ایک ہی جوہر ہے۔
> - ازل سے باپ سے مولود، آخری دنوں میں 'خدا کو جنم دینے والی' مریم سے پیدا ہوا۔

[a] πρόσωπον (prosōpon)
[b] ὑπόστασις (hypostasis)

دیگر الفاظ میں مسیح کی الوہیت اور انسانیت کے باعث اُس کی دو مکمل ذاتیں، دو جوہر اور دو طرح کی ولادتیں ہیں۔

اِس مسیح کو کس طرح سمجھنا ہے؟

1 اِسی ایک اَور واحد مسیح کو، جو بیٹا، خداوند اور اکلوتا ہے یوں جان لیا گیا کہ اُس کی دو ذاتیں ہیں، ایسی ذاتیں جو (a) نہ ایک دوسری کے ساتھ ملائی ہوئی، نہ ہی تبدیل ہوئی ہیں (یوطخیس کے خلاف)، (b) ایک دوسری سے نہ الگ، نہ علیٰحدہ ہوئی ہیں (نسطوریُس کے خلاف)۔

دیگر الفاظ میں: ایک ہی مسیح کو یوں جان لیا گیا کہ اُس کی دو ذاتیں ہیں۔

2 البتہ ذاتوں میں جو فرق ہے وہ اتحاد کے باعث ہرگز موقوف نہیں، بلکہ ہر ذات کی انفرادی خاصیت محفوظ رہ کر ایک ہی شخصیت (پراسوپن) اور ایک ہی اقنوم (ہپاسطسِس) میں متحد ہے۔

دیگر الفاظ میں: گو مسیح ایک ہے تو بھی دونوں ذاتیں موقوف نہیں (یوطخیس کے خلاف)۔

3 مسیح دو شخصیات (پراسوپن) میں نہ بٹ گیا، نہ تقسیم ہوا بلکہ وہ وہی ایک اور واحد بیٹا ہے جو اکلوتا، لوگوس اور خداوند یسوع مسیح ہے۔

دیگر الفاظ میں: گو مسیح کی دو ذاتیں ہیں تو بھی وہ ایک ہی رہا ہے (نسطوریُس کے خلاف)۔

میافیسیت اور دیوفیسیت کے درمیان لٹکا ہوا عقیدہ

پہلے عقیدوں کی نسبت عیقدۂ خلقیدون کا زور خدا کے انسان بننے پر نہیں بلکہ خود مسیح کے کردار پر ہی ہے۔ نیز، تحقیقات نے ثابت کر لیا ہے کہ عقیدے کی اکثر اصطلاحات قورلوس کے نوشتوں میں پائی جاتی ہیں۔ تو بھی اِس کے پیچھے لیو کی دیوفیسیت کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ اِس کی ترتیب میافیسیت اور دیوفیسیت کے انتہا پسند پہلوؤں سے کترا کر ایسا توازن قائم رکھتی ہے جو اُن کے درمیان ہی کھڑی رہتی ہے۔ الفاظ میں تھوڑی سی تبدیلی سے پورا عقیدہ آیا میافیسیت کی طرف یا دیوفیسیت کی طرف چلا جاتا ہے۔ مزید کچھ باتیں قابلِ غور ہیں۔

پہلی نظر میں دوسرا حصہ دیوفیسی لگتا ہے (ایک ہی مسیح ، ایک ہی شخصیت اور ایک ہی اقنوم کی دو غیر مخلوط ذاتیں)۔ لیکن اُس کی ترتیب اِس پر زور دیتی ہے کہ گو مسیح کی دو ذاتیں ہیں تاہم وہ ایک ہی ہے، کہ یہ دو ذاتیں مسیح میں ایک دوسری کے قریب قریب رہتی ہیں (ایک دوسری سے نہ الگ، نہ علیٰحدہ ہوئی ہیں)۔

تو پھر اِن الفاظ کا کیا مقصد ہے کہ دونوں ذاتیں نہ ایک دوسری کے ساتھ ملائی ہوئی، نہ ہی تبدیل ہوئی ہیں (a1)؟ اِس سے یہ تصور رد کیا گیا ہے کہ دونوں ذاتیں مل کر ایک تیسری چیز بن گئی ہیں۔ کیونکہ مسیح کی ایک ہی شخصیت میں دونوں ذاتیں قائم رہتی ہیں (یوطخیس کے خلاف)، گو یوں کہ وہ ایک دوسری سے نہ الگ، نہ علیٰحدہ ہیں (نسطوریُس کے خلاف)۔

غرض دوسرے حصے میں پہلے یہ زور سے کہا جاتا ہے کہ مسیح ایک ہی ہے، گو اُس کی دو ذاتیں ہیں۔ لیکن یہ بات کہنے کے عین بعد دو ذاتوں میں فرق پر زور دیا جاتا ہے (2)۔

> البتہ ذاتوں میں جو فرق ہے وہ اتحاد کے باعث ہرگز موقوف نہیں، بلکہ ہرذات کی انفرادی خاصیت محفوظ رہ کر ایک ہی شخصیت (پراسوپن) اور ایک ہی اقنوم (ہپاسطسِس) میں متحد ہے۔

یہ بات یوطخیس کے خلاف کی گئی جس کے مطابق مجسم ہونے کے بعد مسیح کی دو ذاتیں نہ رہیں۔ اِس سے پہلے دونوں الفاظ ہپاسطسِس (اقنوم) اور فیسِس (ذات) کبھی کبھی مترادف کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اب سے ہپاسطسِس (اور پراسوپن) صرف اقنوم اور فیسِس صرف ذات کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اِن دو اصطلاحات میں امتیاز کرنا ضروری تھا تاکہ اقنوم اور ذات میں فرق قائم رہے اور عقیدے کا بیان کہ ایک ہی اقنوم کی دو ذاتیں ہیں غلط سمجھا نہ جائے۔ نیز، اِس سے میافیسیت کا یہ خطرہ دُور کیا گیا کہ مسیح انسان کے ساتھ ملایا ہوا خدا ہے۔ نہیں، وہ کامل انسان بھی ہے اور کامل خدا بھی۔

آخر میں نسطوریُس کی دیوفیسیت کے خلاف کہا جاتا ہے (3)،

> مسیح نہ دو شخصیات (پراسوپن) میں بٹ گیا، نہ منقسم ہوا بلکہ وہ وہی ایک اَور واحد بیٹا ہے جو اکلوتا، کلامِ خدا (لوگوس) اور خداوند یسوع مسیح ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدۂ خلقیدون ایک طرح سے اسکندریہ اور روم کے اُس اتحاد کی تجدید ہے جو 431ء میں مضبوط ہوا تھا۔ کیونکہ اِس میں لیو اور قورلوس کا سب سے زیادہ اثر نظر آتا ہے۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قورلوس کی کافی باتیں پائی جاتی ہیں اگرچہ قورلوس کو پوری طرح نہیں اپنایا گیا۔ اگر عقیدہ پوری طرح قورلوس کے مطابق ہوتا تو وہ اِس پر زور

دیتا کہ مسیح کا اقنوم اور اُس کی الٰہی ذات ایک ہی ہیں۔ نیز، دونوں ذاتیں اِتنی قریب ہوتیں کہ مسیح کی الٰہی ذات کے بارے میں بھی کہا جا سکتا کہ اُس نے دُکھ اُٹھایا۔

یہ کیوں نہیں کہا گیا؟ خلقیدون کے مطابق مسیح کا دُکھ اُٹھانا اُس کی انسانی ذات پر محدود رہتا ہے۔ اور یہ بات لیو کے خط کے مطابق ہی ہے۔

مسیح کے بارے میں عقیدے کی کچھ کمیاں

عقیدۂ خلقیدون قدیم کلیسیا کی چار مرکزی مجلسوں میں سے آخری مجلسِ عامہ ہے۔ اِن چار مجلسوں کی مرکزی اہمیت آج تک مانی جاتی ہے۔ تو بھی اِس میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں۔

عقیدہ ماہروں کا شعبہ بن گیا

اول، مخالف پارٹیوں کو متفق کرنے کے لئے اِس عقیدے کو ایسی مشکل اصطلاحات سے کام لینا پڑا جن کا روحانی مقصد عام لوگ مشکل سے ہی سمجھ سکتے تھے۔ یہ عقیدہ علمِ الٰہیات کے ماہروں کا شعبہ بن گیا ہے۔

عقیدہ یسوع انسان کی الوہیت بیان نہیں کرسکتا

بے شک گریغوری از نزیانز کی شرط کہ جو کچھ اپنایا نہ گیا اُسے نجات حاصل نہ ہوئی عقیدۂ خلقیدون میں پوری ہوئی ہے۔ تو بھی عقیدے میں ایک کمی رہتی ہے۔ اگرچہ وہ بہ خوبی خدا کی انسانیت بیان کر سکتا ہے (ایک اقنوم کی دو ذاتیں)، لیکن وہ انسان یسوع کی الوہیت بیان نہیں کر سکتا۔ یوں صلیب کا ذکر تک نہیں ہے!

اِس کے پیچھے قدیم یونانی فلسفے کا خیال ہے کہ خدا لا تبدیل ہے۔ اِسی وجہ سے عقیدہ اِتنی سختی سے مسیح کی الوہیت اور انسانیت میں امتیاز کرتا ہے۔ کیونکہ جوہر کے لحاظ سے اُس کی الوہیت لا تبدیل ہے جبکہ اُس کی انسانیت قابلِ تبدیل ہے۔ خیال یہ ہے کہ اگر خدا اور انسان جوہر کے لحاظ سے ایک ہوں تو خدا تبدیلی کے تحت آ کر خدا نہیں

رہ سکتا۔ عقیدے میں کلام کے اِس خیال کے لئے جگہ نہیں ہے کہ مسیح نہ صرف دو کامل ذاتوں کا مالک ہے بلکہ وہ پورے طور پر خدا ہے جو اِسی حیثیت سے پورے طور پر انسان بھی ہے۔ جس طرح لوتھر فرماتا ہے، "نئے عہدنامے کے مطابق خدا کو کس ہیکل میں سجدہ کرنا ہے؟ مسیح کی انسانیت میں۔"

عقیدہ کلیسیاؤں میں رخنہ پیدا کرتا ہے

ایک اَور کمی خلقیدون میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ اِس عقیدے سے کلیسیائی اتحاد کو قائم رکھا گیا تو بھی اِس اتحاد کا کڑوا پھل نکلا۔ کیونکہ نسطوریُس کو رد کیا گیا، اگرچہ اُس کی تعلیم عقیدۂ خلقیدون کے تحت آ جاتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ دیوفیسیت کے پیروکار رومی بادشاہت سے نکل کر مشرق میں منتقل ہوئے۔ ساتھ ساتھ اگرچہ مصر کی میافیسی کلیسیا نے دانت پیس پیس کر خلقیدون کو منظور قرار دیا، تاہم وہ بھی ہوتے ہوتے خلقیدونی کلیسیا سے نکلنے لگی۔ کیونکہ وہ بھی اِس سمجھوتے سے پورے طور پر رضامند نہ ہوئی۔

خلاصہ

قدیم کلیسیا نے تین اہم ترین خزانے آنے والے زمانوں کو وراثت میں دیئے۔ اول، پرانے عہدنامے کے ساتھ جُڑا ہوا نیا عہدنامہ۔ دوسرے، تثلیث کا عقیدہ اور تیسرے، مسیح کے کردار کے بارے میں عقیدہ۔

یہ عقیدے نہ صرف عام تعلیم ہیں بلکہ مسیحی ایمان کا ایسا خلاصہ جس کی بنیادی اہمیت آج تک رہی ہے۔ خبردار جو اِسے نظرانداز کرے! جو سمجھے کہ مجھے اِس کی ضرورت نہیں وہ کسی نہ کسی بدعت میں گرنے کے خطرے میں ہے۔

قدیم کلیسیا نے یہ نہ کہا کہ ایمان کی ہر راہ کسی نہ کسی طرح صحیح ہو گی۔ نہیں، اُس نے دریائے یبوک کے کنارے پر یعقوب کی طرح اِن معاملوں کے ساتھ سخت کُشتی لڑی۔ یعقوب کی طرح اُس نے کہا، "پہلے مجھے برکت دیں، پھر ہی آپ کو جانے دوں

گا۔'' افسوس، کلیسیا کو وہ برکت نہ ملی جو ملنی تھی۔ کیوں؟ اِس لئے کہ میافیسیت اور دیوفیسیت میں مسیح کے بارے میں بولنے کے دو جائز راستے نکلے تھے۔ پہلے کا مرکزِ خیال خدا کا مجسم ہونا تھا جبکہ دوسرے کا زور مسیح میں خالق اور مخلوق کے وجود پر تھا۔ ایک کو بدعت اور دوسرے کو سچا قرار دینے سے معاملہ خراب ہو گیا، کیونکہ دونوں میں سچائی بھی اور خطرے بھی موجود تھے۔

حکومت کے ساتھ پیوست ہونے سے کلیسیائی معاملہ مزید خراب ہو گیا۔ شروع میں عقیدے کی دنیا میں کوئی حد نہیں تھی، لیکن جب کلیسیا حکومت کی اٹوٹ انگ بن گئی تو عقیدہ زیادہ تر بادشاہت پر محدود رہا۔ اِس کا کڑوا پھل کلیسیا کی تقسیم تھا۔

قدیم کلیسیا نے کلام کی اِس بات پر اپنے عقیدے کو تشکیل دی کہ مسیح نے غلام کی صورت اپنائی (فلپّیوں 7:2)۔ اُس نے اِس بات کو یوں سمجھا کہ کلامِ خدا نے مسیح کی انسانیت کو ''الٰہی'' بنائی۔ یعنی الٰہی اقنوم نے انسانیت کو یوں اُٹھا کر اپنا لیا کہ وہ اقنوم کے ساتھ ایک ہو گئی۔ لیکن اِس تصور سے مسیح کی انسانی ذات کم ہی اور اُس کی الٰہی ذات زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ ہمیشہ دوقیت[a] کا خطرہ رہتا ہے، یعنی یہ کہ مسیح انسان تو لگتا ہے جبکہ حقیقت میں خدا ہے۔ غرض وہ بات اب تک سمجھ سے باہر ہے جو لوتھر صدیوں کے بعد بیان کرتا ہے یعنی یہ کہ خالق پست ہو کر مخلوق بن گیا۔

لیکن اگر ہم یہ پیشِ نظر رکھیں تو تثلیث اور مسیح کے بارے میں تعلیم ہماری زندگی کو گھیر کر محفوظ رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ خود خدا پست ہو کر ہم جیسے بن گیا اور ہماری سزا اُٹھائی۔ اِس لئے ہم اُس کے فرزند بن کر اُس کے جلال میں حصہ لے سکتے ہیں۔

انسان کے لئے عزت مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ جس کی بے عزتی کی جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری جان برباد ہو گئی ہے۔ لیکن جب ہماری عزت مسیح کے نجات بخش کام پر منحصر ہوتی ہے تو کیا ہمیں ہر وقت سکون کی زندگی نہیں گزارنی چاہئے، خواہ اِس دنیا

[a] دیکھئے صفحہ 128۔

میں ہماری کتنی بےعزتی کیوں نہ کی جائے؟ ہماری حقیقی عزت اُس اعلیٰ ہستی پر مبنی ہوتی ہے جو خود پست ہو کر ہماری خاطر بےعزت ہوا۔ اور یہ عزت اِس لئے اِتنی یقینی اور حقیقی ہے کہ ہم نہ صرف اُس عظیم ہستی کے شاگرد بن گئے ہیں بلکہ اُس کے ساتھ ایک بھی ہو گئے ہیں، ہاں اُس کے ساتھ ایک گوشت پوست، ایک خون، ایک روح ہو گئے ہیں۔

یہی تثلیث اور مسیح کے بارے میں تعلیم کا گہرا مقصد ہے: یہ دکھانا کہ کلامِ مقدّس کے مطابق ہم مخلوقوں کا خالق کے ساتھ کیا تعلق ہے، کہ ہمیں کس طرح مسیح کے وسیلے سے نجات ملی ہے۔ ایک طرف عرفانیت کے خلاف یہ ظاہر کرنا ہے کہ خالق اور مخلوق میں جو امتیاز ہے وہ قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف یہ دکھانا ہے کہ انسان مسیح میں بحال ہو کر خدا کا فرزند بن گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں آج تک مسیحی ایمان کی بنیاد رہی ہیں۔

باب 13

اوگسطین: گناہ اور فضل

مغرب میں اوگسطین کے پیش خیمے

اوگسطین سے تاریخِ کلیسیا کا ایک نیا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کس ناتے سے؟

اوگسطین (354ء تا 430ء) شمالی افریقہ میں آباد تھا۔ اِس قطعے کا تعلق کافی دیر سے مغرب کے ساتھ تھا۔ اوگسطین میں لاطینی مغرب کا یونانی مشرق سے فرق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ نیز، اُس کا مغربی کلیسیا کی سوچ پر اثر آج تک محسوس ہوتا ہے۔ اِس عظیم فلاسفر اور کلیسیائی خادم کے بغیر قرونِ وُسطیٰ اور بعد کی مغربی کلیسیا سمجھی نہیں جا سکتی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانی کلیسیا کا دھیان خالق اور مخلوق پر رہتا تھا۔ جو عقیدے تیار ہوئے وہ اِسی عنوان کے تحت آ جاتے ہیں۔ یعنی وہ اِس کا جواب دینا چاہتے ہیں کہ خدا اور دنیا کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

گو اوگسطین قدیم کلیسیا کا بشپ ہے تاہم وہ ایک نئ سوچ کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جو اندرونی دنیا پر توجہ دینے لگتا ہے، یعنی اُس دنیا پر جو آج نفسیاتی کہلاتی ہے۔ اور یہی توجہ مغربی کلیسیا کی میراث میں آ گئ ہے۔ اب سے زور خدا اور انا کے آپس میں تعلقات پر رہا۔ جو سوال بعد میں لوتھر کے دل میں بیٹھ گیا وہ اِس رجحان کی اچھی مثال ہے: مَیں خدا کے سامنے کس طرح راست باز اور مقبول ٹھہر سکتا ہوں؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اوگسطین سے پہلے علمِ الٰہیات کے زیادہ تر ماہر یونانی مشرق میں بستے تھے۔ یونانی مشرق کے نزدیک مغربی کلیسیا روم سمیت پیچھے اور ترقی پذیر تھی۔ تاہم مغرب کی سوچ مضبوط بھی تھی اور یونان سے فرق بھی۔ چونکہ اوگسطین نے اِسی سوچ کو بڑھایا اِس لئے لازم ہے کہ ہم کچھ لمحات کے لئے مغرب کے کچھ مرکزی خیالات پر دھیان دیں۔

مغرب کا پرانے عہد نامے پر زور

طرطُلیان فرماتا ہے، ”اتھینے کا یروشلم سے کیا واسطہ، افلاطون کی اکیڈمی کا کلیسیا سے کیا تعلق ہے؟ . . . ہماری تعلیم سلیمان کے برآمدے میں سے ہے، جس نے خود ہمیں سکھایا کہ خداوند کو سادہ دلی سے تلاش کرنا ہے۔“[1]

پرانے عہد نامے پر یہ زور مثالی ہے۔ اِس کے مطابق حکمت دنیاوی فلسفوں سے نہیں بلکہ اسرائیل کی مرکزی عبادت گاہ سے حاصل ہوتی ہے۔ دیگر الفاظ میں کلیسیا ہیکل کا وارث ہے، اور وہ ہیکل کی ہدایت پر چلنے سے ہی خداوند کو پاتی ہے، یعنی سادہ دلی سے اُسے ڈھونڈنے سے۔[a]

---

[a] دیکھئے سلیمان کی حکمت 1:1؛ امثال 7:1؛ یرمیاہ 13:29

مغرب کا ایک ہی عقیدہ

پورے مغرب میں ایک ہی عقیدہ استعمال ہوتا تھا، وہ عقیدہ جو رسولوں کا عقیدہ کہا جاتا ہے گو وہ دوسری صدی میں قلم بند ہوا۔ تثلیث کو بیان کرنے والا یہ عقیدہ مغرب کے ایمان کی کسوٹی بن گیا۔

> مَیں ایمان رکھتا ہوں خدا قادرِ مطلق باپ پر، جو آسمان و زمین کا خالق ہے۔
> اور یسوع مسیح اُس کے اکلوتے بیٹے ہمارے خداوند پر، جو روح القدس کی قدرت سے کنواری مریم سے پیدا ہوا، پنطس پیلاطس کے تحت مصلوب ہوا، دُکھ اُٹھا کر دفن ہوا اور جہنم میں اُترا۔ تیسرے دن وہ مُردوں میں سے اُٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا جہاں وہ باپ کے دہنے ہاتھ بیٹھا ہے۔ وہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کی عدالت کے لئے آنے والا ہے۔
> مَیں ایمان رکھتا ہوں روح القدس پر، مقدّس کلیسیا پر، گناہوں کی معافی پر اور جی اُٹھنے پر۔[2]

اِس عقیدے میں مسیح کے بارے میں مغرب کا ایمان جامع طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ کیا عجب کہ یہی عقیدہ پاپائے روم لیو اعظم کے اُس خط کے شروع میں قلم بند ہے جو اُس نے یوطخیس کے خلاف لکھا تھا۔[a] کیونکہ اِس میں مسیح کی وہی شکل نظر آتی ہے جو لیو اعظم نے مذکورہ خط میں کھینچی۔ یعنی مسیح میں خدا اپنا جلال چھوڑ کر زمین پر اُتر آیا اور دُکھ اُٹھانے کے بعد آسمان پر چڑھ گیا، وہی ہستی جس میں خالق اور مخلوق ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملائے ہوئے، نہ الگ ہیں۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 234 و مابعد۔

مغرب کا گناہ اور توبہ پر زور

ایماندار کو بھی گناہ سے نپٹنا ہے

نئے عہد نامے کے مطابق ایمان کی شرط توبہ اور بپتسمہ ہے۔ یعنی انسان توبہ کر کے بپتسمہ لینے سے ایمان لاتا اور آسمان کی بادشاہی میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ عمل فضل پر مبنی ہے، کیونکہ خدا ہی انسان کو گناہ سے نکال کر اپنی بادشاہی میں شامل کرتا ہے۔[a]

تو پھر کیا کرنا تھا اگر ایمان دار مسیح کا انکار کرے؟ عبرانیوں کا خط فرماتا ہے کہ مرتد کے لئے دوبارہ توبہ کر کے نجات کی راہ میں آنا ناممکن ہے۔[b]

لیکن جلد ہی کلیسیا میں ایک اَور سوال اُبھر آیا۔ کیا کرنا ہے اگر کسی نے مسیح کا انکار تو نہ کیا لیکن کمزوری یا بُری عادت کے باعث گناہ کیا؟ اگر وہ توبہ کرے تو کیا کلیسیا اُسے قبول کرے؟ مُنطانی بدعت نے اِس کا انکار کیا، لیکن کلیسیا نے مجموعی طور پر اِس کی اجازت دی۔ کیونکہ ہوتے ہوتے کلیسیا کی نجات کی راہ کے بارے میں سوچ تبدیل ہوئی تھی۔ کلیسیا سمجھنے لگی کہ ایمان دار بھی گناہ گار ہے، اور اُسے بار بار توبہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے ماننا پڑا کہ زبور 51، لوقا 18:15 اور رومیوں 14:7 و مابعد جیسے حوالجات کا اطلاق ہر ایمان دار پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مکاشفہ کی کتاب میں پوری جماعتوں کو توبہ کرنے کی تنبیہ دی گئی۔

لیکن یہاں ہم خاص کر مغربی کلیسیا پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ روم میں لکھی ہوئی کتاب ہرماس کا خاص مقصد مسیحیوں کے لئے توبہ کا اعلان ہے۔[3] مصنف فرماتا ہے کہ ایک محدود وقت کے لئے ایمان داروں کو توبہ کا موقع ملے گا۔ یہ اتفاق کی بات نہیں کہ تصنیف کا آغاز ہرماس کے اپنے گناہ سے ہوتا ہے۔[4] ایک رویا میں ہرماس ایک بُرج دیکھتا ہے۔ اُسے بتایا جاتا ہے کہ یہ بُرج کلیسیا ہے، اور جو پتھر استعمال ہو رہے ہیں وہ ایمان دار ہیں۔ لیکن اُن کے گناہوں کے باعث بُرج کی مقدّس حالت بُری طرح

---

[a] مرقس 15:1؛ متی 17:4 اور 7:10

[b] عبرانیوں 6:4 و مابعد؛ 26:10 و مابعد؛ 14:12 و مابعد

متاثر ہو گئی ہے۔ لٰہذا لازم ہے کہ ایمان دار توبہ کریں۔[5] یہی مغرب کا ایک مرکزی خیال رہا ہے۔

توبہ کا کلیسیائی بندوبست

جب محسوس ہوتا ہے کہ کلیسیا کی مقدّس حالت ایمان داروں کے گناہوں سے خطرے میں ہے تو توبہ کا کلیسیائی انتظام لازمی بن جاتا ہے۔ اور یہ انتظام چلانے کے لئے کلیسیا کے منصب دار ضروری ہیں۔

توبہ کا بندوبست مغربی کلیسیا کا اہم ترین آلہ بن گیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جس کے ہاتھ میں یہ بندوبست ہے اُس کے ہاتھ میں معافی دینے کا اختیار ہے۔ اُس کے کہنے پر انسان کی زندگی بحال یا برباد ہو سکتی ہے۔ اِس سلسلے میں دو باتیں اہم ہیں۔

اول، طرطُلیان تک توبہ دینے کا اختیار جماعت کے ہاتھ میں تھا۔[6] لیکن رفتہ رفتہ یونانی مشرق میں توبہ کا انتظام راہبوں کے ہاتھ میں آ گیا جبکہ مغرب میں تیسری صدی سے یہ اختیار بشپوں کے سپرد کیا گیا۔[7] یہ کیوں؟ اِس لئے کہ کلیسیا ایمان داروں کا وہ خالص گروہ نہ رہی تھی جو شروع میں تھی۔ جتنا وہ مقبولِ عام ہو گئی اُتنا ہی اُس کا روحانی معیار گر گیا۔ آخر میں اُس میں کئی قسم کے لوگ شامل تھے۔ لٰہذا یہ ایک فطری نتیجہ تھا کہ جو اختیار پہلے پوری مقامی جماعت اور اُس کے بزرگوں کو حاصل تھا وہ منصب داروں اور خاص کر بشپوں پر منتقل ہو گیا۔

دوسرے، ہوتے ہوتے مرتد کو بھی توبہ کا موقع مل گیا۔ تیسری صدی میں بے شمار مسیحیوں نے رومی بادشاہ دیسیُس کی ایذا رسانی کی زد میں آ کر اپنے ایمان کا انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ جب سے کلیسیا مقبولِ عام ہو گئی تھی اور مختلف قسم کے لوگ اُس میں آ گئے تھے تو ابتدائی سنجیدگی نہیں رہی تھی۔ جب ایذا رسانی ختم ہوئی تو سوال اُٹھا کہ کیا یہ توبہ کر کے دوبارہ کلیسیا میں شامل ہو سکتے ہیں؟ بشپ قبریانس نے بڑی جھجک کے بعد اِس کی اجازت دی۔[8]

اوگسطین کے زمانے میں تین قسم کی توبہ مقبولِ عام ہو گئی تھی۔ اول، بپتسمہ پاتے وقت کی توبہ۔ توبہ کی سنجیدگی کے باعث اکثر لوگ بسترِ مرگ پر ہی بپتسمہ لیتے تھے۔ دوسرے، سنجیدہ گناہوں کی علانیہ توبہ۔ اِس توبہ کی ایک بار اجازت تھی۔ تیسرے، روزانہ کے چھوٹے موٹے گناہوں کی انفرادی توبہ۔ بعد کے قرونِ وُسطیٰ میں توبہ کا بندوبست دنیاوی عدالت سے مطابقت رکھنے لگا۔[9]

گناہِ فطری

کلیسیا میں یہ شعور کہ ایمان دار بھی گناہ گار ہے تازہ رہا۔ ہرماس فرماتا ہے، ''مَیں گناہ گار ہوں، اور میرے مختلف قسم کے بے شمار گناہ ہیں۔''[10] اور کلیمینس کے دوسرے خط میں لکھا ہے، ''کیونکہ مَیں بھی جو سراسر گناہ گار ہوں . . . اب تک ابلیس کے آلات کے درمیان رہتا ہوں۔[11]

تب سوال اُٹھا کہ اِس کی کیا وجہ ہے؟ میرے اندر کیا طاقت ہے کہ مَیں پورے طور پر اُس پر غالب نہیں آ سکتا؟ اِسی سوال کے جواب میں گناہِ فطری کی تعلیم پیدا ہوئی۔

طرطُلیان اِس جواب کا پیش خیمہ ہے۔ اُس کے نزدیک آدم گناہ کے باعث بگڑ گیا، اور یہ بگاڑ اُس کی اولاد پر منتقل ہو گیا ہے۔ تاہم طرطُلیان یہ نہیں سمجھتا کہ انسان کی مرضی اِس سے متاثر ہوئی ہے۔ یعنی بگاڑ زیادہ تر اِس میں ہے کہ ہر انسان میں گناہ کرنے کا رجحان موجود ہے۔[12] اِس لئے وہ نومولود بچے کو بے گناہ سمجھتا ہے۔[a13]

لیکن مغرب میں یہ احساس بڑھتا رہتا ہے کہ گناہ ہر انسان کی فطرت کا حصہ ہی ہے، اور کہ گناہ سے نپٹنے کے لئے خود خدا کے فضل کی ضرورت ہے (یوں امروز اور امروزیاستر[b14])۔ ایسی باتوں میں اوگسطین کا راستہ تیار ہو گیا ہے۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 164۔

Ambrosius, Ambrosiaster[b]

مغرب میں قائم رہنے کے کلیسیائی ہتھیار

جب مغرب مشرق سے آنے والے بے شمار قبیلوں کے سیلاب میں ڈوب گیا تو کلیسیا کس طرح قائم رہی بلکہ آخر کار اُن پر غالب آ گئی؟ تین باتیں مددگار ثابت ہوئیں۔

دنیا میں اجنبیت

ابتدائی ایمان دار سمجھتے تھے کہ ہم آسمان کے شہری ہیں، لہٰذا دنیا میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔[a15] یہ خیال بعد میں قائم رہی۔ بے شک اِس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اُن کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی رہیں۔ ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ آسمان کے شہری ہونے کے باعث ہم غیر ایمانداروں کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے۔ نتیجے میں مسیحیوں کی زندگی غیر ایمان دار ماحول کے لئے آسمان کی بادشاہی کی طرف اشارہ رہی۔[16]

جب مغرب میں غیر قومیں شور مچا کر ٹھاٹھیں مارنے لگیں تو اِسی پختگی نے ایمان داروں کو مضبوطی فراہم کی۔ اُنہیں یقین تھا کہ ہماری آسمانی وراثت پکی ہے خواہ اِس دنیا میں کتنی آفتیں ہم پر کیوں نہ آئیں۔ اِس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحی جماعت اجنبیوں کی جماعت (paroikia) کہلانے لگی۔[b17]

جنگ جو کردار

مغربی کلیسیا اپنے آپ کو ایک قسم کی فوج سمجھتی تھی۔ چنانچہ کلیمینس کے خط کے نزدیک ایمان دار خدا کے فوجی ہیں،[18] اور بپتسمہ فوجی جھنڈے پر قسم ہے۔[19] اُنہیں تنبیہ دی جاتی ہے کہ وہ فوج کو چھوڑ کر بھگوڑے نہ بنیں۔[20] ہر ماس اپنے آپ کو فوجی ڈیوٹی پر سمجھتا ہے،[21] اور ایمان داروں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مسیح کمانڈر اِن چیف ہے۔[22] ایذا رسانی جنگ اور شہید جنگ میں گرے ہوئے سورمے[23] سمجھے جاتے ہیں۔

---

[a] دیکھئے عبرانیوں 9:11 و مابعد؛ ا۔ پطرس 11:2۔

[b] انگلش میں مستعمل لفظ parish یونانی لفظ paroikia سے نکلا ہوا ہے۔

مغرب کے راہبوں نے یہ سوچ اپنائی۔ اِسی خیال نے بینڈِکت کے بے شمار راہبوں کو سہارا دیا جب اُنہوں نے رومی حکومت کے زوال پر ہتھیاروں کے بغیر مغرب کو آسمانی بادشاہت کے لئے جیت لیا۔[24]

پادریت کا نظام

مغرب کی کلیسیائی زندگی میں شروع سے ہی چرواہے اور گلے کا نمونہ اہم تھا،[25] وہ نمونہ جو ا۔پطرس 2:5 و مابعد، اعمال 20:28-29 اور یوحنا 21 میں استعمال ہو چکا تھا۔ اِن حوالجات میں بزرگوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ کلیسیائی گلے کی نگہبانی کریں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ جب سے کلیسیا مقبولِ عام ہو گئی مختلف قسم کے لوگ اُس میں آ گئے، اور وہ سنجیدگی نہ رہی جو پہلے تھی۔ اِس حالت پر قابو پانے کے لئے پادریت کا نظام پیدا ہوا، اور گلے کا اختیار گلہ بانوں پر منتقل ہو گیا۔ بشپ مسیح کا نمائندہ بن گیا۔[26] بلکہ قبریانس یقین رکھتا ہے کہ بشپ کو وہ اختیار حاصل ہے جو پطرس رسول کو دیا گیا۔[27] اِس سلسلے کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ ہوتے ہوتے پاپائے روم سب سے اعلیٰ گلہ بان بن گیا۔

خلاصہ

پہلی صدیوں میں مغرب میں ہر جگہ رسولوں کا عقیدہ مانا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ پرانے عہد نامے کا زور ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریعت پر زور دینے کے باعث مسیحی ایمان کی خصوصیت کچھ پیچھے رہ گئی ہے۔ جہاں غیر مسیحی علوم کا تعلق ہے اُنہیں مجموعی طور پر رد کیا جاتا ہے۔ علمِ الٰہیات بھی ترقی پذیر ہے۔

ایمان دار کس طرح اپنے گناہ سے نپٹ سکتا ہے؟ یہ سوال مرکزی اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا توبہ کا کلیسیائی بندوبست لازم ہے۔

---

[b] متی 16:18

دنیا میں اپنے آپ کو خدا کا گلہ اور اجنبی فوج سمجھ کر کلیسیا پادریت اور راہبوں کے نظام کی مدد سے بت پرست مغرب کو جیتنے کے لئے تیار ہے۔ ایک لحاظ سے اِن باتوں کی تکمیل اوگسطین میں پائی جاتی ہے۔

اوگسطین کی افلاطونی راہ

باطن کی طرف رجوع

مغرب میں علمِ الٰہیات صحیح معنوں میں اوگسطین سے شروع ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ پہلا شخص ہے جس کی آنکھیں افلاطونی فلسفے کی مدد سے انسان کی اندرونی دنیا کے لئے کھل جاتی ہیں۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

صدیوں سے رومی دنیا کا انتظام اور امن و امان قدیم انسان کو پختہ اور ابدی لگتا تھا۔ لیکن اوگسطین کے زمانے میں یہ انتظام وحشی قبائل کے حملوں سے اِتنا ڈانواں ڈول ہو گیا تھا کہ اوگسطین کو اِس ظاہری اور عارضی شکل پر شک آ گیا۔ دنیا کے بارے میں یہ منفی خیال اُسے باطن کی طرف لے گیا۔ لیکن جب اُسے اندر یعنی انا کی وسیع دنیا نظر آنے لگی تو یوں نہیں کہ انا پرست بن گیا بلکہ یوں کہ خدا اپنی پوری عظمت کے ساتھ سامنے آیا، وہی خیال جو پولس رسول فرماتا ہے، ”آپ انسان ہوتے ہوئے کون ہیں کہ خدا کے ساتھ بحث مباحثہ کریں؟“[a] اور جب خدا اُس پر غالب آیا تو انا کی وہ عظیم ترین دعا اُبھر آئی جو تصنیف بنام اقرار نامے میں قلم بند ہے۔

گو اوگسطین قدیم کلیسیا کا بشپ ہے تاہم وہ ایک نئی سوچ کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جو اندرونی دنیا پر توجہ دینے لگتا ہے، یعنی اُس دنیا پر جو آج نفسیاتی کہلاتی ہے۔[28] اور یہی توجہ مغربی کلیسیا کی میراث میں آ گئی۔ اب سے زور خدا اور انا کے آپس میں تعلقات پر رہا۔ جو سوال بعد میں لوتھر کے دل میں بیٹھ گیا وہ اِس رجحان کی اچھی مثال ہے: مَیں خدا کے سامنے کس طرح راست باز اور مقبول ٹھہر سکتا ہوں؟

---

[a] رومیوں 20:9

باطن کی طرف رجوع کرنے سے کلیسیا کے بارے میں بھی نئی سوچ پیدا ہوئی، بلکہ کلیسیا کا اِس دنیا میں کردار اور منزلِ مقصود چمک اُٹھی۔ اِس سے اوگسطین نے مغرب کو تاریخ کا شعور دلایا۔[29]

اوگسطین کا روحانی سفر

یاد رہے کہ اوگسطین کے والدین مسیحی تھے، یعنی وہ بت پرستی کے ماحول میں ایمان نہ لایا بلکہ مسیحی ماحول میں۔ اپنی تصنیف بنام اقرار نامے میں وہ اپنا روحانی سفر بیان کرتا ہے جس کے دوران اُس نے قدیم فلسفوں کی گہرائیاں جانچ جانچ کر اپنی تعلیم قائم کی۔ اِس سفر کے تین مرحلے تھے۔[30]

تلاش کے آغاز سے مانی تک

سفر اِس سے شروع ہوتا ہے کہ اوگسطین رومی شاعر سِسرو کی ایک کتاب پڑھتا ہے جس میں قاری کو دنیا چھوڑ کر خدا کو تلاش کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اِس خیال سے تحریک پا کر اوگسطین پہلی دفعہ سنجیدگی سے بائبل کو پڑھنے لگتا ہے۔ لیکن وہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتی بلکہ اُسے گھٹیا لگتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے چھوڑ کر مانی کی عرفانی تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہے۔

مانی کا ذکر ہو چکا ہے۔[a] اُس کے مطابق ابتدا میں نور اور تاریکی کی طاقتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کے نتیجے میں اِس دنیا میں اچھی اور بُری چیزوں کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ پیروکار کی کوشش یہ ہے کہ جسم میں دبی ہوئی چنگاری آزاد ہو جائے۔ نظم و ضبط کے ساتھ زندگی گزارنے اور افزائشِ نسل سے پرہیز کرنے سے یہ چنگاری نجات پا سکتی ہے۔

مغرب میں مانی کے پیروکار اپنی تعلیم یوں پیش کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ قسم کا مسیحی ایمان لگتی تھی۔ اِس طریقے سے بہت سے مسیحی بھی اُن کے جال میں اُلجھ گئے۔ کچھ دیر

[a] دیکھئے صفحہ 131۔

کے لئے یہ تعلیم اوگسطین کو بھی اپنی گرفت میں رکھ سکی۔ لیکن آخرکار اُس کی روحانی پیاس اِس مذہب سے بُجھ نہ سکی۔ جب ایک مشہور مانوی بشپ سے ملاقات ہوئی اور پتا چلا کہ حقیقت میں اِس کے پیچھے کچھ نہیں ہے تو اوگسطین نے مایوس ہو کر مانویت کو ترک کر دیا۔

افلاطون کے باعث اندر کی طرف رجوع

ایک غیرمسیحی فلسفہ اوگسطین کو دوبارہ مسیحی ایمان کی طرف لایا۔ فلسفے کا نام نئ افلاطونیت تھا۔ درمیانی افلاطونیت کا ذکر ہو چکا ہے۔[a] نئ افلاطونیت اُس سے ملتی جُلتی ہے اگرچہ اُس نے مذہبی رنگ اپنائی ہے۔ نئ افلاطونیت میں کیا چیز تھی جو اوگسطین کے لئے مددگار ثابت ہوئی؟

نئ افلاطونیت کے مطابق الٰہی ذات ماورائے دنیا ہے۔ اِس سے باقی چیزیں آبشار کی طرح نکلتی ہیں۔ یعنی الٰہی ذات سے خیالات کی روحانی دنیا ، خیالات کی روحانی دنیا سے مادی دنیا کی روح اور مادی دنیا کی روح سے مادی چیزیں نکلتی ہیں (مادی دنیا کی روح میں جان داروں کی روحیں بھی شامل ہوتی ہیں)۔ انسان مادی چیزوں سے آزاد ہو کر درجہ بہ درجہ الٰہی ذات تک واپس پہنچ سکتا ہے۔

یہ فلسفہ پڑھ کر اوگسطین کی آنکھیں اِس کے لئے کھل گئیں کہ دنیا نہ صرف اچھی اور بُری چیزوں کی ملاوٹ پر مشتمل ہے (مانی) بلکہ ظاہری دنیا کے پیچھے ایک روحانی حقیقت ہے۔ اور چونکہ انسان کی روح کا اِس روحانی حقیقت کے ساتھ رشتہ ہے اِس لئے وہ اُس کے پاس واپس پہنچ سکتی ہے۔ یہ کس طرح ؟ اپنے اندر جا کر اندرونی آنکھوں کے وسیلے سے۔ یہ خیال اپنانے سے اوگسطین قدیم زمانے کا پہلا شخص تھا جسے انسان کی اندرونی دنیا کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ وہ حیرانی سے دیکھتا ہے کہ پورا شہر اِس دنیا میں سما سکتا ہے۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 116۔

کیا اوگسطین یہ غیر مسیحی فلسفہ اپنانے سے خدا سے دُور ہو گیا؟ جی نہیں۔ اِس فلسفے نے ایمان لانے میں اور کتابِ مقدّس کی گہرائیوں میں جانے میں اُس کی مدد کی۔ خدا کا کلام ہمیشہ اُس کی تعلیم کا مرکز رہا۔ ہمیں یہ بات اِس میں بھی نظر آتی ہے کہ اوگسطین ہمیشہ عرفانیت سے دُور رہا، اُس کی تعلیم میں ہمیشہ خالق اور مخلوق کا نمایاں فرق رہا۔

ایمان لا تاکہ سمجھ آئے

کلیسیا میں کبھی کبھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ علم رکھنا ایمان کے لئے خطرناک ہے۔ اِس میں بےشک سچائی ہے، کیونکہ کئی ایک ایمان دار مختلف فلسفے پڑھ پڑھ کر ایمان سے دُور ہو گئے ہیں۔ لیکن کیا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہمیں علم اور سائنس سے کترانا چاہئے؟ ہرگز نہیں!

اِس کے برعکس عرفانیت فرماتا ہے کہ ایمان اور عرفان ایک ہی چیز ہیں، یعنی عرفان حاصل کرنے سے ہم صحیح ایمان لا سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ نے دکھایا ہے کہ خالی علم حاصل کرنے سے انسان ایمان دار نہیں بنتا۔

اب اوگسطین ایک تیسرا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ فرماتا ہے، "ایمان لا تاکہ سمجھ آئے۔" یعنی جو ایمان لائے اُسے صحیح سمجھ آتی ہے۔[31] ایمان کی آنکھوں سے انسان ظاہری باتوں کے پیچھے روحانی حقیقتیں جانچ لیتا ہے۔ کلام کی مدد سے اور روحانی آنکھیں رکھنے کے باعث صحیح عرفان حاصل ہوتا ہے۔

اسکندریہ کے علما نے بھی تقریباً یہی کچھ کہا تھا۔ یعنی اُنہوں نے کہا کہ عرفانیت کی مخالفت ناکافی ہے، ہم ایمان کی بنیاد پر ہی عرفان حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں اورِغین جیسے لوگوں نے سادہ ایمان اور روحانی عرفان کی بلندیوں میں امتیاز کر کے کائنات کے بارے میں پورے نظام کھڑے کئے وہاں اوگسطین اندر، دل کی طرف چل پڑا۔

اوگسطین فرماتا ہے کہ کلام کا ایک ظاہری اور ایک اندرونی پہلو ہے۔ جب انسان خدا کا کلام سنتا ہے تو یہ کلام اُس کے دل میں بیٹھ کر روحانی شکل اپنا لیتا ہے۔ لہٰذا اوگسطین متی 7:7 کو یوں سمجھ سکتا ہے، ”جو کچھ ایمان ڈھونڈتا ہے وہ سمجھ کو ملتا ہے۔“[32]

اب اوگسطین ایمان کی آنکھوں سے انسان کی روح پر غور کرنے لگتا ہے۔

انسان کی روح

انسان کی روح کا خدا کے ساتھ گہرا تعلق

اندرونی دنیا کی طرف رجوع کر کے وہ پوچھتا ہے، ”مَیں کون ہوں؟ مَیں کس طرح جانتا ہوں کہ میرا وجود دھوکا نہیں ہے؟“ جواب یہ ملتا ہے، ”یہ کہ مَیں سوچتا ہوں سچی بات ہے۔“[33][a] یعنی ظاہری چیزیں شاید دھوکا ہی ہوں، لیکن چونکہ اندر سے میری سوچنے کی قابلیت ہے اِس لئے اِس میں شک نہیں کہ مَیں ہوں۔

چونکہ انسان اور خدا دونوں ہی سمجھ رکھتے ہیں اِس لئے انسان کا خدا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہاں، سمجھ کی بنا پر انسان کی روح کا خدا کے ساتھ اِتنا گہرا تعلق ہے جتنا اپنے بدن کے ساتھ بھی نہیں ہے۔[34] اور اِسی گہرے تعلق اور قربت کی بنا پر انسان کی انا یعنی روح لافانی ہے۔

انسان کی روح اُس کی یاد داشت، روشن ہونے کی قابلیت اور مرضی پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تین چیزیں تقسیم نہیں ہو سکتیں۔

روح کی یادداشت

جب اوگسطین ظاہری دنیا کو چھوڑ کر باطن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر بھی ایک وسیع دنیا موجود ہوتی ہے۔ اُسے اپنے اندر کمرے، ہال اور محل نظر آتے ہیں جن میں یادداشت کے تصورات یوں محفوظ رکھے گئے ہیں

---

[a] بمقابلہ Descartes ”چونکہ مَیں سوچتا ہوں اِس لئے مَیں ہوں۔“

کہ ذہن ہر وقت اُن سے مدد لے سکے۔ ساتھ ساتھ اُس میں وہ اصول بھی پائے جاتے ہیں جو سوچ اور سمجھ کو ترتیب دیتے ہیں، یعنی افلاطونی الفاظ میں وہ کچھ جو خیالات کی الٰہی دنیا سے انسان کی روح میں ٹِک گیا ہے۔[35]

روح کی سمجھ

انسان کی سمجھ خود بہ خود الٰہی سچائیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ نہیں، خدا ہی انسان کی روح کو اپنی ابدی سچائیوں سے روشن کر دیتا ہے۔ جتنا روح اپنے آپ کو الٰہی روشنی سے روشن کرنے دے اُتنا ہی وہ الٰہی سچائی میں حصہ لیتی ہے، اُتنا ہی الٰہی سچائیوں کی سمجھ رکھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ بات نہ صرف روحانی سچائیوں پر صادق آتی ہے بلکہ سمجھ کے ہر پہلو پر۔[36]

کلام کو پڑھتے وقت بھی روشن ہو جانے کا سلسلہ سرانجام ہوتا ہے۔ جب انسان کلام کو سنتا ہے تو خدا اندرونی استاد مسیح کے وسیلے سے کلام کا روحانی مطلب دل میں بِٹھا کر روح کو روشن کر دیتا ہے۔[37]

روح کی مرضی

قدیم زمانہ زیادہ تر یہ خیال رکھتا تھا کہ انسان کا عمل اچھائی اور بُرائی کے بارے میں علم پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن اوگسطین اِس کا انکار کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ ہمارا عمل علم پر نہیں بلکہ ہماری مرضی پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے علم کے مطابق گناہ نہیں کرتا بلکہ اپنی مرضی سے۔[38]

تثلیث

توحید پرزور

اوگسطین کپڈکیوں کی تعلیم قبول کرتا ہے۔ تاہم وہ تثلیث کے بارے میں نئے خیالات پیش کرتا ہے۔ توحید پر زور دینے میں وہ مغرب کے مطابق ہی سوچتا ہے۔[a] اُس کے نزدیک تینوں اقانیم ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہیں اور ایک دوسرے میں پورے طور پر سرایت کرتے ہیں۔ گو مختلف موقعوں پر اُن میں سے ایک صادر ہوتا ہے تاہم باپ، بیٹا اور روح نہ صرف الٰہی ذات کے الگ الگ حصے ہیں بلکہ مکمل طور پر الٰہی ذات ہیں۔[39]

اقانیم کے آپس میں تعلقات پرزور

توحید پر یہ زور پہلی نظر میں سبیلیت کے قریب لگتا ہے۔ اوگسطین اِس خطرے سے کس طرح بچتا ہے کہ اقانیم صرف ایک ہی خدا کی مختلف شکلیں ہوں؟ اِس سے کہ وہ تین اقانیم کے درمیان کے تعلقات بیان کرنے سے اُن میں امتیاز کرتا ہے۔

اُس کے نزدیک تینوں اقانیم کا ایک ہی جوہر ہے۔ روح القدس باپ اور بیٹے سے صادر ہو کر محبت کی وہ کڑی ہے جس کے ذریعے باپ اور بیٹا ایک ہیں۔[40]

تثلیث اور انسانی روح کی مشابہت

چونکہ الٰہی ذات ازل سے تثلیث ہے اِس لئے رومیوں 1:20 کے مطابق اُس کے نقشِ قدم کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن خاص کر انسان میں یہ کچھ ملتا ہے، کیونکہ وہ خدا کی صورت پر پیدا ہوا۔[b] اوگسطین انسان کی یہ مطابقت مختلف مثالوں سے پیش کرتا ہے، مثلاً اُس میں ہونا، جاننا، اور چاہنا[41] پایا جاتا ہے؛ اِسی طرح اُس میں محبت کرنے والا، محبوب اور محبت[42] ہوتا ہے؛ نیز، اُس کا ذہن، سمجھ اور محبت[43] ہے؛ اور وہ

---

[a] بمقابلہ صفحہ 98۔

[b] پیدائش 26:1۔

یادداشت، سمجھ اور مرضی[44] پر مشتمل ہوتا ہے۔ اوگسطین کی آخری مثال انسان کی روح کے مذکورہ تین پہلوؤں سے مطابقت رکھتا ہے (یادداشت، روشن ہونے کی صلاحیت یعنی سمجھ اور مرضی)۔ دوسری مثالوں کی نسبت یہ زیادہ کام یاب ہے۔

خلاصہ

توحید پر زور دینے سے اوگسطین نے مغرب کی تثلیث کے بارے میں تعلیم قائم رکھی۔ نتیجے میں خدا کی قربت بھی سامنے آتی ہے۔ جب مسیح انسان بن گیا تو اُس میں خدا ہی قریب آ گیا۔ خود خدا پست ہو کر انسان بن گیا اور ہمارے قریب آیا۔

لیکن اوگسطین میں نجات کی وہ بہ تدریج راہ نظر نہیں آتی جو ایرینئیُس پیش کرتا ہے۔ یہ بات اُس کے خیالات میں اہمیت نہیں رکھتی۔

اوگسطین کے نزدیک انسان تثلیث سے مطابقت رکھتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ اُسے یادداشت، سمجھ اور مرضی پر مشتمل سمجھتا ہے۔ یعنی وہ سمجھتا ہے کہ انسان کی ذات اُس کی انا میں ہوتی ہے۔ اور انا میں اُس نے مرضی کا خاص کردار پہچان لیا۔ انسان کی مرضی ہی یا تو خدا کے ساتھ پیوست ہو جاتی یا اُسے ترک کرتی ہے۔ اور جس طرح تثلیث کا ایک ہی جوہر ہے اُسی طرح انسان کے یہ تین پہلو بھی نہ تقسیم ہو سکتے ہیں، نہ اُس کی انا سے فرق چیز ہیں۔

اوگسطین کی فضل تک راہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی روح کو خدا کی صورت پر ہونے کے باعث خدا کی قربت حاصل ہے۔ اوگسطین کو سمجھ آئی کہ یہ قربت نہ صرف ظاہری ہے بلکہ دل کا ایک گہرا تعلق ہے۔ لیکن اگر انسان اپنی مرضی سے خدا سے دُور ہو جائے تو اِس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

اِس کے حواب میں اوگسطین نے فضل کی تعلیم کو تشکیل دی۔ اُس کے نزدیک چار حوالجات اہم ہیں۔

سب کچھ فضل ہے

ا۔کُرِنتھیوں 7:4 اوگسطین کے نزدیک مرکزی حیثیت رکھتا ہے، ”جو کچھ آپ کے پاس ہے کیا وہ آپ کو مفت نہیں ملا؟“[45]

اوگسطین نے جان لیا کہ انا اپنی طرف سے خدا تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُس کی ہر کوشش غرور پر مبنی ہوتی ہے، وہی چیز جو گناہ کا سرچشمہ ہے، جو انسان کو حلیم ہونے اور خدا سے چمٹنے سے روک لیتی ہے۔[46] چنانچہ سب کچھ فضل ہے۔ فضل کا مطلب ہے کہ خدا سب کچھ کرواتا ہے، کہ نجات کے کام میں انسان کا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔[47] بے شک نجات یافتہ انسان نیک کام کرتا ہے، لیکن اِس کی بنیاد خدا کا فضل ہے۔ اِس کے پیشِ نظر انسان کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، یہ کہ وہ خدا کے سامنے پست ہو کر اپنے غرور کی شکست مان لے۔ جب انسان کو اِس کی سمجھ آتی ہے کہ میری نجات میری کوششوں پر مبنی نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہو کر دعا کر سکتا ہے، ”وہ کچھ بخش دے جس کا حکم تُو دیتا ہے، پھر ہی جو چاہے اُس کا حکم دے۔“[48]

دوسرے آدم کی نجات

> چونکہ انسان کے وسیلے سے موت آئی، اِس لئے انسان ہی کے وسیلے سے مُردوں کے جی اُٹھنے کی بھی راہ کھلی۔ جس طرح سب اِس لئے مرتے ہیں کہ وہ آدم کے فرزند ہیں اُسی طرح سب زندہ کئے جائیں گے جو مسیح کے ہیں۔[a]

درجِ بالا حوالے اور رومیوں 12:5 و مابعد میں پولس رسول پہلے اور دوسرے آدم کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اوگسطین نئے سرے سے اِس پر زور دیتا ہے۔ جس طرح پہلا آدم گناہ میں گر کر موت کا شکار ہو گیا اُسی طرح دوسرا آدم یعنی مسیح

[a] ا۔کُرِنتھیوں 22-21:15

پست ہو کر ابدی زندگی کا باعث بن گیا۔[49] جس طرح پہلے آدم میں تمام انسان شامل تھے اُسی طرح دوسرے آدم مسیح میں وہ افراد شامل ہو گئے ہیں جنہیں اُس نے بحال کیا۔ اِس طریقے سے مسیح نجات کی بنیاد ہے۔ نجات کا یہ سلسلہ مسیح کی انسانی حیثیت سے شروع ہو کر مسیح کی الٰہی حیثیت تک پہنچتا ہے۔[50]

خدا کی مرضی پر مبنی نجات

رومیوں 9:10-29 میں پولس رسول فرماتا ہے کہ خدا اپنی مرضی سے کچھ کو چن کر نجات دیتا ہے۔ یعقوب خدا کو پیارا تھا جبکہ عیسَو سے وہ متنفر رہا۔ ”غرض، یہ خدا ہی کی مرضی ہے کہ وہ کس پر رحم کرے اور کس کو سخت کر دے۔“[a]

اوگسطین نے جان لیا کہ یہ تعلیم فضل کا حصہ ہے۔ چونکہ انسان اپنی گناہ آلودہ حالت کی وجہ سے اپنی نجات کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اِس لئے یہ خدا کی ہی مرضی ہے کہ وہ کس پر رحم کرے، کس کو اپنا فرزند بنائے۔[51] اوگسطین کہہ سکتا ہے، ”خدا اِس لئے ہم پر فضل نہیں کرتا کہ ہم لائق ہیں بلکہ اِس لئے کہ وہ یہ چاہتا ہے۔“[52] خدا کا فضل انسان کی تمام طرح کی مرضی اور محنت سے پہلے سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔

خدا ایک پر رحم اور دوسرے کو رد کرتا ہے۔ ”کیا اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بے انصاف ہے؟“[b] اوگسطین فرماتا ہے کہ خدا کی لا محدود قدرت اُس کے انصاف سے اعلیٰ ہے۔ یہ قدرت اصولی طور پر نیک ارادہ رکھتی ہے، لیکن اِس سے زیادہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ایسی باتوں کی وجوہات مخلوق سے جانچی نہیں جا سکتیں۔

فلاغیُس: اپنی طاقت سے گناہ پر غالب آؤ

چوتھی صدی کی ابتدا میں ایک قبیلہ بنام مغربی گاتھ روم شہر پر حملہ کر کے اُس کا محاصرہ کرنے لگا۔ دباؤ کے تحت کچھ لوگ بے قابو ہو گئے جبکہ بے شمار افراد ڈر کے مارے

---

[a] رومیوں 18:9
[b] رومیوں 14:9

کلیسیا کے ممبر بن گئے۔ اُس وقت ایک برٹش زاہد بنام فلاغیُس روم میں آباد تھا۔ کلیسیا کی صورتِ حال دیکھ کر فلاغیُس بڑی سنجیدگی سے ایمان داروں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرنے لگا۔ اِس سلسلے میں اُس نے اِس پر زور دیا کہ خدا کی مدد سے ایمان دار یہ فرائض ادا کرنے کے قابل ہے۔

اوگسطین کی فضل کے بارے میں تعلیم سن کر فلاغیُس کو بڑا غصہ آیا۔ یاد رہے کہ اوگسطین نے دعا کی تھی کہ ''وہ کچھ بخش دے جس کا حکم تُو دیتا ہے، پھر ہی جو چاہے اُس کا حکم دے۔'' فلاغیُس کے نزدیک اِس قسم کے خیالات ناقابلِ برداشت تھے۔ اُس نے شور مچا کر اعتراض کیا، ''اگر ایسا جُملہ اصول بن جائے تو کلیسیا میں نظم و ضبط کس طرح قائم رہے گا؟ اگر سب کچھ خدا پر چھوڑیں تو ہماری کیا ذمہ داری رہتی ہے؟''

410ء میں گاتھ قبیلے نے روم پر قبضہ کر لیا۔ فلاغیُس اور ایک ہم خیال دوست اپنی جان بچا کر شمالی افریقہ چلے گئے۔ فلاغیُس خود تو اوگسطین سے ملے بغیر آگے نکلا، لیکن اُس کے ساتھی نے کچھ دیر تک وہاں رہ کر فلاغیُس کی تعلیم پھیلانے کی کوشش کی۔ گو افریقہ میں اُس کی تعلیم کو مسترد کیا گیا اور وہ فلاغیُس کی طرح مشرق کے لئے روانہ ہوا، لیکن اوگسطین کے ساتھ بحث مباحثہ چلتا رہا۔ چونکہ مشرق میں موروثی گناہ کا تصور نہیں تھا اِس لئے شروع میں وہاں کے ایمان دار فلاغیُس کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ خاص کر دیوفیسی اُستاد تھیُودور از مپسویستیہ اور نسطوریُس اُن کے پیروکاروں کو پناہ دیتے تھے، کیونکہ اُن کی تعلیم کچھ ملتی جُلتی تھی۔ لیکن مغرب کے اصرار پر آخرکار فلاغیُس کی تعلیم کو بدعت قرار دیا گیا، اور اِفسس کی مجلسِ عامہ (431ء) نے اُس کی تعلیم کو رد کیا۔[53]

اوگسطین اور مغربی مسیحیوں نے کیوں اِتنا شور ڈالا؟ کیا ایمان داروں کو اُن کے فرائض کی یاد دلانا غلط ہے؟ بنیادی مسئلے کی سمجھ صرف اُس وقت آتی ہے جب ہم اِس تعلیم کی جڑوں پر غور کرتے ہیں۔

اوگسطین کی نسبت فلاغیُس کا انسان کی روحانی قابلیت کے بارے میں خیال مثبت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو نجات پانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے، کیونکہ وہ یہ کرنے کے قابل ہے۔ اِس کے برعکس اوگسطین فرماتا ہے کہ نہیں، انسان اپنی طاقت سے نجات حاصل نہیں کر پاتا، کیونکہ سب کچھ خدا کا فضل ہے جو ایک کو چن لیتا اور دوسرے کو رد کرتا ہے۔

فلاغیُس کی تین باتیں اہم ہیں:

انسان کی فطرت مرضی سمیت اچھی ہے

چونکہ خدا کائنات کا خالق ہے اِس لئے سب کچھ اچھا ہے۔ فلاغیُس کے نزدیک انسان کی فطرت بھی اچھی ہے، اور اُسے نیک کام کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ خدا کی مانند بن جائے۔ بےگناہ بننا بھی اِس میں شامل ہے۔ کیونکہ خالق انسان سے صرف ایسے کاموں کا تقاضا کرتا ہے جو وہ پورا کر سکتا ہے۔

موروثی گناہ کا انکار

جہاں موت کا تعلق ہے وہ فلاغیُس کے خیال میں انسان کے گناہ کی وجہ سے وجود میں نہ آئی بلکہ کائنات کے انتظام کا قدرتی حصہ ہے۔ تو پھر آدم کے گناہ میں گرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ فلاغیُس موروثی گناہ کا انکار کرکے فرماتا ہے کہ گناہ میں گرنے سے آدم نے ایک بُرا نمونہ پیش کیا۔ نسل در نسل اِس پر عمل کرنے سے گناہ انسان کی بُری عادت بن گیا ہے۔ ہر انسان اپنے گناہ کا ذمہ دار ہے، اور اُس پر آدم کے گناہ کا اثر نہیں پڑتا۔

انسان اپنی طاقت سے گناہ پر غالب آ سکتا ہے

فلاغیُس فرماتا ہے کہ اچھا کام کرنے کی قابلیت بحال کرنے کے لئے خدا نے شریعت قائم کی۔ شریعت انسان کو اُس کے گناہوں کا شعور دلا کر اُسے خدا کی راہ دکھاتا ہے۔

لیکن اِس سے انسان نجات نہیں پا سکتا۔ اِس لئے خدا نے اپنے فضل سے ایک اَور مددگار یعنی مسیح کو بخش دیا۔ مسیح اپنی تعلیم اور نمونے سے انسان کی ہدایت کر کے اُسے گناہ سے کترانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ بپتسمے اور گناہ کی معافی سے انسان کی اچھی فطرت بحال ہو کر گناہ کی عادت کو ختم کرنے کی قابلیت پاتی ہے۔[54]

اوگسطین کا جواب: پوری زندگی فضل پر مبنی ہے

اوگسطین اور فلاغیُس میں بنیادی فرق

اوگسطین سے پہلے بھی ایسے خیالات ملتے ہیں جو اُس کی فضل کے بارے تعلیم سے ملتے جلتے ہیں۔[55] لیکن اوگسطین اِس میں لاثانی ہے کہ اُس کی تعلیم انسان کی دلی گہرائیوں کی طرف لے جاتی ہے۔

ہمیں یہ بات اُس کی گناہ کے بارے میں تعلیم میں نظر آتی ہے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ گناہ نہ صرف ایک اخلاقی کمی ہے، جس طرح فلاغیُس کہتا ہے بلکہ گناہ کرتے وقت انسان خدا کے ساتھ محبت چھوڑ کر اپنے آپ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یعنی گناہ سے خدا کے ساتھ محبت کا تعلق بگڑ جاتا ہے۔ اور جب انسان اپنے آپ سے محبت کرنے لگتا ہے تو وہ کبھی نجات نہیں پا سکتا، کیونکہ وہ اپنی اناپرستی سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

تو پھر نجات کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ صرف اِس صورت میں کہ انسان سے محبت کی جائے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ پر فرماتا ہے، ”یقیناً محبت کے پیدا ہونے اور بڑھنے کی سب سے بڑی تحریک اُسی وقت ملتی ہے جب انسان محبت رکھنے سے پہلے ہی جان لے کہ مجھ سے محبت کی جاتی ہے۔“[56] یعنی اِس سے پہلے کہ مَیں صحیح محبت رکھ سکتا ہوں لازم ہے کہ مجھ سے محبت کی جائے۔ جدید علمِ نفسیات نے اِس کی خوب تصدیق کی ہے۔ آخرکار انسان کی محبت کی بنیاد خدا ہی کی محبت ہے جس نے پہلے ہی اُس سے محبت کی ہے۔

حقیقت میں فلاغیُس کی انسان کے بارے میں تعلیم حد سے زیادہ مثبت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کائنات کے انتظام اور انسان کی عقل و قابلیت کے تعاون سے انسان کی بحالی ناگریز ہے۔ اُس کی نسبت اوگسطین انسان کی گناہ پر غالب آنے کی قابلیت پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن نہ صرف یہ بلکہ وہ جانتا ہے کہ نجات ایک ظاہری عمل سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک اندرونی اور روحانی سلسلہ ہے جو صرف اور صرف فضل کے تحت سرانجام ہوتا ہے۔

انسان کی ابتدائی حالت اور گناہ کا اثر

انسان کو خدا کی صورت پر بنایا گیا۔[a] لیکن کس طرح؟ اوگسطین جواب دیتا ہے، "تعلقات کے لحاظ سے۔" انسان کی روح تثلیث سے مطابقت رکھتی ہے، اور اِسی مطابقت کے باعث اُس کا خدا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔[b] یہی وجہ ہے کہ آدم کے پہلے گناہ کا اِتنا سخت نتیجہ نکلا۔ درجِ ذیل میں اِس کو تفصیل سے پیش کرنا ہے۔

خدا نے انسان کو اچھا اور راست باز خلق کیا، یعنی یوں کہ وہ اپنی آزاد مرضی کے مطابق خدا کی طرف رجوع کرتا تھا۔ آدم اور حوا فروتنی سے خدا کی مرضی کے ساتھ ایک تھے۔ اِس لئے اُن کی حالت لافانی تھی۔ کیونکہ خدا کے فضل نے اُنہیں لباس کی طرح محفوظ رکھا۔ اِس کامل حالت میں انسان گناہ نہ کرنے کے قابل تھا۔[57]

غرض، باغِ عدن کی اِس حالت میں انسان نہ صرف خدا کی صورت پر تھا بلکہ وہ فضل کے باعث محفوظ بھی تھا۔ انسان کی ابتدائی حالت فضل کے تحت قائم رہتی تھی۔ چنانچہ جب آدم گناہ میں گر گیا تو یہ نہ صرف کمزوری یا آزمائش کی وجہ سے ہوا۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ معاملہ تھا، کیونکہ اُس نے جان بوجھ کر اپنا منہ خدا سے موڑ کر اپنی طرف رجوع کیا۔ انسان خدا کے تابع نہیں رہنا چاہتا بلکہ اپنا مالک ہونا چاہتا تھا۔[58] غرور

[a] پیدائش 26:1

[b] دیکھئے صفحہ 261۔

کے اِس اظہار سے وہ ابتدائی فضل سے محروم ہو گیا، اور اِس کی جگہ اناپرستی آ گئی۔ محبت کی جگہ لالچ آ گیا۔[59]

گناہ کا آدم کے لئے کیا نتیجہ نکلا؟ خدا کی جس صورت پر اُسے بنایا گیا وہ بگڑ گئی۔ خود انسان یہ بگاڑ بحال نہیں کر سکتا، کیونکہ اُس کی مرضی بگڑ گئی ہے۔ اب سے اُس کی اور خدا کی مرضی ایک نہیں۔ صرف خدا کا فضل اُسے بحال کر سکتا ہے۔[60]

ساتھ ساتھ گناہ اور موت انسان کا حصہ بن گئے ہیں۔ آدم گناہ میں گرتے وقت اپنا مالک بننا چاہتا تھا، لیکن اِس کے اُلٹ ہو گیا۔ اب سے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتا۔ وہ غرور اور لالچ کا شکار رہتا ہے جو اُسے گناہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔[61]

موروثی گناہ

لیکن آدم اور حوا کے گناہ کا اثر نہ صرف اُن پر پڑا بلکہ اُن کی پوری اولاد پر، جس طرح رومیوں 5:12 میں لکھا ہے، ”جب آدم نے گناہ کیا تو اُس ایک ہی شخص سے گناہ دنیا میں آیا۔ اِس گناہ کے ساتھ ساتھ موت بھی آ کر سب آدمیوں میں پھیل گئی، کیونکہ سب نے گناہ کیا۔“

اوگسطین فرماتا ہے کہ گناہ انسان کی میراث میں آ گیا، اب سے ہر انسان پیدائش سے ہی گناہ گار ہے۔ اُس کے نزدیک اُس کی اولاد جنسی لالچ کے تحت پیدا ہونے سے آدم کی گناہ آلودہ حالت اُس کی اولاد پر منتقل ہوئی ہے۔ اِس کے لئے وہ زبور 51:5 جیسی آیات پیش کرتا ہے، ”جوں ہی میں ماں کے پیٹ میں وجود میں آیا تو گناہ گار تھا۔“[62]

اوگسطین یہ نہیں کہنا چاہتا کہ جنسی تعلقات خود گناہ ہیں بلکہ یہ کہ گناہ گار انسان صرف گناہ کے تحت اولاد پیدا کر سکتا ہے۔[63] کم از کم اُس وقت سے یہ آیت بہت دفعہ یوں سمجھا گیا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ آیت اگرچہ موروثی گناہ کی طرف اشارہ کرتی ہے تاہم اِس بات کی تصدیق نہیں کرتی کہ خود جنسی تعلقات غلط

ہیں۔ جو سمجھتا ہے کہ جنسی تعلقات گناہ کا حصہ ہیں اُس کے نزدیک یہ ایک شرم ناک عمل ہے۔ نتیجے میں اُس کا ضمیر متاثر ہو جائے گا اور وہ اپنے آپ کو ناپاک محسوس کرے گا گو کلامِ پاک یہ بات کہیں نہیں سکھاتی۔

لیکن حقیقت میں اِس معاملے میں ایمان دار کا راستہ دو انتہاؤں کے درمیان رہتا ہے۔ جنسی تعلقات خدا کی ایک نعمت ہے جس کی بنیاد پر ازدواجی زندگی مضبوط رہتی ہے۔ لیکن یہ تعلقات صرف اِس صورت میں صحت مند اور روحانی رہتے ہیں کہ میاں بیوی پر محدود رہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی میں نہ جنسی تعلقات سے پرہیز گاری اور نہ ہی نام نہاد آزاد محبت ایمان کا حصہ ہو سکتے ہیں۔

غرض، گو ہم موروثی گناہ میں جنسی لالچ کا حصہ قبول نہیں کر سکتے، تاہم اوگسطین نے ایک اہم روحانی خیال پیش کیا جب اُس نے موروثی گناہ پر زور دیا۔

شریعت اور فضل کی آزادی

اوگسطین کے نزدیک گناہ میں گرنے سے آدم ابتدائی فضل سے محروم رہ گیا۔ اب وہ لالچ کی حکومت کے تحت آ گیا۔ بحالی کے لئے لازم ہے کہ خدا دوبارہ فضل کی پہلی حالت قائم کرے۔ اِس کے لئے اُس نے دو چیزیں قائم کیں، شریعت اور فضل کی آزادی۔

شریعت

اوگسطین کی رائے میں شریعت سے کیا مراد ہے؟ شریعت خدا کی انسان کے لئے مرضی ہے، اور اُس کا خلاصہ دس احکام میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر انسان تو جانتا ہے کہ شریعت مقدّس، راست اور اچھی ہے۔[a] لیکن وہ اُسے پورا نہیں کر پاتا۔[64b]

اِس میں بھی اوگسطین پولس کے خیالات کو انسان کی اندرونی یعنی نفسیاتی حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ موروثی گناہ کی وجہ سے انسان کی روح شریعت کے تقاضوں تلے کراہتی ہے، کیونکہ وہ محسوس کرتی ہے کہ مَیں اُنہیں پورا نہیں کر سکتی،

اور مجھے سزا ہی ملتی ہے۔ وہ اُسے محبت کی روح میں پوری نہیں کر پاتی اگرچہ رومیوں 10:13 کے مطابق محبت ہی شریعت کی تکمیل ہے۔[65] نتیجے میں ''شریعت کے اثر سے ہم مر جاتے ہیں۔''[c]

فضل کی آزادی

انسان اپنی اناپرستی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ صرف وہ فضل جو مسیح کے وسیلے سے ملتا ہے اُسے آزاد کر کے خدا کا فرزند بنا سکتا ہے۔[d] اور یہ باغِ عدن میں ملے فضل سے کہیں زیادہ ہے، کیونکہ اِس میں خدا انسان پر رحم کر کے اُسے تبدیل کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ انسان میں ایمان اور محبت بھی قائم کرتا ہے۔[66]

یہ کس طرح سرانجام ہوتا ہے؟ خدا کا فضل انسان کو اُس کی اناپرستی سے آزاد کر کے اُس کا دل خدا کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ مسیح کلام کے وسیلے سے اُسے بلا کر اُس کی روح میں آ جاتا ہے تاکہ اُس کا غرور ختم کر کے ایمان پیدا کرے۔[67] انسان کا اِس میں کیا حصہ ہے؟ یہ کہ وہ ایمان لا کر خدا سے چمٹ جائے۔ لیکن پہلا قدم خدا کا فضل ہے، جو انسان کو شریعت کے بغیر راست باز ٹھہراتا ہے۔[68]

خدا کا فضل نہ صرف انسان کی مرضی آزاد کرتا ہے[69] بلکہ وہ اُس کی تجدید بھی کر دیتا ہے۔ جس صورت پر انسان کو بنایا گیا تھا اور جو گناہ سے بگڑ گئی تھی اُسے خدا بحال کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ ساتھ وہ اُس میں وہ محبت قائم کرتا ہے جس سے وہ شریعت کے تحت محروم رہ گیا تھا۔[70] بپتسمے سے انسان کی گناہ آلودہ حالت ختم ہو جاتی ہے، اُسے معافی ملتی ہے اور وہ روح القدس سے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے۔[71]

---

[a] رومیوں 12:7
[b] رومیوں 14:7
[c] ۲۔کُرنتھیوں 6:3
[d] رومیوں 21:8

اُس کے نزدیک کلام، بپتسمہ اور عشائے ربانی فضل کے اندرونی کاموں کے ظاہری نشان ہیں۔[72] کیونکہ خدا نہ صرف نجات دیتے وقت اپنا فضل عطا کرتا ہے بلکہ بعد میں بھی۔ پوری زندگی فضل کے تحت رہتی ہے۔ فضل کا یہ سلسلہ قدم بہ قدم انسان کو تبدیل کر کے گناہ کو دباتا رہتا ہے۔ بے شک یہ سلسلہ آخرت سے پہلے تکمیل تک نہیں پہنچے گا۔ فضل کے اِس اندرونی کام سے انسان مسیح کی انسانی حیثیت سے شروع ہو کر مسیح کی الٰہی حیثیت تک پہنچتا ہے۔[73]

غرض انسان نہ صرف ایمان لاتے وقت بلکہ پوری زندگی کے دوران فضل سے گھرا رہتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ”مَیں اکیلا نہیں چلنا چاہتا، ہاں ایک قدم بھی نہیں۔“[74] بے شک انسان نجات کے سلسلے میں بہت کچھ حاصل کرتا ہے، لیکن فضل کے لحاظ سے ہر اچھا کام نعمت ہے، ہر نیک کام کے پیچھے خدا کا فضل ہے جو اُسے فروتنی کی طرف لے جاتا ہے۔[75]

نجات یافتہ بھی فضل کے تحت رہتا ہے

فلاغیُس کی نسبت اوگسطین کی فضل کے بارے میں تعلیم نہایت گہری ہے۔ کیونکہ اُس نے پہچان لیا کہ نجات یافتہ انسان بھی گناہ گار رہتا ہے، لہٰذا اُسے روزانہ خدا کے فضل کی ضرورت رہتی ہے۔ خدا کا فضل انسان کی فطرت کا حصہ نہیں ہے، اِس لئے وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کر سکتا بلکہ فضل سے گھرا رہتا ہے۔ جیتے جی وہ فضل کے تحت رہتا ہے۔

فضل کے اِس شعور نے اوگسطین کی رومیوں 7:14 و مابعد کے بارے میں تعلیم بھی تبدیل کر دی۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ وہاں کا مذکورہ ”مَیں“ غیر نجات یافتہ انسان ہے۔ مثلاً جب پولس رسول فرماتا ہے، ”جو نیک کام مَیں کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کرتا بلکہ وہ بُرا کام کرتا ہوں جو کرنا نہیں چاہتا“[a] تو اِس سے مراد غیر نجات یافتہ انسان ہے۔ لیکن

[a] رومیوں 7:19

جتنا اوگسطین بوڑھا ہوتا گیا اُتنا ہی اُس نے پہچان لیا کہ نجات یافتہ انسان میں بھی گناہ کا اثر رہتا ہے۔ بلکہ جو فلاغیُس کی طرح اِس کا انکار کرے وہ کس طرح اُن بے شمار ایمان داروں کی مدد کر سکتا ہے جو اپنی بُری عادتوں سے نپٹ نہیں سکتے؟ یہ اوگسطین کی عظمت ہے کہ اُس نے ایمان داروں کی زندگی میں گناہ اور فضل کا کردار بیان کر کے گناہ سے نپٹنے کا راستہ کھول دیا۔ اُس نے دکھایا کہ اگر ایمان دار سنگین گناہ میں گر بھی جائے تاہم وہ خدا کے فضل سے دوبارہ بحال ہو سکتا ہے۔[76]

خدا کا ایمان لانے میں کیا کردار ہے؟ تقدیر کا سوال

جب انسان کی نجات اور اُس کا قائم رہنا سراسر خدا کے فضل پر مبنی ہوتا ہے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خدا ہی مقرر کرتا ہے کہ کون نجات پائے گا۔ یہی تقدیر کے بارے میں مسیحی تعلیم ہے۔ یہ بھی اوگسطین کا ایک تحفہ ہے کہ اُس نے فضل پر مبنی تقدیر کی تعلیم واضح کر دی۔

کبھی کبھار لوگوں کو تقدیر کی تعلیم بُری لگتی ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ فضل کی تعلیم لازم ہے تاہم تقدیر کی تعلیم کو نہیں چھیڑنا چاہئے۔ ایسے لوگ فضل اور تقدیر کا گہرا تعلق نہیں جانتے۔[77]

اوگسطین کے نزدیک گو خدا پہلے سے جانتا تھا کہ انسان اُس کا انکار کرے گا تاہم اُس نے اُسے رد نہ کیا۔ کیوں؟ چونکہ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ انسان کیا کرے گا اِسی لئے خدا کا ارادہ ازل سے پکا تھا کہ جواب میں کیا کرے گا۔ نتیجے میں اُس نے ازل سے کچھ لوگوں کو نجات کے لئے چن لیا۔ چونکہ یہ چناؤ خدا کی طرف سے ہے اِس لئے نہ خدا چنے ہوئے شخص کو کبھی رد کرے گا نہ ہی یہ شخص اپنا چناؤ رد کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے وہ وہ کچھ چاہتا ہے جو خدا کا اُس کے لئے ارادہ ہے۔

خدا کی محبت کی حد اُس کا انصاف ہے۔ لہٰذا گو اُس کی محبت اور فضل نہایت وسیع ہے تاہم سب کو نجات نہیں ملے گی۔ جن کے دل خدا کے رحم کے سامنے سخت رہتے

ہیں اُنہیں وہ رد کرے گا۔ صرف ایک محدود تعداد کو نجات ملے گی۔ اور یہ تھوڑے بہت لوگ پہلے سے مقرر کئے گئے ہیں۔ متی 14:22 کی بنا پر اوگسطین بلانے اور مقرر کرنے میں امتیاز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ گو بہتوں کو بلایا گیا ہے تاہم تھوڑے ہی نجات کے لئے مقرر ہیں۔

گو اوگسطین یہ تعلیم دیتا ہے کہ تھوڑوں کو نجات کے لئے مقرر کیا گیا ہے تاہم وہ کلوین کا یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ خدا نے کچھ کو ازل سے رد کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک مضمون ہے جس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اُس کا پورا زور اِس پر ہے کہ جو ایمان لایا اُسے ازل سے نجات کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اِس پر وہ یقین رکھ سکتا ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں اوگسطین یہ کہنے سے گریز کرتا ہے کہ وہ لازماً ابدی سزا کے لئے مقرر ہیں بلکہ وہ یہ بات خدا کے ہاتھ میں چھوڑتا ہے۔

کلیسیا

اوگسطین کیوں اِتنا کام یاب ہوا؟ اِس لئے کہ وہ کلیسیا کا خادم تھا۔ اُس کے ذہن میں مسیحی ایمان اور کلیسیا ایک ہی چیز ہیں۔ کیا عجب کہ اُس نے کلیسیا کے کردار پر بھی بہت دھیان دیا۔ جب دوناتس کا تفرقہ وجود میں آیا تو اوگسطین کو مزید صفائی سے کلیسیا کا کردار پیش کرنا پڑا۔

دوناتس کا تفرقہ

یہ تفرقہ کس طرح پیدا ہوا؟ دیوقلیطیان بادشاہ کی ایذا رسانی کے اختتام پر شمالی افریقہ کی کلیسیاؤں میں جھگڑا چھڑ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایذا رسانی کے وقت ایک بشپ نے کتابِ مقدّس حکومت کے حوالے کر دی تھی۔ شمالی افریقہ کے بشپ دوناتس نے اعتراض کیا کہ ایسے لوگ باغی ہیں، کلیسیا میں اُن کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ اور جو اُن کے ہاتھ سے بپتسمہ یا عشائے ربانی لے وہ ناپاک ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسے پادری کی جماعت

جھوٹی اور خراب ہے، اُس سے الگ ہونے کی ضرورت ہے۔ جب دوسروں نے یہ بات نہ مانی تو تفرقہ پیدا ہوا۔

دوناتس کی تعلیم قبریانس سے متاثر تھی۔ قبریانس نے فرمایا تھا کہ مقدّس رسومات کا صرف اِس صورت میں اثر ہوتا ہے کہ پادری مقدّس ہو۔ اگر پادری کا کردار ٹھیک نہ ہو تو اُس کے ہاتھ سے دیا گیا بپتسمہ یا عشائے ربانی نامنظور اور بےاثر ہے۔ اِس کے برعکس روم کے بشپ ستفنس اول نے فرمایا تھا کہ رسومات کا اثر پادری پر منحصر نہیں ہوتا۔ لہٰذا جس نے بدعتی شخص کے ہاتھوں بپتسمہ لیا اُسے دوبارہ بپتسمہ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

392ء سے رومی حکومت دوناتس کے تفرقے کو سختی سے دبانے لگی۔ نتیجے میں اُن میں سے بہت سے دوبارہ کلیسیا میں شامل ہونے پر مجبور ہوئے جبکہ کچھ الگ رہے۔ یہ اُس وقت سرانجام ہوا جب اوگسطین بشپ تھا، اور یہ کھینچا تانی اُس کی کلیسیا کے بارے میں تعلیم پر اثرانداز ہوئی۔[78]

اُپتاتس ازمِلیوے: کلیسیا کی پاکیزگی انسان پرمبنی نہیں ہوتی

اوگسطین سے پہلے شمالی افریقہ کے بشپ اُپتاتس از ملیوے نے دوناتس کے جواب میں کتاب لکھی۔ اُس میں اُس نے فرمایا کہ دوناتس کے لوگ ایمان دار بلکہ ہمارے بھائی ہیں۔[79] اُن کی صرف ایک غلطی ہے، کہ وہ باقی ایمان داروں کے ساتھ ایک نہیں ہونا چاہتے۔ اِس سے وہ اپنا غرور دکھا کر اپنے مسیحی بھائیوں سے محبت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔[80]

اِن کے برعکس پوری دنیا کی کلیسیا ایک ہے۔[81] نیز، کلیسیا کی مقدّس حالت خدا کی نعمتوں پر منحصر ہوتی ہے، یعنی بشپ کے منصب، مقدّس رسومات اور عقیدے پر۔

بے شک کلیسیا میں ناپاک لوگ بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اُنہیں نکالنا خدا کا ہی کام ہے۔ وہی خود رَو پودوں کو گندم سے الگ کرے گا۔[a82]

بپتسمے کے لئے تثلیث کی پکار، ایمان کا اقرار اور خدمت گزار کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ خدمت گزار مقدّس ہو۔ رسومات خود بہ خود مقدّس ہوتی ہیں، اُن کا اثر انسان پر منحصر نہیں ہوتا۔[83]

کلیسیا کی دُگنی شکل

اوگسطین نے اُپتاتس کے خیالات اپنائے۔ یعنی اُس کے نزدیک بھی مقدّس رسومات نجات کے لئے لازم ہیں، اگرچہ اِن کا اثر پیش کرنے والے پر منحصر نہیں ہوتا۔ نیز، ظاہری کلیسیا میں پاک اور ناپاک لوگ ہوتے ہیں، اور اُنہیں الگ الگ کرنا خدا ہی کی ذمہ داری ہے۔

لیکن ساتھ ساتھ اوگسطین نے جان لیا کہ دوناتس کا فرقہ ایک بات میں حق بہ جانب ہے، اِس میں کہ کلیسیا مقدسین کی جماعت ہے۔ یہ خیال اوگسطین نے قبول کیا۔ کس طرح ؟ افلاطونی سوچ سے مدد لے کر اُس نے کلیسیا کی ظاہری اور اندرونی صورت میں امتیاز کیا۔ اگرچہ ظاہری کلیسیا میں پاک اور ناپاک لوگ ہوتے ہیں لیکن اُس کے اندر ایک روحانی مرکز ہے، روح القدس کی جماعت۔[84] لیکن اِس مرکزی جماعت کو ظاہر کرنا ہمارا کام نہیں ہے، کیونکہ اُس کا کردار محبت کی اَن دیکھی کڑی پر مشتمل ہے۔ اِس بندھن سے ایمان دار ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے سر مسیح کے ساتھ ایک ہیں۔ اور یہی کڑی وہ چیز ہے جس سے دوناتس کا فرقہ محروم رہ گیا ہے۔ جو کلیسیا سے الگ ہو جائے وہ محبت اور حقیقی ایمان سے الگ ہو گیا ہے۔[85]

تاہم اوگسطین کے نزدیک کلیسیا کا اندرونی مرکز اُس کی ظاہری شکل سے الگ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسیح نہ صرف اپنے روحانی بدن (یعنی اندرونی جماعت) کا سر ہے۔ نہیں،

---

[a] متی 24:13 و مابعد

اُس نے مجسم ہو کر کلیسیا کی ظاہری شکل کو بھی قائم کیا۔[86] ظاہری شکل کے وسیلے سے وہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور چونکہ اِس اندرونی جماعت کے افراد مکمل نہیں ہوتے اِس لئے اُنہیں ظاہری کلیسیا سے پیش کی گئی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے، یعنی تعلیم، مقدّس رسومات اور ہدایت کی۔ لٰہذا محبت کی یہ روحانی جماعت بھی صرف کلیسیا کی ظاہری شکل میں قائم رہ سکتی ہے۔[87]

کلام اور مقدس رسومات کی دُگنی شکل

اوگسطین کے نزدیک کلیسیا کی دُگنی شکل کی طرح کلام اور مقدّس رسومات کی بھی ایک ظاہری اور ایک اندرونی صورت ہے۔[88] جب کلیسیا کلام کی تعلیم دیتی ہے تو یہ اُس کی ظاہری صورت ہے۔ لیکن جب خدا یہ ظاہری کلام مسیح کی معرفت انسان کے دل سے مخاطب ہوتا ہے تو دل روشن ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اوگسطین اپنی تصنیف 'اقرار نامے' میں اِس کی خوب صورت مثال دیتا ہے، ''لیکن تُو، اے خداوند نے دوست کی بات سے مجھے میری طرف مائل کر دیا، تُو نے مجھے میرے پشت کے پیچھے سے کھینچ کر نکال لایا جہاں مَیں چھُپ گیا تھا۔''[89]

کلام کی طرح مقدّس رسومات کی بھی ظاہری اور اندرونی شکل ہے۔ جب عشائے ربانی کی ظاہری شکل پیش کی جاتی ہے تو ایمان دار اندر سے مسیح اور اُس کے روحانی بدن کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔[90] البتہ اِسی صورت میں کہ کلام (یہ میرا بدن ہے وغیرہ) اور ایمان شامل ہو۔[91]

تاریخ میں کلیسیا کا کردار

اوگسطین کے نزدیک کلیسیا کا ایک تاریخی پہلو بھی ہے۔ یہ بات اُس کی تصنیف 'خدا کا شہر' میں پیش کی جاتی ہے۔

دنیا کی تاریخ دائرہ نہیں بلکہ لکیر ہے

قدیم زمانے کے مطابق کائنات دائروں میں گھومتی ہے۔ ایک چکر کے ختم ہونے پر دوسرا چکر شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی سب کچھ بار بار واقع ہوتا ہے، گو اُس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اِس کے برعکس اوگسطین نے جان لیا کہ کائنات کا وقت دائرے سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ لکیر سے۔[92] دنیا کا ایک آغاز ہے، اور وہ آخرت کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ البتہ خدا جو کائنات کا حصہ نہیں ہے وقت کی اِس پیمائش کے تحت نہیں چلتا۔ نیز، کائنات میں صرف انسان کو وقت کا شعور حاصل ہے۔ یہ اِس سے نظر آتا ہے کہ اُسے ماضی اور مستقبل کا احساس ہے۔[93]

غرض کائنات بار بار واقع نہیں ہوتی بلکہ اُس کا ایک آغاز ہے، اور وہ خدا کی طرف بڑھتی ہوئی اپنا مقصد پورا کرتی جا رہی ہے۔ اوگسطین اِس بات کی تصدیق فلپّیوں 13:3 جیسے حوالجات میں دیکھتا ہے جہاں پولس رسول فرماتا ہے، ”جو کچھ میرے پیچھے ہے وہ مَیں بھول کر سخت تگ و دَو کے ساتھ اُس طرف بڑھتا ہوں جو آگے پڑا ہے۔“[94]

دنیا کا شہر اور خدا کا شہر

قدیم انسان کے نزدیک ملک کی حکومت ایک مذہبی معاملہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حکومت کے پیچھے دیوتاؤں کی طاقت اور حفاظت ہے، اور حکمران اُن کا نمائندہ ہے۔ یہ بات رومی حکومت پر بھی صادق آتی ہے، جو کئی صدیوں سے کام یاب رہی تھی۔

لیکن 410ء میں مغربی گاتھوں نے روم پر قبضہ کر کے اُس کا ستیاناس کر دیا۔ رومی ممالک کی رعایا کو بڑا صدمہ پہنچا۔ بت پرستوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ بت پرستی منع کرنے کے باعث ہوا ہے۔ اور مسیحیوں کے دل میں سوال اُبھر آیا کہ خدا نے یہ کیوں ہونے دیا؟

اِس سوال کے جواب میں اوگسطین نے اپنی تصنیف ’خدا کا شہر‘ قلم بند کی۔ اِس میں وہ دکھاتا ہے کہ حکومت اور مذہب دو الگ چیزیں ہیں۔ اِس دنیا میں دو الگ شہر

ہوتے ہیں، خدا کا شہر اور دنیا کا شہر۔ یوں تاریخ میں ایک عارضی اور ایک ابدی چیز ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھی ہوئی چلتی آئی ہیں۔ آخرت پر ہی وہ الگ الگ ہو جائیں گی۔ ایک طرف خدا کا شہر ہے، یعنی مسیحیت جو دنیا میں اجنبی اور کمزور ہے۔ دوسری طرف دنیا کا شہر ہے جس کا خاص نمائندہ رومی حکومت ہے۔[95]

اوگسطین دنیا کی حکومت کو بہ راہِ راست شیطانی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ مانتا ہے کہ حکومت کا فرض امن و امان قائم رکھنا ہے۔ اِس ناتے سے مسیحی بھی اُس میں حصہ لے سکتے ہیں۔[96] 'دنیا کا شہر' کلیسیا کے لئے بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم اوگسطین کو نام نہاد رومی امن و امان کا منفی پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ کیا یہ قائم رکھنے کے لئے ہول ناک ظلم و تشدد نہیں ہوا؟ اُس کی زیادتی کے پیشِ نظر قابلِ تعریف رومی حقوق بھی مذاق بن گئے ہیں۔ کیا دنیاوی حکومتیں سب سے بڑے لٹیرے نہیں ہوتیں؟[97] یہ خیال آج کل بھی کتنا موزوں لگتا ہے!

اوگسطین کی یہ تعلیم لاثانی تھی۔ اُس سے پہلے یوسیبیُس نے تاریخِ کلیسیا لکھی تو تھی، لیکن اُس میں اور اوگسطین میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یوسیبیُس سمجھتا ہے کہ جب حکومت نے مسیحی ایمان کو قبول کر لیا تو کلیسیا کا مقصد پورا ہو گیا، یوں سمجھیں کہ تاریخ عروج پر آ گئی ہے۔[98] اوگسطین حکومت کے بارے میں ایسی مثبت سوچ نہیں رکھتا۔ وہ اِس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ 'دنیا کا شہر' مسیحی بن جائے۔ اِس کے برعکس اُسے دنیا کے شہر کی خدا کے شہر سے مخالفت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایک طرف جہنم کے لئے مقرر بے شمار لوگ ہیں جبکہ دوسری طرف نجات کے لئے مقرر تھوڑے تھوڑے افراد ہیں۔ اِس دنیا میں ہم صحیح امن و امان حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ ماورائے دینا ہی ہے۔ یہ دو شہر دو مختلف دنیائیں ہیں جو دنیا کی تاریخ میں ایک دوسری کے ساتھ اُلجھی رہتی ہیں لیکن جو آخرت پر الگ الگ ہو جائیں گی۔

اوگسطین کا یہ خیال اِتنا غیرمعمولی تھا کہ بعد کی رومی کلیسیا نے اُسے یوں نہ مانا۔ اِس کی جگہ اُس نے دو حکومتوں کی تعلیم پیش کی۔ اُس کے نزدیک ایک ہی دنیا میں

دو حکومتیں ہیں، کلیسیا کی روحانی حکومت اور بادشاہ کی دنیاوی حکومت۔ اِس سے وہی پاپائے روم اور بادشاہ کے درمیان ہاتھا پائی شروع ہوئی جو قرونِ وُسطیٰ کا ایک نشان ہے۔

خلاصہ

اوگسطین نے عرفان، فضل اور کلیسیا کے بارے میں اپنی تعلیم سے وہ مرکزی مضامین چھیڑے جو آج تک مغرب کی سوچ میں اُبھر آتے رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ خوش باش زندگی کی تلاش میں نہیں تھا بلکہ سچائی کی تلاش میں۔ یہ تعلیم اِسی تلاش کا نتیجہ تھی۔

اندر کی دنیا

سچائی کی اِس تلاش میں اوگسطین نے ایک نئی دنیا پائی جو اِس طرح پہلے کسی کو نظر نہیں آئی تھی یعنی انسان کے اندر کی دنیا۔ باطن کی طرف رجوع کرنے سے درجِ ذیل نتیجے نکلے۔

ایمان پر مبنی سمجھ

سوال: سمجھ کا ایمان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ جواب: ایمان لا تاکہ سمجھ سکے۔ اوگسطین سمجھ گیا کہ صحیح سمجھ اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب خدا مجھے روشن کر دے۔ خدا اور انسان کی گہری قربت اِس میں نظر آتی ہے کہ انسان میں بھی ایک قسم کی تثلیث ہے، یعنی اِس میں کہ وہ یادداشت، سمجھ اور مرضی پر مشتمل ہوتا ہے۔

فضل

اِس مضمون کے لئے اوگسطین نے باطن کی طرف رجوع کیا۔ انسان کی مرضی، موروثی گناہ، فضل اور تقدیر کے بارے میں تعلیم سے اُس نے قرونِ وُسطیٰ کی نجات کے بارے میں سوچ تیار کی۔ یعنی ”میَں کس طرح خدا کا رحم حاصل کر سکتا ہوں؟“

کلیسیا

باطن کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ کلیسیا کی تعلیم میں بھی نظر آتا ہے۔ کلیسیا کی ایک ظاہری اور ایک اندرونی شکل ہے۔ اور اِس دنیا میں دو شہر ہیں، دنیا کا شہر اور خدا کا شہر۔ ایمان دار دونوں کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

اوگسطین سے سبق

باطن کی طرف رجوع کریں

اوگسطین کی طرح اِس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے باطن پر نظر ڈالیں۔ جب ہم ایمان کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تب ہی ہمیں صحیح سمجھ آتی ہے۔ یہ سمجھ عام علم سے کہیں بلند ہے۔ یہ وہی سمجھ ہے جسے بائبل حکمت کہتی ہے۔ ایمان کی آنکھوں سے ہمیں گناہ کی سنجیدگی پتا چلتا ہے۔ ایمان کی آنکھوں سے ہم اردگرد کے حالات کے پسِ پردہ معاملے پہچان سکتے ہیں۔ بلکہ یہی سمجھ ہمیں مُرجھانے والی دنیا میں قائم رہنے کی مضبوطی عطا کرتی ہے۔ تب ہم دنیا کے طوفانوں میں ڈانواں ڈول نہیں ہو جاتے بلکہ مضبوطی سے خدا کی سیدھی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔

تثلیث کی قربت

اوگسطین نے تثلیث کے بارے میں ایک اہم سچائی جان لی۔ سچائی یہ تھی کہ چونکہ ہم تثلیث کی صورت پر بنے ہوئے ہیں اِس لئے ہم خدا کے بہت قریب ہیں۔ ہماری عزت اِسی سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔

اکثر ہم اپنی عزت کو اپنے رُتبے، اپنے پیسوں، اپنے لباس اور اپنی تعلیم پر مبنی سمجھتے ہیں۔ لٰہذا ہم جلد ہی اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں اگر یہ چیزیں چھیڑی جائیں۔ ہم کتنی بار ایک ہی لفظ کی بنا پر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ لیکن ایسی حرکتیں صرف اِس کا اظہار کرتی ہیں کہ ہم حقیقی عزت کا سرچشمہ نہیں سمجھتے۔ اگر ہمیں اُس عزت کا شعور ہو جو خدا نے ہمیں دی ہے تو دنیاوی عزت ماند پڑ جائے گی۔ صرف وہ محبت اور عزت

جو ہمیں خدا سے حاصل ہے حقیقی اور ابدی ہے۔ اور جہاں تک ہم عزت اور محبت کی اِس بندھن میں رہیں گے وہاں تک ہم ایمان میں ترقی کریں گے۔

فضل پانے کے لئے گناہ کی پہچان ضروری ہے

گناہوں کی سنجیدگی کی پہچان ہمارے دلوں کو خدا کے فضل کے لئے کھول دیتی ہے۔ ہمارا معاشرہ یہ سنجیدگی نہ پہچاننا اور نہ ہی اُسے تسلیم کرنا چاہتا ہے، اِس لئے وہ نجات سے دُور ہی دُور رہتا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اپنے گناہوں کی پہچان اور تسلیم ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اِس کے بغیر ہم خدا کے فضل کو قبول نہیں کر سکتے۔

ہمارے معاشرے میں اکثر فلاغیُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان مجموعی طور پر ٹھیک ہی ہے گو وہ کچھ کمزور ہے۔ اگر وہ کوشش کرے تو بے شک اچھا بن سکتا ہے۔ لیکن یہ مثبت بات کہیں نظر نہیں آتی۔ اخبار کو کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں؟ چاروں طرف ہنگامہ، چاروں طرف دہشت ہی دہشت۔

اگر انسان کوشش بھی کرے تاہم وہ گناہوں سے نپٹنے میں ناکام رہ کر پریشان رہتا ہے۔ تو کیا یہ بات تسلی کا باعث نہیں کہ ہمارے آقا نے ہمارے گناہوں کو اپنے اوپر اُٹھا کر ہم سے دُور کر دیا ہے؟ نہ صرف یہ، بلکہ وہ ہمارے ہاتھ کو چھوٹے بچے کی طرح تھامے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ وہی روح القدس کے کام سے ہمیں تبدیل کرتا رہتا ہے، وہی اپنا فضل ہماری زندگی میں ڈالتا رہتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے رہیں۔ تب ہی ہم اُس کے ساتھ چمٹے ہوئے یہ فضل پاتے رہیں گے۔

سیالکوٹ کنوینشن سے اِتنے بے شمار لوگ کیوں تبدیل ہوئے؟ اِس لئے کہ اُنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ آج تک یہ رواج رہا ہے۔ عبادت ہوتے وقت ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم گناہ گار ہیں۔ لیکن کون آنسو بہا بہا کر تفصیل سے جماعت کے سامنے

اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے؟ اگر ہم واقعی خدا کا فضل پانا چاہیں تو پہلے دل کی گہرائیوں سے اپنے گناہوں کا اقرار کریں۔

اندرونی کلیسیا کی تسلی

ظاہری اور اندرونی کلیسیا کی تعلیم تسلی کا باعث بھی ہے اور تحریک کا بھی۔ ظاہری کلیسیا کبھی بھی کامل نہیں ہو گی، اُس میں ہمیشہ حقیقی اور نامی ایمان دار رہیں گے۔ ہم اِس سے یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ تعلیم اور نظم و ضبط بےفائدہ ہے۔ لیکن یہ تسلی کی بات ہے کہ خدا ہی منصف ہے، اور وہی آخرت پر گندم کو خود رَو پودوں سے الگ الگ کرے گا۔

دنیا جلد ہی بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ پیشِ نظر رکھ کر ہم اوگسطین کی تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شہری سکون سے زندگی گزار سکے۔ بےشک ناانصافی بہت ہے۔ تاہم کلیسیا کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت کے تابع رہے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حکومت کی ہر بات کو پسند کریں۔ لیکن خدا ہم سے تابع داری کا تقاضا کرتا ہے، خواہ ہم مغرب میں ہوں یا مشرق میں۔ ساتھ ساتھ ہمیں یہ تسلی ہے کہ تمام حکومتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اور ہمیں پتا ہے کہ کلیسیا اِس دنیا میں اجنبی ہے، کہ اُس کی منزلِ مقصود آسمان ہے۔ اِس لئے ہم خدا کو تکتے رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ مسیح دنیا پر فتح پا چکا ہے۔ جتنا دنیا ڈانواں ڈول ہو رہی ہے اُتنا ہی ہم فتح کے نعرے لگا لگا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب تک کلیسیا کا جہاز سمندر کی طوفانی موجوں سے ہچکولے کھا رہا ہے، لیکن ایک دن وہ سکون کی بندرگاہ میں پہنچے گا، ایک دن ہمیں پورے طور پر فتح حاصل ہو گی۔

ایمان کے شہدا اور شہید پرستی

باب 14

ایذا رسانیاں

ایذارسانیوں کی جڑیں

> مبارک ہو تم جب لوگ میری وجہ سے تمہیں لعن طعن کرتے، تمہیں ستاتے اور تمہارے بارے میں ہر قسم کی بُری اور جھوٹی بات کرتے ہیں۔ خوشی مناؤ اور باغ باغ ہو جاؤ، تم کو آسمان پر بڑا اجر ملے گا۔ کیونکہ اِسی طرح اُنہوں نے تم سے پہلے نبیوں کو بھی ایذا پہنچائی تھی۔ [a]

[a] متی 5:11-12

شہادت کا پہلا نمونہ خود مسیح ہے جو ہماری خاطر صلیب پر چڑھ گیا۔ البتہ اُس کا کردار بھی فرق تھا اور نجات کا جو کام اُس نے ادا کیا بھی۔ جتنے بھی مسیحی اپنے ایمان کی خاطر شہید ہوئے ہیں اُن میں سے کسی نے بھی اپنی موت سے کفارہ نہیں دیا۔ شہادت کا مطلب گواہی دینا ہے۔ شہید گواہی دیتا ہے کہ مسیح میرا آقا اور نجات دہندہ ہے جس کا انکار مَیں نہیں کر سکتا۔

خود مسیح نے اِس خیال کا بیج بو دیا۔ مذکورۂ بالا آیات میں اُس نے اپنے شاگردوں کو اِس سے آگاہ کیا کہ ایذا رسانی کے اوقات آئیں گے۔ اور مسیح کی موت کے عین بعد کلیسیا کی ایذا رسانی ہونے لگی۔ سب سے پہلا شہید ستفنس تھا۔ ساتھ ساتھ وہ پہلا نمونہ بھی بن گیا۔

یہ نمونہ کیسا تھا؟ ستفنس روح القدس سے اِتنا معمور تھا کہ عدالت میں اُس کا چہرہ فرشتے کا سا نظر آیا۔[a] ساتھ ساتھ خدا نے ستفنس کو دفاع کے صحیح الفاظ عطا کیئے۔ ستفنس کا یہ پیغام ہمیں سخت لگتا ہے، کیونکہ اِس میں وہ مخالفوں کی سخت دلی ڈانٹتا ہے۔ یعنی وہ ایک بات میں بھی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہے۔ پیغام کے بعد اُسے خدا کا جلال نظر آتا ہے، اور یسوع خدا باپ کے دہنے ہاتھ کھڑا ہے۔ یہ سن کر یہودی اُسے سنگسار کرتے ہیں۔ مرتے وقت وہ اپنی روح کو مسیح کے سپرد کر کے دعا کرتا ہے، ”اے خداوند، اُنہیں اِس گناہ کے ذمہ دار نہ ٹھہرا۔“

غور کریں، ستفنس تلوار سے نہیں بلکہ صرف الفاظ سے اپنا دفاع کرتا ہے۔ اور جو بات وہ کرتا ہے وہ سیدھی سی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ روح القدس سے اِتنا معمور ہے کہ اُسے خدا کا جلال نظر آتا ہے۔ یہ بھی اہم ہے کہ وہ اپنی روح کو مسیح کے سپرد کر کے دعا کرتا ہے کہ اِنہیں اِس گناہ کے ذمہ دار نہ ٹھہرا۔ اِس دعا کا پہلا پھل ساؤل ہے جو بعد میں پولس کہلاتا ہے۔

---

[a] اعمال 15:6

قدیم کلیسیا میں جہاں بھی دیکھیں اِس نمونے پر چلنے کی گہری آرزو نظر آتی ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ فرشتے کی مانند بننا راہبوں کا ٹارگیٹ بھی تھا۔ سنجیدہ مسیحیوں کی سب سے گہری خواہش یہ تھی کہ ستفنس کی طرح خدا کو دیکھیں، کہ روح القدس کی مدد سے مسیح کے ہم شکل بن جائیں۔ یہ کچھ حاصل کرنے کا ایک طریقہ شہادت تھا۔ دوسرا طریقہ راہب کی زندگی تھا۔ اِسی وجہ سے قدیم کلیسیا کے ایمان دار اِن دونوں شعبوں میں اِتنی دل چسپی لیتے تھے۔ اور اِسی وجہ سے وہ شہیدوں کو موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ جسے خود ایسا جلال حاصل نہیں تھا وہ یقین رکھتا تھا کہ شہید کا دامن نہ چھوڑنے سے مجھے بھی کچھ نہ کچھ برکت ملے گی، چاہے روحانی برکت، چاہے شفا یا دولت ہو۔

مسیحیوں کو پہلے ستانے والے یہودی تھے۔ شروع میں رومی حکومت اُنہیں یہودی فرقہ سمجھ کر نہیں چھیڑتی تھی۔ لیکن نیرو بادشاہ سے لے کر رومی حکومت اُن کی ایذا رسانی کرنے لگی۔

ساسانی حکومت کی ایذا رسانیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔[a] جہاں رومی ممالک کا تعلق ہے عموماً کہا جاتا ہے کہ ابتدائی کلیسیا کی دس بڑی ایذا رسانیاں تھیں:

---

[a] دیکھئے صفحہ 62۔

ایذا رسانی	بادشاہ	سال (قریباً)
1	نیرو	64ء
2	دومِطیان	81ء–96ء
3	تراجان	108ء
4	مرقس اَوریلیُس	177ء–180ء
5	سویُرس	202ء–211ء
6	مکسِمِنُس تھراکس	235ء–238ء
7	دیسیئس	249ء–251ء
8	ولیریان	257ء–260ء
9	آوریلیان	274ء–275ء
10	دیوقلیطیان	303ء–311ء

اِس کا مطلب یہ نہیں کہ اِن کے درمیان مسیحیوں کو ستایا نہیں جاتا تھا۔ بیچ میں بھی ایمان داروں کو اِدھر اُدھر چھوٹے پیمانے پر ستایا جاتا تھا۔ لیکن مذکورۂ بالا ایذا رسانیاں طوفان کی سب سے بڑی موجیں تھیں۔

اِن ایذا رسانیوں کے دو دور تھے۔ پہلا دور ایذا رسانی 1 تا 6 اور دوسرا دور ایذا رسانی 7 تا 10 پر مشتمل تھا۔ پہلے دور میں اکثر ایذا رسانیاں نہ ہر جگہ تھیں نہ ہر وقت۔ یہ ایذا رسانیاں نسبتاً کم سخت تھیں۔ دوسرا دور دیسیئس بادشاہ سے شروع ہوا جو پہلی دفعہ مسیحی ایمان کو سراسر ختم کرنا چاہتا تھا۔ سب سے زیادہ شہید اِسی دور کے ہیں۔

ایذارسانیوں کی وجوہات

لوگ کیوں مسیحیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے؟ اِس کی کئی وجوہات ہیں۔

دیوتاؤں کا انکار

بہت دفعہ مسیحیوں پر کفر کا الزام لگایا گیا۔ کفر سے مراد یہ تھا کہ وہ تمام دیوتاؤں کا انکار کرتے ہیں۔ یہ بات ایک طرح سے درست ہے۔ ایمان دار توحید کے باعث خدا کے سوا دیگر کسی بھی دیوتا کی پوجا نہیں کر سکتے تھے۔ یوسطین شہید نے فرمایا، "یوں ہمیں کافر کہا جاتا ہے۔ اور جہاں اِس قسم کے دیوتاؤں کا تعلق ہے ہم یہ مانتے بھی ہیں۔ لیکن حقیقی خدا کے لحاظ سے ہم کافر نہیں ہیں۔"[1]

چونکہ ایمان دار دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتے تھے اِس لئے جب کبھی کوئی آفت آتی تو لوگ جلد ہی اُنہیں سزا دینے پر آمادہ ہوتے۔ خیال یہ تھا کہ دیوتا مسیحیوں کی "اجنبی توہم پرستی"[2] کے باعث ناراض ہو کر ملک پر آفت لائے ہیں۔

نجات کا واحد راستہ

مسیحی کیوں دیوتاؤں کا انکار کرتے تھے؟ وہ سمجھتے تھے کہ مسیح پر ایمان نجات کا واحد راستہ ہے، کہ تمام باقی مذاہب جھوٹ ہی ہیں۔ اِس لئے وہ دوسروں سے الگ الگ عبادت کرتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ دوسروں کی عبادتوں میں شریک ہونے سے انکار ہی کرتے تھے، یہ کہہ کر کہ یہ دیوتا حقیقت میں بدروحیں ہیں۔

ایمان دار اِس سے بڑھ کر کہتے تھے کہ اگلے جہان میں دیگر تمام مذاہب کے پیروکار ہلاک ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اِس خیال نے بُت پرستوں کو اُن کی طرف مائل نہ کیا۔[3] یاد رہے کہ ایمان دار کئی طرح سے اپنے پڑوسیوں سے فرق تھے۔ اول، اُن کا اخلاقی معیار اونچا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی فکر کرتے تھے۔ نیز، ہر ایمان دار کا فرض تھا کہ اپنے ہاتھوں سے پیسے کمائے۔ ایسی باتوں سے وہ اپنے بُت پرست پڑوسیوں سے نمایاں طور پر فرق تھے۔ علاوہ از ایں کچھ پیشے مسیحی کے لئے ناممکن تھے، مثلاً اداکاری

اور گلیڈی ایٹر کا پیشہ۔ اداکاری اِس لئے منع تھی کہ جو ڈرامے پیش کئے جاتے تھے اُن کے اکثر غیر اخلاقی مضامین تھے۔ گلیڈی ایٹر جنگجو تھے جو لوگوں کی تفریح کے لئے دوسرے لوگوں یا جانوروں کے ساتھ لڑتے تھے۔ اکثر کوئی نہ کوئی مر جاتا تھا، اِس لئے یہ مسیحیوں کے لئے منع تھا۔

بہت مسیحی اِس کے بھی خلاف تھے کہ مسیحی فوجی بنیں۔ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج میں ایسے فنکشن تھے جن میں بُتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ فوجی کو لازماً اِس میں شریک ہونا تھا۔ انکار کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اکثر ستانے والوں کا ایک خاص ٹارگیٹ فوج میں مسیحی تھے۔ مذہبی فنکشنوں میں شریک نہ ہونا بےوفائی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

جہاں ایمان دار علانیہ طور پر عبادت نہیں کر سکتے وہاں وہ چپکے سے جمع ہوتے تھے۔ اِس کے پیشِ نظر لوگ شک کی نظر سے اُن پر دیکھتے تھے۔ اُنہیں لگتا تھا کہ مسیحی پسِ پردہ غیر اخلاقی حرکتیں کر رہے ہیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ مسیحی عشائے ربانی کے موقعے پر رنگ رلیوں میں اپنے دل بہلاتے ہیں۔[4] اثیناگرس فرماتا ہے، "ہم پر تین الزام لگائے جاتے ہیں: کفر، مردم خوری اور زنائے مَحرَم۔"[5][a]

ایسی وجوہات کی بنا پر الگ رہنے سے مسیحی مشکوک لگتے تھے۔ اور یہ شک جلد ہی نفرت میں بدل سکتا تھا۔ کئی دفعہ مسیحیوں پر الزام لگانے کے پیچھے لالچ بھی تھا۔ الزام لگانے والے کو اُس کی ملکیت پر قبضہ کرنے کی اُمید تھی۔

بغاوت کا خطرہ

حقیقت میں رومی حکومت بہت مختلف قسم کے مذاہب برداشت کرتی تھی۔ تو وہ کیوں مسیحی ایمان کے خلاف کھڑی ہوئی؟ اِس لئے کہ مسیحی ایمان دار رومی دیوتاؤں اور بادشاہ کی پوجا کرنے سے انکار کرتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ رومی دستور کے مطابق ایسی پوجا رعایا کی وفاداری کی تصدیق تھی۔

---

[a] مَحرَم وہ رشتے دار ہے جس کے ساتھ نکاح ناجائز ہے

آج کل حب الوطن دکھانے کے لئے قومی ترانہ گایا جاتا ہے۔ جو انکار کرے اُسے باغی سمجھا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو رومی دیوتاؤں کی پوجا کرنے سے انکار کرے وہی باغی سمجھا جاتا تھا۔ قاری نوٹ کریں کہ رومی حکومت یہ تقاضا نہیں کرتی تھی کہ لوگ اپنا اپنا مذہب چھوڑیں۔ وہ محض یہ چاہتی تھی کہ لوگ اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ رومی دیوتاؤں اور بادشاہ کی پوجا بھی کریں۔

رومی حکومت اِس پر بہت دھیان دیتی تھی کہ رعایا پوری وفاداری اور اطاعت کا اظہار کرے۔ جو تابع رہے وہ سکون سے زندگی گزار سکتا تھا، لیکن جو بھی گڑبڑ پیدا کرے اُس سے حکومت سختی سے نپٹتی تھی۔ اِسی وجہ سے کلَودیُس بادشاہ نے ایک موقع پر تمام یہودیوں کو روم شہر سے نکال دیا۔[6] اور کیا عجب کہ مسیحیوں کے سخت مخالف قیلسُس نے اِس پر زور دیا کہ مسیحی حکومت کے تابع نہیں رہتے۔[7]

معاشرے پر منفی اثر

کلامِ مقدّس کے مطابق ہر انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے، اور جو بھی مسیح پر ایمان لائے اُسے نجات ملتی ہے خواہ امیر ہو خواہ غلام۔ یہ خیال قدیم زمانے میں سراسر نامنظور تھا۔ خاص کر یہ بات عوام کو بُری لگتی تھی کہ کلیسیا غلام کو بھی بھائی سمجھتی تھی۔ کلیسیا میں آزاد کئے گئے غلام بڑے عُہدوں پر بھی آ سکتے تھے۔ مثلاً تیسری صدی میں روم کا ایک بشپ ایسا آزاد کیا گیا غلام تھا۔

عوام کی نظر میں کلیسیا معاشرے کو اُلٹ پلٹ کرنا چاہتی ہے، ہبلکہ اُس کی حرکتوں سے معاشرے کا ڈھانچا ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ خود مسیح نے فرمایا تھا کہ دولت آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونے میں رُکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ کیا یہ خیال انقلابی نہیں تھا؟

خاندان میں نااتفاقی

مسیح نے فرمایا تھا، ''مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔''[a] قدیم کلیسیا میں یہ بات بے شمار خاندانوں پر صادق آئی۔ کلیسیا بُت پرستوں اور ایمان داروں کے درمیان شادی منع کرتی تھی، لیکن جن خاندانوں میں کچھ افراد مسیحی بن گئے اور دوسرے بُت پرست رہے اُن میں اَن بن اور جھگڑے کا بہت امکان تھا۔ یہ نااتفاقی قبر تک رہتی تھی۔ ایمان دار کے مرنے پر سوال یہ تھا کہ کیا اُسے بت پرست طریقے سے دفنایا جائے یا مسیحی طرز کے مطابق؟

یوسطین شہید ایک ایمان دار کا ذکر کرتا ہے جسے سزائے موت دی گئی۔ وجہ: کسی رومی افسر کی بیوی نے مسیح پر ایمان لا کر اپنے خاوند کو سمجھایا کہ شراب اور دیگر بُری عادتوں سے گریز کرے۔ جب اُس نے یہ کچھ نہ چھوڑا تو بیوی نے طلاق دی۔ اِس کے بدلے میں شوہر نے مذکورہ آدمی کو سزائے موت دلوائی، کیونکہ بیوی اُسی کے ذریعے ایمان لائی تھی۔[8]

اگر مسیحی کی تعداد کم رہتی تو شاید رومی حکومت دھیان نہ دیتی۔ لیکن یہ فرقہ جلد ہی پورے ممالک میں پھیلتا گیا۔ اور ایذا رسانیوں کے پیچھے نہ صرف رومی حکومت تھی بلکہ بہت مرتبہ بے ہنگام عوام بھی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسیحی خاموش نہ رہے۔ یوسطین شہید جیسے دلیلی اپنے دفاع میں کتابیں لکھنے سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔[9]

---

[a] متی 10:35-36

مغرب کی ایذا رسانیاں

پہلا دور: گاہے بگاہے کی ایذا رسانیاں

1: نیرو (64ء)

64ء میں روم شہر کا کافی حصہ آگ سے تباہ ہوا۔ لوگ افواہیں پھیلانے لگے کہ نیرو بادشاہ نے خود یہ کروایا تاکہ اپنے نئے محل کے لئے جگہ بنا لے۔ لوگوں کو خاموش رکھنے کے لئے نیرو نے مسیحیوں کو مجرم ٹھہرایا۔ اُنہیں عام سزا نہ دی گئی۔ کچھ کو کھالوں میں لپیٹ کر کتُوں سے پھڑوایا گیا۔ کچھ کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ کچھ کو جلنے والی چیزوں میں لپیٹ کر جلایا گیا تاکہ اندھیرے میں روشنی دیں۔ نیرو نے تماشے دیکھنے کے لئے اپنے باغوں کو عوام کے لئے کھول دیا۔[10]

اِن سالوں میں غالباً دونوں رسولوں پطرس اور پولس کو روم میں سزائے موت دی گئی۔[11] یہ ایذا رسانی روم شہر پر محدود رہی، لیکن رومی حکومت نے پہلی دفعہ دکھایا کہ مسیحی ایمان کا اقرار کرنے والا سزائے موت کے لائق ہے۔

2: دومِطیان (81ء تا 96ء)

دومِطیان بادشاہ کا پورا زور رومی حکومت، ثقافت اور مذہب پر تھا۔ ساتھ ساتھ اُس نے بادشاہ کی پوجا پر بھی زور دیا۔ کیا عجب کہ مسیحیوں کو ستایا گیا۔ یوسیبیُّس مؤرخ کے مطابق اُس وقت یوحنا رسول نے جلاوطنی میں مکاشفے کی کتاب قلم بند کی۔[12]

3: تراجان (108ء)

تراجان بادشاہ کی حکومت کے تحت بشپ اِغناطسیوس شہید ہوا۔

108ء سے اگلی بڑی ایذا رسانی تک مسیحیوں کو اِتنا نہ چھیڑا گیا۔ تاہم گاہے بگاہے مسیحیوں کو ستایا گیا۔ اُس دوران دو مشہور راہنما پالِکارپ اور یوسطین شہید کو سزائے موت دی گئی۔[13]

پلینی اور تراجان کے خط قریباً 112ء میں بتونیہ کے رومی گورنر پلینی نے تراجان بادشاہ کو خط لکھ کر اُس سے پوچھا کہ مسیحیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ مسیحی ایمان نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہاتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ مندر خالی تھے، اور دیوتاؤں کو قربان کئے گئے جانوروں کا گوشت بیچنا مشکل ہی ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر کچھ لوگوں نے مسیحیوں پر الزام لگایا تھا۔ گورنر نے کچھ مسیحیوں کو سزائے موت دی اور کچھ کو جو رومی شہری تھے گرفتار کر دیا تھا۔ پلینی کا بادشاہ سے سوال یہ تھا کہ مسیحیوں کو کس جرم کی بنا پر سزا دینی ہے؟ کیا مسیحی ایمان کا اقرار کرنا کافی ہے؟ کیا بچوں یا کمزوروں کو بھی سزا دینی ہے؟ مسئلہ یہ تھا کہ اب مسیحیوں پر الزاموں کا سیلاب آ گیا تھا۔ کچھ کی پوچھ گچھ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ مسیحی ایمان کا انکار کرتے ہیں۔ اور جو ایمان میں مضبوط رہے اُن کے بارے میں کوئی بُری بات پتا نہ چلا۔ لیکن گورنر کے نزدیک اُس کا اُن کے ساتھ سلوک حق بجانب تھا، کیونکہ مندر دوبارہ بھر گئے ہیں۔

تراجان جواب میں پلینی کے سلوک کی تصدیق کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ فرماتا ہے کہ کوئی اپنا نام چھپا کر کسی پر الزام نہ لگائے۔ یعنی جو کسی پر الزام لگانا چاہے وہ عام عدالت میں جا کر یہ کرے۔ یہ بات اِس لئے اہم ہے کہ عام عدالت میں اگر الزام لگانے والا غلط نکلے تو اُسے وہ سزا دی جاتی تھی جو ملزم کو دینی تھی۔ تراجان یہ بھی فرماتا ہے کہ گورنر خود اپنی طرف سے تفتیش نہ کرے کہ کون کون مسیحی ہے۔ تاہم اگر کسی پر عدالت کے ذریعے الزام لگایا جائے اور وہ مسیحی ایمان کا اقرار کرے تو اُسے سزا دینی ہے۔ تاہم اگر وہ انکار کر کے دیوتاؤں کی پوجا کرے تو اُسے آزاد کرنا ہے۔ تراجانت کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسیحیوں کو خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔[14]

4: مرقس اَوریلیُس (177ء تا 180ء)

مرقس اَوریلیُس[a] کے تحت ایذا رسانی خاص کر جنوبی فرانس میں عروج پر آئی۔ مسیحیوں کو ظالمانہ طریقوں سے سزائے موت دی گئی۔ اُن کی لاشوں کو کتُوں کے سامنے پھینکا گیا، اور جو کچھ باقی رہا اُسے بھسم کرکے دریا میں بکھیر دیا گیا۔[15]

5: سویرُس (202ء تا 211ء)

سویرُس[b] بادشاہ کے تحت مسیحیوں کو خاص کر شمالی افریقہ اور مصر میں ستایا گیا۔ قرطاجنہ میں ایک عورت بنام پرپیطُوَا[c] اور اُس کے ساتھیوں کی شہادت مشہور ہوئی۔[16] اُس وقت اورِغین کا باپ بھی مصر میں شہید ہوا۔ اورِغین خود جو اُس وقت نوجوان تھا اپنے والد کے ساتھ مرنا چاہتا تھا، لیکن اُس کی ماں نے اُس کے کپڑے چھپا کر اُسے جانے نہ دیا۔[17]

202ء میں ایرینیُس کا جنوبی فرانس میں سر قلم کیا گیا۔

6: مکسِمنُس تھراکس (235ء تا 238ء)

اِس بادشاہ[d] نے ایذا رسانی کے دوران روم کے بشپ اور ایک مسیحی بنام ہِپالیتُس کو جزیرۂ ساردینیا میں جلاوطن کر دیا۔[18]

دوسرا دور: مسیحیت کو نیست کرنے کی کوششیں

7: دیسیُس (249ء تا 251ء)

دیسیُس[e] بادشاہ سے ایذا رسانیوں کی نوعیت تبدیل ہوئی۔ اُس کے تحت پہلی بار مسیحیت کو سراسر ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ بادشاہ رومی ثقافت اور مذہب کا عقیدہ پرست

---

[a] Marcus Aurelius
[b] Septimius Severus
[c] Perpetua
[d] Maximinus Thrax
[e] Decius

تھا، لہٰذا وہ جلدی سے مسیحیوں کے خلاف قدم اُٹھانے لگا۔ پہلے اُس کا ٹارگیٹ کلیسیا کے لیڈر تھے۔ روم، انطاکیہ اور یروشلم کے بشپ شہید ہوئے جبکہ اسکندریہ اور قرطاجنہ کے بشپ چھپ جانے سے بچ گئے۔

250ء میں دیسیُس نے نیا قدم اُٹھایا۔ اُس نے ایک فرمان صادر کیا جس کے مطابق رومی ممالک کے ہر باشندے کو مجسٹریٹ کے سامنے مملکت کی سلامتی کے لئے دیوتاؤں کو قربانی پیش کرنی ہے۔ یہ کچھ ادا کرنے پر رسید[a] ملے گی۔ جو انکار کرے اُسے سزائے موت دی جائے۔

کچھ مسیحیوں نے قربانی پیش کرنے کے بجائے رشوت دے کر رسید حاصل کی جبکہ بے شمار لوگوں نے ایمان کا انکار کرکے قربانی پیش کی۔ لیکن جو ایمان میں مضبوط رہے اُنہیں سزائے موت دی گئی۔ اورِغین کو بھی گرفتار کیا گیا۔ جب دیسیُس 251ء میں مر گیا، تو ایذا رسانی تھم گئی۔ اورِغین کو آزاد کر دیا گیا، لیکن تشدد کے باعث اُس کی طبیعت اِتنی خراب ہوئی تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد فوت ہوا۔[19]

اِس ایذا رسانی نے کلیسیا میں ایک مشکل سوال پیدا کیا۔ سوال یہ تھا کہ اُن لاتعداد مسیحیوں کے ساتھ کیا کرنا ہے جنھوں نے رسید خرید لی یا جنھوں نے قربانی پیش کی؟ کیا وہ توبہ کرکے دوبارہ کلیسیا کے ممبر بن سکتے ہیں؟ کچھ لوگ اُن بشپوں کے خلاف بھی ہوئے جو چھپ گئے تھے۔ کیا اُنہیں بھاگنا چاہئے تھا؟

8: ولیریان (257ء تا 260ء)

ولیریان[b] بادشاہ نے فارسیوں سے لڑتے وقت مسیحیوں کے خلاف دو فرمان بھیجے۔ 257ء کے پہلے فرمان میں اُس نے کلیسیائی خدمت گزاروں کو حکم دیا کہ وہ رومی دیوتاؤں کو قربانیاں پیش کریں ورنہ جلاوطن ہو جائیں گے۔ اگلے سال کے دوسرے فرمان میں اُس نے حکم دیا کہ مسیحی راہنماؤں کو سزائے موت دی جائے۔ نیز، رومی عہدیدار

libellus[a]
Valerian[b]

رومی دیوتاؤں کی پوجا کریں، ورنہ اپنے عُہدے، اپنی ملکیت اور جان سے محروم رہ جائیں گے۔ دولت مند رومی خواتین اپنی ملکیت سے محروم رہ کر جلاوطن ہو جائیں گی، اور سرکاری افسر اور شاہی گھرانے کے ملازم غلام بن جائیں گے۔ یہ فرمان ظاہر کرتا ہے کہ بہت سے مسیحی سب سے اونچے طبقوں میں شامل ہو گئے تھے۔

روم کا بشپ اپنے سات خادموں سمیت شہید ہوا۔ قرطاجنہ کا بشپ قبریانس جو پچھلی ایذا رسانی میں چھپ گیا تھا اب اُس کا سر قلم ہوا۔ خاص کر شمالی افریقہ میں بہت سے مسیحی شہید ہوئے۔ لیکن 260ء میں ولیریان فارسی فوج سے گرفتار ہوا اور ایذا رسانی ختم ہوئی۔[20]

9: اوریلیان (274ء تا 275ء)

اَوریلیان[a] بادشاہ نہایت کام یاب حکمران تھا۔ اُس کے تحت رومی مملکت دوبارہ مضبوط ہوئی۔ وہ سورج دیوتا[b] کی پوجا پر زور دے کر اپنے آپ کو اُس کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ رومی قوموں کو اِس مذہب سے متحد کرنا چاہتا تھا۔ کچھ اشارے ملتے ہیں کہ وہ مسیحیوں کو ستانے کا منصوبہ باندھ رہا تھا، لیکن اِس سے پہلے کہ پورے ہو سکے وہ فوت ہوا۔[21]

10: دیوقلیطیان (303ء تا 311ء)

248ء دیوقلیطیان تخت نشین ہوا۔ اُس وقت مالی اور سیاسی حالات خراب تھے۔ اِن پر قابو پانے کے لئے دیوقلیطیان کی حکومت سخت تھی۔ رومی مملکت کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے رومی مذہب کو بھی مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ خود وہ اپنے آپ کو رومی دیوتا جیوپیٹر کی دنیاوی شکل سمجھتا تھا۔ رومی ثقافت اور مذہب کو بحال کرنے

Aurelian[a]
sol invictus[b]

کا ایک قدم اجنبی فرقوں کی تباہی تھا۔ نتیجے میں اُس نے نہ صرف مسیحیوں بلکہ مانی کے پیروکاروں کو بھی ستایا۔

303ء سے دیوقلیطیان مسیحیوں کے خلاف فرمان صادر کرنے لگا۔ یہ سب سے سخت ایذا رسانی تھی۔ فرمانوں کے مطابق گرجاگھروں کو ڈھا دینا، کلامِ مقدّس کو جلا دینا اور مسیحیوں کو سرکاری ملازمت سے نکالنا ہے۔ کلیسیائی ملکیت حکومت کے قبضے میں آنا ہے۔ جن مسیحیوں نے رومی دیوتاؤں کی پوجا کرنے سے انکار کیا اُن پر تشدد کرنا ہے۔ شروع میں خاص کر کلیسیائی راہنماؤں کو پکڑا گیا۔ لیکن 304ء سے تمام مسیحی بادشاہ کا نشانہ بن گئے۔ جیل اِتنے بھر گئے کہ دیگر مجرموں کو آزاد کرنا پڑا۔ رومی دیوتاؤں کی پوجا سے انکار کرنے والے ایمان داروں پر تشدد ہوا، اور بہتوں کو کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ کچھ کو زندہ حالت میں جلایا یا بھونا گیا، کچھ کی آنکھیں نکالی گئیں۔ پٹائی اور کوڑا لگانے کے بعد زخموں پر نمک یا سرکہ لگایا گیا۔ کچھ کا سر قلم کیا گیا، کچھ مصلوب ہوئے، کچھ کے منہ میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا گیا۔

روم میں کلیسیا کی ملکیت حکومت کے قبضے میں آ گئی اور بہت سے مسیحیوں کو قتل کیا گیا۔ ایشیائے کوچک میں ایک پورا مسیحی قصبہ باشندوں سمیت بھسم ہوا۔ تمام ممالک اور خاص کر مشرق میں ایمان داروں پر دباؤ سخت تھا۔ صرف فرانس اور برٹن کے حاکم نے مذکورہ فرمانوں پر عمل نہ کیا۔[22]

305ء میں دیوقلیطیان صحت کی خرابی کے باعث تختِ شاہی سے دست بردار ہوا۔ ایذا رسانی فوراً ختم نہ ہوئی البتہ کم ہوئی۔ لیکن 313ء میں بادشاہی کے مغربی حصے کے بادشاہ قسطنطین نے مشرقی حصے کے بادشاہ کے ساتھ فرمان صادر کیا جس میں مسیحیوں اور دیگر مذہبوں کو علانیہ طور پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی۔ علاوہ از ایں کلیسیائی ملکیت واپس کر دی گئی۔ یہ فرمان اٹلی کے شہر میلان میں صادر ہوا، لٰہذا فرمانِ میلان کہلاتا ہے۔[23]

قسطنطین کی تبدیلی

قسطنطین کو روم کا پہلا مسیحی بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات صرف کسی حد تک درست ہے۔

312ء میں اُس نے روم شہر کے قریب اپنے مخالف پر فتح پائی۔ یہ واقعہ ایک پل بنام پلِ مِلوِیا[a] کے سامنے ہوا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے قسطنطین نے رات کو ایک خواب دیکھا جس نے اُسے قائل کیا کہ آئندہ مَیں مسیحی خدا میں پناہ لوں گا۔ ایک مؤرخ بنام لکطانتیُس[b] اِس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ رات کے وقت بادشاہ کو خواب میں حکم دیا گیا کہ اپنے فوجیوں کی ڈھالوں اور علَموں پر ایک نشان لگوائے، تب ہی فتح پائے گا۔ نشان میں دو حروف خی رو (χ ρ) جُڑے ہوئے تھے۔[24] یونانی میں یہ دو حروف نام مسیح (χριστός) کے پہلے دو حروف ہیں۔

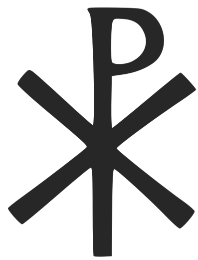

خی رو کا نشان

یوسیبِیُّس مؤرخ کا بیان کچھ فرق ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ قسطنطین نے سورج کی طرف دیکھ کر اُس کے اوپر روشنی کی صلیب دیکھی۔ اِس کے ساتھ یہ جملہ نظر آیا، ''اِس میں فتح پا۔''[c] آنے والی رات کو مسیح نے خواب میں اُسے فرمایا کہ یہ نشان اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کر۔ اُس وقت سے وہ خی رو کا نشان استعمال کرنے لگا۔ یوسیبِیُّس کے بیان کے مطابق یہ مذکورہ جنگ سے پہلے کسی اَور وقت واقع ہوا۔ یوسیبِیُّس کے مطابق خود قسطنطین نے اُسے یہ کچھ سنایا۔[25]

قسطنطین پہلا شخص تھا جس نے یہ نشان استعمال کیا۔ عام مسیحی اِس سے واقف نہیں تھے۔ یہ پہلی دفعہ 317ء کے ایک سکے پر نظر آتا ہے۔

Milvia[a]
Lactantius[b]
(en toutō nika) ἐν τούτῳ νίκα[c]

غالباً قسطنطین رفتہ رفتہ مسیحی ایمان کی طرف مائل ہوا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ 312ء میں وہ مضبوط مسیحی نہیں تھا۔ یہ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے پلِ مِلوِیا کی فتح پر ایک یادگار بنوائی جس پر فتح کی دیوی[a] کی تصویریں نقش کی گئیں۔ اور اُسے مخصوص کرتے وقت مختلف دیوتاؤں کو قربانیاں پیش کی گئیں۔ یادگار کی کوئی بھی بات مسیحی ایمان کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔

321ء میں قسطنطین نے رعایا کو ہدایت دی کہ وہ سورج دیوتا کا دن منائیں۔ اور کافی دیر تک بادشاہ کے سِکوں پر سورج دیوی کی علامتیں رہیں۔ یہ اور دیگر کئی باتیں دکھاتی ہیں کہ قسطنطین ٹھوس مسیحی نہیں تھا۔ غالباً وہ کم از کم شروع میں سمجھتا تھا کہ مسیحی ایمان اور سورج دیوتا کا ایمان ایک ہی چیز ہیں۔ جب اُس نے اپنا نیا دار الحکومت قسطنطنیہ قائم کیا تو اُس نے اُس میں دو گرجا گھر تعمیر کئے بلکہ سورج دیوتا کا ایک مجسمہ بھی جس کی شکل بادشاہ کی شکل سے ملتی جلتی تھی۔ ساتھ ساتھ اُس نے ایک دیوی کا مجسمہ بھی بنوایا۔[26]

غرض، گو قسطنطین مسیحی تھا وہ ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کو بھی چلنے دیتا تھا۔ تاہم اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُس سے مسیحیوں کا نصیب بدل گیا۔ اب سے مسیحی مذہب کو نہ صرف برداشت کیا گیا بلکہ منظورِ عام بھی ہو گیا۔ افسوس کہ کئی جگہوں پر ستائے ہوئے ستانے والے بن گئے۔

قسطنطین کی تبدیلی کے فوائد

قسطنطین کی تبدیلی کی وجہ سے نہ صرف مسیحی ایمان منظور ہوا بلکہ حکومت خود مسیحی بن گئی، گو یہ سلسلہ قسطنطین کے بعد تکمیل تک پہنچا۔ کلیسیا کو اِس سے کیا سہولتیں حاصل ہوئیں؟[27]

---

[a] victoria

بدعتوں کا دباؤ رومی ممالک کے اتحاد کے لئے حکومت کو مضبوط اور متحد مذہب کی ضرورت تھی۔ لٰہذا حکومت نے بدعتوں کو نامنظور قرار دے کر دبایا، گو کچھ دیر کے لئے وہ آریت کی بدعت کی طرف مائل رہی۔

کلیسیائی خدمت گزاروں کی سہولتیں کلیسیائی خدمت گزاروں کو کچھ ٹیکسوں اور دیگر عوامی فرائض ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ملکیت رکھنے کا کلیسیائی حق کلیسیا کو قانونی طور پر ملکیت رکھنے کی اجازت ملی۔ بادشاہ نے خود بہت سے گرجا گھر بنوائے۔

کلیسیا کی مالی مدد حکومت مالی طور پر کلیسیائی خدمت گزاروں کی مدد کرنے لگی۔

کلیسیائی عدالتوں کی منظوری کلیسیا میں پہلے سے عدالتیں تھیں۔ اب یہ حکومت سے بھی منظور ہوئیں۔ اِس بنا پر بشپ قیدیوں کی سفارش کر سکتے تھے۔ اور اب جو گرجا گھر میں پناہ لیتا تھا اُسے چھیڑا نہیں جا سکتا تھا۔ مثلاً غلام یا قرض دار چرچ میں پناہ لے کر بشپ کی سفارش کی توقع کر سکتا تھا۔ پہلے یہ حق مندروں کو حاصل تھا۔

اتوار کی چھٹی اتوار کو قانونی چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔

ظلم و تشدد کو محدود رکھنے کی کوششیں کچھ قوانین مسیحی ایمان کی وجہ سے تبدیل ہوئے۔ مصلوب کرنے کی سزا منع کی گئی۔ اُکھاڑے میں موت تک لڑنے کا تماشا آہستہ آہستہ ختم کیا گیا۔ حکومت نے طفل کشی (والدین سے بچوں کا قتل) روکنے کی کوشش کی۔ نیز، اُس نے غلاموں کو آزاد کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ قدیم روم میں

مجرم کے ماتھے پر گرمی سے دہکتے لوہے سے نشان لگانے کی رسم تھی۔ اب قسطنطین نے یہ منع کیا۔ وجہ یہ تھی کہ چونکہ انسان کو خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اِس لئے اُس کے چہرے کو بگاڑنا غلط ہے۔

خواتین اور خاندان کے حقوق بڑھائے گئے اب خواتین کو ملکیت رکھنے کے وہی حقوق حاصل ہوئے جو مردوں کو بھی حاصل تھے سوائے زمین بیچنے کے حقوق کے۔ علاوہ از ایں ماں کو کچھ شرائط پر سرپرستی کا حق بھی مل جاتا تھا۔

ازدواجی زندگی کے بارے میں مسیحی تعلیم قانون بن گئی۔ مثلاً قریبی رشتے داروں سے شادی کرنا منع ہوا۔ طلاق دینے لینے کے راستے میں مزید رُکاوٹیں ڈالی گئیں۔ نیز، داشتہ رکھنا ممنوع ہوا۔

رومی حقوق کے مطابق والد اپنے بچوں کی زندگی اور موت کا مالک تھا۔ اب یہ حق محدود کیا گیا۔ مثلاً اب سے جو باپ اپنے بچے کو قتل کرے اُسے سزا دی جاتی تھی۔

قوانین پر مسیحی تعلیم کا اچھا اثر یُوسطِنیان بادشاہ نے رومی قوانین کے ساتھ جُڑے ہوئے مسیحی اصول ترتیب سے قلم بند کئے، اور اُس کا یہ شاہ کار جدید زمانے کے عدالتی نظام کی بنیاد بن گیا۔

قسطنطین کی تبدیلی کے نقصانات

مذکورۂ بالا سہولتوں کے ساتھ ساتھ کچھ منفی نتائج بھی نکلے۔

کلیسیا میں حقیقی ایمان کی کمی چونکہ حکومت مسیحی بن گئی اِس لئے مسیحی بننا فیشن بن گیا۔ پہلے کلیسیا زیادہ تر حقیقی ایمان داروں پر محدود رہی تھی، لیکن اب گرجا گھر ایسے لوگوں سے بھر گئے جو سنجیدہ نہیں تھے۔ نتیجے میں کلیسیا کا نظم و ضبط، جوش، جد و جہد اور محبت کم ہو گئی۔ ساتھ ساتھ بُت پرستی کی بہت سی رسمیں داخل ہوئیں۔

کلیسیا میں دولت کے ساتھ کرپشن کا اضافہ ابتدائی مسیحی سادہ تھے، لیکن اب کلیسیا میں دولت اور شان کا اظہار عام ہو گیا۔ بڑے شہروں کے عہدیدار نہایت امیر بن گئے۔ نتیجے میں کرپشن کا خطرہ بڑھ گیا۔

کلیسیا میں حکومت کی مداخلت کلیسیا کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کلیسیائی معاملوں میں مداخلت بھی کرنے لگے۔ جو انتظام عزت اور دولت پر مبنی ہوتا ہے اُس کی خود مختاری جاتی رہتی ہے۔ ساتھ ساتھ کلیسیا بھی حکومت کے معاملوں میں دخل دینے لگی۔ یُوسطِنیان یہ مداخلت عروج تک لایا جب اُس نے فرمایا کہ روحانی اور دنیاوی باتوں کو بادشاہ کے ہاتھ میں ہونا ہے۔[a]

بدعتوں کی ایذارسانی بادشاہ جلد ہی بدعتوں کو ستانے لگا۔ مسیحی نظر سے یہ قابلِ مذمت ہے۔ لیکن ہمیں بادشاہ کا نقطۂ نظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قدیم دنیا میں یہ سوچ پائی نہیں جاتی تھی کہ ہر انسان اپنی مرضی کا ایمان رکھ سکتا ہے۔ نیز، بادشاہ مسیحی ایمان کو بادشاہی کے اتحاد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا، اور بدعتیں یہ اتحاد مجروح کر سکتی تھیں۔

دیگر سلطنتوں میں رہائش پذیر مسیحیوں کے لئے نقصان رومی حکومت کی حمایت رومی ممالک کی کلیسیا کے لئے کئی طرح سے مفید تھی، لیکن دیگر ممالک میں رہنے والے ایمان داروں کو بہت نقصان ہوا۔ وہاں کے لوگ اُنہیں مغرب کے ایجنٹ سمجھنے لگے۔ یہ بات خاص کر مشرقی کلیسیا کے لئے نقصان کا باعث بن گئی۔[b]

---

[a] دیکھئے صفحہ 481۔
[b] دیکھئے اگلا صفحہ ۔

مشرقی کلیسیا کی بڑی ایذا رسانی

رومی ممالک کے ایمان داروں کو 313ء تک ستایا گیا۔ اُن کے مشرق میں بسنے والے مسیحیوں کی حالت سراسر فرق تھی۔ وہاں کے ایمان دار قسطنطین تک نسبتاً امن و امان سے زندگی گزار سکتے تھے۔ حالات بدلنے کی کیا وجہ تھی؟

تقریباً 315ء میں قسطنطین نے فارسی بادشاہ شاپور کو ایک خط بھیج دیا۔ اُس میں اُس نے شاپور کے ممالک میں بسنے والے مسیحیوں کی سفارش کر کے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اُن سے اچھا سلوک کرے۔[28] بے شک قسطنطین کی نیت اچھی تھی، لیکن فارس روم کا دشمن تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ مسیحیوں کی سفارش کرنے سے یوں لگ رہا تھا کہ فارس میں رہنے والے مسیحی رومی حکومت کے حامی ہیں۔ یہ ڈر کہ فارس کے مسیحی ہر وقت حکومت کے دشمن بن سکتے ہیں ایذا رسانی کی ایک جڑ تھی۔

دوسری جڑ ساسانی بادشاہوں کی قوم پرستی تھی۔ ساسانی حکومت قدیم فارس کی ثقافت اور مذہب کی تجدید کرنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مسیحیوں کے نئے فرقے کے حق میں نہیں ہو سکتی تھی۔ زرتشتی مذہب کے راہنماؤں نے زور پکڑ لیا، اور وہ مسیحیوں کے سب سے سخت مخالف بن گئے۔

مشرقی کلیسیا کی ایذا رسانی شاپور دوم کے تحت شروع ہوئی۔ رومیوں نے شاپور کے دادا کو سخت شکست دی تھی، اور 337ء میں شاپور بدلہ لینے کے لئے نکلا۔ اُس نے رومی شہر نِصیبین پر حملہ کیا، لیکن بے فائدہ۔ کیا عجب کہ تھوڑی دیر کے بعد ایذا رسانی کا آغاز ہوا۔ مسیحیوں پر الزام لگایا گیا کہ وہ رومی دشمن کی مدد کر رہے ہیں۔ ساسانی بادشاہ نے بشپ سے تقاضا کیا کہ وہ ایمان داروں سے دُگنا ٹیکس جمع کرے۔ بشپ نے انکار کیا، ”مَیں ٹیکس لینے والا نہیں بلکہ خداوند کی بھیڑوں کا چرواہا ہوں۔“

تب بادشاہ نے فرمان صادر کیا کہ گرجاگھروں کو ڈھا دیا جائے اور جو کلیسیائی راہنما سورج کی پوجا کرنے سے انکار کریں اُنہیں سزائے موت دی جائے۔ مملکت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسیحیوں کا شکار کیا گیا۔ ہر جگہ قتلِ عام نہ ہوا۔ کئی

علاقوں میں زیادہ دھیان کلیسیائی راہنماؤں پر دیا گیا۔ ایک اَور نشانہ فارسی نومرید تھے، کیونکہ اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایسے لوگ تمام حقوق سے محروم ہوئے، اور بہتوں کو سزائے موت بھی دی گئی۔ زرتشتی راہنما مسیحیوں کو ستانے میں حکومت کی خاص مدد کرتے تھے۔

چالیس سال تک ایذا رسانی جاری رہی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایذا رسانی مغرب کی تمام ایذا رسانیوں سے کئی گنا زیادہ شدید تھی۔ ہو سکتا ہے کہ 2 لاکھ کے قریب ایمان دار شہید ہوئے۔

ایذا رسانی کے اِس سلسلے نے کلیسیائی نظام کو بُری طرح متاثر کیا۔ دار الحکومت میں جب کبھی نیا بشپ مقرر کیا جاتا تو اُسے فوراً قتل کیا جاتا۔ آخر کار 20 سال تک کلیسیا پاپا مقرر کرنے سے باز رہی۔

ایذا رسانی کی شدت شاپور دوم کی موت سے کچھ سال پہلے نسبتاً کم ہوئی۔ 363ء میں ساسانی حکومت نے رومی بادشاہ یولیان مرتد پر فتح پا کر نِصیبین شہر پر قبضہ کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ اِس وجہ سے اُس کی مسیحیوں سے نفرت کم ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایذا رسانی بادشاہ کی موت یعنی 379ء تک جاری رہی۔ لیکن حقیقت میں وہ 401ء تک نہ رُکی۔[29]

باب 15

شہادت اور شہید پرستی

شہید کا اصلی مطلب: گواہ

شہید کا لفظی مطلب گواہ ہے۔ یہی مطلب نئے عہد نامے میں ملتا ہے۔ یونانی میں گواہ کے لئے لفظ مرتس[a] استعمال ہوا ہے۔[b] یہ خدا کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔[c] لیکن رفتہ رفتہ شہید کا مطلب تبدیل ہوا۔ آخرکار صرف ایمان کی خاطر مرنے والے کو شہید سمجھا جاتا تھا۔ کلام کے تین حوالجات میں مرتس کا یہ مطلب ممکن البتہ

[a] μάρτυς (martus)
[b] مثلاً اعمال 15:22؛ ا۔پطرس 5:1؛ مکاشفہ 14:3
[c] رومیوں 9:1؛ فلپّیوں 8:1؛ ا۔تیم 5:2–6

لازمی نہیں ہے یعنی مکاشفہ 1: 5، 2: 13 اور اعمال 22: 20۔ آخری حوالے میں ستفنس کو مرتس کہا جاتا ہے، وہی آدمی جو پہلا شہید ہوا۔

دوسری صدی سے مرتس صرف اور صرف ایمان کی خاطر مرنے والے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ جو مسیح کا اقرار کرنے کے باعث ستایا گیا لیکن مرا نہیں وہ "اقرار کرنے والا"[a] کہلاتا تھا۔ جب لوگ اُن مسیحیوں کو شہید قرار دینے لگے جن پر 177ء کی ایذا رسانی میں تشدد ہوا تھا تو اُنہوں نے خود سختی سے انکار کر کے کہا کہ ہم محض اقرار کرنے والے ہیں۔[1]

مسیحیوں کو شہادت کا یہ تصور کہاں سے مل گیا؟ پرانے عہد نامے میں کچھ نمونے ملتے ہیں۔ خاص کر دانی ایل اور اُس کے دوستوں کی مثال مسیحیوں کے سامنے رہی۔ یرمیاہ بھی ایسا نمایاں گواہ تھا۔ اِن لوگوں کو ایمان کا اقرار کرنے کے باعث ستایا تو گیا، لیکن وہ نتیجے میں نہ مرے۔

مکابیوں کی کتابوں میں بھی شہید کے کئی ایک نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتابیں گو کلامِ مقدّس کا حصہ نہیں ہیں لیکن قدیم مسیحی اِن سے خوب واقف تھے۔ اِن میں مکابیوں کا انقلاب بیان کیا جاتا ہے۔ 164ق شام کے ظالم بادشاہ انطاکُس چہارم نے یہودی مذہب کو دبانے کی کوشش کی، جس کے جواب میں یہودی اُس کے خلاف کھڑے ہوئے۔ اُن کی بادشاہ کے ساتھ جنگ زیادہ اسلام کے جہاد سے مطابقت رکھتی ہے، لیکن ساتھ ساتھ ایسے یہودیوں کا ذکر ہے جو نہ لڑے بلکہ ایمان کے باعث قتل کئے گئے۔ مثال کے طور پر ۲۔مکابیوں 18:6 و مابعد میں ایک بزرگ بنام الی عزر کا ذکر ہے جو سؤر کا گوشت نہ کھانے کے سبب سے شہید ہوا۔

لیکن مسیحیوں نے حکومت کے خلاف قدم نہ اُٹھائے۔کیوں؟ خود یسوع اُن کا سب سے اول نمونہ تھا۔ جس طرح اس نے اپنی جان دی اُسی طرح اُس کے پیروکاروں کو بھی کرنا تھا۔ وہ نہ لڑا بلکہ کہا کہ میری بادشاہی اِس دنیا کی نہیں ہے۔

Greek: ὁμόλογος (homologos); Latin: confessor[a]

مسیح کے الفاظ ابتدائی مسیحیوں کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ مثلاً،

> اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اُسے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ اِسی طرح اگر کوئی تمہاری چادر چھین لے تو اُسے قمیص لینے سے بھی نہ روکو۔[a]
>
> لیکن میں تم کو بتاتا ہوں کہ بدکار کا مقابلہ مت کرنا۔ اگر کوئی تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے تو اُسے دوسرا گال بھی پیش کر دے۔[b]
>
> مبارک ہیں وہ جن کو راست باز ہونے کے سبب سے ستایا جاتا ہے، کیونکہ اُنہیں آسمان کی بادشاہی ورثے میں ملے گی۔[c]
>
> وہ بات یاد کرو جو مَیں نے تم کو بتائی کہ غلام اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا۔ اگر اُنہوں نے مجھے ستایا ہے تو تمہیں بھی ستائیں گے۔ اور اگر اُنہوں نے میرے کلام کے مطابق زندگی گزاری تو وہ تمہاری باتوں پر بھی عمل کریں گے۔[d]

ستفنس کلیسیا کا پہلا شہید ہوا، اور اپنی موت سے اُس نے آنے والی نسلوں کو شہادت کا کامل نمونہ دکھایا۔

پہلی تبدیلی: شہید قربانی ہے

قریباً 150ء میں پالِکارپ کو سزائے موت دی گئی۔ اِس سلسلے میں پہلی مرتبہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آج کے معنوں میں شہید (مرتس) تھا۔ یعنی جب وہ شہید کہلاتا ہے تو اِس کا مطلب نہ صرف گواہ ہے۔ پہلے پالِکارپ چھپ گیا تھا، لیکن جب اُس کی

---

[a] لوقا 6:29
[b] متی 5:39
[c] متی 5:10
[d] یوحنا 15:20

دوسری چھپنے کی جگہ بھی معلوم ہوئی تو اُس نے گورنر کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ گورنر نے اُس سے کہا، ''مسیح پر لعنت کریں تو آپ کو چھوڑا جائے گا۔'' پالِکارپ نے جواب دیا، ''86 سال سے مَیں اُس کا خادم ہوتا آیا ہوں، اور اِس دوران اُس نے کبھی بھی مجھ سے غلط سلوک نہ کیا۔ تو مَیں کس طرح اپنے بادشاہ اور نجات دہندے پر کفر بک سکتا ہوں؟''[2] تب اُسے جلا دیا گیا۔ آخر میں جلاد نے اُس کے جسم میں خنجر گھونپا۔ 'شہادتِ پالِکارپ' نامی تصنیف میں اُس کی موت کا موازنہ قربانی سے کیا جاتا ہے۔[3]

یہ خیال کہ شہادت قربانی ہے نئے عہد نامے کے دور میں پایا نہیں جاتا، لیکن اُس کے عین بعد بشپ اِغناطسیوس پہلی دفعہ یہ پیش کرتا ہے۔ اِغناطسیوس کو دوسری صدی کے شروع میں روم بھیجا گیا تاکہ اُسے سزائے موت دی جائے۔ سفر کے دوران اُس نے 7 خط لکھے جو اُس کا اپنی موت کے بارے میں تصور منعکس کرتے ہیں۔ اِغناطسیوس لفظ مرتس (شہید) استعمال نہیں کرتا، گو خطوں میں گواہی دینے کا خیال بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن قربانی کا خیال بہت دفعہ پیش آتا ہے۔ روم کے ایمان داروں کو وہ لکھتا ہے کہ مجھے سزا پانے سے نہ روکیں، کیونکہ مَیں چاہتا ہوں کہ جب تک قربان گاہ تیار ہو مجھے قربانی کے طور پر خدا کے حضور اُنڈیلا جائے۔[4]

177ء میں جنوبی فرانس کی ایذا رسانی میں بھی شہیدوں کی موت کا مقابلہ قربانی سے کیا جاتا ہے۔ ایک کے بارے میں لکھا ہے، ''اطّلس کو لوہے کی کرسی پر رکھ کر بھسم کیا گیا جبکہ قربانی کی خوشبو اُس کے جسم سے اُٹھی۔''[5] اور چوتھی صدی کے شروع میں یوسیبیُّس ایک شہید کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ ایک مبارک اور معصوم میمنا تھا جس نے دلیری سے خدا کا اقرار کیا۔[6] یہاں بھی قربانی اور گواہی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

شہید پرستی کی ابتدا

تحقیقات کے مطابق ایمان دار دوسری صدی سے شہدا کا احترام کرنے لگے۔ 'شہادتِ پالِکارپ' کے مطابق ستانے والوں کو اندیشہ تھا کہ ایمان دار پالِکارپ کی لاش کو لے کر اُس کی پرستش کریں گے، لہٰذا اُنہوں نے اُسے بھسم کر دیا۔ تاہم مسیحیوں نے بچے کھچے ہڈیوں اور راکھ کو جمع کر کے دفنا دیا، اور جماعت سالانہ اُس کی شہادت کی یاد کرنے لگی۔[7] مصنف فرماتا ہے، ''یہاں ہم جہاں تک ممکن ہو جمع ہو کر خوشی اور شادمانی سے خداوند کی مرضی کے مطابق اُس کی شہادت کا دن منائیں گے۔ یوں ہم اُنہیں یاد کریں گے جن کا مقابلہ ہو چکا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اُنہیں تربیت اور تیاری کا موقع ملے گا جو آئندہ کبھی مقابلے میں شریک ہو جائیں۔''[8]

شہید پرستی کی وجوہات

شہید کی یاد

شہید کے ساتھ یہ سلوک پورے رومی ممالک کے لئے عام ہوا۔ شہید کی قبر پر ایمان دار سالانہ جمع ہوتے تھے۔ مذکورۂ بالا حوالے میں جہاں ''شہادت کا دن'' لکھا ہے وہاں یونانی میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی مطلب سالگرہ[a] ہے۔ شاید اِس کے پیچھے خیال یہ تھا کہ مرنے سے شہید حقیقی طور پر پیدا ہوا ہے۔ کم از کم یہ اِس طرف اشارہ ہے کہ لوگ یہ دن سال گرہ کی طرح مناتے تھے۔ ہاں، اوگسطین کو اپنے ایمان داروں کو سمجھانا پڑا کہ وہ ایسے مواقع پر نہ نشے میں آئیں نہ کوئی اَور غلط فائدہ اُٹھائیں۔ خود اپنے بارے میں وہ فرماتا ہے کہ جب نوجوان تھا تو لڑکیوں کو دیکھنے کے لئے ایسی جگہوں پر جایا کرتا تھا۔[9]

---

[a] γενέθλιος (genethlios)

آئندہ کی ایذا رسانیوں کے لئے تقویت

دوسرے، شہید کی قبر پر ایمان دار نہ صرف شہید کی جد و جہد یاد کرتے تھے بلکہ اُس سے آئندہ کی ایذا رسانیوں کے لئے تقویت بھی پاتے تھے۔ شہید ایذا رسانی پر فتح کی علامت بن گیا، اور لوگ اُس کی قبر سے قائم رہنے کی تقویت پاتے تھے۔

بت پرستی

کلامِ مقدّس میں اِس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اِس کی ایک جڑ بے شک بُت پرستی میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بُت پرست شفا پانے یا کوئی اَور معجزہ دیکھنے کے لئے مندر میں رات گزارتے تھے۔[a] اگر شفا مل گئی تو وہ شفایاب عضو کی نقل بنا کر مندر میں رکھتے تھے۔ مسیحی اپنے شہدا کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرتے تھے۔

تاہم اِس کی براہِ راست جڑ بت پرستی نہیں تھی۔ رومی اور یونانی بُت پرست یہودیوں سمیت لاشوں کو ناپاک سمجھتے تھے۔ البتہ رومی اور یونانی اپنی خاندانی قبروں کے پاس خاص دن مناتے تھے۔ لٰہذا مسیحیوں کا شہید کی قبر پر جانا اِتنا غیرمعمولی نہیں تھا۔ غیرمعمولی یہ بات تھی کہ اُن کے نزدیک مُردہ ناپاکی کا باعث نہیں ہے۔ اِس سے بڑھ کر وہ سمجھتے تھے کہ ہمیں شہید سے برکت ملے گی۔

سرپرستی

ایک اَور جڑ سرپرستی کا خیال تھی۔ اُس زمانے میں اکثر لوگ کسی نہ کسی سرپرست کے تحت چلتے تھے۔ ایسا سرپرست نہ صرف اُنہیں چلاتا تھا بلکہ وہ حفاظت اور پرورش کی ضمانت بھی دیتا تھا۔ ایمان دار بھی اپنے شہدا کو اپنے سرپرست سمجھتے تھے۔ وہ اپنی زندگی ایسے شہدا کی پناہ میں گزارتے تھے۔[10]

یہ شہیدپرستی نہ صرف عام مسیحیوں میں پایا جاتا تھا بلکہ کلیسیائی عہدیداروں میں بھی۔ نیز، رفتہ رفتہ کلیسیا اِن شہدا کے دن کلیسیائی کیلنڈر میں درج کرنے لگی۔ ہو

---

incubation[a]

سکتا ہے کہ شہید کی قبر پر جمع ہونے کا یہ سلسلہ عوام سے شروع ہوا، اور کہ بعد میں بشپوں نے اِن جلسوں پر قابو پانے کے لئے اُنہیں کلیسیائی شکل دی۔[11]

یہ شہیدپرستی نہ صرف مسیحی شہدا پر محدود رہی۔ کم از کم چوتھی صدی سے کلیسیا مکابیوں کی کتابوں میں مذکورہ یہودی شہدا کو بھی مسیحی ٹھہرانے لگی۔[12]

رضاکارانہ شہادت کا مسئلہ

مسیحی شہادت کی اِتنی قدر کرنے لگے کہ بعض رضاکارانہ طور پر شہید ہوئے۔ تین قسم کی رضاکارانہ شہادت تھیں۔

جذبات سے مغلوب ہو کر شہادت کچھ لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی شہادت کرواتے تھے۔ ایک عورت کا ذکر ہے جو دو افراد کی شہادت دیکھ کر اِتنے جذبے میں آ گئی کہ کوئی اُسے روک نہ سکا۔ جس آگ میں شہید جل رہے تھے اُس میں وہ کود کر شہید ہوئی۔[13] نیقومیدیہ میں ایسے لوگوں کے پورے گروہ کا ذکر ہے۔[14]

حکم رانوں کو اکسا کر شہادت بعض نے ستانے والوں کو اکسایا تاکہ وہ اُنہیں سزائے موت دیں۔ 304ء میں ایک مرد یوپلیُس نے رومی حاکم کے سامنے آ کر چلاّیا، ”مَیں مسیحی ہوں، مَیں مسیح کے نام کی خاطر مرنا چاہتا ہوں۔“[15] جب حکمران نے اُسے کہا کہ دیوتاؤں کو قربانی چڑھا تو اُس نے کہا، ”مَیں اپنے آپ کو صرف مسیح اپنے خدا کو قربان کرتا ہوں۔“[16] اِس جواب میں بھی شہادت اور قربانی کے دونوں خیالات جُڑے ہوئے ہیں۔

اپنی عصمت دری بچا کر شہادت کافی مسیحی اِن دو قسموں کی شہادت کی تنقید کرتے تھے۔ لیکن ایک تیسری قسم کی شہادت بہت سے ایمان داروں کو منظور تھی۔ جن خواتین نے عصمت دری کے خطرے کے باعث خودکشی کی اُن کی اکثر تعریف کی جاتی

تھی۔ یوسیبِئس ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جس نے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ دریا میں پھلانگ لگا کر خودکشی کی۔ وجہ کچھ فوجی تھے جو اُن سے زیادتی کرنے پر آمادہ تھے۔[17] ایسی خودکشی بہتوں کے نزدیک کیوں منظور تھی؟ اِس لئے کہ مسیحی جنسی پاکیزگی پر اِتنا زور دیتے تھے۔

رضاکارانہ شہادت کی تنقید

کچھ مؤرخوں کی رائے ہے کہ یہ رومی سوچ سے نکلا، کیونکہ خودکشی رومیوں میں منظورِ عام تھی، خاص کر جب خودکشی نہ کرنے سے عزت متاثر ہو سکتی تھی۔[18] بے شک کچھ مسیحیوں میں رومی سوچ رضاکارانہ شہادت کی ایک جڑ ہو سکتی تھی البتہ زیادہ تر نہ یونانی اور نہ یہودی سوچ خودکشی کی حمایت کرتی تھی۔ رومی سوچ کا ایک نمائندہ طرطُلیان ہے جو مسیحیوں کو اُبھارنے کے لئے ایسے غیرمسیحی افراد پیش کرتا ہے جنہوں نے خودکشی کی۔[19] دونوں بزرگ امروز[20] اور یوحنا فم الذہب[21] رضاکارانہ شہادت نامنظور قرار دیتے ہیں۔ لیکن دونوں فرماتے ہیں کہ اگر عصمت دری کا خطرہ ہو تو خودکشی منظور ہے۔[22]

لیکن ''شہادتِ پالِکارپ'' کا مصنف فرماتا ہے، ''جو اپنی مرضی سے شہادت کے لئے سامنے آتے ہیں اُن کی تعریف ہم نہیں کرتے۔''[23] اور اسکندریہ کا بزرگ کلیمینس سب کی تنقید کرتا ہے جو جان بوجھ کر شہید بننا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ شہادت کا مطلب صرف اور صرف ہی گواہی ہے۔ اور گواہی کا مطلب مسیح کا اقرار کرنا ہے۔[24] اُس کے نزدیک اقرار کرنے سے ایمان دار اپنی خدا اور انسان سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ جو جان بوجھ کر شہید بنے وہ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے، لہٰذا وہ گناہ کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں ممکن ہو مسیحی کو بھاگنا چاہئے۔ اِس سے وہ نہ صرف اپنے آپ سے محبت کا اظہار کرتا ہے بلکہ سزا دینے والے سے بھی، کیونکہ اِس سے وہ غلط قدم اُٹھانے سے بچ جاتا ہے۔[25]

اوگسطین بھی ہر طرح کی رضاکارانہ شہادت نامنظور قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک جان بوجھ کر شہید بننا خودکشی ہے، اور یہ غلط ہے۔ کیونکہ جو خودکشی کرے وہ قتل کا مجرم بنتا ہے۔ اور جتنا وہ بےقصور ہو اُتنا ہی سنجیدہ خودکشی کا جرم ہے۔ چونکہ شہید بےقصور ہے اِس لئے جان بوجھ کر شہید بننا سنگین جرم ہے۔[26] وہ ایک عورت کی مثال دیتا ہے جس نے عصمت دری سے بچنے کے لئے خودکشی کی۔ اوگسطین کے نزدیک یہ غلط تھا، کیونکہ عورت کا قصور نہیں تھا اِس لئے وہ حقیقت میں پاک رہی۔[27]

شہید پرستی کے طور طریقے

مسیحی کس طرح اپنے شہدا کا احترام کرتے تھے؟

اکثر اوقات شہید کے دن جلوس نکل کر شہید کی قبر پر پہنچتا تھا۔ وہاں اُس کی شہادت سنائی جاتی تھی۔ اگر اِس کے بارے میں کوئی تصنیف تھی تو اُس کی تلاوت کی جاتی تھی۔ اِس کے بعد بشپ یا کوئی بزرگ وعظ کرتا تھا۔ عشائے ربانی بھی منائی جاتی تھی۔ بہت دفعہ لوگ قبر پر پکنک یا ضیافت کرتے تھے۔ ہم شمالی افریقہ کے بارے میں جانتے ہیں کہ شہدا کی قبروں پر ضیافت، شراب نوشی اور ناچنا عام تھا۔ اوگسطین اپنے وعظوں میں بار بار ایسی حرکتوں کی مذمت کرتا ہے۔ وہ پورا زور شہدا کے اچھے نمونے اور گواہی پر دیتا ہے۔[28]

ایمان دار اِس سے کیا حاصل کرنے کی توقع کرتے تھے؟ وہ نہ صرف روحانی بلکہ جسمانی برکت بھی پانا چاہتے تھے۔ اوگسطین اپنی آخری تصنیف بنام 'خدا کا شہر' میں شفا کی مثالیں پیش کرتا ہے جو اُس کے نزدیک شہدا کے وسیلے سے سرانجام ہوئیں، گو وہ اِس پر زور دیتا ہے کہ یہ شفا خدا کی طرف سے ہے۔[29]

شہید پرستی اِس سے بھی ظاہر ہوئی کہ لوگ شہدا کے اردگرد دفنایا جانا چاہتے تھے۔ لوگوں کے نزدیک چونکہ شہید خدا کے قریب ہیں اِس لئے جو اُن کے قریب دفن ہیں وہ بھی خدا کے زیادہ قریب ہوں گے۔ نیز، قیامت کے دن اُنہیں شہید کی پناہ حاصل

ہو گی۔ البتہ ایک اَور وجہ یہ تھی کہ شہید کے قریب قبریں لٹیروں سے زیادہ محفوظ رہتی تھیں۔[30]

دو شہید پرست بزرگ

امروز: مغرب کا شہید پرست

چوتھی صدی کی شہید پرستی کے پھیلاؤ میں امروز اہم کردار ادا کرتا ہے، لہٰذا اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ امروز رومی گورنر تھا، لیکن ایک دن لوگوں نے اُسے مجبوراً میلان کا بشپ مقرر کر دیا۔ میلان اٹلی کا بڑا شہر ہے۔ امروز آریُس کے سخت خلاف تھا جبکہ اُس وقت کی حکومت کے بہت سے ملازم آریت کی طرف مائل تھے۔ نتیجے میں وہ بار بار حکومت سے ٹکراتا رہا۔ 386ء میں یہ کلیش عروج تک پہنچا جب بادشاہ کی ماں نے حکم دیا کہ میلان کا ایک گرجا گھر آریوں کو دیا جائے۔ امروز نے انکار کیا۔ اُنہیں روکنے کے لئے وہ جماعت کے ساتھ چرچ میں رہا جبکہ فوجیوں نے اُس کے گھیرا ڈال رکھا۔ کچھ دیر تک لگ رہا تھا کہ خون بہے گا، لیکن پھر حکومت نے شکست مان کر اُنہیں چھوڑ دیا۔[31]

جسم کو دبانے کے دو طریقے شہادت اور راہبانہ زندگی ہیں

امروز غیر شادی شدہ رہا، اور اُس نے اپنی کنواری بہن کے لئے کنوارپن کے بارے میں ایک کتاب بنام 'کنواریاں' لکھی۔ اُس کے خیال میں کنوارپن آسمانی زندگی منعکس کرتا ہے، کیونکہ فرشتے شادی نہیں کرتے۔ جب سے مسیح مجسم ہوا آسمانی زندگی کی یہ خصوصیت انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔[32] مسیح کی آمد سے پہلے انسان قدرتی زندگی گزارتا تھا۔ لیکن اب جسم کو دبانے کی دو صورتیں کنوارپن اور شہادت مسیحیوں کی خصوصیت بن گئی ہیں۔ ہاں کنوارپن شہادت کی بنیاد ہی ہے۔[33]

راہبانہ زندگی سے آسمانی برکتیں حاصل ہوتی ہیں

ایک تصنیف بنام 'موت کی بھلائی' میں امروز موت کا مضمون چھیڑتا ہے۔ اُس کے نزدیک گناہ موت ہے اور بپتسمہ بھی ایک قسم کی موت ہے۔ یہ موت اچھی ہے، کیونکہ اِس سے ایمان دار گناہ سے آزاد ہو کر خدا کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ تیسری قسم کی موت قدرتی موت ہے۔ مصنف اپنی افلاطونی سوچ کے مطابق فرماتا ہے کہ جسم گناہ اور دنیاوی خوشیوں کا منبع ہے۔ لٰہذا موت اچھی ہے، کیونکہ اِس سے انسان کی لافانی روح جسم کے بوجھ سے آزاد ہو جاتی ہے۔[34]

امروز کے نزدیک ایمان دار مرنے پر ایسی پاک قربانی بن جاتا ہے جو مکمل طور پر مسیح کو پسندیدہ ہو۔[35] لیکن جو اِس زندگی میں موت کے مطابق چلے اُسے کسی حد تک پہلے ہی آسمانی برکتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ یعنی جو دنیاوی خوشیوں اور گناہ سے پرہیز کر کے اپنے جسم کو دبائے رکھے وہ دنیا میں رہتے ہوئے آسمانی برکتوں میں شریک ہوتا ہے۔ چونکہ موت ایک اچھی چیز ہے اِس لئے انسان کو کنوارپن اور زُہد کے ذریعے زندہ حالت میں مُردہ ہونا چاہئے۔ جتنا وہ اِس مُردہ حالت میں ترقی کرے اُتنا ہی وہ موت سے پہلے ہی آسمان کے قریب آ جائے گا۔[36]

امروز شہید بننے کی آرزو رکھتا ہے

امروز کے نزدیک زُہد شہادت کی بنیاد ہے۔ خود وہ شہید بننے کے لئے تڑپتا تھا۔ کچھ اشارے ملتے ہیں کہ وہ حکومت کی مخالفت کرنے سے شہید بننے کی اُمید رکھتا تھا۔ 386ء میں ایک نیا گرجا گھر تیار ہوا جس میں امروز نے قربان گاہ کے نیچے اپنے لئے قبر بنوائی تھی۔ چونکہ ایسی جگہ عام طور پر شہید کے لئے مقرر تھی اِس لئے عین ممکن ہے کہ اُس نے شہید بننے کی توقع کی۔[37] اُس وقت میلان شہر کا کوئی مقامی شہید نہیں تھا۔ غالباً امروز نے اُمید رکھی کہ شہید بننے سے میں میلان کا پہلا شہید بنوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

شہدا کی تقسیم سے سب کو برکت حاصل ہوتی ہے

جب نیا گرجا گھر مکمل ہوا تو لوگ منت کرنے لگے کہ کسی شہید کو اُس میں رکھنا چاہیے۔ اگلے دن امروز ایک زیارت گاہ کے قریب کھود کر زمین سے دو بڑے آدمیوں کے پنجر نکال لایا۔ اِن کو اُس نے شہید قرار دے کر پروتاسیُس اور گرواسیُس[a] کے نام دیئے اور گرجا گھر میں دفنا دیا۔[38] اُس کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ اُس کے نزدیک یہ شہید ایمان داروں کو پناہ دیتے ہیں۔[39] لیکن اِن شہیدوں کی تمام ہڈیاں میلان میں نہ رہیں بلکہ امروز نے اِنہیں مختلف جگہوں میں تقسیم کیا۔ اوگسطین کے قریب بھی اُن کی زیارت گاہ بن گئی تھی۔ اُس وقت کسی مُردے کی لاش یا ہڈیاں یوں چھیڑنا منع تھا، لیکن امروز نے پروا نہ کی۔ شہیدوں کے اعضا الگ الگ کر کے یوں تقسیم کرنا مقبولِ عام ہو گیا۔ ہاں، ساتویں مجلسِ عامہ میں فرمان صادر ہوا کہ ہر کلیسیا کی قربان گاہ میں کسی شہید کی کوئی نہ کوئی یادگار ہونی چاہیے۔ بعد میں امروز کو دو اَور جگہوں پر نامعلوم شہیدوں کا پتا چل گیا۔ اِس طریقے سے وہ شہیدپرستی کا اہم نمونہ بن گیا۔

امروز کو کس طرح یقین ہوا کہ یہ نام نہاد پنجر شہید تھے؟ اول، اُن کے ساتھ بہت خون لگا تھا۔ یہ شہید کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے، جو لوگ اُن کا احترام کرنے آتے اُن میں سے معجزے ہوئے۔[40]

یوحنا فم الذہب: مشرق کا شہیدپرست

یوحنا فم الذہب پہلے انطاکیہ میں خدمت گزار تھا اور بعد میں قسطنطنیہ کا بشپ مقرر ہوا۔ امروز کی طرح وہ راہب بھی تھا اور شہیدپرست بھی۔ یوحنا شہدا کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟

Protasius and Gervasius[a]

شہادت پاک صاف کرنے والی قربانی ہے

اُس کے نزدیک شہید اپنی موت سے قربانی دیتا ہے، اور یہ قربانی اُسے پاک صاف کر دیتی ہے۔ شہادت ایک قسم کا بپتسمہ ہے، جس سے شہید کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔[41] لیکن اُس کی موت کا دوسروں کے لئے بھی اچھا اثر ہے۔ بشپ فرماتا ہے کہ پطرس، پولس اور اِغناطسیوس نے اپنی موت سے بُت پرستی کے خون سے لت پت شہر کو پاک صاف کر دیا۔[42] نہ صرف یہ بلکہ شہید اپنے خون سے کفارہ دیتا ہے۔ بشپ دو فوجیوں کی مثال پیش کرتا ہے جو یولیان بادشاہ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اِن دو فوجیوں نے اپنی شہادت سے باقی اُن فوجیوں کے لئے کفارہ دیا جنہوں نے اِس معاملے میں سمجھوتا کیا۔ اُن کی شہادت سے خدا باقیوں کے گناہوں کا لحاظ نہیں کرے گا۔[43]

شہدا کا اثر قائم رہتا ہے

فَم الذہب سمجھتا ہے کہ چونکہ شہدا مسیح کی خاطر موئے اِس لئے مسیح اُن کا قرض دار بن گیا ہے۔ شہادت سے اُنہیں نہ صرف ابدی زندگی بلکہ مسیح کی خاص توجہ اور برکت حاصل ہوئی ہے۔[44] اِس طریقے سے یوحنا فضل کا خیال اُلٹا دیتا ہے۔ نہ انسان خدا کا قرض دار ہے بلکہ خدا انسان کا۔

غرض، شہادت کا اصلی مطلب یعنی گواہی یوحنا کی تعلیم میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اِس کی نسبت پورا زور شہید کے اثر پر ہے۔ اور یہ اثر موت کے بعد بھی رہتا ہے۔ ایک شہید بنام بابِلاس[a] کی یاد میں وہ فرماتا ہے کہ گو وہ 130 سال پہلے فوت ہوا، لیکن اُس وقت سے لے کر آج تک اُس نے بہت سے کام کئے ہیں۔ رواج کے مطابق اِس بابِلاس کی ہڈیوں کو قبرستان سے ایک زیارت گاہ میں شفٹ ہوئیں جو ایک مندر کے پڑوس میں تھی۔ لوگ مندر میں پوشیدہ علم معلوم کرنے کے لئے جایا کرتے تھے،

---

[a] Babylas

لیکن بابِلاس کی ہڈیوں کے باعث یہ کام رُک گیا۔ جب یولیان مرتد نے ہڈیوں کو واپس قبرستان میں منتقل کر دیں تو شہید نے ناراض ہو کر مندر پر آگ نازل کی۔[45] ایسی کوئی بات بشپ کے ذہن میں ہو گی جب وہ فرماتا ہے کہ شہید موت کے بعد اپنے کاموں سے ظاہر کرتے ہیں کہ شہید کی موت حقیقت میں موت نہیں ہے، کیونکہ موت کے بعد بھی اُن کا اثر رہتا ہے۔[46]

شہدا اپنی یادگاروں میں حاضر رہتے ہیں

یوحنا کو پورا یقین ہے کہ جہاں بھی شہید کی لاش کا کوئی بھی حصہ ہو وہاں وہ اب تک حاضر ہے۔ لٰہذا ایسی چیزیں کلیسیا کے لئے برکت اور قدرت کا باعث ہیں۔ وہ برکات کا خزانہ [a] ہیں،[47] ایک ایسی بندرگاہ جس میں ایمان دار طوفان سے پناہ لے سکے۔[48]

شہید درمیانی اور پناہ ہے

یوحنا فم الذہب کے نزدیک شہید خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ہے۔ وہ ایک مثال دیتا ہے،

> جس طرح فوجی جنگ میں ملے اپنے زخموں کو دکھا کر دلیری سے بادشاہ سے بات کرتے ہیں اُسی طرح شہید بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہاتھوں میں اپنے کٹے ہوئے سروں کو اُٹھائے ہوئے اُنہیں یوں پیش کرتے ہیں کہ آسانی سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے جو ہم آسمان کے بادشاہ سے چاہتے ہیں۔[49]

یوحنا کہہ سکتا ہے کہ شہید کے تابوت کے پاس آنا خدا کے حضور آنے کے برابر ہے۔[50] کیا عجب کہ بشپ شہیدوں کو شہر کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

---

[a] θησαυρός (thēsauros)

اُس کے نزدیک شیاطین اُن سے دُور بھاگتے ہیں[51] بلکہ مسیح شہدا کو اسلحہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔[52]

شہید کی تقلید ضروری ہے

یوحنا فم الذہب اپنے پیغاموں میں ہمیشہ کسی بات کا اخلاقی پہلو نکالنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ معاشرے میں تبدیلیاں لانا چاہتا ہے۔ جو بُت پرستی اب تک باقی ہے اُسے وہ مٹانا چاہتا ہے۔ یہ رجحان اُس وقت بھی نظر آتا ہے جب کبھی وہ شہیدوں کی بات چھیڑتا ہے۔ بار بار وہ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ شہیدوں کا صحیح احترام اُن کی تقلید سے ہوتا ہے۔[53] گو یوحنا کے زمانے میں ایذا رسانی ختم ہو گئی ہے لیکن اُس کے نزدیک شہیدوں کی تقلید سے ایمان دار شہید کا کردار اپناتے ہیں بلکہ شہید اُن میں دوبارہ زندہ ہوتے ہیں۔ شہدا کی یاد سے ایمان دار اپنے ذہن کو دنیاوی فکروں سے پاک صاف رکھ سکتے ہیں۔ ''اگر یہ یاد آپ کے دل میں رہے تو دولت کا تعقب نہیں کریں گے، غریب ہونے کے باعث نہیں روئیں گے، قدرت و جلال کی تعریف نہیں کریں گے۔''[54]

شہید ہمیں مسیحی زندگی سکھاتے ہیں۔ مثلاً بشپ ایک شہید کی زندگی سے نتیجہ نکالتا ہے کہ پیٹوپن سے پرہیز کرنا ہے،[55] دوسرے کے نمونے سے کہ سُست مت ہونا۔[56] اُس کے نزدیک مسیحیوں کو شان دار کپڑوں، کھانے اور پینے والی چیزوں اور تماشاگاہ سے گریز کر کے لوہے سے زیادہ سخت ہونے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں صرف ایسی تبدیلیوں سے بہتری آئے گی۔[57] نہ صرف یہ بلکہ ''یہاں اِن شہیدوں کی خوبیوں کی تقلید کرنے سے ہمیں وہاں اُن کے ساتھ اُن کے تاج حاصل ہو سکیں گے۔''[58]

بشپ کے نزدیک بے شک خدا اپنے لوگوں کی مدد کرتا ہے، لیکن اِس کے لئے لازم ہے کہ وہ مسیحی زندگی گزاریں۔ ایک شہید کے بارے میں وہ فرماتا ہے کہ یسوع نے ویسے ہی اُس کی مدد نہ کی بلکہ جب شہید نے اپنے آپ کو اُس کی مدد کے لائق بنا دیا

تب ہی اُس نے اُس کی مدد کی۔[59] خدا اِس شرط پر لوگوں کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اِس لائق بنائیں۔

امروز کی طرح یوحنا کنوارپن کی خاص قدر کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک کنوارپن آسمان کی بادشاہی کی حالت ہے، لہٰذا جو اِس حالت میں رہ سکے وہ مبارک ہے۔ یوحنا کنوارپن کو تاج سمجھتا ہے، وہی چیز جو خاص کر شہید کو ملتا ہے۔[60]

راہبانہ زندگی بھی شہادت ہے

جو بھی راہبانہ زندگی گزارے وہ حقیقت میں شہید ہے۔ یوں یوحنا کے نزدیک انطاکیہ کا بشپ گو قدرتی طور پر فوت ہوا تاہم شہید ہے،

> اُس نے اُن کی زندگی کی تقلید کی۔ اُسے اُن کی جرأت اشد پسند تھی۔ ہر عمل سے اُس نے ممکنہ حد تک شہدا کی صورت اپنے آپ میں محفوظ رکھی۔ سوچ لیں! اُنہوں نے اپنے جسم قتل و غارت کے حوالے کر دیئے جبکہ اُس نے اُن دنیاوی چیزوں کو مار ڈالیں جو اُس کے اندر کام کر رہی تھیں۔[a] شہدا آگ کے شعلے کے سامنے ثابت قدم رہے جبکہ اُس نے اپنی مرضی کا شعلہ بجھا دیا۔ وہ جنگلی جانوروں کے دانتوں کے خلاف لڑے جبکہ اُس نے ہمارے سب سے وحشی جذبے یعنی غصے کو تھما دیا۔[61]

غرض یوحنا راہبانہ زندگی ایک قسم کی شہادت سمجھتا ہے۔ اور یہ کچھ وہ ایمان داروں سے بھی مانگتا ہے۔ "شہدا نے اپنی جان کو حقیر جانا۔ سو آپ عیش و عشرت کو حقیر جانیں۔ اُنہوں نے اپنے جسموں کو آگ میں پھینک دیا۔ اب آپ غریبوں کے ہاتھوں

---

[a] کُلسیّوں 5:3

میں پیسے پھینکیں۔ اُنہوں نے جلتے ہوئے کوئلوں کو پاؤں تلے روندا۔ اب آپ لالچ کا شعلہ بُجھا دیں۔"[62]

شہید پرستی کے دو نقاد

وِگلنتیُس: پہلا پروٹیسٹنٹ؟

دیگر رومی ممالک کی نسبت ابتدا میں فرانس میں شہید پرستی کی طرف رجحان کم تھا۔ جب شروع ہوا تو خاص کر راہبوں سے۔ مارتن از تور[a] اِس کا اہم نمائندہ تھا جو راہب بھی تھا اور شہید پرست بھی۔ جیتے جی وہ معجزے کرنے کے لئے مشہور ہوا۔ امروز کی طرح جب فوت ہوا تو لوگ اُس کا احترام کرنے لگے گو وہ شہید نہیں ہوا تھا۔

شہید پرستی کے یہ حامی یوحنا فم الذہب سے بھی آگے بڑھنے لگے۔ ایک بشپ کے نزدیک شہید خدا کا حصہ بن گئے ہیں، بلکہ اُن کا خون الٰہی ہے۔[63] لٰہذا شہیدوں کی پرستش مناسب ہے۔ ایمان دار کو اُن سے دعا کر کے اپنے گناہوں کا اقرار کرنا چاہئے۔[64] اِس بشپ کے نزدیک مسیح نے اپنے اچھے کردار کے باعث صعود فرمایا۔ ایمان دار مسیح کے کفارے کے وسیلے سے نہیں بلکہ اُس کی تقلید سے خدا کے پاس پہنچتا ہے۔ جو گناہ کے بوجھ تلے اِس روحانی سیڑھی پر چڑھ نہیں سکتے اُنہیں بشپ مشورہ دیتا ہے کہ شہدا سے مدد لیں۔ اُن کے پاؤں سے لپٹنے سے وہ بھی آسمان پر پہنچ سکتے ہیں۔[65]

اِس کے مقابلے میں فرانس کے قدیم مسیحی نہ تو راہبانہ زندگی جانتے تھے، نہ کنوارا رہنے کا خیال۔ شہید پرستی کی یہ باتیں اُنہیں بُری لگیں۔ اُن کے ایک بزرگ بنام وِگلنتیُس[b] نے اعتراض میں ایک کتاب لکھی۔ وِگلنتیُس کو پہلا پروٹیسٹنٹ کہا گیا ہے، گو یہ مبالغہ آرائی ہے۔ اُس کا کیا اعتراض تھا؟

Martin of Tours[a]
Vigilantius[b]

شہید پرستی بُت پرستی ہے

مصنف فرماتا ہے کہ شہید پرستی حقیقت میں فرانس کے قدیم مسیحی رواج کے خلاف ہے۔ وہ شہید پرستوں کو بُت پرست قرار دیتا ہے، کیونکہ صرف خدا کی پرستش کرنی چاہیئے۔ اُس کے نزدیک شہیدوں کی یادگاروں کو چوم کر اُن کے سامنے موم بتیاں جلانا قدیم بُت پرستی کا نئے سرے سے اظہار ہے۔[66]

دنیا میں شہید کا کوئی بھی اثر نہیں

وِگلِنتیُس انکار کرتا ہے کہ شہیدوں کی روحیں اُن کی ہڈیوں میں موجود ہیں۔ وہ یا ابرہام کی گود میں یا کسی اَور آرام کی جگہ میں ہیں۔ نیز، مُردے زندوں کے لئے دعا نہیں کر سکتے۔[67] وہ نہیں مانتا کہ شہیدوں کی قبروں پر واقعی معجزے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ معجزے مسیح کے معجزوں سے فرق ہیں۔ مسیح کے معجزے نشان تھے جن کا مقصد غیر ایمانداروں کو قائل کرنا تھا کہ آسمان کی خوش خبری سچ ہے۔[68]

راہبانہ زندگی کی نسبت محبت کا اظہار بہتر ہے

مصنف کنوارا رہنے اور راہب کے علیحدگی میں رہنے کی تنقید کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک اپنی تمام جائیداد کو دوسروں میں تقسیم کرنے کی نسبت بہتر یہ ہے کہ ہم روزانہ پیسے کما کر غریبوں کی مدد کریں۔[69]

یہ اعتراضات بےفائدہ رہے، اور جو شہید پرستی مشرق میں شروع ہوئی تھی وہ بڑھتی بڑھتی فرانس پر بھی غالب آ گئی۔ غالباً اِس میں روم کا بشپ کا ہاتھ بھی تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ کلیسیا کے فادر کنوارے رہیں۔ خیال یہ تھا کہ جس طرح لاوی پاک حالت میں ہیکل میں خدمت کرتے تھے اُسی طرح عشائے ربانی پیش کرنے والوں کو بھی پاک ہونے کی ضرورت ہے۔ اور جو کنوارا نہیں تھا اُسے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا۔[70]

اوگسطین: شمالی افریقہ میں شہید پرستی کا نقاد

دوناتی فرقے کا چیلنج

شہید پرستی کے معاملے میں اوگسطین کو خاص چیلنج پیش آیا۔ شمالی افریقہ میں فرقہ بنام دوناتی جو کلیسیا سے الگ ہو گیا تھا شہادت پر خاص زور دیتا تھا۔ یہ فرقہ کس طرح پیدا ہوا تھا؟ دیوقلیطیان بادشاہ کی شدید ایذا رسانی کے دوران بہت سے مسیحیوں نے اپنے ایمان کا انکار کر دیا تھا۔ اِن میں کچھ بشپ بھی تھے۔ کچھ نے کلامِ مقدّس کو بھی حکمران کے سپرد کیا تھا، گو یہ اکثر لوگوں کے نزدیک سنگین گناہ تھا۔ ایذا رسانی کے اختتام پر جنہوں نے ایمان کا انکار کیا تھا اُن میں سے اکثر لوگ بشمول بشپ کے دوبارہ کلیسیا میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ سوال پیدا ہوا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ جو بشپ بحال ہو کر دوبارہ عشائے ربانی اور بپتسمہ کی رسمیں ادا کریں کیا وہ خدا کو مقبول اور پسندیدہ ہیں؟[a]

تفرقہ بازی 311ء میں عروج پر آ گئی جب سِلیانس قرطاجنہ کا بشپ بن گیا۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ جن بشپوں نے اُسے مخصوص کیا اُن میں سے ایک نے ایذا رسانی ہوتے وقت کلامِ مقدّس کو رومی حکمران کے سپرد کر دیا تھا۔ لہٰذا اُن کے نزدیک سِلیانس کی مخصوصیت منظور نہیں۔ اُنہوں نے اُس پر یہ الزام بھی لگایا کہ ایذا رسانی ہوتے وقت سِلیانس نے لوگوں کو جیل میں پڑے اُن ایمان داروں کی مدد کرنے سے روک دیا تھا جن کو سزائے موت دینی تھی۔[71] جلد ہی نیا فرقہ بن گیا جس کے اپنے بشپ تھے اور جو دوناتی کہلانے لگے (دوناتس اُن کا ایک بشپ تھا)۔ دونوں پارٹیوں نے قسطنطین سے اپیل کی، لیکن قسطنطین نے دوناتی فرقے کے خلاف فرمان صادر کر کے اُنہیں دبانے کی کوشش کی۔[72]

---

[a] دیکھئے صفحہ 274۔

شہادت قربانی نہیں بلکہ گواہی ہے

یہ دوناتی فرقہ طرطُلیان کا شہادت کے بارے میں خیال رکھتا تھا۔ اُس کے نزدیک شہادت ہر صورت میں اچھی ہے۔ اِس کے پیشِ نظر اوگسطین کو نئے سرے سے شہادت کے بارے میں سوچنا پڑا۔ جب اُس نے کتابِ مقدّس کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ شہادت کا اصلی مطلب گواہی ہے۔ چنانچہ اُس نے گواہی پر زور دے کر یہ خیال چھوڑ دیا کہ شہادت قربانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ جان گیا کہ مسیح ہماری واحد قربانی ہے، اِس لئے ہم شہادت کو قربانی نہیں ٹھہرا سکتے۔ ایک وعظ میں اُس نے شہیدوں کے بارے میں فرمایا، "جنہوں نے اپنا خون اپنے چھڑانے والے خداوند کے لئے بہایا اُنہیں اُس کے خون نے فدیہ دے کر چھڑایا۔ اُس نے اپنا خون اُن کی نجات خریدنے کے لئے بہایا جبکہ اُنہوں نے اپنا خون اُس کی خوش خبری پھیلانے کے لئے بہایا۔"[73]

قاری دھیان دیں کہ یہاں اوگسطین کا پورا زور مسیح کے نجات دینے والے کام پر ہے، گو شہید اپنے خون سے خوش خبری کی گواہی دیتا ہے۔ اور اوگسطین بار بار یہ بات دہراتا ہے۔ کئی بار اُسے کسی شہید کے دن پر شہادت کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یاد رہے کہ ایسے موقعوں پر شہید کی کہانی سنائی جاتی تھی جس کے دوران ہمیشہ شہید کی قربانی کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ تاہم اوگسطین قربانی کا ذکر کرنے سے گریز کرتا ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ اُس نے جان لیا ہے کہ خدا کا فضل سب کچھ ہے، اُسی نے مسیح کے ذریعے انسان کو کامل قربانی عطا کی ہے۔ انسان اپنی طرف سے کوئی قربانی نہیں دے سکتا۔

یہ خیال کہ شہادت قربانی ہے دوناتی فرقے کا ایک پکا اصول تھا۔ اِس کے پیشِ نظر اوگسطین صاف طور پر حقیقی قربانی یعنی مسیح کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ دوناتیوں کا پورا زور ایمان دار کی قربانی اور پاکیزگی پر تھا جبکہ اوگسطین بار بار فرماتا ہے کہ ہمیں اپنی قربانی اور پاکیزگی کو چھوڑ کر خدا کی قربانی اور پاکیزگی کی طرف دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ وہی ہماری قربانی اور پاکیزگی کا منبع ہے۔

حقیقی شہادت مسیحی ایمان کی گواہی ہے

اوگسطین کے نزدیک لازم نہیں کہ ایمان دار مصیبت سہنے کے باعث ہی شہید ہو۔ بلکہ جس چیز کی گواہی وہ دیتا ہے وہی شہادت کا باعث ہے۔ اوگسطین لوگوں کا شہدا کی مصیبت پر غیر صحت مند دھیان کھینچ کر شہادت کے منبع مسیح کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ شہید پرستش کے لائق نہیں ہے بلکہ مسیح۔ جو تکلیف دوناتی سہہ رہے ہیں وہ شہادت کی تکلیف نہیں ہے، کیونکہ وہ کلام سے ہٹ کر باتوں پر ضد کر رہے ہیں۔[74]

اِس میں اوگسطین حق بجانب ہے۔ ایک دوناتی تصنیف میں شہید اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہیں، ''جو بھی باغیوں (یعنی دوسرے مسیحیوں) سے تعلق رکھے اُس کا ہمارے ساتھ آسمان کی بادشاہی میں کوئی حصہ نہیں۔''[75] دوناتی فرقے کا پورا زور الگ رہنے اور دوسروں کو مجرم ٹھہرانے پر تھا۔ اِن کے خلاف اوگسطین فرماتا ہے کہ کلیسیا تقسیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ بشپوں کی نہیں بلکہ خدا کی ہے۔ پطرس رسول بھی اپنی نہیں بلکہ خدا کی بھیڑوں کی پرورش کرتا تھا، اِس لئے وہ حقیقی شہید ہے۔[76]

اوگسطین کے نزدیک خدا کی کلیسیا نہ صرف ایک بلکہ ہمہ گیر بھی ہے۔ یہ بات بھی دوناتی ایمان کے خلاف تھی، بلکہ کچھ کا پکا ایمان تھا کہ واحد کلیسیا شمالی افریقہ میں موجود ہے۔[77]

شہیدوں کی تقلید کرنی چاہئے

جب ایذا رسانی عام تھی تو شہید دوسروں کے لئے اچھا نمونہ تھے۔ کیونکہ جب لوگوں کو ستایا جاتا تھا تو وہ اُن کی مثال سے تقویت پاتے تھے۔ لیکن اوگسطین کے شمالی افریقہ میں مسیحیوں کو ستایا نہیں جاتا تھا سوائے دوناتیوں کے۔ تاہم وہ شہیدوں کو موجودہ حالات کے لئے اچھا نمونہ سمجھتا تھا۔ کس ناتے سے؟

اول، شہید روحانی طور پر اچھا نمونہ ہیں، لہٰذا اُن کی تقلید کرنی چاہئے۔ مسیح کی پیروی کرنے میں شہید صحیح راہ دکھاتے ہیں۔[78] یاد رہے کہ شہیدوں کی قبروں پر شراب نوشی

اور عیاشی عام تھی۔ لہٰذا اوگسطین اِس پر زور دیتا ہے کہ شہید کے دن کا مقصد صرف اور صرف شہیدوں کی تقلید پر غور کرنا ہے۔[79] جو ایمان، صبر اور مہربانی شہیدوں میں پائی جاتی ہے اُس سے دوناتی محروم رہتے ہیں۔[80] کیونکہ دوناتی دوسروں کو اُکسانے سے اپنی موت کرواتے ہیں۔ یہ بھلائی نہیں بلکہ غرور کا اظہار ہے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم شہیدپرستی کا مرکز بن جائیں۔[81]

شہید درمیانی نہیں ہے

اوگسطین کی کلیسیا میں شہدا کی پرستش کرنے کا خطرہ تھا، اِس لئے وہ اُنہیں سمجھانے پر مجبور ہوا کہ شہیدوں کی پوجا کرنا غلط ہے۔[82] وہ اعمال 14 کا حوالہ لے کر فرماتا ہے کہ پولس اور برنباس کے رونگٹے کھڑے ہوئے جب لوگ اُن کی پوجا کرنے لگے۔ اِسی طرح شہدا کو نہ یہ پسند ہے کہ لوگ اُن کی پوجا کرتے ہیں نہ یہ کہ وہ اُن کی قبروں پر شراب نوشی اور عیاشی کرتے ہیں۔[83] اوگسطین قبروں پر ہونے والے معجزوں کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن وہ بار بار اِس پر زور دیتا ہے کہ اِن کا مقصد مسیح اور تقلید کی طرف لانا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یوحنا فم الذہب کے نزدیک شہدا خدا اور انسان کے درمیانی ہیں۔ لیکن اوگسطین میں یہ خیال پایا نہیں جاتا۔ اِس کے برعکس وہ فرماتا ہے، ''آخر ایسا تو نہیں ہے کہ آپ انسان ہیں جبکہ وہ نہیں تھے۔ . . ہم سب آدم کے ہیں، ہم سب مسیح میں ہونے کے کوشاں ہیں۔''[84] یعنی جو کچھ اُنہوں نے کیا وہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ البتہ اُس کے نزدیک شہید خدا کے حضور ایمان داروں کے لئے دعا کرتے ہیں۔[85] غرض شہید موت کے بعد وہی کچھ کرتے ہیں جو زندہ ہوتے وقت کرتے تھے۔

ہم دل کی فتح سے تاجِ شہادت حاصل کرتے ہیں

اوگسطین کے نزدیک گو ایذا رسانی ختم ہو گئی ہے تاہم عام مسیحی کو شہادت کا تاج مل سکتا ہے۔ کس طرح ؟ شہید کی روح میں زندگی گزارنے سے۔[86] یعنی شہید کی طرح

زندگی گزارنے سے۔ ایمان، ثابت قدمی اور توہم پرستی سے دُور رہنے سے ہم اپنا تاج کماتے ہیں۔[87]

شہید بہت دفعہ تماشاگاہ میں موئے۔ اوگسطین فرماتا ہے کہ حقیقی تماشا گاہ انسان کا دل ہے۔ اصلی جنگ انسان کے دل میں ہو رہی ہے، اور فتح پانے سے اُسے شہادت کا تاج ملے گا۔

> گو ہمیں یہ مخالف نظر نہیں آتا تاہم ہم اُس پر غالب آ سکتے ہیں۔ ہم اُسے کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ اِس لئے کہ ہم اپنے اندر ہی اُن چیزوں کا تجربہ کرتے ہیں جن سے وہ ہمیں شکست دینا چاہتا ہے، اپنے اندر ہی اُنہیں روکتے ہیں۔ آپ اپنے دشمن ابلیس کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن اپنے اندر ہی آپ اپنے لالچ کا تجربہ کرتے ہیں۔ آپ اپنے دشمن ابلیس کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن آپ اپنے اندر ہی اپنی شہوت کا تجربہ کرتے ہیں۔ آپ اپنے دشمن ابلیس کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن آپ اپنے اندر ہی اپنے غصے کا تجربہ کرتے ہیں۔ اُس پر غالب آئیں جس کا تجربہ آپ اپنے اندر کرتے ہیں، تب جو باہر آپ کی تاک میں بیٹھے ہیں وہ شکست کھا چکے ہیں۔[88]

غرض اوگسطین شہادت کا خیال نئے عہدنامے اور پولس رسول کے پاس واپس لایا ہے۔

مقدسین کا احترام

آخر میں مقدسین کے احترام کے بارے میں چند ایک الفاظ۔ نئے عہدنامے کے مطابق ہر ایمان دار مقدّس ہے، کیونکہ وہ مسیح کے کفارے سے مقدّس ٹھہرتے ہیں۔ لیکن قسطنطین کی تبدیلی کے بعد جب بُت پرستوں کا سیلاب کلیسیا میں داخل ہوا تو یہ نام

''مقدّس'' صرف ایمان کے خاص پہلوانوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ رومی ممالک میں جب ایذا رسانیاں ختم ہوئیں تو مقدّس بننے کے لئے شہادت لازم نہیں تھی۔ اب سے اُن لوگوں کو مقدّس قرار دیا گیا جو راہبانہ زندگی گزارنے اور کلیسیا کی خدمت کرنے میں لاثانی تھے، اور جن کے ذریعے معجزے ہوئے تھے۔[89]

مذکورہ مقدسین کی بڑی اکثریت کلیسیا کے عہدیدار اور راہب تھے۔ کم از کم چوتھی سال سے لوگ مشکل سے ہی تصور کر سکتے تھے کہ شادی شدہ شخص مقدّس ہو سکتا ہے۔ اِس خیال کے تحت پطرس رسول کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے الگ ہوا۔[a]

فرشتوں کا احترام بھی سرِ عام ہو گیا۔ اِس میں یہ بات درست ہے کہ فرشتے ہماری حفاظت کرتے ہیں۔[b] تاہم نئے عہد نامے میں فرشتوں کی پرستش منع ہے۔[c] اب یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ کچھ مقدسین خاص جگہوں اور شعبوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ مثلاً پطرس اور پولس رسول روم کے محافظ ہیں جبکہ انتونی وبائی بیماری سے محفوظ رکھتا ہے، لوقا مصوروں کا محافظ ہے وغیرہ۔

لوگوں کے ذہن میں مقدسین اور فرشتوں کا پورا نظام وجود میں آ گیا۔ سب سے اوپر ملکہ مریم ہے، پھر رسول اور شہید پرانے عہد نامے کے آبا اور نبیوں کے ساتھ، پھر دیگر مقدسین۔ مجلسِ شوریٰ کے ممبر دیونیسیُس کی نام نہاد کتابوں[d] نے اِس نظام کو وہ شکل دی جو آج تک ایسی کلیسیاؤں میں مانی جاتی ہے۔

---

[a] لیکن دیکھئے ۱۔کرنتھیوں 5:9۔

[b] دانی ایل 13:10، 20، 21؛ 1:12؛ متی 10:18؛ لوقا 7:15؛ عبرانیوں 14:1؛ اعمال 15:12

[c] کلسّیوں 18:2؛ مکاشفہ 10:19؛ 22:8-9

[d] Pseudo-Dionysios Areopagita

کنواری مریم کا احترام

مقدسین کے احترام کے ساتھ ساتھ کنواری مریم کا احترام بھی شروع ہوا۔ کنواری مریم کے احترام کے پیچھے یہ خیال ہے کہ وہ یسوع مسیح کی ماں ہے، لہٰذا خاص احترام کے لائق ہے۔ لیکن کم از کم چوتھی صدی سے کلیسیا کتابِ مقدّس سے دُور ہو کر اُس سے ایک ایسی درمیانی بنانے لگی جو کئی دفعہ مسیح سے بھی زیادہ مؤثر لگتی ہے۔ مسیح کی طرح وہ بھی بے گناہ اور نجات دہندہ بن گئی۔

بے شک مشرقی اور رومی کلیسیائیں احترام[a] اور پرستش[b] میں امتیاز کر کے فرماتی ہیں کہ ہم مریم اور مقدسین کی پرستش نہیں بلکہ احترام کرتی ہیں۔ لیکن جو کچھ عمل میں آتا ہے وہ پوجا ہی لگتا ہے۔ بہت سے کنواری مریم سے دعا کر کے اُس کی سفارش مانگتے ہیں۔ یہی تعلیم آج تک پروٹیسٹنٹ کلیسیاؤں کو مشرقی اور رومی کلیسیاؤں سے الگ رکھتی ہے۔ اُس کے احترام میں بہت کچھ ملتا ہے جو پرانی دیویوں کی پوجا میں بھی پایا جاتا ہے۔

احترام کا یہ رواج کس طرح شروع ہوا؟ نئے عہد نامے میں اِس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ یوحنا بپتسمہ دینے والے کی ماں الیشبع مریم کو "میرے خداوند کی ماں" کہتی ہے۔[c] نیز، وہ پکارتی ہے، "تُو تمام عورتوں میں مبارک ہے۔"[d] اور جبرائیل فرشتہ فرماتا ہے، "اے خاتون جس پر رب کا خاص فضل ہوا ہے۔"[e] اور خود مریم اپنے بارے میں فرماتی ہے، "اب سے تمام نسلیں مجھے مبارک کہیں گی۔"[f]

اِس میں کوئی شک نہیں کہ مریم ایک خلوص دل اور غیر معمولی عورت تھی۔ لیکن اُس کے بارے میں کہیں نہیں کہا جاتا کہ وہ بے گناہ یا سفارش کرنے والی ہے۔ اعمال 14:1 میں اُسے صرف "یسوع کی ماں" کہا جاتا ہے، اور نہ ہم جانتے ہیں کہ وہ

---

[a] δουλεία (douleia)
[b] λατρεία (latreia)
[c] لوقا 43:1
[d] لوقا 42:1
[e] لوقا 28:1
[f] لوقا 48:1

کہاں پیدا ہوئی، نہ کہ اُسے کہاں دفنایا گیا۔ یوحنا 4:2 میں یسوع اُسے ڈانٹتا ہے، اور جب اُس کی ماں اُس سے ملنے آتی ہے تو وہ اِس پر زور دیتا ہے کہ خونی رشتے کی نسبت روحانی رشتے داری کہیں بہتر ہے، ''جو بھی میرے آسمانی باپ کی مرضی پوری کرتا ہے وہ میرا بھائی، میری بہن اور میری ماں ہے۔''[a] یہ بات ایک اَور موقع پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایک عورت پکارتی ہے، ''آپ کی ماں مبارک ہے جس نے آپ کو جنم دیا اور آپ کو دودھ پلایا۔'' جواب میں یسوع ہاں میں ہاں نہیں ملاتا بلکہ اُسے سمجھا کر فرماتا ہے، ''بات یہ نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ مبارک ہیں جو اللہ کا کلام سن کر اُس پر عمل کرتے ہیں۔''[b]

اب قاری دھیان دیں کہ دوسری صدی سے مریم کے بارے میں تعلیم کس طرح تبدیل ہوئی۔ یوسطین شہید، ایرینئیُس اور طرطُلیان جیسے بزرگ حوا کا مریم سے مقابلہ کرکے فرمانے لگے کہ جس طرح حوا گناہ اور موت کا منبع تھی اُسی طرح مریم اپنی تابع داری سے نجات کا وسیلہ بن گئی۔90 یعنی جس طرح مسیح دوسرا آدم ہے اُسی طرح مریم دوسری حوا ہے۔ بلکہ ایرینئیُس مریم کو حوا کی حامی بھی سمجھتا ہے۔91 گو یہ بزرگ نہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ مریم ہماری سفارش کرتی ہے، نہ یہ کہ وہ بےگناہ تھی، لیکن مریم کا کردار خود بہ خود بڑھتا گیا۔ لوگ پیدائش 15:3 کو یوں سمجھنے لگے کہ مسیح نہیں بلکہ حوا یعنی مریم سانپ کے سر کو کچل ڈالے گی، اگرچہ عبرانی کا صاف مطلب یہ ہے کہ حوا کی اولاد یعنی مسیح سانپ کے سر کو کچل ڈالے گی۔[c]

چوتھی صدی میں راہبانہ زندگی کی طرف رجحان نے یہ بات اپنا کر مزید بڑھا دی۔ اب مریم کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نہ صرف مسیح کی پیدائش تک کنواری تھی بلکہ اُس کے بعد بھی۔ یوسف کو نہایت بوڑھا ٹھہرایا گیا، اور اُس کے ساتھ مریم کی شادی

---

[a] متی 50-46:12
[b] لوقا 28-27:11
[c] چوتھی صدی کے لاطینی ترجمے بنام وُلگاتا میں یہی غلطی آج تک پائی جاتی ہے۔

صرف نامی سمجھی جاتی تھی (لیکن دیکھئے متی 1: 25)۔ نیز، یسوع کے بھائیوں کو کزن قرار دیا گیا، گو یہ بات یونانی متن کے خلاف ہے۔ اِس کے پیچھے یہ احساس تھا کہ جس عورت سے مسیح پیدا ہوا اُس سے کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہوتے ہوتے مریم کو ''ہمیشہ کی کنواری'' کا لقب مل گیا۔

چوتھی صدی کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ جب مسیح پیدا ہوا تو مریم کا بچہ دان نہ کھلا بلکہ جس طرح یسوع جی اُٹھنے کے بعد دروازوں میں سے گزرا اُسی طرح وہ مریم کے پیٹ میں سے بھی گزر گیا۔

اوگسطین اِس سے کچھ آگے بڑھ گیا۔ اُس نے فرمایا کہ مریم بےگناہ تھی، گو وہ موروثی گناہ سے پاک نہیں تھی۔[92] اِس کی وجہ دل چسپ ہے۔ وہ کتابِ مقدّس کا حوالہ نہیں دیتا بلکہ یہ فرماتا ہے کہ چونکہ مسیح بےگناہ تھا اِس لئے لازم ہے کہ اُس کی ماں بھی بےگناہ تھی۔ بعد میں یہی دلیل یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوئی کہ جب مریم ماں کے پیٹ میں وجود میں آئی تو وہ موروثی گناہ سے آزاد تھی۔

تاہم 430ء تک مریم کا احترام کم پایا جاتا ہے۔ مذکورہ سال میں نسطوریُس نے فرمایا کہ مریم کے لئے نام ''خدا کو جننے والی''[a] استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ ''مسیح کو جننے والی۔''[b] ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''خدا کو جننے والی'' کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مریم کسی صورت میں خدا کی ماں تھی بلکہ یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی جو خدا بھی تھا اور انسان بھی۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ اِس لئے نسطوریُس سے ناراض ہوئے کہ وہ مریم کا خاص احترام کرتے تھے۔ اور نسطوریُس کی شکست کے بعد مریم کا احترام مزید بڑھ گیا۔

چوتھی صدی کے آخر میں پہلی دلائل ملتی ہیں کہ لوگ مریم اور مقدسین کو پکار کر دعا کرنے لگے۔ پھر پانچویں صدی میں یہ رجحان صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چونکہ مریم یسوع

---

[a] θεοτόκος (theotokos)
[b] χριστοτόκος (christotokos)

کی ماں تھی اِس لئے اُسے مقدسین کی سرپرست سمجھی جاتی تھی، لہٰذا وہ باقی مقدسین کی نسبت زیادہ احترام کے لائق تھی۔ اب بے شمار گرجاگھروں اور مذبحوں کو مریم کے لئے مخصوص کیا گیا۔ یُوسطِنیانِ اعظم بادشاہ اُس کی سفارش مانگتا رہتا تھا، اور اُس کا جرنیل مریم کی پناہ مانگ کر جنگ کے لئے نکلتا تھا۔ مریم کی بے شمار تصویریں اور مجسمے بنائے گئے۔ اِن میں سے بہتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن سے معجزے سرانجام ہوئے ہیں۔

غرض، ہوتے ہوتے مریم مسیح کی طرح بن گئی۔ لوگ سمجھنے لگے کہ مریم اپنی ماں کے پیٹ میں وجود میں آتے وقت بے گناہ تھی اور اِسی حالت میں پیدا ہوئی، کہ وہ جی اُٹھی اور آسمان پر اُٹھا لی گئی، کہ وہ آسمان و زمین کی تمام قدرت میں شریک ہے۔

آج رومن کیتھولیک کلیسیا میں خاص کر ایک دعا سرِ عام ہے جو یہ احترام دکھاتی ہے، وہ جو ''آوے مریا'' کہلاتی ہے۔ اُس کے پہلے حصے میں دعا گو لوقا 1:28،42 دہرا کر مریم سے دعا کرتا ہے جبکہ اُس کا آخری حصہ کتابِ مقدّس سے ہٹ کر ہے،

- ''اے مریم جس پر رب کا خاص فضل ہوا ہے، سلام! رب تیرے ساتھ ہے۔
- تُو تمام عورتوں میں مبارک ہے اور مبارک ہے تیرا بچہ!
- اے مقدّس مریم، خدا کی ماں، ہمارے گناہوں کے لئے دعا کر، اب اور موت کے وقت۔ آمین۔''

دعا میں تیسرے حصے کا اضافہ تقریباً 1500ء میں ہوا۔ تاہم یہ دعا مذکورہ کلیسیا میں دعائے ربانی اور رسولی عقیدے کے برابر ہے۔

مقدسین کی یادگاروں کا بھی احترام

نہ صرف مقدسین کا احترام کیا جاتا تھا بلکہ اُن کی ہڈیوں یا کسی اَور یادگار کا بھی۔ یہ کرنے کی کتابِ مقدّس میں کیا دلائل ملتے ہیں؟

۲۔سلاطین 21:13 میں ایک مُردے کا ذکر ہے جس کی لاش الیشع کی قبر میں ڈالنے سے دوبارہ زندہ ہوئی۔ لیکن یہودیوں نے اِس سے یہ نتیجہ نہ نکالا کہ الیشع کی ہڈیوں کا احترام کرنا ہے۔

مزید تین حوالجات اِس ناتے سے پیش کئے جاتے ہیں۔ اول، بیمار عورت کو مسیح کا لباس چھونے سے شفا مل گئی۔[a] دوسرے، ایک جگہ پر مریض پطرس رسول کے سائے میں رکھے جاتے ہیں تاکہ تن درست ہو جائیں۔[b] تیسرے، ایک موقع پر لوگوں نے اپنے رومال اور ایپرن پولس رسول کے بدن سے لگانے کے بعد اُنہیں اپنے مریضوں پر رکھ دیئے تو اُن کی بیماریاں جاتی رہیں۔[c] لیکن ہر مثال میں لوگ زندہ تھے۔ نیز، نئے عہد نامے میں یہ کرنے کی ہدایت نہیں دی جاتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ مسیح اور نہ اُس کے شاگردوں نے ایسا کوئی طریقہ استعمال کیا۔ مذکورہ مثالوں میں عوام نے ایسا کیا، لیکن یہ نہیں کہا جاتا کہ ہمیں ایسا کرنا چاہئے۔ نہ نیا عہد نامہ اور نہ رسولی بزرگوں میں ایسا دستور نظر آتا ہے۔

مقدسین کے احترام کا مسئلہ

مقدسین کی وساطت کی ضرورت نہیں

سوال اُٹھتا ہے کہ مرحوم مقدسین کس طرح مختلف جگہوں کی دعائیں سن سکتے ہیں؟ یہ خدا ہی کا کام ہے۔ اور اگر کوئی جواب دے کہ مقدسین خدا کے ذریعے ہماری دعائیں سن کر ہماری سفارش کرتے ہیں تو سوال ہے کہ اِس کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم سیدھے خدا سے دعا کر سکتے ہیں تو ہم کیوں کسی اَور کے ذریعے یہ کریں؟ وہ مسیح کے ذریعے ہمیشہ ہماری سننے کے لئے تیار ہے۔

---

[a] متی 20:9
[b] اعمال 16-14:5
[c] اعمال 12-11:19

کلامِ مقدس سے دُور باتیں

حقیقت تو یہ ہے کہ شہید پرستی نئے عہد کی سرزمین سے کہیں دُور ہو گئی ہے۔ جو عناصر اُس میں پائے جاتے ہیں وہ کانٹ چھانٹ کر کے ملکِ پاکستان کے پیر و فقیروں میں بھی ملتے ہیں۔ شہیدوں یا دیگر بزرگوں کی یادگاروں کا احترام ہمارے ہاں بھی سرِ عام ہے۔ بے شمار لوگ زیارت گاہوں پر جا کر کسی بزرگ کی سفارش اور پناہ مانگتے ہیں۔ افسوس کہ عام مسیحیوں میں بھی ایسی بُت پرستی پائی جاتی ہے۔

مسیح کی نجات کافی ہے

شہید پرستی ایک اَور بات کا اظہار کرتی ہے۔ اِس سے لوگ دکھاتے ہیں کہ مسیح کا نجات دینے والا کام ہمارے لئے ناکافی ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ مسیح تک پہنچ مشکل ہے، لٰہذا دیگر بزرگوں کی وساطت کی ضرورت ہے۔ اُن ہی سے وہ گناہوں کی معافی، معجزے اور پناہ مانگتے ہیں، گو مسیح ہی یہ کچھ سرانجام دیتا ہے۔

خدا کا فضل کافی ہے

نیز، لگتا ہے کہ لوگ خدا کا مسیح میں فضل نہیں سمجھتے تھے۔ نئے عہد نامے کے مطابق ہم مسیح کی کفارہ دینے والی قربانی کے باعث ہی خدا کو مقبول ہو گئے ہیں۔ ہماری نجات میں ہمارا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔ اِس کے باوجود راہبانہ زندگی اور شہید پرستی میں یہ خیال عام ہے کہ انسان کو بھی کچھ کرنا چاہئے۔ اِس کی انتہا پسند شکل فرانس میں نظر آتی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ انسان کو جد و جہد کر کے خوبیوں کی سیڑھی پر چڑھنے سے آسمان تک پہنچنا ہے۔ اور اگر وہ اِس میں ناکام رہے تو شہید سے سفارش مانگ کر یہ کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ مسیح کی کفارہ دینے والی قربانی کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔

غرض، جو اصل یعنی مسیح کو چھوڑے وہ دل کی خلا کو نقلی چیزوں سے دُور کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب مسیح سب کچھ ہو اور ہم اُس سے لپٹے رہیں تو ہمیں پیر و فقیروں

کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ مسیح نہ صرف آسمان پر ہے بلکہ وہ روح القدس کے وسیلے سے لمحہ بہ لمحہ ہمارے ساتھ چلتا ہے۔

یاد رہے کہ مریم اور دیگر مقدسین کا احترام مشرق اور مغرب کی قدیم کلیسیاؤں کا رگ و ریشہ بن گیا ہے۔ البتہ پروٹیسٹنٹ کلیسیاؤں نے یہ بات مسترد کر دی۔ ہم مانی کے پیروکار فَوسٹُس کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، "آپ نے بُتوں کو شہیدوں میں تبدیل کر دیا ہے۔" گو اوگسطین[93] اور دیگر بزرگوں نے جواب میں اعتراض کیا کہ ہم صرف شہدا کا احترام کرتے ہیں تاہم عملی طور پر مقدسین کے احترام میں پرانی بُت پرستی نظر آتی ہے۔

شہدا سے سبق

گواہی دینے کا فرض

شہادت کا بنیادی مطلب گواہی دینا ہے۔ قدیم مسیحی اپنے ایمان کی گواہی دیتے تھے۔ کبھی کبھی یہ گواہی خون سے لکھی گئی۔ لیکن گواہی دینا مسیح کے لائق زندگی گزارنے سے شروع ہوتا ہے۔ جدید دور میں جب معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں آ رہی ہیں ہمیں اِس کی اشد ضرورت ہے۔

آسمانی عزت کی تمنا

قدیم ایمان دار کی ایمان کی خاطر مرنے کی تیاری حیرت انگیز ہے۔ بے شک جب لوگ جان بوجھ کر شہید ہوئے تو سوال اُٹھتا ہے کہ کیوں؟ کلامِ مقدّس میں خیال تک نہیں ملتا کہ ہم رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو موت کے حوالے کریں۔ بے شک اِس کے پیچھے ایک وجہ یہ تھی کہ لوگ آسمانی عزت کی آرزو رکھتے تھے۔ لوگ شدت سے "شہادت کا تاج" حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دنیاوی عزت پر لوگ آسمان کی عزت ترجیح دیتے تھے۔

آسمانی شہریت کا احساس

حقیقت میں ہماری نسبت قدیم ایمان دار زیادہ شدت سے محسوس کرتے تھے کہ ہم اِس دنیا کے نہیں ہیں۔ اِسی وجہ سے وہ اِتنی جلدی سے شہید ہونے کے لئے تیار تھے۔ اِس معاملے میں ہم اُن سے سیکھ سکتے ہیں۔ بے شک خدا کا فضل سب کچھ ہے، بلاشبہ مسیح کا نجات دینے والا کام ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ لیکن کیا ہمیں اِس کا احساس ہے کہ ہم آسمان کے شہری ہیں، کہ ہمارا وطن آسمان پر ہے؟

صبر و تحمل کی جرأت

ہم شہدا کی دلیری اور ثابت قدمی سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ ظلم و تشدد مسیحی راستہ نہیں ہے۔ اِس کے برعکس جب مشکلات کا سامنا کرنا پڑے تو آئیں، ہم مسیح سے تقویت پا کر یہ صبر و تحمل سے برداشت کریں۔ ہم ایذا رسانی کی جنگ میں صرف روحانی اسلحہ استعمال کریں۔ خدا کی مرضی ہے کہ ہم امن و امان کا باعث ہوں۔ تخریب کاری مسیحیوں کے لئے آپشن ہی نہیں، خواہ اُن کے ساتھ کتنی زیادتی کیوں نہ کی جائے۔

اندرونی جنگ میں ثابت قدمی

ساتھ ساتھ ہم اوگسطین کا خیال نہ بھولیں کہ حقیقی جنگ بیرونی نہیں بلکہ اندرونی ہے۔ جب دل آزمائش میں پڑے تو آئیں ہم ثابت قدم رہ کر اُس پر غالب آئیں۔ تب ہی ہم شہیدوں اور راہبوں کے صحیح پیروکار ثابت ہوں گے۔

دیگر مذاہب کی تجدید کرنے والوں سے خبردار

جو بادشاہ قدیم ثقافت اور مذہب کو بحال کرنا چاہتا تھا وہ مسیحیوں کو زیادہ ستاتا تھا۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے خبردار جو اپنے مذہب کی بحالی پر زور دیتے ہیں۔ جو اپنے مذہب کو بحال کرنا چاہے وہ بہت دفعہ دوسرے مذاہب کو دبانا چاہتا ہے۔

مغرب پر بھروسا رکھنے سے خبردار

قدیم کلیسیا میں ایک سیاسی بات نظر آتی ہے جو آج کے دور پر بھی صادق آتی ہے۔ جب مغربی حکمران مسیحی بن گیا تو مشرق کی زرتشتی حکومت مسیحیوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگی۔

ملکِ پاکستان میں بھی کئی ایک غیر مسیحی سمجھتے ہیں کہ مسیحی مغرب کے دوست ہیں۔ نتیجے میں اُنہیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور شاید کبھی پورے طور پر حل نہیں ہو سکتا۔

جو ایمان دار سوچے کہ مغرب کی حکومتیں پاکستانی مسیحیوں کی مدد کریں گی وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اول، مغرب کی حکومتیں مجموعی طور پر مسیحی نہیں ہیں۔ دوم، ہر حکومت کا مرکزی ٹارگیٹ اپنے ملک کی ترقی اور حفاظت ہے۔

قسطنطین کی مثال لیجئے۔ اُس نے فارس کے بادشاہ کو خط لکھ کر اُسے مسیحیوں سے اچھا سلوک کرنے کا مشورہ دیا۔ نتیجے میں اِس کے اُلٹ ہوا۔ اور جب مسیحیوں کو ستایا گیا تو مغرب اُن کی مدد کے لئے نہ آیا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ مشرق میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ بار بار مسیحیوں کو مغرب کے ایجنٹ اور جاسوس قرار دیا گیا ہے۔

اِس کا کیا حل ہے؟ اگر ایمان دار مایوس نہ ہونا چاہے تو وہ مدد کے لئے مغرب کی طرف نہ دیکھے بلکہ خدا اور اپنے بھائی بہنوں کی طرف۔ مسیحی ایمان کی مضبوطی مغرب پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ خدا پر۔

اِس کا مالی پہلو بھی ہے۔ آج کل بے شمار پادری انٹرنیٹ کے ذریعے مغرب کی مختلف کلیسیاؤں سے پیسے مانگتے ہیں۔ جو رام کہانیاں وہ اِس سلسلے میں سنا دیتے ہیں اُن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ کے مطابق ہزاروں غیر مسیحی مسیحی بن رہے ہیں۔ کچھ اپنی ایذا رسانی کا کوئی نہ کوئی قصہ گھڑ لیتے ہیں۔ عزیز قاری، ایسی باتیں مسیحی ایمان کے لائق نہیں ہیں، اور اِن سے غلط نتیجے نکلتے ہیں۔

جو کلیسیا حقیقی طور پر خود مختار ہو اُسے ایسی چالوں کی ضرورت ہی نہیں۔ اُسے سوائے خدا کے کسی اَور کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایمان کے پہلوان

قدیم کلیسیا کے راہب

باب 16

مصر کے راہب

اب ہم قدیم کلیسیا کے ایک پہلو کی طرف رجوع کریں گے جو قاری کو شاید عجیب و غریب لگے۔ کیونکہ راہبوں کی زندگی جدید دور کے اکثر ایمان داروں کو اِتنی اجنبی لگتی ہے کہ وہ اِسے جلد ہی نظر انداز کر کے آگے نکلنے کی آزمائش میں ہوتے ہیں۔ لیکن جو سچے دل سے اُنہیں سمجھنے کی کوشش کرے اُس کے لئے بہت سے روحانی خزانے کھل جائیں گے۔

قدیم کلیسیا کے راہبوں کو سمجھنے کے لئے پہلے ہم مصر کی طرف رجوع کریں گے جس کے راہبوں کے بارے میں ہم سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

356ء میں مشہور راہب انتونی نے مصر کے ایک ویران پہاڑ پر وفات پائی۔ اُس کے ایک قریبی شاگرد نے بعد میں لکھا،

> جوں ہی اِس زمین کے عظیم اور مبارک بزرگ انتونی جو پوری دنیا کے لئے دعا کرتے تھے کوچ کر گئے تو سب کچھ پیٹخ دیا گیا، سب کچھ عذاب میں مبتلا ہوا ہے۔ اب الٰہی غضب مصر کو برباد کر رہا ہے۔ جب وہ حقیقی طور پر دنیا میں تھے تو اپنے ہاتھ اُٹھائے پورے دن دعا کرتے اور خدا سے ہم کلام ہوتے رہے۔ اُنھوں نے ہونے نہ دیا کہ غضب ہم پر اُتر آئے۔ اپنے خیالات کو اُٹھائے رکھ کر وہ اِسے ہم پر نازل ہونے سے روکتے رہے۔ لیکن اب یہ ہاتھ بند ہو گئے ہیں۔[1]

جدید دور کی راہبوں کے بارے میں رائے حد سے زیادہ منفی ہے۔ اُنہیں اکثر طفیلی اور معاشرے کے لئے بے کار سمجھا جاتا ہے۔ برِ سغیر میں شاید اُنہیں پیر و فقیر سمجھا جائے۔ لیکن قدیم کلیسیا کے راہبوں کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی یہ رٹی رٹائی باتیں چھوڑ کر اُنہیں قدیم کلیسیا کی آنکھوں سے دیکھیں۔ اِس کے لئے ہم اُن کے سب سے اہم نمائندے انتونی پر غور کریں گے۔

انتونی کا مذکورہ شاگرد ایک بات بیان کرتا ہے جو پوری قدیم کلیسیا میں مقبولِ عام تھی، یہ کہ راہبوں کو مسیحیت کے پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ قدیم ایمان دار اُس اَن دیکھی جنگ کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے جو خدا کے لشکروں اور ابلیس کے درمیان جاری ہے۔ اِس جنگ میں کام یاب رہنے کے لئے خاص کر مصر کے ایمان دار پادریوں کی نسبت زیادہ تر راہبوں کا سہارا لیتے تھے۔ کیونکہ اِنہیں الٰہی لشکروں کے پیش خیمے مانا جاتا تھا، ایسے نمائندے جو ملک کے تمام باشندوں کی سفارش کرتے تھے۔

انتونی: سب سے الگ زندگی

یہ راہب انتونی کون تھا؟ غالباً تقریباً 356ء تا 358ء اتھاسیُس نے اپنے دوست انتونی کی سوانح عمری بنام 'حیاتِ انتونی' لکھی۔ یہ تصنیف سوکھے ہوئے جنگل میں آگ کی طرح تیزی سے تمام رومی ممالک میں پھیل گئی۔ لاتعداد ایمان داروں کے دل جُنبش

میں آ گئے۔ بے شمار افراد اِسے پڑھ کر ایمان میں مضبوط ہوئے یا اِس سے بڑھ کر خود راہب بن گئے۔ سب سے مشہور مثال اوگسطین ہے جس کا روحانی سفر اِس کتاب سے بہت متاثر ہوا۔ آیئے، ہم اِس تصنیف پر غور کریں، کیونکہ مصنف انتونی کی زندگی بیان کر کے وہ نمونہ پیش کرتا ہے جس پر اُس کے خیال میں ہر راہب کو چلنا چاہئے۔ یہ ہمارے لئے راہبوں کو سمجھنے کا راستہ کھول دیتی ہے، خواہ ہر بات حقیقت پر مبنی ہو یا نہ ہو۔

معاشرے سے الوداع

انتونی ایک اَن پڑھ قُبطی تھا۔ وہ یونانی زبان نہیں بولتا تھا، وہ زبان جو بڑے شہر اسکندریہ میں بولی جاتی تھی اور جو یونانی تعلیم اور ثقافت کا مترادف تھی۔ انتونی کو مسیحی تربیت حاصل ہوئی۔ تقریباً 18 سال کی عمر میں دونوں والدین کوچ کر گئے، اور خاندان کی پوری ذمہ داری بیٹے پر آ گئی۔ اُس کی زمین کے تقریباً 200 ایکڑ تھے۔ ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔

ایک دن گرجا گھر کی طرف چلتے وقت یہ خیال اُسے چھیڑنے لگا کہ ابتدائی ایمان دار اپنی ساری ملکیت رسولوں کے سپرد کرتے تھے تاکہ اُسے ضرورت کے مطابق لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ جب چرچ پہنچا تو متی 21:19 کی تلاوت ہوئی جہاں مسیح امیر جوان کو فرماتا ہے، ''اگر تُو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اور اپنی پوری جائیداد فروخت کر کے پیسے غریبوں میں تقسیم کر دے۔ پھر تیرے لئے آسمان پر خزانہ جمع ہو جائے گا۔ اِس کے بعد آ کر میرے پیچھے ہو لے۔'' اِس کلام نے انتونی کے دل کو چیر ڈالا، اور اُسے محسوس ہوا کہ مسیح مجھ سے ہم کلام ہو رہا ہے۔

اُس نے فوراً اپنی زمینوں کو دوسروں کو دے کر باقی ملکیت بیچ ڈالی۔ اکثر پیسوں کو اُس نے غریبوں میں بانٹ دیا جبکہ تھوڑا بہت اپنی بہن کے لئے محفوظ رکھا۔[2] لیکن

کچھ دیر کے بعد کلام کی یہ بات سن کر کہ ''کل کے بارے میں فکر کرتے کرتے پریشان نہ ہو''[a] اُس نے باقی پیسوں کو بھی تقسیم کیا۔

پھر اپنی بہن کو کچھ وفادار کنواریوں کے سپرد کر کے وہ راہبانہ زندگی گزارنے لگا۔ اثناسیُس فرماتا ہے، ''اُس وقت تک مصر میں خانقاہوں کا پے در پے سلسلہ[b] نہیں تھا، اور جو بھی راہب تھا وہ دُور کے ریگستان سے بالکل ناواقف تھا۔ لٰہذا جو بھی اپنی زندگی پر دھیان دینا چاہتا وہ اپنے گاؤں کے قریب ہی علیٰحدگی میں زاہدانہ زندگی گزارتا تھا۔'' قریب کے گاؤں میں ایک بزرگ تھا جو ایسی راہبانہ زندگی گزار رہا تھا۔ انتونی اُس کے نمونے پر چلنے لگا۔ ساتھ ساتھ جب کبھی کسی نیک آدمی کی خبر ملتی تو ''شہد کی دانش مند مکھی کی طرح'' نکل کر اُسے تلاش کرتا تاکہ اُس کی خوبیوں سے سیکھ لے۔ انتونی بھیک نہیں مانگتا بلکہ اپنے ہاتھوں سے روزی کماتا تھا، کیونکہ اُسے پولس رسول کی بات یاد رہی کہ جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ کھانا بھی نہ کھائے۔[c] کمائے ہوئے پیسوں سے وہ روٹی خریدتا اور باقی ضرورت مندوں کو دیتا تھا۔ لیکن کام نے اُسے دعا کرنے سے نہ روکا: ''وہ مسلسل دعا میں لگا رہا، یہ جانتے ہوئے کہ علیٰحدگی میں بلاناغہ دعا کرنا لازم ہے۔''3[d]

یہ باتیں ایک آدمی کی تصویر کھینچتی ہیں جو کلام کی ٹھوس بنیاد پر زندگی گزارتا تھا۔ ''کیونکہ اُس نے کلام کی تلاوت پر اِتنی توجہ دی تھی کہ کلام کی کوئی بھی بات زمین پر گر کر ضائع نہ ہوئی بلکہ اُسے سب کچھ یاد رہی۔ بعد میں اُس کی یادداشت اُس کے لئے کتابوں کی حیثیت رکھتی تھی۔'' یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ قدیم زمانے میں کتابیں کم اور قیمتی تھیں، لٰہذا کلام کی یادداشت عام تھی۔ بہت سے لوگ پورے

---

[a] متی 34:6
[b] συνεχῆ μοναστήρια (sunexē monastēria)
[c] ۲۔تھسل 10:3
[d] متی 6:6؛ ۱۔تھسل 17:5

نئے عہد نامے اور کم از کم پرانے عہد نامے کے کچھ حصے یاد کرتے تھے۔ کچھ کا ذکر ہے جنہیں پورا کلام زبانی یاد تھا۔

انتونی کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کی خوبیوں کو دیکھ کر حسد نہیں کرتا بلکہ اُن سے سیکھنے کے لئے تیار تھا۔ ''اُس نے ایک کی مہربان حالت اور دوسرے کی بلاناغہ دعا کا ملاحظہ کیا۔ اُس نے نوٹ کیا کہ ایک غصے سے آزاد رہتا جبکہ دوسرے کو شفقت کی نعمت ہے۔ اُس نے اُس پر بھی دھیان دیا جو بیدار رہتا تھا اور اُس پر بھی جو جوش سے مطالعہ کرتا تھا۔ اُس نے ایک کے صبر و تحمل کی تعریف کی جبکہ دوسرے کے روزے اور زمین پر سونے کے طرزِ زندگی نے اُسے بہت متاثر کیا۔ اُس نے ایک کی نرم دلی اور دوسرے کی قوتِ برداشت پر غور کیا جبکہ یہ خاص بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی کہ سب کے سب مسیح کا خوف اور ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے۔''

لیکن انتونی نہ صرف حسد کئے بغیر دوسروں کی خوبیوں سے خوش ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کی خوبیاں اپنانے میں لگا رہا۔ ''اور اُس نے یہ یوں کیا کہ کسی کو دُکھ نہ ہوا بلکہ سب اُس سے خوش تھے۔'' اُسے دیکھ کر اُس کے جاننے والے اُسے ''خدا کا پیارا'' کہنے لگے، اور وہ اُن کا بیٹا اور بھائی بن گیا۔[4]

یہ راہ آسان نہیں تھی۔ جوں ہی وہ اُس پر آ گیا ابلیس اُس پر حملے کرنے لگا۔ اُس نے اُسے گزشتہ دولت کی یاد دلائی اور یہ کہ بہن کی فکر کرنی چاہئے۔ مزید باتیں اُسے آزماتی رہیں، مثلاً رشتے داروں کے تقاضے، پیسوں اور شہرت کی آرزو، کھانے پینے کے مختلف مزے اور آرام دہ زندگی کی دیگر سہولتیں۔ یہ خیال اُسے ستاتا رہا کہ خوبیاں حاصل کرنا کتنا مشکل ہے، اِس کے لئے کتنی محنت درکار ہے۔ ایک طرف جسم کمزور اور دوسری طرف بہت وقت ضروری ہے۔ جس طرح ڈسٹنگ یا آندھی سے گرد کا پورا بادل اُڑ جاتا ہے اُسی طرح اِن خیالات[a] کو اُبھارنے سے خیالات کا بادل اُڑ گیا۔ لیکن ابلیس

اُسے اُس کے پکے ارادے سے دُور کرنے میں ناکام رہا۔ ابلیس پر غلبہ کی کیا وجہ پیش کی جاتی ہے؟ انتونی کی مضبوطی، بڑا ایمان اور بلاناغہ دعا۔

پھر ابلیس نے اُسے جنسی آزمائشوں میں ڈال دیا، "کیونکہ یہ جوانوں کو پھنسانے کا پہلا پھندہ ہیں۔" یہ دن رات اُسے تنگ کرتی رہیں، یہاں تک کہ دوسروں کو اُن کے درمیان کی کُشتی نظر آئی۔ شیطان اُس کے ذہن میں گندی باتیں ڈالتا تو انتونی اِن کا مقابلہ دعاؤں سے کرتا۔ ابلیس اُس میں شہوت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تو انتونی ایمان، دعاؤں اور روزوں سے اپنے جسم کی قلعہ بندی کرتا۔ ایک رات ابلیس اُسے ورغلانے کے لئے عورت کی صورت میں قریب آیا۔ لیکن اُس کا ذہن مسیح اور اُس شرافت پر لگا رہا جو مسیح کے باعث حاصل ہوئی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ روح[b] کی روحانی[c] حالت پر دھیان دیتا رہا۔ اِس طریقے سے وہ ابلیس کے شعلہ زن دھوکے سے بچ گیا۔

"تب دشمن نے لطف اُٹھانے کی ہموار راہ پیش کی۔ لیکن انتونی نے غصے اور دُکھ سے بھرے آدمی کی طرح جہنم کی آگ کی دھمکی اور کھانے والے کیڑے کی تکلیف[d] اپنا مرکزِ خیال بنایا۔ یوں اُس کا مقابلہ کر کے وہ نقصان سے بچ کر اِن آزمائشوں میں سے گزر گیا۔"

انتونی کی روحانی طاقت کے بارے میں پڑھ کر ایک سوال قاری کے ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا انتونی جیسے راہبوں نے اپنی طاقت پر زور دے کر خدا کے فضل کو نظرانداز نہ کیا؟ کیا یہ ایک نئی قسم کی شریعت نہیں ہے جو انکار کرتا ہے کہ نجات صرف اور صرف خدا کی طرف سے ملتی ہے؟ لیکن انتونی کی زندگی اِس بات کو رد کرتی ہے۔ اُس کے شیطان پر غلبہ کی وجہ یوں پیش کی جاتی ہے: "کیونکہ خداوند انتونی کے

---

[a] λογισμός (logismos)
[b] ψυχή (psychē)
[c] νοερός (noeros)
[d] مرقس 9:48

ساتھ کام کر رہا تھا، وہی خداوند جو ہماری خاطر مجسم ہوا[a] اور جس نے جسم کو ابلیس پر غلبہ بخش دیا تاکہ جو بھی حقیقی طور پر لڑے وہ کہہ سکے کہ یہ کام مَیں نے خود نہیں بلکہ اللہ کے فضل نے کیا ہے جو میرے ساتھ تھا۔“[b5] غرض انسان محنت تو کرتا ہے لیکن یہ محنت خدا کے فضل پر منحصر ہوتی ہے۔

تب ابلیس کالے بچے کی صورت میں اُس پر ظاہر ہو کر کہتا ہے، ”مَیں زناکاری کا یار ہوں، اور مَیں نے جوانوں سے لڑنے کے لئے اِس میں پھنسانے والے پھندوں اور آزمائشوں کو اپنا لیا ہے۔ مَیں شہوت کی روح کہلاتا ہوں۔“ یہ روح اِس لئے کالی ہے کہ اُس کا دل شریر ہے اور اِس لئے بچہ کہ انتونی کی مضبوطی کے سامنے کمزور ہو گیا ہے۔ مصنف فرماتا ہے، ”یہ ابلیس کے خلاف انتونی کا پہلا مقابلہ تھا۔ لیکن حقیقت میں یہ کام یابی بھی نجات دہندے کی طرف سے تھی جس نے یہ کچھ انتونی میں سرانجام دے کر[6] ’پرانی فطرت میں موجود گناہ کو مجرم ٹھہرایا تاکہ ہم میں شریعت کا تقاضا پورا ہو جائے، ہم جو پرانی فطرت کے مطابق نہیں بلکہ روح کے مطابق چلتے ہیں‘۔“[c] غرض یہاں بھی خدا کا فضل انتونی کے ذاتی کام کی بنیاد ہے۔

لیکن نہ انتونی اور نہ اُس کا دشمن سُست ہوئے۔ انتونی جانتا تھا، کہ ابلیس کے بہت سی چالیں ہیں،[d] کہ وہ ایک شعبے میں ناکام ہونے پر کوئی اَور پھندہ لگائے گا۔ جواب میں وہ اپنے بدن کو مارتا کوٹتا اور اُسے اپنا غلام بناتا گیا،[e] یہ ڈرتے ہوئے کہ ایک شعبے میں غلبہ پا کر مجھے کسی اَور شعبے میں صحیح راہ سے دُور کھینچا جائے گا۔ اُس نے زیادہ سخت طرزِ زندگی کا عادی بننے کا ارادہ رکھا۔

---

[a] لفظی ترجمہ جسم پہن کر ὁ σάρκα δι’ ἡμᾶς φορέσας

[b] ۱۔کُرِنتھیوں 10:15

[c] رومیوں 8:3-4

[d] اِفسیوں 6:11

[e] ۱۔کُرِنتھیوں 9:27

یہ کیسا طرزِ زندگی تھا؟ بہت دفعہ وہ پوری رات جاگتا رہا۔ کھانا وہ روزانہ صرف مغرب کے وقت کھاتا تھا، لیکن کبھی نہ کبھی وہ دو یا چار دن کے بعد ہی کھانا کھاتا تھا۔ اُس کی خوراک روٹی اور نمک پر ہی محدود رہی، اور وہ صرف پانی پیتا تھا۔ اُس کی چٹائی تھی، لیکن اکثر وہ ننگے فرش پر سوتا تھا۔ تیل وہ استعمال نہیں کرتا تھا، کیونکہ اُس کے نزدیک ”مناسب ہے کہ جوان مرد تربیت حاصل کرنے میں جوشیلے ہوں۔ اِس مقصد کے تحت وہ کچھ تلاش نہ کریں جو جسم کو ڈھیلا کرے بلکہ وہ اُسے محنت مشقت کا عادی بنائیں۔ اُنہیں پولس رسول کی بات یاد رہنی چاہئے کہ ’جب مَیں کمزور ہوتا ہوں تب ہی مَیں طاقت ور ہوتا ہوں‘۔“[a] ”کیونکہ جب جسم کے مزے ماند پڑیں[b] تب ہی روح کا رگ و ریشہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔“

وہ جانتا تھا کہ روحانی ترقی زیادہ دیر تک زُہد کرنے پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اِس پر کہ انسان اِس کی گہری خواہش اور پکا ارادہ رکھے۔ لہٰذا انتونی نے کبھی گزشتہ کامیابیوں پر بھروسا نہ رکھا بلکہ وہ روزانہ یوں زندگی گزارتا تھا جس طرح پہلی دفعہ زُہد کر رہا ہو۔ اِس سلسلے میں وہ فلپّیوں 3:13 دہراتا رہتا تھا کہ ”جو کچھ میرے پیچھے ہے وہ مَیں بھول کر سخت تگ و دَو کے ساتھ اُس طرف بڑھتا ہوں جو آگے پڑا ہے۔“ مذکورہ آیت کے عین بعد پولس رسول فرماتا ہے،

> ”مَیں سیدھا منزلِ مقصود کی طرف دوڑا ہوا جاتا ہوں تاکہ وہ انعام حاصل کروں جس کے لئے اللہ نے مجھے مسیح عیسیٰ میں آسمان پر بُلایا ہے۔ چنانچہ ہم میں سے جتنے کامل ہیں آئیں، ہم ایسی سوچ رکھیں۔[c]

[a] ۲۔کُرِنتھیوں 10:12
[b] لفظی کمزور ہو جائیں
[c] فلپّیوں 3:14-15

یہ دو آیات انتونی کے زُہد کا مقصد ظاہر کرتی ہیں۔ اول، روحانی انعام حاصل کرنا ہے، اور دوسرے، کامل بننا ہے۔ اور مقصد کی بنیاد خدا کی بُلاہٹ ہے، اُسی نے ایمان دار کو اِس کے لئے بلایا ہے (آیت 14)۔

اِس مسلسل بھاگ دوڑ کے پیچھے ایک اَور آیت بھی تھی۔ ایک موقعے پر ایلیاہ نبی فرماتا ہے، "رب الافواج کی حیات کی قسم جس کی خدمت مَیں کرتا ہوں۔"[a] عبرانی متن کا لفظی ترجمہ "جس کے سامنے میں کھڑا ہوں" ہے، گو اِس کا مطلب خدمت کرنا ہی ہے۔ انتونی کے نزدیک راہب کا مقصد یہی ہے کہ وہ روزانہ اور لمحہ بہ لمحہ خدا کے حضور کھڑا رہے۔ ایلیاہ یہ نہیں کہتا کہ جس کے سامنے میں کھڑا تھا بلکہ جس کے سامنے مَیں کھڑا ہوں۔ انتونی کے لئے اِس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ "وہ روزانہ جوش سے اپنے آپ کو یوں پیش کرنے میں لگا رہا کہ خدا کو لائق نظر آئے۔" کس طرح ؟ "دل میں پاک صاف اور خدا ہی کی مرضی کے تابع رہنے کے لئے تیار ہونے میں۔" اِس میں ایلیاہ کا نمونہ مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ "وہ کہا کرتا تھا کہ عظیم نبی ایلیاہ کے چال چلن کا ملاحظہ کرنے سے راہب کو اُس کی اپنی ذاتی زندگی اُسی طرح نظر آنی چاہئے جس طرح آئینے میں دیکھنے سے۔"[7]

قبر میں شیاطین پر فتح

اِس طریقے سے اپنے آپ پر قابو پانے[b] کے بعد انتونی گاؤں سے دُور کچھ قبروں کے پاس گیا۔ ایک جاننے والے کو یہ بتا کر کہ کچھ دنوں کے بعد واپس آ کر مجھے روٹی پہنچائیں وہ ایک قبر میں داخل ہوا، اور دوست نے باہر سے دروازے کو بند کر دیا۔ مصنف کے مطابق قبر میں شیاطین کا غول اُس پر ٹوٹ پڑا، اور وہ اِتنا سخت زخمی ہوا کہ فرش پر گر کر شدید درد کے باعث بول بھی نہ سکا۔ لیکن خدا کی مرضی تھی کہ انتونی کا دوست اگلے

---

[a] ۱۔سلاطین 15:18

[b] συσφίγγω (sysphingō)

دن روٹی کھلانے کے لئے پہنچے۔ جب دروازے کو کھولا تو راہب کو مُردہ سی حالت میں زمین پر پڑا دیکھا۔

دوست اُسے اُٹھا کر گاؤں کے گرجا گھر میں لایا۔ یہ سن کر اُس کے رشتے دار اور گاؤں کے دیگر باشندے جمع ہوئے ''جس طرح مُردے کے پاس۔'' لیکن آدھی رات انتونی ہوش میں آ گیا۔ سب سوئے ہوئے تھے سوائے دوست کے۔ اُسے پاس آنے کا اشارہ دے کر انتونی نے درخواست کی، ''کسی کو نہ جگائیں بلکہ مجھے اُٹھا کر دوبارہ قبروں کے پاس لے جائیں۔''[8] دوست نے اُسے دوبارہ قبر میں پہنچا کر دروازے کو بند کر دیا۔

سوال ہے کہ وہ کیوں واپس جاتا ہے؟ اِس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟ مصنف اِس کا جواب دیتا ہے، ''وہ زخموں کے سبب سے کھڑا نہ ہو سکا بلکہ زمین پر لیٹ کر دعا کرنے لگا۔ اور دعا کرنے پر وہ بلند آواز سے بول اُٹھا، 'مَیں، انتونی، حاضر ہوں۔ مَیں تمہارے ضربوں سے نہیں بھاگتا، کیونکہ اگر تم مجھے مزید بھی مارو کوٹو لیکن کوئی بھی چیز مجھے مسیح کی محبت سے جُدا نہیں کرے گی۔'[a] اور اُس نے زبور گایا، 'گو فوج مجھے گھیر لے میرا دل خوف نہیں کھائے گا'۔''[b] اِن الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتونی اپنے آپ کو روحانی میدانِ جنگ میں کھڑا فوجی سمجھتا تھا۔ جس طرح سورما لڑائی ہوتے وقت پیچھے نہیں ہٹتا اُسی طرح انتونی جانتا ہے کہ روحانی فتح صرف قائم رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس کے خاص ہتھیار بھی نوٹ کریں۔ اول، وہ دعا کرتا ہے اور دوسرے، وہ دشمن کے خلاف کلام کے حوالجات تیر کی طرح چلاتا ہے۔[c]

تب شیاطین کا غول مختلف خطرناک جانوروں کی صورت میں اُس پر جھپٹ پڑے۔ ''رات کے وقت اُنہوں نے اِتنا شور مچایا کہ لگ رہا تھا کہ پورا مقام زلزلے سے ہل رہا ہے اور کہ شیاطین قبر کی چار دیواروں کو توڑ کر جانوروں اور رینگنے والے جان داروں

---

[a] رومیوں 35:8

[b] زبور 3:27

[c] دیکھئے حیاتِ انتونی، 16-54، جہاں انتونی لمبی تقریر میں ابلیس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کے طریقے تفصیل سے پیش کرتا ہے۔

کی صورت میں داخل ہو رہے ہیں۔'' انتونی کو اُن سے مارا اور چھیدا گیا، اور اُس نے جسم میں شدید ترین درد محسوس کیا۔ لیکن اُس کی روح نہ ہلی بلکہ وہ بیدار حالت میں لیٹے ہوئے جسم کی تکلیف کے باعث کراہتا رہا۔ لیکن وہ ہوش میں رہا اور اُن کا مذاق اُڑا کر بول اُٹھا، ''اگر تم میں طاقت ہوتی تو کافی ہوتا اگر تم میں سے ایک آتا۔ لیکن چونکہ خداوند نے تمھیں کمزور کر دیا ہے اِس لئے تم مجھے غول کی صورت میں ڈرانا چاہتے ہو۔ تمہاری کمزوری اِس سے ثابت ہوتی ہے کہ تم نے جانوروں کی صورت اپنائی ہے۔'' یہ بھی اُس نے فرمایا، ''اگر تم قابل ہو اور میرے خلاف لڑنے کی طاقت مل گئی ہو تو حملہ کرنے میں دیر مت کرو۔ لیکن اگر تم ناقابل ہو تو مجھے فضول تکلیف کیوں دے رہے ہو؟ کیونکہ ہمارے خدا پر ایمان ہمارے لئے مہر اور محفوظ چاردیواری ہے۔''[9]

قاری دھیان دیں کہ انتونی اپنی طاقت پر فخر نہیں کرتا بلکہ اِس پر بھروسا رکھتا ہے کہ خدا ہی میرا قلعہ ہے، اُس میں ہم ابلیس پر فتح پا چکے ہیں۔ اور لکھا ہے، ''خداوند انتونی کا مقابلہ نہیں بھولا تھا بلکہ مدد کے لئے حاضر رہا۔ انتونی کو چھت کھلی ہوئی نظر آئی، اور روشنی کی کرن اُس پر نازل ہوئی۔ شیاطین اچانک اوجھل ہو گئے، جسم کی اذیّت جاتی رہی اور قبر کی دیواریں دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر قائم ہوئیں۔'' انتونی نے یہ سہارا محسوس کیا، اور درد سے آزاد ہو کر وہ تازہ دم ہوا۔ تب اُس نے خدا سے پوچھا، ''تُو کہاں تھا؟ تُو شروع میں ظاہر کیوں نہ ہوا تاکہ میری اذیّت کو ختم کرے؟'' خدا نے جواب دیا، ''اے انتونی، میَں حاضر تو تھا لیکن میں تیرا مقابلہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور چونکہ تُو سب کچھ برداشت کر کے ثابت قدم رہا اور شکست نہ کھائی اِس لئے میں ہمیشہ تیرا سہارا بنا رہوں گا، ہاں میں ہر جگہ پر تیرے نام کی شہرت پھیلاؤں گا۔'' یہ سن کر انتونی کھڑا ہو کر دعا کرنے لگا۔ لکھا ہے کہ اُس وقت اُس نے محسوس کیا کہ جسم کی طاقت پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہے۔ اُس کی عمر 35 سال تھی۔[10]

پہاڑی قلعے میں الٰہی جلال کا حصول

انتونی اِس فتح سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اب فیصلہ کیا کہ مَیں ریگستان میں جا کر ابلیس کا مقابلہ کروں گا۔ اِس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟ جو مصر سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ مصر میں بارش کی شدید کمی ہے۔ لٰہذا پورا مصر ریگستان ہے سوائے اُن جگھوں کے جنہیں دریائے نیل سے پانی ملتا ہے۔ جہاں پانی نہیں پہنچتا وہاں فوراً ریگستان شروع ہوتا ہے۔ مسافر ایک لمحہ ہرے بھرے کھیت میں اور اگلا لمحہ جھُلستی ہوئی ریت پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ قدیم زمانے سے مصریوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ریگستان موت اور شیاطین کا مقام ہے۔اِسی وجہ سے انتونی قدم بہ قدم ریگستان کی طرف بڑھتا گیا۔ گاؤں کے کنارے پر سے وہ قبروں میں بسنے لگا، اور وہاں فتح پا کر وہ ریگستان میں جا پہنچا، اُس جگہ جہاں پانی اور خوراک کی قلت ہے اور جو بدروحوں اور موت کا قلعہ ہے۔ ابلیس نے مختلف قیمتی چیزیں راستے میں رکھنے سے اُسے اِس ارادے سے باز لانے کی کوشش کی، لیکن انتونی مضبوط رہا۔

وہاں ایک ویران و سنسان قلعہ تھا جو فوج نے ترک کیا تھا اور جو جنگلی جانوروں کا بسیرا بن گیا تھا۔ راہب کو دیکھ کر وہ بھاگ گئے۔ جب انتونی نے دیکھا کہ پانی دست یاب ہے تو اُس نے چھ ماہ کے لئے روٹی اپنے ساتھ لے کر داخل ہونے کا راستہ پتھروں سے بند کر دیا اور ''اُس میں یوں اُترا جس طرح مقدّس ترین جگہ میں۔'' وہاں کی تنہائی میں وہ بڑی دیر تک رہا۔ جاننے والے سال میں دو دفعہ اُسے روٹی دیا کرتے تھے۔[11]

دلچسپ بات یہ ہے کہ گو وہ تنہا تھا تاہم لوگ اُس کے قریب آیا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ گو اُس نے اپنے جاننے والوں کو داخل ہونے نہ دیا، لیکن وہ دن رات باہر ٹھہرا کرتے تھے۔ اندر سے ہجوم کا شور مچتا اور گونجتا رہا، قابلِ رحم آوازیں چیختی رہیں کہ ''جو ہمارا ہے اُس سے دُور ہو جا۔ تیرا ریگستان کے ساتھ کیا واسطہ؟ تُو ہمارے حملے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

شروع میں لوگ یہ سن کر سمجھتے تھے کہ کچھ مرد انتونی سے لڑ رہے ہیں، لیکن جب اُنہوں نے سیڑھیوں پر چڑھ کر سوراخ میں سے اندر جھانکا تو کوئی نظر نہ آیا۔ اُنہوں نے انتونی کو آواز دی تو اُس نے قریب آ کر اُنہیں چلے جانے کو کہا۔ ''ڈرو مت، کیونکہ اِس طریقے سے شیاطین بُزدلوں پر اپنے نام نہاد حملے کرتے ہیں۔ صلیب کا نشان بنا کر جرأت سے چلے جائیں اور اِنہیں آپس میں کھیلنے دیں۔'' خود اُسے بدروحوں سے نقصان نہ پہنچا، نہ وہ کبھی مقابلے کے باعث تھک گیا۔ بہت دفعہ اُس کے عزیز اُسے مُردہ حالت میں پانے آتے لیکن اُسے زبور 68:1-2 گاتے ہوئے سنتے،

> اللہ اُٹھے تو اُس کے دشمن تتر بتر ہو جائیں گے، اُس سے نفرت کرنے والے اُس کے سامنے سے بھاگ جائیں گے۔ وہ دھوئیں کی طرح بکھر جائیں گے۔ جس طرح موم آگ کے سامنے پگھل جاتا ہے اُسی طرح بے دین اللہ کے حضور ہلاک ہو جائیں گے۔

اور اِس طرح زبور 118:10،

> تمام اقوام نے مجھے گھیر لیا، لیکن مَیں نے اللہ کا نام لے کر اُنہیں بھگا دیا۔[12]

انتونی اِسی حالت میں اپنے آپ کو تربیت دیتا رہا۔ لیکن بیس سال کے بعد بہت سے لوگ جو جوش میں آ کر اُس کے نمونے پر چلنے کے آرزومند تھے جاننے والوں کے ساتھ دروازے کو زبردستی توڑنے لگے۔ تب انتونی ''یوں نکلا جس طرح مقدّس ترین کمرے

میں سے، الٰہی بھیدوں میں شریک[a] اور خدا سے معمور۔"[b]

قاری دھیان دیں کہ اُسے کس طرح بیان کیا جاتا ہے، کیونکہ قدیم کلیسیا کے ہر راہب کی منزلِ مقصود یہی حالت تھی۔ "اُسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے، کیونکہ اُس کی جسمانی حالت پہلے کی مانند تھی۔ نہ وہ ورزش کئے بغیر آدمی کی طرح موٹا تھا، نہ روزہ رکھنے اور شیاطین سے لڑنے کے باعث دُبلا پتلا۔ وہ بالکل اُسی طرح تھا جس طرح الگ ہونے سے پہلے تھا۔ لیکن اُس کی روح خالص تھی، کیونکہ نہ وہ دُکھ سے سکڑی ہوئی، نہ خوشی سے ڈھیلی، نہ ہنسی یا غم سے دبی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہجوم کو دیکھ کر نہ وہ پریشان تھا نہ اُس نے اِتنے لوگوں کی سلام دعا سے خوشی منائی۔ وہ ہر لحاظ سے سمجھ کی راہنمائی کے تحت متوازن مزاج اور قدرتی حالت میں تھا۔"[13]

اِن الفاظ سے مصنف نہ صرف انتونی کو بیان کرنا چاہتا ہے بلکہ اُس کی تعریف کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ سچے راہب کا کردار کس طرح ہونا چاہئے۔ اِس کے پیچھے وہ حالت ہے جو یونانی لفظ اپاتھیا[c] (جذبات سے آزاد حالت) سے بیان کی جاتی ہے۔ جو شخص اِس کا مالک ہو وہ فرشتوں کی مانند بن گیا ہے، بلکہ وہ خدا کی جذبات سے خالی حالت میں شریک ہو گیا ہے۔[d] اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نیک کام نہ کرے۔ لیکن ایسا شخص سکون سے معمور رہتا ہے، اور کسی بھی کام میں بے چینی کا دخل نہیں ہوتا۔ مذکورہ لفظ سمجھ لوگوس[e] کا ترجمہ ہے یعنی کلام، وہی کلام جو مسیح ہے۔ دیگر الفاظ میں وہ مسیح کی سمجھ کے تحت چلتا ہے۔ اُس کی حالت اِس ناتے سے قدرتی ہے کہ وہ باغِ عدن میں گناہ کرنے سے پہلے آدم اور حوا کی طرح خدا کی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔[14]

---

[a] (mystagōgeō) μυσταγωγέω
[b] (theophoros) θεόφορος
[c] (apatheia) ἀπάθεια
[d] یہ خیال کہ خدا جذبات سے خالی ہے یونانی فلسفوں کا ایک پرانا خیال ہے۔
[e] (logos) λόγος

ہمیں یہ حالت مزید سمجھنے کے لئے کلامِ مقدّس کی گہرائیوں میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلے میں کوہِ سینا خاص اہمیت کا حامل ہے، وہ جگہ جہاں خدا نے اپنا جلال ظاہر کر کے اپنی شریعت موسیٰ کو دی۔ شریعت کو ملنے پر موسیٰ کا چہرہ خدا کا جلال یوں منعکس کرنے لگا کہ دیگر اسرائیلی ڈر کے مارے اُس سے دُور رہے۔[a] لیکن نہ صرف موسیٰ بلکہ ایلیاہ پر بھی خدا کا جلال کوہِ سینا پر ظاہر ہوا۔ ایزبل سے بھاگ کر وہ ریگستان میں سے گزر کر کوہِ سینا پر پہنچا جہاں خدا کے جلال کا اظہار اُس پر ہوا۔[b]

نئے عہدنامے میں بھی ایک واقعہ پیش آتا ہے جو موسیٰ، ایلیاہ اور کوہِ سینا سے تعلق رکھتا ہے۔ متی 17:1-3 میں لکھا ہے،

> چھ دن کے بعد عیسیٰ صرف پطرس، یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ وہاں اُس کی شکل و صورت اُن کے سامنے بدل گئی۔ اُس کا چہرہ سورج کی طرح چمکنے لگا، اور اُس کے کپڑے نور کی مانند سفید ہو گئے۔ اچانک الیاس اور موسیٰ ظاہر ہوئے اور عیسیٰ سے باتیں کرنے لگے۔

گو مذکورہ پہاڑ کوہِ سینا نہیں ہے تاہم واقعے کا سینا پہاڑ سے گہرا تعلق ہے۔ اِس طرف پہلا اشارہ یہ ہے کہ یسوع کی صورت نے موسیٰ کی طرح تبدیل ہو کر خدا کا جلال منعکس کیا۔ دوسرے، وہ کوہِ سینا کے دو خاص نمائندوں موسیٰ اور ایلیاہ سے ہم کلام ہوا۔ اور تیسرے، خدا کا جلال بادل کی صورت میں اُن پر چھا گیا جس میں سے آواز سنائی دی، ”یہ میرا پیارا فرزند ہے، جس سے مَیں خوش ہوں۔ اِس کی سنو۔“[c] غرض مسیح میں کوہِ سینا کے پہلے دو واقعات کا عروج ہے۔ لوقا موسیٰ اور ایلیاہ کے بارے میں ایک دل چسپ بات کا اضافہ کرتا ہے، ”وہ عیسیٰ سے اِس کے بارے میں بات کرنے

[a] خروج 34:29-30
[b] ا۔سلاطین 19
[c] متی 17:5

لگے کہ وہ کس طرح اللہ کا مقصد پورا کر کے یروشلم میں اِس دنیا سے کوچ کر جائے گا۔"[a] یعنی خدا کے جلال کا عروج اِس میں ہے کہ اُس کا پیارا بیٹا صلیب پر چڑھ گیا۔

اب کچھ اشارے ملتے ہیں کہ انتونی کے ذہن میں یہی باتیں تھیں جب وہ ریگستان میں چلا گیا۔ اول، ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ خاص کر ایلیاہ کے نمونے پر چلتا تھا۔ دوسرے، دو بار لکھا ہے کہ وہ پہاڑ کے لئے روانہ ہوا۔ لگتا ہے کہ منزلِ مقصود ایک خاص پہاڑ ہے،[b] لیکن اُس کا نام بیان نہیں کیا جاتا۔ عین ممکن ہے کہ وہ موسیٰ اور خاص کر ایلیاہ کی طرح ریگستان میں سے گزر کر کوہِ سینا جیسے پہاڑ پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اُسے خدا کی قربت اور جلال حاصل ہو۔اور جس طرح ایلیاہ ریگستان میں سے بھاگ کر کوہِ سینا پہنچا اُسی طرح انتونی بھی "بھاگ کر"[c] پہاڑ کے لئے روانہ ہوا۔[15] متن سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ انتونی کو خدا کا خاص جلال مسیح کی صلیبی موت میں نظر آتا ہے۔[16]

جو کچھ انتونی کے قلعے میں سے نکلنے کے بارے میں قلم بند ہوا ہے وہ بھی اِس طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح خدا کے حضور سے نکلنے پر موسیٰ کا چہرہ خدا کے جلال سے چمکنے لگا، اُسی طرح انتونی خدا کا جلال منعکس کرتا تھا۔ جو کچھ اُس کی حالت کے بارے میں لکھا ہے وہ بلاشُبہ مصری سوچ کے نزدیک اِسی جلال کا اظہار ہے۔

اور جس طرح موسیٰ، ایلیاہ، اور مسیح تینوں پہاڑ سے اُتر کر نئے سرے سے خدمت میں لگ گئے اُسی طرح انتونی بھی خدمت میں لگ گیا۔ یعنی اُس کی روحانی ترقی نے اُسے بے حرکت نہ بنایا بلکہ وہ سیدھے لوگوں کی خدمت کرنے لگا۔ "اُس کے ذریعے خداوند نے وہاں موجود بہتوں کو بیماریوں سے شفا دی اور دوسروں کو بدروحوں سے پاک صاف کر دیا۔ اُس نے انتونی کو بولنے کا خاص فضل بھی دیا۔ بہتوں کو جو غمگین تھے اُس نے تسلی دی، اور جن کے درمیان اَن بن تھی اُنہیں اُس نے یگانگت بخشی، سب کو یہ سمجھاتے ہوئے کہ مسیح کی محبت کو دنیا کی ہر چیز پر ترجیح دینا ہے۔ نیز، اُس

[a] لوقا 31:9
[b] ὁ ὄρος (ho oros)
[c] ὁρμάω (hormaō)

نے اُنہیں نصیحت دے کر مشورہ دیا کہ آنے والی اچھی چیزیں اور خدا کی ہم سے شفقت یاد کرو جس نے 'اپنے فرزند کو بھی دریغ نہ کیا بلکہ اُسے ہم سب کے لئے دشمن کے حوالے کر دیا۔' [a17]

جو کچھ انتونی کے ساتھ ہوا وہ تاریخی کتابوں میں دیگر بہت سے راہبوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ جتنے وہ دوسروں سے الگ ہوتے اُتنا ہی عام لوگ مشورہ لینے، صلح کرانے اور نصیحت پانے کے لئے اُن کے پیچھے پڑتے۔ چونکہ راہب دوسروں اور خاص کر اختیار والوں کی پروا نہیں کرتے تھے اِس لئے وہ منصفانہ فیصلے بھی صادر کر سکتے تھے۔ لوگ شفا پانے اور بدروحوں سے آزاد ہونے کے لئے بھی اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔

انتونی کی خدمت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار لوگ ریگستان میں راہب بن کر اُس کے نمونے پر چلنے لگے۔ اِن راہبوں کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا بلکہ وہ اکثر چھوٹے گروہوں کی صورت میں رہتے تھے۔ اکثر اُن میں سے ایک استاد تھا جو "ابا" (باپ) کہلاتا تھا۔[18] تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ سلسلہ انتونی سے شروع نہ ہوا، گو اُس کے نمونے سے بے شک اِس میں بہت اضافہ ہوا۔ مصنف فرماتا ہے، "اُس وقت سے پہاڑوں میں راہبوں کے گروہ رہے، اور راہبوں نے ریگستان کو شہر میں تبدیل کر دیا۔"[19]

راہب کی شہادت

311ء کی ایذارسانی میں جب بہت مسیحی شہید ہونے لگے تو انتونی اسکندریہ گیا "تاکہ اگر بلایا جائے تو مقابلے میں حصہ لے اور اگر نہ تو اُن کا مشاہدہ کرے جو مقابلے میں شریک ہیں۔" اُس نے علانیہ طور پر جیلوں اور کانوں میں ڈالے ہوئے مسیحیوں کی خدمت کی، ہاں عدالت میں اور شہادت تک اُس نے اپنے لوگوں کا ساتھ دیا۔ جب جج

---

[a] رومیوں 8:32

نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھا تو اُس نے اعلان کیا کہ راہب عدالت بلکہ شہر سے دُور رہیں۔ لیکن انتونی معمول کے مطابق حاضر ہوا اور ایسی جگہ پر کھڑا ہوا جہاں وہ جج اور گورنر کو صاف نظر آیا۔ حقیقت میں وہ شہید بننا چاہتا تھا، لیکن جانتا تھا کہ جان بوجھ کر شہادت کی تلاش میں رہنا غلط ہے۔[20]

جب ایذا رسانی ختم ہوئی تو اُسے بڑا دُکھ ہوا کہ مَیں شہید ہونے کے لائق نہ ٹھہرا۔ وہ پہلے کی طرح ریگستان میں چلا گیا اور "وہاں روزانہ اپنے ضمیر سے شہید ہوتا اور ایمان کے مقابلوں میں لڑتا رہا۔" یہ بیان اہم ہے، کیونکہ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتونی کے نزدیک راہب ایک طرح کا شہید ہے، کہ وہ روزانہ شہید کی زندگی گزارتا ہے۔ شروع میں شہیدوں کو روحانی کھلاڑی اور فوجی سمجھا جاتا تھا، اور اب راہب انتونی اپنے آپ کو یہی کچھ سمجھتا ہے۔ جب تھوڑے سالوں کے بعد رومی بادشاہ مسیحی بن گیا اور ایذا رسانیاں ختم ہوئیں تو راہب شہیدوں کے جانشین بن گئے۔ اِس کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ کبھی نہیں نہاتے تھے۔ انتونی کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ کبھی بھی نہیں نہاتا تھا۔ وہ اپنے پاؤں تک نہیں دھوتا اور اُنہیں صرف مجبوری کے تحت پانی میں ڈالتا تھا۔[21]

اندرونی پہاڑ

انتونی کی شہرت اِتنی بڑھ گئی کہ اُس کا سکون ہجوم کے باعث جاتا رہا۔ ایک دن اُس نے اِن سے تنگ آ کر شمال میں جانے کا منصوبہ باندھ لیا۔ لیکن جب وہ کسی کشتی کے انتظار میں دریائے نیل کے کنارے پر بیٹھ گیا تو "اوپر کی ایک آواز" نے اُس سے پوچھا، "اے انتونی، تُو کدھر جا رہا ہے؟ اور وجہ کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا،

''ہجوم ہونے نہیں دیتے کہ مَیں سکون کی زندگی گزاروں،[a] اِس لئے مَیں شمالی تھیبئید[b] جانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہاں بہت سی باتیں مجھے تنگ کر رہی ہیں، خاص کر یہ کہ وہ مجھ سے ایسے کاموں کا تقاضا کر رہے ہیں جو میرے بس کی بات نہیں۔''[22] انتونی نے ایک روحانی حقیقت پہچان لی جس سے ہم بہت دفعہ محروم رہتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ جب ہماری اندرونی حالت بگڑ جائے تو ہم فتح مند زندگی نہیں گزار سکتے، گو ہم سے کتنے عظیم کام کیوں نہ سرزد ہوں۔

تب الٰہی آواز نے اُسے حکم دیا کہ یہاں سے گزرنے والے بدوؤں کی راہنمائی میں ''اندرونی پہاڑ'' کے لئے روانہ ہو جا۔ یہ بات ایلیاہ کی یاد دلاتی ہے جو ایزبل اور حالات کے باعث مایوس ہو کر کوہِ سینا کے لئے روانہ ہوا۔ کوہِ سینا کی جو حالت انتونی کو پہاڑی قلعے میں حاصل ہوئی تھی وہ لوگوں کے شور شرابہ سے گم ہو گئی تھی، اِس لئے وہ ایک بار پھر سینا کی تلاش میں نکلا۔ تین دن سفر کرتے کرتے انتونی ایک پہاڑ کے پاس پہنچا جس کے پاس پانی اور کھجور کے دو چار درخت دست یاب تھے۔ اُس وقت سے وہ وہاں ٹک گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہاڑ بحیرۂ احمر کے قریب تھا۔

تاہم انتونی کی زندگی نہایت مصروف رہی۔ اُس نے کچھ زمین کی کھیتی باڑی کی تاکہ دوسروں کے لئے بوجھ نہ بنے۔ کیونکہ اُس کے شاگرد اُس کے بارے میں سن کر اُسے خوراک پہنچانے لگے۔ اثناسیُس لکھتا ہے کہ وہاں اُس کے شیاطین کے ساتھ سخت مقابلے ہوتے رہے۔ لیکن نہ صرف یہ، دوسرے راہب اُس سے سیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے، اور اُس کے کئی ایک سفروں کا بھی ذکر ہے۔ وہ خاص کر اپنی پرانی جگہ کے پاس جایا کرتا تھا۔ اُسے مصنف ''بیرونی پہاڑ'' کہتا ہے۔ جب ضرورت تھی تو انتونی اسکندریہ بھی جا پایا۔

---

[a] ἠρεμέω (ēremeō)
[b] Thebaid

معجزے

مصنف چند ایک معجزوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو انتونی کے ذریعے سرزد ہوئے۔ مثلاً ایک لڑکی کو شفا مل گئی جس کی آنکھوں، ناک اور کانوں سے کیڑوں سے بھرا ہوا بلغم نکلتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مفلوج بھی تھی۔ لیکن مصنف اِس پر زور دیتا ہے کہ انتونی نے جادو منتر استعمال نہ کیا بلکہ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مَیں خود کچھ بھی نہیں ہوں بلکہ خدا ہی شفا دینے والا ہے۔[23] ”بہر حال انتونی نے حکم دینے سے شفا نہ دی بلکہ دعا کرنے اور مسیح کا نام پکارنے سے۔ چنانچہ سب پر ظاہر تھا کہ وہ خود یہ کام نہیں کرتا تھا بلکہ خداوند جو اپنے وسائل سے رحم کا اظہار کر کے دُکھ اُٹھانے والوں کو شفا دیتا تھا۔ انتونی کا حصہ صرف اور صرف دعا اور نظم و ضبط[a] تھا جس کی خاطر وہ پہاڑ پر رہا۔ کیونکہ الٰہی باتوں کا مراقبہ کرنے سے وہ خوشی مناتا تھا جبکہ جب ہجوم اُسے 'بیرونی پہاڑ' کے پاس گھسیٹ کر تنگ کرتے تھے تو وہ غم کھاتا تھا۔“[24]

رویائیں اور پیش گوئیاں

انتونی کے ذریعے کئی لوگوں سے بدروحیں نکالی گئیں۔[25] مصنف کئی بار اِس کا ذکر کرتا ہے کہ انتونی رویا بھی دیکھتا[26] اور نبوّت بھی کرتا تھا،[27] یہاں تک کہ اُس نے اپنی موت کی پیش گوئی بھی کی۔[28]

کئی موقعوں پر انتونی کی اِس نعمت سے حکومت بھی متاثر ہوئی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک رومی افسر اثناسیُس کے حامیوں کو ستانے لگا۔ یہ سن کر انتونی نے اُسے خط بھیج کر آگاہ کیا کہ تجھ پر غضب نازل ہونے والا ہے۔ افسر نے خط کو زمین پر پھینک کر اُس پر تھوکا، پھر انتونی کو گرفتار کرنے کے لئے نکلا۔ لیکن راستے میں اُس کے ساتھی کے گھوڑے نے اُس پر حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ تین دن کے بعد افسر مر گیا۔[29]

---

[a] ἄσκησις (askēsis)

انتونی کا شاگرد سراپیون[a] ایک رویا کا ذکر کرتا ہے جس میں انتونی نے عشائے ربانی کی میز کو خچروں سے گھری ہوئی دیکھی۔ خچر میز کو لات مار رہے تھے۔ اُس نے رویا سے یہ مطلب اخذ کیا کہ خدا کا غضب کلیسیا پر نازل ہو گا۔ خچر آریُس کے بدعتی پیروکار ہیں جو ناسمجھ جانوروں کی طرح کلیسیا کی توہین کریں گے۔ لیکن انتونی نے یہ پیش گوئی بھی کی کہ خداوند بعد میں کلیسیا کو شفا دے گا۔ یہ واقعہ دو سال کے بعد سرانجام ہوا۔[30]

اَن پڑھ کی حکمت

انتونی اَن پڑھ تھا، بلکہ وہ یونانی بھی نہیں بولتا تھا۔ ایک بار کچھ فلاسفر اُس سے بحث مباحثہ کرنے آئے۔ جب وہ صلیب کا مذاق کرنے لگے تو اُس نے جواب میں کہا کہ کیا بہتر ہے، صلیب کا اقرار کرنا یا یہ دعویٰ کہ دیوتا زناکار تھے؟[31] اُس نے اُنہیں ڈانٹا کہ وہ خالق کے بجائے مخلوق کی پرستش کرتے ہیں، اور کہ وہ زبان کی فصاحت کو حکمت سمجھتے ہیں۔

مزید بہت باتوں کے بعد اُس نے بدروحوں سے دبے ہوئے کچھ لوگ پیش کر کے اُنہیں کہا کہ وہ اپنے بحث مباحثہ یا اپنے مذہبی طریقوں سے یہ بدروحیں نکالیں۔ "اگر آپ یہ نہیں کر پاتے تو ہمارے ساتھ جھگڑنے سے باز آئیں۔ تب آپ صلیب کی قوت دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے مسیح کا نام پکار کر دو چار دفعہ اُن کے اوپر صلیب کا نشان بنایا تو فوراً بحال ہوئے۔[32] مصنف اِس سے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ انتونی کو تعلیم کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اُس کا ذہن خدا سے روشن ہوا تھا۔

اِس دانائی کے باعث عدالتیں بھی انتونی کی طرف رجوع کیا کرتی تھیں۔ اُس کے انکار پر وہ اپنے قیدی اُس کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ غالباً اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ طرف داری نہیں دکھاتا تھا۔ البتہ اُس سے مدد لینا اُن کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا، "کیونکہ اُس کا اُن کے لئے مشورہ یہ تھا کہ وہ انصاف کو ہر دیگر چیز پر ترجیح دیں، کہ وہ خدا کا

---

[a] Serapion of Thmuis

خوف رکھتے ہوئے یہ جان لیں کہ جتنی سختی سے وہ دوسروں کا فیصلہ کریں اُتنی سختی سے اُن کا بھی فیصلہ کیا جائے گا۔"a33

نہ صرف عدالتیں اُس سے مشورہ لیتے تھے بلکہ بادشاہ بھی۔ قسطنطین اور اُس کے دونوں بیٹوں نے بھی اُسے خط لکھے۔ خط ملنے پر انتونی کا ردِعمل اُس زمانے کی نظر سے غیرمعمولی تھا جو بادشاہ کو دیوتا سا سمجھتا تھا۔ اُس نے فرمایا، "تعجب نہ کریں اگر بادشاہ ہمیں خط لکھے، وہ تو انسان ہی ہے۔ اِس کے بجائے تعجب کریں کہ خدا نے انسان کے لئے شریعت قلم بند کی اور کہ وہ اپنے بیٹے سے ہم سے ہم کلام ہوا ہے۔" کافی دیر تک اُس نے جواب دینے سے انکار کیا، لیکن شاگردوں کے اصرار پر اُس نے خط لکھوا کر اُنہیں مسیحی ہونے کی بنا پر منظور کیا اور نجات کے بارے میں کچھ باتیں لکھیں۔ لیکن اُس نے اُن کی خوش آمد نہ کی بلکہ لکھا کہ "موجودہ دور کا زیادہ خیال مت کرنا بلکہ آنے والی عدالت کو ذہن میں رکھیں۔ جان لیں کہ مسیح ہی حقیقی اور ابدی بادشاہ ہے۔" اُس نے اُن سے منت کی کہ دوسروں کی فکر کرتے ہوئے انصاف اور ضرورت مندوں پر دھیان دیں۔34

وفات

انتونی 105 سال کی عمر میں کوچ کر گیا۔ "حیاتِ انتونی" کے مطابق وہ پہلے سے اِس بات سے آگاہ تھا، لہٰذا اُس نے ایک الوداعی تقریر بیرونی پہاڑ پر اور دوسری تقریر اندرونی پہاڑ پر پیش کی۔ اِن میں اُس نے نظم و ضبط اور خیالات کی پہرہ داری پر زور دیا۔ نیز، اُس نے اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کی کہ کلیسیا سے الگ فرقوں اور بدعتوں سے کتراؤ۔

انتونی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ میری لاش کو مصری رواج کے مطابق مسالا لگا کر محفوظ رکھیں۔ اُس نے اِس خطرے کا اندازہ لگایا ہو گا کہ موت کے بعد لوگ میری لاش کو غلط

---

[a] متی 2:7

استعمال کرکے پیر و فقیر کا مرکز بنا دیں گے۔ اِس لئے اُس نے دو شاگردوں کو حکم دیا کہ میری لاش کو کسی نامعلوم جگہ پر چھپا کر دفن کریں تاکہ کوئی بھی میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنا سکے۔[35]

وفات پاتے وقت اُس نے فرمایا کہ اثناسیُس کو بھیڑ کی میری ایک کھال دینی ہے۔ جو چادر اُنہوں نے مجھے نئی حالت میں دی تھی، جس پر میں لیٹا رہا اور جو میرے ساتھ پرانی ہو گئی ہے وہ بھی اُنہیں ملنی ہے۔ بھیڑ کی دوسری کھال میرے شاگرد سراپیون کو دیا جائے۔ بالوں کا لباس اپنے پاس رکھیں۔[36]

اِن ہدایات کا کیا مقصد تھا؟ کیا پسِ پردہ اِن میں پیر و فقیروں کے طور طریقے پائے جاتے ہیں؟ کیا انتونی چاہتا ہے کہ لوگ بعد میں اِن لباسوں کا احترام کریں؟ ہرگز نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس کا بڑا نمونہ ایلیاہ تھا۔ اُس کی موت کا بھی ایلیاہ کی طرف اشارہ ہے۔

ایلیاہ کے اُٹھا لئے جانے سے پہلے اُس کا شاگرد الیشع گزارش کرتا ہے کہ "مجھے آپ کی روح کا دُگنا حصہ میراث میں ملے۔"[a] اِس سے کیا مراد ہے؟ الیشع پہلوٹھے کا حصہ مانگتا ہے جو دوسرے وارثوں کی نسبت دُگنا ہوتا ہے۔ ایلیاہ کے اُٹھا لئے جانے کے بعد الیشع کو واقعی یہ اختیار ملتا ہے، اور اِس کا نشان ایلیاہ کی چادر ہے جو زمین پر گر کر پیچھے رہ گئی ہے۔ اب الیشع اِسی کے ذریعے دریائے یردن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پار کرتا ہے جس طرح ایلیاہ پہلے کر چکا تھا۔

اب دل چسپ بات یہ ہے کہ جہاں مذکورہ ترجمے میں "چادر" کا ذکر ہے وہاں یونانی ترجمے بنام ہفتادہ میں "بھیڑ کی کھال"[b] لکھی ہے۔ یعنی یونانی مترجم نے تصور کیا کہ یہ کپڑا بھیڑ کی کھال سے بنا ہوا تھا۔ مصر میں لوگ اِسی ترجمے سے واقف تھے، لہٰذا ہر ایک کو فوراً معلوم تھا کہ انتونی کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے کپڑے بانٹنے سے اپنی

---

[a] ۲۔سلاطین 9:2

[b] μηλωτή (mēlōtē)

روح میراث میں بانٹ رہا ہے۔ اور اِس میں مختلف درجے بھی نظر آتے ہیں۔ پہلے درجے پر مصر کا بشپ اثناسیُس ہے جسے کھال اور چادر دونوں ہی ملتی ہیں۔ دوسرے درجے پر سراپیون ہے جسے صرف کھال ملتی ہے۔ اور تیسرے درجے پر دفنانے والے دونوں شاگرد ہیں جنہیں بالوں کا لباس ملتا ہے۔ نیز، اِس میں نہ صرف اختیار کا پہلو ہے۔ اپنی روح اُنہیں سونپنے سے انتونی چاہتا ہے کہ جو کام مَیں نے شروع کیا ہے وہ آپ کو جاری رکھنا ہے۔ آپ ہی میرے روحانی وارث ہیں۔

تب انتونی نے فرمایا، ''میرے بچے، خدا حافظ، کیونکہ انتونی کوچ کر جا رہا ہے اور آئندہ آپ کے پاس نہیں ہوگا۔'' اُس کے شاگردوں نے اُسے گلا لگا دیا، اور پھر وہ سکون کے ساتھ انتقال کر گیا، ''یوں جس طرح اپنے دوستوں کو آتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو گیا ہے۔''[37] اثناسیُس اِس کا ذکر کرتا ہے کہ وفات پاتے وقت نہ انتونی کی نظر کمزور ہو گئی تھی، نہ اُس کے دانت خراب تھے، بلکہ اُس کی جسمانی طاقت بھی قائم رہی تھی۔ خواہ یہ بات درست ہو یا نہ ہو، لیکن اہم بات یہ ہے کہ مصنف اِس بیان سے موسیٰ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جس کے بارے میں لکھا ہے کہ آخر تک نہ اُس کی آنکھیں دُھندلائیں، نہ اُس کی طاقت کم ہوئی۔[a] بلکہ وہ بھی بہت عمر رسیدہ ہوا اور نامعلوم جگہ پر دفن ہوا۔ اثناسیُس دکھانا چاہتا ہے کہ انتونی زندگی کے آخری دم تک اپنے بڑے نمونوں موسیٰ، ایلیاہ اور یسوع پر چلتا رہا۔

اثناسیُس انتونی کا اثر اِن الفاظ سے بیان کرتا ہے، ''ایسا تھا جیسا خدا نے اُس کے کردار میں مصر کو ڈاکٹر عطا کیا تھا۔'' گو درجِ بالا کی ہر بات ثابت نہیں ہو سکتی لیکن اہم بات یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے لاتعداد افراد اِس نمونے پر چل پڑے۔

---

[a] استثنا 34:6-7

پخومیُس : خانقاہ کا پہل کار

انتونی اُن راہبوں کا بے مثال نمونہ ہے جو سب سے الگ رہ کر زندگی گزارتے تھے، گو عجب یہ ہے کہ اِس تنہائی کے باوجود اُس کا معاشرے پر گہرا اثر پڑ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں بھی وہ رہتا تھا اُس کے شاگرد دُور نہیں تھے۔[a]

اب ہم اُن راہبوں کی طرف رجوع کریں گے جو گروہ کی صورت میں رہنا پسند کرتے تھے۔[b] اِن کا پہلا مشہور نمائندہ پخومیُس تھا۔[38] گو تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ وہ خانقاہ کے انتظام کا بانی نہیں تھا لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تحریک کی ابتدا میں ایک خاص راہنما تھا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ انتظام چلانے کا ماہر ثابت ہوا، کیونکہ وفات پاتے وقت وہ مردوں کی نو خانقاہوں اور عورتوں کی دو خانقاہوں کا سربراہ تھا۔ اُن میں ہزاروں راہب رہتے تھے۔ اِن راہبوں کے قواعد دیگر کئی خانقاہوں کے لئے نمونہ بن گئے۔ ایشیائے کوچک کے باسیل از قیصریہ اور مغرب کے بینڈِکت نے اِن سے خاص فائدہ اُٹھایا۔

خانقاہ تک کا سفر

راہبانہ زندگی کے پہلے قدم

روایات کے مطابق پخومیُس 292ء میں جنوبی مصر میں پیدا ہوا۔ اُس کے والدین بت پرست تھے۔ 312ء میں اُس کی رومی فوج میں جبری بھرتی ہوئی۔ پہلے ایام میں اُسے دیگر نئے سپاہیوں کے ساتھ جیل میں ڈالا گیا۔ اِس پریشان کن، بھوکی اور خوف زدہ حالت میں کچھ مقامی لوگوں نے جیل میں آ کر اُنہیں کھانے پینے کی چیزیں مہیا کیں۔ اُس نے پوچھا، ”یہ لوگ ہمارے ساتھ اِتنا اچھا سلوک کیوں کر رہے ہیں گو وہ ہم سے

[a] انتونی کا یہ طرزِ زندگی anachoritic کہلاتا ہے۔ جس یونانی لفظ سے یہ نکلا ہے اُس کا مطلب ”چلا جانا، پیچھے ہٹنا، الگ ہو جانا“ ہے۔

[b] یہ طرزِ زندگی cenobitic کہلاتا ہے۔ اِس میں یونانی زبان کے دو الفاظ koinos یعنی مشترکہ اور bios یعنی زندگی جُڑے ہوئے ہیں۔

ناواقف ہیں؟" دوسروں نے جواب دیا، "یہ مسیحی ہیں۔" محبت کے اِس اظہار سے پخومیُس بہت متاثر ہوا۔ ایک سال کے بعد جب فوج سے فارغ ہو پایا تو وہ جنوبی مصر واپس گیا۔ 313ء میں اُس نے بپتسمہ لیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ راہب بن گیا۔

پخومیُس ایک مقامی راہب کا شاگرد بن گیا۔ اُس کی زندگی سخت تھی: کوشش یہ تھی کہ کم از کم رات کا آدھا حصہ جاگتی حالت میں گزارے، اگر ممکن ہو تو پوری رات۔ موسمِ گرما میں وہ کھانا روزانہ ایک بار اور موسمِ سرما میں دو دن کے بعد ہی ایک دفعہ کھاتا تھا۔ روٹی اور نمک کے علاوہ وہ کچھ نہیں کھاتا تھا۔

خانقاہ کی رویا

سات سال تک پخومیُس ایسی زندگی گزارنے پر مطمئن تھا۔ لیکن پھر وہ خانقاہ کے انتظام کی طرف مائل ہونے لگا۔ ایک دن جب ایک متروک گاؤں بنام تبنّیسی[a] کے قریب لکڑی چن رہا تھا تو ایک آواز سنائی دی، "اے پخومیُس، پخومیُس، جد و جہد کے ساتھ اِس جگہ ٹھہر کر خانقاہ بنا دے۔ کیونکہ بہت سے لوگ تیرے پاس آئیں گے تاکہ تیرے ساتھ راہب بنیں۔" یہ سن کر وہ اپنے استاد کے ساتھ اِس گاؤں میں شفٹ ہوا، لیکن استاد تھوڑی دیر کے بعد انتقال کر گیا۔ اُن ایام میں اُس کا بڑا بھائی یوحنا اُس کے پاس آ کر راہب بن گیا۔

تب پخومیُس کو ایک نیا مکاشفہ ملا۔ ایک رات کو ایک فرشتے نے اُسے تین بار بتایا، "اے پخومیُس، پخومیُس، خداوند کی مرضی یہ ہے کہ تُو بنی انسان کی خدمت کر کے اُنہیں اُس کے ساتھ ملائے۔" اِس میں پخومیُس اور انتونی میں فرق نظر آتا ہے۔ اُسے اپنی خدمت کے وسیلے سے انسان کو خدا کے ساتھ ملانا ہے۔ اب پخومیُس اپنی رویا اور راہبوں کی تعداد کے سبب سے سنجیدگی سے خانقاہ کو بڑھانے لگا۔ اُس کا بھائی متفق نہیں تھا، لیکن کچھ دیر کے بعد وہ فوت ہوا۔

Tabennisi[a]

جلد ہی سَو سے زیادہ راہب اِس مشترکہ زندگی میں شامل ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق شروع میں پخومِیُس کی کوششیں ناکام رہیں۔ اُس وقت سب متفق ہو گئے تھے کہ ہر راہب خود مختار رہے گا لیکن پخومِیُس کو پیسے دے گا تاکہ وہ کھانے پینے اور باقی ضروریات اِن سے پوری کر سکے۔ لیکن وہ اُسے نوکر سمجھنے لگے۔ کافی دیر تک وہ اُن کا بُرا سلوک برداشت کرتا رہا، لیکن جب وہ مشترکہ عبادتوں کو چھوڑنے لگے تو اُس نے اُنہیں بھگا دیا جو سنجیدہ نہیں تھے۔ شاید اِسی تلخ تجربے کے باعث اُس نے خانقاہ کا انتظام تبدیل کیا۔ اب سے تمام ملکیت مشترکہ تھی۔

پخومِیُس کے ذہن میں ابتدائی کلیسیا کی وہ مشترکہ حالت تھی، جو اعمال 2:44-47 میں قلم بند ہے،

> جو بھی ایمان لاتے تھے وہ ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ اُن کی ہر چیز مشترکہ ہوتی تھی۔ اپنی ملکیت اور مال فروخت کر کے اُنہوں نے ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا۔ روزانہ وہ یک دلی سے بیت المقدس میں جمع ہوتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ مسیح کی یاد میں اپنے گھروں میں روٹی توڑتے، بڑی خوشی اور سادگی سے رفاقتی کھانا کھاتے اور اللہ کی تمجید کرتے رہے۔

بمقابلہ اعمال 4:32،

> ایمانداروں کی پوری جماعت یک دل تھی۔ کسی نے بھی اپنی ملکیت کی کسی چیز کے بارے میں نہیں کہا کہ یہ میری ہے بلکہ اُن کی ہر چیز مشترکہ تھی۔

اب سے یہ راہبانہ برادری مزید تیزی سے پھیلنے لگی، اور گاؤں میں گرجا گھر بنانے کے بعد راہبوں نے اپنی زمین پر بھی چرچ تعمیر کیا۔ اُس وقت پخومِیُس کی بہن مریم

اُس کے پاس آئی، اور اُس نے اُس کے لئے بھی خانقاہ بنوائی۔ جلد ہی دوسری خواتین اِس میں شامل ہوئیں۔

329ء سے مزید خانقاہیں بنائی گئیں، اور اُس کے جیتے جی مردوں کی 9 اور عورتوں کی 2 خانقاہیں قائم ہوئیں۔ اِس تنظیم کو اُس نے "رفاقت"[a] کا نام دیا۔ یہ لفظ بھی ابتدائی کلیسیا کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔[b] ایک قابلِ اعتبار روایت کے مطابق پخومِیُس کے جیتے جی اِس تنظیم کے 3000 راہب تھے جبکہ صدی کے آخر تک یہ تعداد 7000 تک بڑھ گئی تھی۔[39]

گو پخومِیُس خانقاہ کے انتظام کا بانی نہیں تھا، لیکن وہ خانقاہوں کی ایسی مضبوط اور با ترتیب تنظیم قائم کرنے میں بے مثال تھا۔ اِسی لئے وہ اِتنا کام یاب تھا۔

پخومیُس کی غیرمعمولی بصیرت

روایات کے مطابق پخومِیُس غیرمعمولی بصیرت کا حامل تھا۔ وہ حالات اور لوگوں کے پیچھے کی اَن دیکھی حقیقتیں پہچان سکتا تھا گو خود وہ اپنی اِس نعمت پر فخر نہیں کرتا تھا۔ یہ بات پرکھنے کے لئے اُسے ایک دفعہ کلیسیائی مجلس میں بلایا گیا۔ لوگوں کو یہ نعمت مشکوک لگتی تھی، اور بشپوں نے اُس سے جواب دہی کا تقاضا کیا۔

حواب میں پخومِیُس نے اپنی روحانی ترقی اور اپنی خانقاہوں کی کام یابی کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کا موقف یہ تھا کہ بصیرت کی یہ نعمت بھی دوسروں کی روحانی مدد کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ تو بھی لگتا ہے کہ کلیسیائی عہدیدار پورے طور پر مطمئن نہ ہوئے۔ روایت کے مطابق جب پخومِیُس خاموش ہوا تو ایک آدمی نے تلوار لے کر اُس پر حملہ کیا، اور گو اُسے قتل کرنے میں ناکام رہا لیکن بحث مباحثہ کے باعث پخومِیُس اپنے راہبوں کے ساتھ قریب کی خانقاہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔

---

[a] κοινωνία (koinōnia)

[b] مذکورۂ بالا حوالوں میں مستعمل لفظ مشترکہ یونانی لفظ κοινά (koina) کا ترجمہ ہے۔

موت

346ء میں پخومیُس ایک وبائی بیماری کی زد میں آ کر کوچ کر گیا۔ بسترِ مرگ پر اُس نے اپنے قریبی شاگرد کو ہدایت دی کہ میری لاش کو مت چھوڑنا، ایسا نہ ہو کہ لوگ اِسے لے کر مقبرہ بنائیں۔ وہ ناخوش تھا کہ لوگ اِس طریقے سے مقدسین کی لاشوں کو کاروبار کا وسیلہ بناتے تھے۔

خانقاہ کا انتظام

پخومیُس کے قواعد

پخومیُس کے ہاتھوں ہمیں خانقاہ کے پہلے قواعد بھی ملے ہیں۔ انتونی جیسے راہب اپنی مرضی کے مطابق زُہد کرتے تھے، لیکن پخومیُس کے راہبوں کو اِس کی اجازت نہیں تھی۔ اُنہیں تفصیل سے خانقاہ کے قواعد کے مطابق چلنا تھا۔

اِن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ پخومیُس راہبوں کی زندگی ہر طرح سے صحیح ترتیب دینا چاہتا ہے۔ اُس کے نزدیک کوئی بھی کام اِتنا غیر اہم نہیں کہ اُس پر غور کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ پھل کو جمع کرنے کا طریقہ بھی اہم ہے اور یہ جاننا بھی کہ عبادت میں کتنے رسّے تیار ہوئے۔

لیکن اِن ہدایات کے پیچھے ایک اَور مقصد بھی ہے: سب کو برابر رکھنا ہے۔ چنانچہ ہدایت 71 میں لکھا ہے، ''کوئی بھی باغ سے سبزی نہ لے اگر اُسے مالی سے دی نہ جائے۔'' اِس کے پیچھے یہ خیال ہے کہ ہر ایک کا اپنا اختیار ہے، اور یہ اختیار ہدایات سے محفوظ رکھنا ہے۔ کوئی بھی اپنے غلط عمل سے دوسرے کا اختیار ختم نہ کرے۔

لیکن اختیار غلط بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اِس لئے ہدایت 75 میں لکھا ہے، ''کھجور کے درختوں کا انچارج دوسرے بھائیوں سے پہلے اُن کا پھل نہ کھائے۔'' اختیار رکھنے والے ہمیشہ اِس خطرے میں ہوتے ہیں کہ چھوٹے بادشاہ بن جائیں۔ اِس ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ کھجور کا انچارج دوسرے بھائیوں کے برابر رہے۔ غرض اِن ہدایات کا

گہرا مقصد ابتدائی کلیسیا کی وہی حالت قائم رکھنا تھا جو اعمال کی کتاب میں بیان کی گئی ہے۔

خانقاہ کا نقشہ

انتونی جیسے راہب ریگستان میں رہتے تھے۔ اِن کے مقابلے میں پخومیُس کے راہب دریائے نیل کے قریب آباد تھے۔ لٰہذا اُن کی خانقاہیں اونچی اونچی چار دیواری سے گھری تھیں۔ یہ راہبوں کو باقی معاشرے سے محفوظ رکھتی تھیں، چاہے پڑوسی ہوں چاہے رشتےدار۔ جو داخل ہونا چاہتا تھا اُسے گیٹ میں سے گزرنا پڑتا تھا جس کی احتیاط سے پہرہ داری کی جاتی تھی۔

جو اندر آنے میں کام یاب ہوا اُس نے کیا دیکھا؟ اُسے گیٹ کے پاس گیسٹ ہاؤس، پھر مشترکہ کچن، بیکری، ڈائننگ ہال، مریض خانہ، اسمبلی ہال اور چرچ نظر آیا۔ ہم یہ نہ صرف روایات سے جانتے ہیں بلکہ آثارِ قدیمہ سے بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ مثلاً 1989ء میں پخومیُس کے ایک چرچ کا پتا چل گیا جس کی لمبائی 135 فٹ اور چوڑائی 79 فٹ تھی۔

اِن مشترکہ عمارتوں کے علاوہ وہ مکان تھے جن میں راہب رہتے تھے۔ ہر مکان میں 40 راہبوں کے اپنے اپنے کمرے تھے۔ گودام بھی موجود تھے۔ یہ انتونی کی تنہا زندگی سے کتنی فرق تھی۔ یہاں ہر راہب اپنے اپنے کاروبار میں لگا رہتا تھا۔ خانقاہ میں ٹوکریاں اور چٹائیاں بنانے والے، چمڑا رنگنے والے، موچی، لوہار، نان بائی، اونٹ چلانے والے اور کاتب اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کی کشتیاں بھی تھیں جن کے ذریعے وہ اپنا سودا بازاروں تک پہنچاتے اور دوسری خانقاہوں سے رابطہ رکھتے تھے۔

درجہ وار ترتیب

خانقاہوں کا سربراہ پخومیُس تھا۔ وہ دوسرے راہبوں کا ''باپ'' تھا۔ قُبطی زبان میں وہ ''اپا'' یعنی ابّا کہلاتا تھا۔ یہ لفظ اپا یا ابّا پادری کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ

بزرگ کے لئے۔ پخومیُس کے راہب زیادہ تر صرف اُسی کو اباّ سمجھتے تھے۔ سربراہ کی حیثیت سے وہ دریائے نیل پر کشتی کے ذریعے مختلف خانقاہوں کو وزٹ کیا کرتا تھا۔ وہی ہدایات اور قواعد پیش کرتا، عہدیداروں کو مقرر کرتا اور مشکل فیصلے صادر کرتا تھا۔

اُس کے تحت ہر خانقاہ کا منتظم تھا جس کے تحت مزید افسر تھے۔ جن مکانوں میں راہب رہتے تھے ہر ایک پر ایک شخص مقرر تھا جو راہبوں کا سربراہ، استاد اور روحانی باپ تھا۔ وہ اپنے مکان کی ہر چیز کے لئے جواب دہ تھا۔

خانقاہ بیٹھنے کی ترتیب تک زندگی کا ہر پہلو مقرر کرتی تھی۔ اور بیٹھنے کی یہ ترتیب کسی عُہدے پر منحصر نہیں تھی بلکہ اِس پر کہ ہر ایک کب راہب بنا۔ غرض عملی طور پر بھی خانقاہ میں سب برابر تھے۔

خانقاہ میں داخلہ

جو راہب بننا چاہتا تھا اُسے فوراً قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ گیٹ کا پہرہ دار پہلے اُسے دعائے ربانی اور کچھ زبور سکھاتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اُس سے معلوم کرتا کہ کیا وہ کسی سے بھاگ کر آیا یا کسی جرم کے باعث داخل ہونا چاہتا ہے؟ کیا وہ اپنے والدین اور ملکیت کو ترک کر سکتا ہے؟ منظور ہونے پر اُس کا داخلہ ہوتا۔ اب اُسے راہب کی روٹین اور کام سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ جب وہ اِس میں کام یاب ثابت ہوتا تب ہی علانیہ ممبر بن جاتا۔ لگتا نہیں کہ اُسے مَنت ماننا پڑتا تھا۔

اُس وقت اُسے راہب کا لباس بھی ملتا یعنی بازو کے بغیر قمیص، کندھوں پر رکھی ہوئی مذکورہ بھیڑ کی کھال،[a] سر اور گردن کو ڈھانکنے کا کپڑا (ہڈ hood)، رات اور صبح کی عبادت کے لئے چوغہ، چپل اور سفر کے لئے ڈنڈا۔

راہب کا فرض تھا کہ وہ ممکنہ حد تک کلامِ مقدّس یاد کرے۔ پہلے اُسے 20 زبور اور پولس رسول کے دو خط زبانی یاد کرنا تھا، لیکن ہر راہب کا ٹارگیٹ پورا زبور اور پورا نیا

---

[a] μηλωτή (mēlōtē)

عہد نامہ یاد کرنا تھا۔ جو اَن پڑھ تھے، اُن کا فرض تھا کہ پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ یہ خانقاہ کا ایک لازمی اصول تھا۔

جو ممبر بن گئے اُن میں بہت سے تھے جن کا بپتسمہ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اُس زمانے میں بپتسمہ کا سلسلہ پیچیدہ تھا۔ اُمید وار کو تین سال تک سکھایا اور جانچا جاتا تھا۔ غیر بپتسمہ یافتہ لوگ نہ صرف عشائے ربانی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اُنہیں اِس کا مشاہدہ کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اِس سنجیدگی کے پیشِ نظر بہت سے لوگ بسترِ مرگ پر ہی بپتسمہ لیتے تھے۔ غرض غیر بپتسمہ یافتہ راہبوں کو بپتسمے کے لئے تیار کرنا بھی خانقاہ کی ایک ذمہ داری بن گئی۔

دن کی روٹین

راہبوں کا دن کس طرح گزرتا تھا؟ پَو پھٹتے ہی وہ اُٹھ کر اسمبلی ہال میں عبادت کے لئے جمع ہوتے۔ عبادت ہوتے وقت ہر ایک کے سامنے سرکنڈوں کا ڈھیر ہوتا، کیونکہ راہب کو سُست نہیں بیٹھنا تھا بلکہ عبادت کرتے وقت بھی رسّے بنانے تھے۔

سامنے ایک راہب کلام کے حوالجات زبانی پیش کرتا۔ ہر حوالے کے اختتام پر وہ تالی بجاتا تو راہب کھڑے ہو کر ماتھے پر صلیب کا نشان بناتے اور پھر بازوؤں سے صلیب کا نشان بنائے ہوئے دعائے ربانی کی تلاوت کرتے۔ تالی دوبارہ بجتی تو وہ دوبارہ صلیب کا نشان بنا کر گھٹنے ٹیکتے اور پھر فرش پر اوندھے منہ ہو کر دل میں اپنے گناہوں کا خیال کر کے روتے۔ پھر وہ اُٹھتے اور صلیب کا نشان بنا کر دل میں دعا کرتے۔ تالی کے تیسری بار بجنے پر وہ دوبارہ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ عمل کچھ نہ کچھ صلات سے ملتا جُلتا ہے گو یہ راہب اسلام کی آمد کے کم از کم دو سَو سال پہلے یہ کیا کرتے تھے۔

عبادت کے بعد ہر راہب اپنے اپنے کام میں لگ جاتا۔ بُدھ اور جمعے کو روزہ رکھا جاتا تھا۔ سوائے اِن دنوں کے روزانہ دو دفعہ کھانا ملتا تھا، دوپہر کو اور شام کے وقت۔ عام کھانا روٹی اور سبزی پر مشتمل تھا۔ انتونی جیسے راہبوں کی نسبت یہ بہت تھا۔ کھانا

کھاتے وقت ہر راہب اپنی اپنی مقررہ جگہ پر خاموشی سے اور ڈھانکا ہوا سر جھکا کر بیٹھا ہوتا تھا۔

شام کے کھانے کے بعد دوبارہ عبادت ہوتی تھی۔ روزے کے دن راہب کو کھانا کھانے کے بجائے اپنے اپنے مکان کے سربراہ سے ہدایات ملتی تھیں۔ اِن کلاسز میں اُنہیں بحث مباحثہ کرنے کی اجازت تھی۔ جو خاموشی کام کرتے اور کھانا کھاتے وقت درکار تھی اُسے ایسے موقعوں پر چھوڑنا تھا تاکہ علم میں اضافہ ہو۔

شام کی عبادت کے بعد راہب اپنے اپنے کمرے میں جا کر دعا کرتے تھے۔ کوشش تھی کہ رات کے وقت نہ سوئے، اور اگر بیدار رہنا ناممکن ہو تو راہب کرسی پر بیٹھے سوتے تھے۔

مصر کے عام رواج کے مطابق عشائے ربانی صرف ہفتے اور اتوار کو منائی جاتی تھی۔ اِن دو دنوں کے دوران خانقاہ کا سربراہ راہبوں کو ہدایات دیتا تھا۔

سالانہ اجتماع

سال میں دو دفعہ تمام خانقاہوں کے راہب مرکزی خانقاہ بنام پبو[a] میں جمع ہوتے تھے۔ پخومیُس کے آخری سالوں میں یہاں ہزاروں راہب جمع ہوتے تھے۔ پہلا اجتماع ایسٹر پر منعقد ہوتا تھا، اور اُس میں بپتسمے دیئے جاتے تھے۔

دوسرا اجتماع تقریباً اگست میں ہوتا تھا۔ اُس کا ایک مقصد سال کا آڈِٹ رپورٹ تھا۔ ہر خانقاہ کا سربراہ سال کی آمدنی اور اخراجات پیش کرتا تھا۔ یہ رپورٹیں بڑی باریک بینی سے تیار کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر یہ بات بھی اِن میں درج ہوتی تھی کہ روزانہ کی ہر عبادت میں کتنے رسّے بنائے گئے تھے۔

اِس اجتماع کا دوسرا مقصد روحانی تھا۔ ہر ایک کو ایک دوسرے کو معاف کرنا تھا۔ پخومیُس کا ایک خط دست یاب ہے جس میں وہ ایسے موقعے پر راہبوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنی دشمنیاں ختم کر کے صلح سلامتی کی زندگی گزاریں۔[40]

Pbow[a]

مکاریوس: سکیتِس کے چھوٹے چھوٹے گروہ

ہم نے دو قسم کے راہبوں پر غور کر لیا ہے، ایک علیٰحدگی میں رہنے والے پر (انتونی) اور دوسرے، خانقاہ کی صورت میں رہنے والے پر۔ لیکن یاد رہے کہ اِن دو انتہاؤں کے درمیان دیگر مختلف قسم کے راہب بھی تھے۔ اب ہم مختصراً مصری راہبوں کے تین ایسے گروہوں پر دھیان دیں گے، سکیتِس، نِطریہ اور کلّیا۔

تقریباً 330ء میں راہب سکیتِس[a] میں آباد ہونے لگے۔ اُن کا بانی ایک راہب بنام مکاریوس مصری تھا۔[41]

مکاریوس مصری کی زندگی

مکاریوس مصر میں پیدا ہوا۔ راہب بننے سے پہلے وہ شُتُربان تھا اور ساتھ ساتھ نیٹرون کی سمگلنگ بھی کرتا تھا۔ کسی وقت وہ شتربانی کو چھوڑ کر انتونی کی طرح گاؤں کے کنارے پر راہبانہ زندگی گزارنے لگا۔ جب گاؤں والے اُسے فادر بننے پر مجبور کرنا چاہتے تھے تو وہ کسی اَور گاؤں میں بھاگ گیا۔

وہاں ایک دن ایک لڑکی نے اُس پر الزام لگایا کہ اِس آدمی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ گاؤں والے آگ بگولا ہو کر اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُسے مار مار کر اُس کی بڑی بےعزتی کی۔ ایک جاننے والے کی سفارش کے باعث بال بال بچ گیا۔ لیکن لڑکی کے والدین نے تقاضا کیا کہ ہم اِسے نہیں چھوڑیں گے جب تک بیٹی کی پرورش کرنے کی ضمانت نہ دے۔ جاننے والے نے ضمانت دی۔ خود مکاریوس نے اپنا دفاع نہ کیا گو الزام جھوٹا تھا بلکہ اپنے آپ سے کہا، "اے مکاریوس، دیکھو تجھے بیوی مل گئی ہے۔ اب تھوڑا بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اُس کی پرورش کرے۔" چنانچہ وہ ٹوکریاں بنا کر کمائے ہوئے پیسے نام نہاد بیوی کو بھیجتا رہا۔

---

[a] Scetis

جب عورت دردِزہ میں مبتلا ہوئی تو اُسے بہت دقت ہوئی۔ جب بچہ کئی دن کے بعد بھی پیدا نہ ہوا تو اُس نے تسلیم کیا کہ مکاریوس اِس بچے کا باپ نہیں ہے بلکہ فلاں فلاں جوان۔ یہ سن کر گاؤں والے مکاریوس سے معافی مانگنے کے لئے نکلے۔ لیکن جب اُسے اُن کا یہ منصوبہ معلوم ہوا تو وہ فوراً بھاگ گیا۔ یوں چلتے چلتے وہ سکیتِس آ پہنچا۔[42]

مکاریوس ماضی کی سمگلنگ کے باعث سکیتِس سے خوب واقف تھا، کیونکہ وہاں نیٹرون ملتا تھا۔ جب وہ 330ء میں وہاں ٹک گیا تو جلد ہی مزید راہب اُس کے ارد گرد جمع ہوئے۔ لگتا ہے کہ مکاریوس دلوں کو پڑھنے کی نعمت رکھتا تھا۔

سکیتِس شمالی مصر اور دریائے نیل کے مغرب میں واقع وادی تھا، اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ خطرناک تھا۔ ریگستان میں سے 24 گھنٹوں کا سفر درکار تھا۔ تاریخی کتابوں میں کئی ایک مسافروں کا ذکر ہے جو گم ہو کر اِس ریگستان میں مر گئے۔ وہاں کچھ چھوٹے نخلستان اور دلدلی جگہیں تھیں۔ پانی سے بدبو آتی تھی۔ اِس علاقے سے نیٹرون نکالا جاتا تھا۔ آج یہ وادی النطرون کہلاتا ہے۔

سکیتِس کا انتظام

راہبوں کی زندگی

سکیتِس کے راہبوں کی زندگی انتونی اور پخومیُس دونوں سے فرق تھی۔ یہاں راہب الگ الگ بکھرے ہوئے رہتے تھے، لیکن اُن کی آپس میں رفاقت بھی تھی۔ اُن کے گارے کی اینٹوں یا پتھروں سے بنے مکان تھے۔ اکثر گھروں میں دو کمرے تھے، ایک کام کرنے، کھانا کھانے اور مہمانوں کے لئے اور دوسرا دعا کے لئے۔ کچھ غاروں میں بھی رہتے تھے۔

یہ راہب بھی کام کرتے تھے۔ عام طور پر وہ دلدلی جگہوں سے سرکنڈے لا کر رسّے اور ٹوکریاں بناتے تھے۔ جب دریائے نیل سے ملحق کھیتوں میں فصل پک جاتی تو اکثر

راہب مزدوری کا کام کرنے آتے تھے۔ کچھ راہب اَور کام بھی کرتے تھے، لیکن وہ کم ہی تھے۔ اپنی روزی کمانا ایک اہم اصول تھا۔ یہ اصول نئے عہد نامے کی ہدایات پر مبنی تھی کہ ہر ایک اپنی روزی کمائے۔

کچھ راہب دو، چار یا سات دنوں کے بعد ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ لیکن عام رائے یہ تھی کہ روزانہ ایک بار تھوڑا سا کھانا زیادہ دیر تک روزہ رکھنے سے بہتر ہے۔ عام طور پر وہ روزانہ دو روٹیاں کچھ نمک کے ساتھ کھاتے تھے۔ وہ یہ روٹیاں مہینوں کے لئے بناتے تھے۔ جب سخت ہو جاتیں تو کچھ پانی کے ساتھ نرم کر دیتے۔ سبزی اور دیگر خوراک مہمانوں اور مریضوں کے لئے محفوظ رکھی جاتی تھی۔ مہمان نوازی ایک اہم اصول تھی، اُن کے لئے خاص چیزیں پکانا لازم تھا۔

سکیتِس میں راہب سوموار سے لے کر جمعے تک اپنے کمروں میں گزارتے تھے۔ عام طور پر وہ آدھی رات کے بعد اُٹھ کر زبور گاتے اور کلام پر غور و خوض کرتے تھے۔ دن کے وقت وہ کام کرتے اور ساتھ ساتھ دعا اور کلام پر غور و خوض کرتے تھے۔ تقریباً تین بجے کھانے کا وقت تھا، اور پھر مغرب کو دوبارہ زبور گائے جاتے تھے۔ دن ڈھلنے پر وہ سو جاتے تھے۔

ابّا اور شاگرد

پخومیُس کی خانقاہوں کے برعکس اِن راہبوں کے لکھے ہوئے قواعد نہیں تھے۔ اُن کے قواعد نیا عہد نامہ، مقامی رسم و رواج اور بزرگ راہبوں کی حکمت تھے۔ جو راہب بننا چاہتا وہ ایسے کسی بزرگ راہب کا شاگرد بن جاتا تھا۔ اِس طریقے سے سکیتِس میں چھوٹے گروہوں کے راہب بن گئے۔ ہر بزرگ کے ارد گرد اُس کے شاگرد رہتے تھے۔ یہ بزرگ ''ابّا'' یعنی ''ابو'' کہلاتے تھے۔ یہ نام اُس کی عمر یا عُہدے پر منحصر نہیں تھا بلکہ اُس کی روحانی بزرگیت پر۔ ابّا کے علاوہ وہ ''بوڑھے'' بھی کہلاتے تھے جبکہ شاگرد ''جوان'' تھے۔

بزرگ کا کیا کردار تھا؟ اول، وہ شاگردوں کو ریگستان میں رہنے کا فن سکھاتا تھے، مثلاً اپنے لئے مکان اور ٹوکریاں بنانا، صحیح طریقے سے عبادت کرنا وغیرہ۔ لیکن وہ اُن کا روحانی راہنما بھی تھا۔ بعد میں ہم اِس راہنمائی پر غور کریں گے۔

چار جماعتوں کی تشکیل

چوتھی صدی کے آخر تک اِن چھوٹے گروہوں کی چار جماعتیں بن گئیں۔ اِن میں راہب پہلے کی طرح ایک دوسرے سے الگ الگ رہتے تھے، لیکن ہر جماعت کا اپنا چرچ تھا۔ ہر چرچ کا فادر تھا، اور اُن میں سے ایک سب کا سربراہ تھا۔

ہفتے اور اتوار کو راہب گرجا گھر میں عبادت اور کھانے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ عبادت میں ایک آدمی سامنے کھڑے ہو کر زبور گاتا جبکہ باقی بیٹھے رہتے تھے۔ زبور کے اختتام پر سب کھڑے ہو کر خاموشی سے ہاتھ اُٹھائے دعا کرتے۔ پھر سب اوندھے منہ ہو کر دعا کرتے اور آخر میں دوبارہ کھڑے ہو جاتے۔ سامنے والے کی بلند آواز سے دعا کے بعد سب دوبارہ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سات دفعہ ہوتا تھا۔

یہاں مصر کی دوسری جگہوں کی طرح عشائے ربانی ہفتے اور اتوار کو منائی جاتی تھی۔ اتوار کو راہب چرچ میں نہ صرف روٹی بلکہ پکا ہوا کھانا اور مے ملتی تھی۔

نِطریہ : سکیتس کا رشتے دار

انتونی، پخومیُس اور مکاریوس مصری راہبوں کے تین مختلف نمونے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اِن نمونوں پر چلنے والے ایسی جگہوں پر رہتے تھے جو عوام کی پہنچ سے دُور تھیں۔ اِن کے برعکس نِطریہ ریگستان کے کنارے پر ہی واقع تھا، اور چونکہ یہ اسکندریہ سے محض 40 کلومیٹر دُور تھا اِس لئے عام مسافر آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔

نِطریہ کا بانی امون تھا۔ امون کا خاندان امیر تھا، لیکن بچپن میں دونوں والدین کوچ کر گئے۔ 22 سال کی عمر میں ایک چچا نے امون کو شادی کرنے پر مجبور کیا، لیکن شادی کی رات کو امون نے کلام کی تلاوت کر کر کے بیوی کو کنواری رہنے پر قائل کیا۔ ہمیں

یہ حرکت بڑی عجیب سی لگتی ہے، لیکن قدیم کلیسیا اور خاص کر شام میں یہ رواج قابلِ قبول تھا۔

کافی دیر تک میاں بیوی اِسی حالت میں رہے۔ اِس دوران امون بلسان کے اپنے باغوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ راہبانہ زندگی گزارتا تھا۔ لیکن 18 سال کے بعد امون کی بیوی اُس سے الگ رہنے کے لئے تیار ہوئی، اور قریباً 325ء میں اُس نے جا کر ریگستان کے کنارے پر اپنے لئے دو کمرے بنائے۔ وہ اپنی موت تک وہاں رہا، گو سال میں دو دفعہ اپنی اہلیہ سے ملنے آتا تھا۔ جلد ہی دیگر لوگ آ کر اُس کے شاگرد بن گئے۔

نِطریہ کے قریب کی جھیلوں سے نیٹرون[a] نکالا جاتا تھا۔ یہ نہ صرف صابن کے طور پر استعمال ہوتا تھا بلکہ حنوط کرنے (ممی بنانے) اور شیشہ بنانے کے لئے درکار تھا۔ مؤرخ پلادیُس جس نے قریباً 390ء میں پورا سال وہاں گزارا فرماتا ہے کہ تقریباً 5000 راہب وہاں آباد تھے۔ کچھ اکیلے، کچھ جوڑے اور کچھ گروہ کی صورت میں رہتے تھے۔ وہ باغوں میں بھی کام کرتے اور مے بھی بناتے تھے۔ کتان کا کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔ انتظام کی سات بیکریاں تھیں۔

ہفتے اور اتوار کو راہب عبادت کے لئے جمع ہوتے تھے۔ 8 فادر تھے، لیکن اِن میں سے صرف ایک کو عشائے ربانی کی راہنمائی اور وعظ کرنے کی اجازت تھی۔ نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے چرچ کے قریب تین کوڑے کھجور کے درختوں سے لٹکی ہوئی تھیں، ایک باغی راہبوں، ایک لٹیروں اور ایک چوروں کی اصلاح کے لئے۔ لیکن چرچ کے قریب ایک مہمان خانہ بھی تھا۔

نِطریہ کے راہب نہ انتونی اور نہ پخومیُس کے راہبوں کی مانند تھے۔ لیکن وہ سکیتِس سے بھی فرق تھے، کیونکہ معاشرے کی قربت کے باعث دنیا کے ساتھ تعلقات منقطع نہیں تھے۔ پخومیُس کی خانقاہوں کی طرح وہ کئی ایک مختلف کام کرتے تھے۔ لیکن

[a] νίτρον (nitron)

پخومیُس کی خانقاہیں بے شمار قواعد اور درجہ وار راہنماؤں کے ذریعے زندگی کے ہر پہلو کو ترتیب دیتی تھیں۔ نیز، راہنمائی میں کلیسیائی عہدیداروں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اِن کی نسبت نِطریہ کے راہبوں کے ایسے تفصیلی قواعد نہیں تھے، اور فادر اُن کی راہنمائی کرتے تھے۔ غرض وہ زیادہ تر ایسی آبادی سے مطابقت رکھتے تھے جس کا انتظامیہ کلیسیائی عہدیداروں کے ہاتھ میں ہو۔[43]

کِلّیہ: نطریہ کی ترقی یافتہ صورت

نطریہ کے قریب کِلّیہ واقع تھا۔[a] ایک روایت کے مطابق ایک دن انتونی امون سے ملنے آیا۔ گفتگو کے دوران امون نے اِس کا ذکر کیا کہ بعض بھائی دوسروں سے کچھ دُور رہنا چاہتے ہیں جہاں اُنہیں زیادہ سکون حاصل ہو۔ انتونی کے مشورے کے مطابق وہ تین بجے کے کھانے کے بعد سیر کے لئے نکلے۔ جب سورج ڈوبنے لگا تو انتونی نے ہدایت دی کہ ہم اِس جگہ پر دعا کر کے صلیب لگائیں۔ انتونی کے نزدیک یہ مقام دوسروں سے دُور ہونے کے باوجود اِتنا قریب تھا کہ اگر نطریہ کا کوئی راہب اُن سے ملنے آئے تو وہ تین بجے کے کھانے کے بعد آسانی سے مغرب سے پہلے پہلے اُن تک پہنچ سکے۔ 12 میل کا فاصلہ تھا۔[44] کِلّیہ کے راہب ایک دوسرے سے اِتنے دُور رہتے تھے کہ ایک دوسرے کو نظر نہ آ سکے۔ وہاں صرف ترقی یافتہ راہب رہ سکتے تھے۔ یہ بھی ہفتے اور اتوار کو جمع ہوتے تھے۔ مذکورہ مؤرخ پلادیُس فرماتا ہے کہ جب مَیں چوتھی صدی کے آخر میں وہاں پہنچا تو 600 راہب آباد تھے۔ راہبوں کا ایک فادر کچھ بزرگوں کے ساتھ اُن کی راہنمائی کرتا تھا۔

نِطریہ آج کل صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے، لیکن کِلّیہ کے بہت کھنڈرات معلوم ہوئے ہیں جو 49 مربع میل پر پھیلے ہوئے ہیں۔[45]

---

[a] کِلّیہ κελλία (kellia) کا مطلب حُجرے (cells) ہے۔

باب 17

بیرونِ مصر کے راحب

ہم نے مصر میں مختلف قسم کے راہبوں پر غور کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں اُسی طرح تمام راہب ایک جیسے نہیں تھے۔ یاد رہے کہ اِن کے علاوہ بھی بہت سے گروہ تھے، ہاں ہزاروں مرد اور خواتین آبادیوں میں بھی راہبانہ زندگی گزارتے تھے۔

اِس کی خوب صورت مثال اُس زمانے کا ایک کاغذ ہے جو قدیم شہر بنام آکسیرِنخس[a] کے کھنڈرات میں مل گیا ہے۔ کاغذ ایک یہودی آدمی کا دو بہنوں کے ساتھ معاہدہ ہے۔ اُس میں بہنوں کا ایک فلیٹ کرائے پہ مذکورہ آدمی کے سپرد کیا گیا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ فلیٹ شہر میں پڑا ہے اور کہ دونوں بہنیں راہبہ ہیں۔ یہ اور

[a] Oxyrhynchus

دیگر بہت مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ راہبانہ زندگی نہ صرف مردوں کا شعبہ تھا اور نہ ہی صرف ریگستان میں گزاری جاتی تھی۔[1]

ہم نے مصر کو اپنا مرکزِ خیال بنا لیا ہے، لیکن چوتھی صدی میں مصر کے علاوہ شام، فلسطین اور کپدُکیہ میں بھی راہبوں کا ذکر ہے۔ اب ہم مختصراً اُن پر بھی توجہ دیں گے۔

شام کے راہب

انتہا پسند راہب

گو شام میں خاص کر بڑی آبادیوں میں یونانی بولی جاتی تھی، لیکن اکثر لوگوں کی مادری زبان سُریانی تھی۔

تھیُدورط مؤرخ[a] نے شام کے راہبوں کے بارے میں سب سے مشہور تاریخ قلم بند کی۔ پلادیُس کی تاریخ کی طرح اِس میں مختلف راہبوں کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ جب ہم اُن کا مقابلہ مصر کے راہبوں سے کرتے ہیں تو اُن کے انتہا پسند طریقے سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے جسموں کو حد سے زیادہ برداشت کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

مثال کے طور پر مؤرخ ایک راہب بنام یعقوب کا ذکر کرتا ہے جو بیمار پڑ گیا۔ جب تھیُدورط اُس سے ملنے آیا تو معلوم ہوا کہ کپڑوں کے نیچے زنجیریں بندھی ہوئی ہیں تاکہ زیادہ تکلیف ہو۔ یہ راہب ایک کھلے پہاڑ پر رہتا تھا۔ گو اُس کی صحت بحال ہوئی لیکن کچھ دیر کے بعد وہ اِتنا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کو تھا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوئے تاکہ اُس کی لاش پر قبضہ کریں۔ مقصد اُس کی برکت کو لاش کی صورت میں حاصل کرنا تھا۔ جب وہ اُس کے جسم کو ادھ موئی حالت میں پھاڑنے لگے تو فوجی اور دیگر لوگ ہتھیار لے کر اُسے شہر میں لے گئے تاکہ اُسے محفوظ رکھیں۔[2]

---

[a] Theodoret of Cyrrhus

شمعون العمودی

تھیُدورط کا خاص ہیرو شمعون العمودی[a] تھا۔ شمعون ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا۔ جب وہ ابھی لڑکا تھا تو پہاڑی وعظ کی تلاوت نے اُس میں راہب بننے کا بیج بو دیا۔ وہ ایک خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہاں اُس نے کھجور کے پتوں سے بیلٹ بنا کر اُسے کمر سے یوں باندھا کہ زخمی ہوا۔ جب خون نکلنے لگا تو دوسروں نے مشکل سے اُسے یہ اُتارنے پر مجبور کیا۔ اِس قسم کی اپنے جسم سے زیادتی کے باعث اُنہوں نے اُسے نکال دیا۔

پھر اُس نے اپنے آپ کو تین سال کے لئے ایک جھونپڑی میں بند رکھا۔ لکھا ہے کہ اُس دوران اُس نے ایک پورے مہینے تک نہ پانی پیا نہ کھانا کھایا۔ اِس میں اُس کا نمونہ موسیٰ اور ایلیاہ تھے۔ اُس کی شہرت پھیلنے لگی۔ مصنف فرماتا ہے کہ اُس وقت اُس کے 200 شاگرد بن گئے۔

تین سال کے بعد شمعون نے جھونپڑی کے ساتھ والے پہاڑ پر چڑھ کر ایک چھوٹا سا احاطہ اپنے لئے بنایا اور ایک لمبی زنجیر سے اپنے دائیں پاؤں کو چٹان کے ساتھ لگایا تاکہ کہیں نہ جا سکے۔ لیکن بعد میں ایک بشپ نے اُسے یہ اُتارنے پر قائل کیا، یہ کہہ کر کہ زنجیر کی کیا ضرورت ہے؟ تھیُدورط فرماتا ہے کہ جب زنجیر کو اُتارا گیا، تو زنجیر کے نیچے جو کپڑا لگا تھا اُس میں 20 پسو تھے۔ شمعون نے اِنہیں ختم نہیں کیا تھا۔ مصنف کے نزدیک یہ شمعون کی قوتِ برداشت ظاہر کرتا ہے۔

ہوتے ہوتے بڑے ہجوم اُسے چھو کر برکت پانے کے لئے آنے لگے۔ اُن سے تنگ آ کر اُس نے اپنے لئے ایک پلر[b] بنوایا۔ پہلے یہ پلر تقریباً 12 فٹ لمبا تھا لیکن آخر میں اُس کی لمبائی تقریباً 50 فٹ تک پہنچ گئی۔ پلر کے اوپر ایک چھوٹا سا چبوترا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً 3 یا 4 فٹ تھی۔ تیس سال تک وہ اُس پر رہا۔

---

[a] Simeon Stylites (390–459)

[b] στῦλος (stylos)، عربی عمود

ستون پر وہ ہاتھ اُٹھائے دعا کرتا اور جھک جاتا تھا۔ جھکتے وقت اُس کی پیشانی پاؤں تک پہنچتی تھی۔ زائرین جب آتے تو گن لیتے کہ وہ کتنی مرتبہ جھکتا ہے۔ مصنف فرماتا ہے کہ ایک دن ایک ساتھی گننے لگا۔ 1244 بار جھکنے کے بعد دوست تھکاوٹ کے باعث گننے سے باز آیا۔ ہفتے میں شمعون ایک بار کھانا کھاتا تھا۔ خاص موقعوں پر وہ سورج کے غروب ہونے سے طلوعِ آفتاب تک اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے کھڑا رہتا تھا۔

ہمیں یہ رویہ حد سے زیادہ انتہا پسند لگتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے لوگ پیر و فقیر کی مانند لگتے ہیں جن کے پاس لوگ روحانی سفارش مانگنے آتے تھے۔ خود تھیُودورط یہ کمی محسوس کرتا ہے لٰہذا شمعون کے دنیا اور کلیسیا پر مثبت اثر پر زور دیتا ہے۔

شمعون رات سے لے کر دوپہر کے تین بجے تک دعا میں لگا رہتا تھا۔ تین بجے سے مغرب تک وہ پہلے تعلیم دیتا، پھر لوگوں کی گزارشیں سنتا، شفا دیتا اور تنازعوں کے فیصلے دیتا تھا۔ اُس کے سامنے سب برابر تھے، چاہے امیر ہو یا غریب۔ مصنف کے مطابق وہ تاہم حلیم تھا۔ وہ اپنے آپ کو ضرورت مندوں کا خاص محافظ سمجھتا تھا۔[3] یہاں ہمیں شام کے راہبوں کا ایک خاص کردار نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ معاشرے سے الگ رہتے تھے اِس لئے وہ معاشرے کی مجبوریوں اور سیاست سے آزاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مخالف پارٹیوں کے درمیان غیر جانب دار ثالث بن سکتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ خدا کے سامنے لوگوں کی سفارش کرتے تھے۔

لگتا ہے کہ شمعون کے وسیلے سے ہزاروں بدُو ایمان لائے۔ تھیُودورط خود گواہ تھا جب اُنہوں نے شمعون کے پاس آ کر اپنی بت پرستی کو رد کیا اور مسیحی ایمان قبول کیا۔ جب شمعون نے ہدایت دی کہ برکت ملنے کے لئے تھیُودورط کے پاس جاؤ تو وہ اِتنے جوش میں آ گئے کہ اُسے اِدھر اُدھر کھینچنے لگے۔ لیکن شمعون نے پلر پر سے اُنہیں آواز دی تو وہ سنبھل گئے۔[4]

عہد کے فرزند

پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ شام کی راہبانہ تحریک مصر کے اثر کے باعث شروع ہوئی۔ لیکن تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ تحریک خود بہ خود پیدا ہوئی۔ اور شروع سے اُس کے راہب انتہا پسند تھے۔ ططیان کی مثال لیجئے جس نے نہ صرف یونانی کلچر کو مسترد کیا بلکہ لگتا ہے کہ وہ شادی اور افزائشِ نسل کے بھی خلاف تھا۔[5] کنوارپن اور مباشرت سے پرہیز عام تھی۔ امون کا ذکر ہو چکا ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کنوارپن کی حالت میں رہا۔ شام میں اِس قسم کے کئی جوڑے رہتے تھے۔ کچھ کنوارے اور کنواریاں الگ الگ گروہوں کی صورت میں رہتے تھے۔ یہ ''عہد کے فرزند'' کہلاتے تھے۔ اِس قسم کے راہب کو ''ایحیدایا'' بھی کہا جاتا تھا۔ اِس لفظ کا مطلب واحد ہے۔ اِس ناتے سے غیر شادی شدہ شخص ''ایحیدایا'' ہے۔ ایک ذہن کا مالک بھی ''ایحیدایا'' ہے۔ لیکن کتابِ مقدّس کے سُریانی ترجمے بنام پشیطہ میں مسیح کو بھی ''ایحیدایا'' یعنی اکلوتا کہا جاتا ہے۔ لٰہذا ''ایحیدایا'' وہی ہے جو نہ صرف غیر شادی شدہ یا ایک ذہن کا مالک ہے بلکہ وہ جو مسیح کی مانند بننا چاہتا ہے۔[6]

افرائیم سُریانی

غالباً افرائیم سُریانی (306ء–373ء) ''ایحیدایا'' تھا۔ افرائیم نِصیبین[a] میں رہائش پذیر تھا۔ یہ شہر رومی ممالک میں شامل تھا، لیکن 363ء میں جب فارس نے اُس پر قبضہ کر لیا تو افرائیم کو حدیاب[b] میں منتقل ہونا پڑا۔

افرائیم اپنے گیتوں اور وعظوں میں بہت دفعہ ایحیدایا کی زندگی بیان کرتا ہے۔ اُس کے مطابق ایحیدایا فرشتوں کی سی زندگی گزارتے ہیں، کیونکہ فرشتوں کی طرح وہ شادی نہیں کرتے۔ ہاں، وہ نہیں سوتے بلکہ جاگے ہوئے خدا کے حضور دعا کرتے رہتے ہیں۔

---

[a] تُرکی کا شہر نصَیبین
[b] تُرکی کا شہر اُرفا

اُن کا بڑا نمونہ خود مسیح ہے، جو جاگتی حالت میں ہمیں موت کی نیند سے جگاتا ہے۔ ایحیدایا مسیح کے نمونے پر چل کر دانش مند کنواریوں کی طرح بیدار حالت میں دُلہے کی آمد کے انتظار میں رہتا ہے۔[7]

لیکن عہد کے یہ فرزند معاشرے سے الگ نہیں بلکہ اُس کے درمیان ہی رہتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کلیسیا کی خدمت میں حصہ لیتے تھے۔ ایک گیت میں افرائیم گاتا ہے،

> جس نے مقدّسین کے پاؤں کو دھو دیا ہے خود وہ اُس شب نم سے پاک صاف ہو جائے گا۔
> جو ہاتھ غریبوں کو دینے کے لئے بڑھ گیا ہے اُس کی طرف درختوں کے پھل بڑھیں گے۔
> جو دُکھ میں مبتلا مریضوں سے ملنے گیا ہے پھول اُس کے قدموں کو شگوفوں کے تاج سے سجانے دوڑتے ہیں۔ بلکہ ہر ایک دوسروں کو دھکا دے دے کر اِس جوش میں ہے کہ پہلے اُس کے قدموں کو چومے۔[8]

دوسروں کے لئے اِس فکر نے عملی جامہ بھی پہن لیا۔ مؤرخ پلادیُس کے مطابق ایک دفعہ حدیاب میں کال پڑی۔ افرائیم کو پتا چلا کہ کچھ لوگ گندم کے ذخیرے چھپائے رکھے ہیں تو اُس نے اُنہیں سمجھایا۔ اُنہوں نے جواب دیا، ''ہمیں ڈر ہے کہ تقسیم کرنے والے غلط فائدہ اُٹھائیں۔'' تب افرائیم خود گندم اَور پیسے تقسیم کرنے کا اِنچارج بن گیا۔[9]

چونکہ عہد کے فرزند معاشرے کے درمیان رہتے تھے اِس لئے ظاہر ہے کہ عام مسیحیوں کے ساتھ ٹکرانے کا خطرہ رہتا تھا۔ ایسے تنازعوں پر قابو پانے کے لئے چوتھی

صدی کے آخر میں ایک تصنیف بنام 'ایمان کی سیڑھی'[a] قلم بند ہوئی۔ اُس میں ایمان کے مختلف درجوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ جو ایمان لائے وہ درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا ہوا سب سے اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ سب سے اونچے درجے پر ایمان دار کامل کہلاتے ہیں۔ کامل ایمان داروں نے اپنے خاندان، شادی اور ملکیت کا انکار کیا ہے۔ اِن سے الگ اور نچلے درجے پر وہ ایمان دار ہیں جو راسب باز کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ راست باز زندگی گزارتے تو ہیں، لیکن اُنہوں نے اپنے خاندان، شادی اور ملکیت کا انکار نہیں کیا۔ کتاب کا خاص مقصد ہر درجے کے فرائض مقرر کرنا ہے تاکہ مسیحی برادری بحال رہے۔[10]

فلسطین: لَورا کا راہبانہ انتظام

ایک قدیم روایت کے مطابق چوتھی صدی کے ابتدائی سالوں میں ایک آدمی بنام خرِتون[b] نے ایشیائے کوچک سے آ کر فلسطین میں پہلی خانقاہیں قائم کیں۔ اِس کا مطلب ہے کہ شام کی طرح فلسطین کی راہبانہ تحریک تقریباً اُسی وقت وجود میں آئی جب مصر میں شروع ہوئی۔

رواج کے مطابق خرِتون نے فلسطین میں ایک خاص قسم کی خانقاہ قائم کی جو لَورا کہلاتی ہے۔ لَورا میں راہب الگ الگ بھی رہتے تھے اور مل کر بھی۔ یعنی سکیتِس کی طرح اِس میں انتونی اور پخومیُس کے طرزِ زندگی دونوں ملائے گئے ہیں۔ یونانی میں لَورا کا مطلب راستہ یا گلی ہے۔ راہب الگ الگ رہتے تھے، لیکن ایک پکے راستے (لَورا) نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم رکھا۔ اُن پر ایک راہنما اور انتظام چلانے والا مقرر ہوتا تھا، اور کمروں کے بیچ میں اکثر کچھ مرکزی عمارتیں مثلاً چرچ اور بیکری تھیں۔ سوموار سے لے کر جمعے تک راہب اپنے اپنے کمروں میں رہتے اور کام کرتے تھے جبکہ ہفتے اور اتوار کو وہ عبادت اور کھانے کے لئے جمع ہوتے تھے۔

---

liber graduum[a]
Chariton[b]

مزید قسم کے راہب بھی تھے، لیکن لَورا فلسطین کی راہبانہ زندگی کا نشان بن گیا۔ یہ خانقاہیں خاص کر یروشلم کے مشرق اور جنوب کے بیابان میں قائم ہوئیں۔ لیکن اکثر راہب ایک دن کے سفر کے اندر اندر یروشلم پہنچ سکتا تھا۔ ایک مشہور لَورا کا مرکز وادئ قدرون تھی۔

فلسطین کا دیگر مرکز غزہ میں تھا۔[11]

کپدُکیہ کی خدمت گزار خانقاہیں

کپدُکیہ ایشیائے کوچک (ترُکی) کے بیچ میں ہے۔ یہ علاقہ شروع سے ایک اہم مسیحی مرکز تھا۔ چوتھی صدی میں تین مشہور بزرگ یہاں خدمت گزار تھے، باسیل از قیصریہ، اُس کا بھائی گریغوری از نیسہ اور اُن کا ساتھی گریغوری از نزیانز۔ اُن ہی کے ہاتھوں تثلیث فی التوحید کا وہ فارمولا مقبولِ عام ہوا جو آج تک مانا جاتا ہے۔

اِن میں سے باسیل راہبانہ زندگی کا مرکز بن گیا۔ باسیل کا خاندان امیر اور ایمان میں مضبوط تھا۔ جوانی میں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اتھینے گیا۔ واپسی پر اُس نے بپتسمہ لیا۔ ساتھ ساتھ وہ راہب بن گیا۔ یہ طرزِ زندگی بہتر طور پر سیکھنے کے لئے اُس نے مسوپتامیہ، شام، فلسطین اور مصر کے راہبانہ مرکزوں کا جائزہ لیا۔ بہت ساری باتیں اُسے قابلِ تعریف لگیں، لیکن کچھ باتیں اُسے ناپسند تھیں۔

357ء میں اُس نے پُنتُس میں اپنی زمینوں پر راہبوں کا گروہ قائم کیا۔ اِس مقصد کے تحت باسیل نے راہبانہ زندگی کے بارے میں اپنی رویا ایک تصنیف بنام 'راہبانہ ہدایات'[a] میں قلم بند کی۔ اِن ہدایات میں باسیل عملی زندگی پر کم اور راہبانہ زندگی کے اصولوں پر زیادہ دھیان دیتا ہے۔

---

[a] ἀσκητικά (askētika)

جو راہب انتونی کی طرح معاشرے سے الگ رہتے ہیں اُنہیں باسیل شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک جگہ پر وہ یسوع مسیح کی مثال پیش کرتا ہے جس نے اپنی محبت دکھانے کے لئے شاگردوں کے پاؤں دھو دیئے۔ باسیل سوال کرتا ہے،

> تو پھر آپ کس کے پاؤں دھوئیں گے، کس کی خدمت کریں گے، کس کی نسبت آخر میں آئیں گے اگر آپ تنہائی میں اپنے واسطے زندگی گزاریں؟ بھائیوں کا مل کر اور یگانگت سے رہنا کتنا اچھا اور پیارا ہے۔ کیونکہ روح القدس اِس حالت کا موازنہ اُس تیل سے کرتا ہے جس کی خوش بو سردار کاہن سے پھیلتی ہے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے اگر انسان تنہائی میں رہے؟[12]

لہٰذا باسیل کا پورا زور رفاقت اور خدمت پر ہے۔ وہ لکھتا ہے،

> کون نہیں جانتا کہ انسان ایک مہذب اور رفاقت رکھنے والی مخلوق ہے، کہ وہ نہ تنہائی میں رہتا، نہ جنگلی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ہماری کوئی خصوصیت ہو تو یہ کہ ہم ایک دوسرے سے رفاقت رکھتے، ایک دوسرے کے ضرورت مند ہوتے اور اپنی نسل سے محبت رکھتے ہیں۔ اب چونکہ خداوند نے خود اِن چیزوں کے بیج ہم میں ڈال دیئے ہیں اِس لئے وہ اِن کے پھل کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ لہٰذا وہ فرماتا ہے، ''مَیں تم کو ایک نیا حکم دیتا ہوں، یہ کہ ایک دوسرے سے محبت رکھو (یوحنا 13:34)۔'' اور وہ ہماری روحوں کو اِس حکم پر عمل کرنے پر اُبھار کر تقاضا کرتا ہے کہ ہم ظاہر کریں کہ اُس کے شاگرد ہیں۔ کس طرح؟ نشانوں اور معجزوں سے نہیں، گو اُس نے اُنہیں روح القدس میں یہ کرنے کی قوت بھی عطا کی تھی۔ لیکن وہ کیا فرماتا ہے؟ ''اگر تم ایک دوسرے سے محبت رکھو گے تو سب جان لیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو (یوحنا 13:35)۔'' اور

> ہر جگہ وہ اِن احکام کو اِس بات سے وابستہ کرتا ہے کہ جو بھی اپنے پڑوسی پر نیکی کا اظہار کرے وہ مجھ پر ہی نیکی کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے، ''کیونکہ میں بھوکا تھا اور تم نے مجھے کھانا کھلایا، مَیں پیاسا تھا'' وغیرہ۔ نیز، ''جو کچھ تم نے میرے اِن سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے لئے کیا وہ تم نے میرے ہی لئے کیا۔''[13]

باسیل کی یہ باتیں نہ صرف خیالی پلاؤ تھیں بلکہ اُس نے اِنہیں عملی جامہ پہنایا۔ وہ انتظام چلانے کی نعمت رکھتا تھا، اور بعد میں جب بشپ بنا تو اپنی یہ رویا بڑے پیمانے پر لایا۔ اُس نے دھیان دیا کہ راہب کلیسیا کی خدمت میں شریک ہو جائیں۔ اُس نے قیصریہ شہر میں نہ صرف خانقاہیں بلکہ غریبوں کے لئے ہسپتال اور زائرین کے لئے سرائے بھی قائم کئے۔ اُس کا اِس پر زور مشہور ہوا کہ جو مسیح میں ہے اُس کا پہلا فرض محبت ہے چاہے راہب ہو چاہے عام شخص۔ بعد میں مغرب کے راہب خاص کر اُسی کے نمونے پر چل پڑے۔

تاہم ہم نہیں کہہ سکتے کہ باسیل کپدُکیہ کی راہبانہ زندگی کا بانی تھا۔ اُس نے خود بہت کچھ ایک راہب بنام یوستتھیُس از سِبستے[a] سے سیکھ لیا جو 330ء سے آرمینیا میں راہبوں کی جماعتیں قائم کرنے لگا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب پخومیُس، مکاریوس اور امون یہ کچھ مصر میں کر رہے تھے۔

دوسرے، باسیل کی بہن مکرینہ[b] نے اُس سے پہلے راہبانہ زندگی اپنائی تھی۔ جب مکرینہ 12 سال کی تھی تو اُس کی منگنی ہوئی۔ منگیتر فوت ہوا تو مکرینہ نے شادی کرنے سے انکار کیا۔ باپ کی فوت پر پورا خاندان پُنتُس میں شفٹ ہوا، اور وہاں مکرینہ دعا کرنے، سادہ کھانے اور گھر کے کام میں لگ گئی۔ گھر کا کام غلام کا کام سمجھا جاتا تھا، اور یہ کرنے سے اُس نے غلام کا سا کردار اپنا لیا۔ بعد میں اُس نے اپنی ماں کو بھی یہ زندگی اپنانے

Eustathius of Sebaste[a]
Makrina[b]

پر قائل کیا۔ ہوتے ہوتے گھر خانقاہ بن گیا، اور تمام افراد برابر ہو گئے۔ سب ایک ہی میز پر کھانا کھاتے اور ایک ہی طرزِ زندگی گزارتے تھے۔ کوئی بھی عُہدہ نہ رہا۔

کچھ بیوائیں بھی اُن کے ساتھ جا ملیں، اور جب کال پڑ گئی تو اُنہوں نے کئی ایک لڑکیوں کو پناہ دی۔ ہوتے ہوتے جو رجحان تقریباً 350ء میں خاندان کی صورت میں شروع ہوا تھا وہ 380ء تک ایک پکا راہبانہ انتظام بن گیا تھا۔

مکرینہ کے علاوہ اُس کا بھائی نَوکرتِس[a] بھی راہبانہ زندگی کا تجربہ کرنے لگا۔ 352ء میں وہ اپنے ایک نوکر کے ساتھ خاندانی جنگل کی تنہائی میں جا بسا۔ ساتھ ساتھ وہ شکار کرنے اور مچھلی پکڑنے سے کچھ مقامی عمر رسیدہ افراد کو سہارا دیتے تھے۔

غرض، باسیل کے سامنے راہبانہ زندگی کے دو مختلف نمونے تھے: مکرینہ کا راہبانہ گھرانہ اور نَوکرتِس کی معاشرے سے الگ زندگی۔ لیکن 357ء میں نَوکرتِس اپنے نوکر سمیت مچھلی پکڑتے وقت ڈوب گیا۔ لگتا ہے کہ باسیل نے ابتدا میں اپنے بھائی کا کام اپنا لیا۔ لیکن ہوتے ہوتے اُس نے بھائی کا انتظام اپنی رویا کے مطابق بدل دیا۔

اِس سے ہم کئی دل چسپ نتیجے نکال سکتے ہیں۔ شام اور فلسطین کی طرح کپدُکیہ میں بھی تقریباً اُسی وقت راہب کے گروہ وجود میں آئے جب وہ مصر میں پیدا ہوئے۔ نیز، گو باسیل کپدُکیہ میں راہبوں کا بانی نہیں تھا لیکن وہ خدمت گزار راہبانہ زندگی کا ایک اہم نمائندہ ہے۔ اُس کا خاص تحفہ وہ زور ہے جو اُس نے راہبوں کی خدمت پر دیا۔

Naukratis[a]

باب 18

آبا کی کہاوتیں

جب راہب اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تو وہ کیا کرتا تھا؟ وہ غور و خوض کرتے کرتے ذہن میں سے گزرنے والے اُن خیالات کو نوٹ کرتا جو آزمائش یا پریشانی کا باعث تھے۔ جب ابّا کے پاس آتا تو یہ کچھ اُسے پیش کرتا۔ تب ابّا اُسے کوئی ہدایت دیتا تھا۔

مثلاً ایک شاگرد نے ابّا کے پاس آ کر پوچھا،

> ''مَیں کیا کروں؟ کیونکہ میری روح کے خواب میری عقل و سمجھ کو اندھیرا کر دیتے ہیں، اور میری روح پرانی عادت کے باعث اِن سے مزہ بھی لیتی ہے۔'' مقدّس نے جواب دیا، ''آپ نے اپنے ذہن کو اِن تصورات سے دُور نہیں کیا، اِسی لئے یہ گندی خواہش برداشت کر رہا

> ہے۔ اب وہ کچھ کریں جو مَیں آپ کو بتاتا ہوں۔ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو جاگتی حالت میں لائیں اور بیدار حالت میں دعا کرتے رہیں۔ تب آپ جلد ہی اِن سے آزاد ہو جائیں گے۔"[1]

بہت دفعہ شاگرد اِتنا ہی کہتا تھا، "ابّا، مجھے بات فرمائیں کہ مَیں کس طرح نجات پاؤں۔" مثلاً

> ایک دن ایک بھائی ابّا مکاریوس مصری کے پاس آ کر بولا، "ابّا، مجھے بات فرمائیں کہ مَیں کس طرح نجات پاؤں۔" بزرگ نے فرمایا، "قبرستان میں جا کر مُردوں کو گالیاں دیں۔" بھائی نے جا کر مُردوں کو گالیاں دیں اور اُن پر پتھر پھینکے۔ تب وہ واپس آیا اور بزرگ کو اطلاع دی۔ اُس نے پوچھا، "کیا اُنہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟" اُس نے جواب دیا، "نہیں۔" تب بزرگ بولا، "کل دوبارہ جا کر مُردوں کی تعریف کریں۔" بھائی چلا گیا۔ اب اُس نے مُردوں کی تعریف کی، "اے رسولو، مقدّسو، اے راست بازو۔" پھر بزرگ کے پاس واپس آ کر کہا، "مَیں نے اُن کی تعریف کی ہے۔" اُس نے پوچھا، "کیا اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا؟" بھائی بولا، "نہیں۔"
>
> تب مکاریوس بولا، "آپ کو معلوم ہے کہ گو آپ نے اُن کی اِتنی بےعزتی کی لیکن اُنہوں نے جواب نہ دیا۔ اور گو آپ نے اُن کی اِتنی تعریف کی تاہم اُنہوں نے کچھ نہ کہا۔ اگر نجات پانا چاہیں تو آپ بھی اِسی طرح مُردہ بن جائیں۔ مُردوں کی طرح نہ لوگوں کی ناانصافی کا حساب کریں، نہ اُن کی تعریف کا۔ یوں آپ نجات پا سکتے ہیں۔"[2]

کہاوتوں کے مجموعے

آبا کی یہ کہاوتیں دو صورتوں میں جمع ہوئی ہیں۔ دونوں صورتیں ''آبا کی کہاوتیں''[a] کہلاتی ہیں۔

کہاوتوں کی ایک صورت کو لغت کی طرح حروفِ ابجد کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔ مثلاً اگر قاری انتونی کی کہاوتیں ڈھونڈنا چاہیں تو وہ ''الف'' کی طرف رجوع کرے گا۔ باسیل کی کہاوتیں ''بے'' کے تحت آتی ہیں اور مکاریوس کی میم کے تحت۔

دوسری کہاوتوں کو مختلف مضامین کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔ مثلاً مختلف راہبوں کی کہاوتیں ''بلاناغہ دعا'' کے تحت آتی ہیں اور اِسی طرح ''میزبانی،'' ''حلیمی'' اور دیگر مضامین کے تحت۔

یہ کہاوتیں گو یونانی میں قلم بند ہوئیں لیکن پہلے قُبطی زبان میں پیش کی گئیں۔ اِن کی اکثریت شمالی مصر اور خاص کر سکیتِس سے ہے۔ لیکن غالباً وہ فلسطین میں قلم بند ہوئیں۔ اِن مرکزی یونانی کہاوتوں کے علاوہ آبا کی کہاوتیں دیگر کئی زبانوں میں قلم بند ہوئی ہیں۔

کہاوتوں کا مقصد

اِن کہاوتوں کا کیا مقصد تھا؟

پہلے یہ نوٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر ''نجات کا کلام'' ایک خاص شاگرد کو بتایا گیا ہے۔ بے شک قاری اِن سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، لیکن پہلے یہ ایک خاص شخص کی مدد کے لئے کہی گئی ہے۔ مثلاً ایک دن ابّا یُوپرپیپُس[b] نے ایک بزرگ راہب سے ''نجات کا کلام'' مانگا۔ بزرگ نے جواب دیا، ''اگر آپ نجات پانا چاہیں تو جب کسی سے ملنے جائیں تو اِس سے پہلے نہ بولیں کہ آپ سے بات کی جائے۔'' شائد یہ مشورہ

---

[a] apophthegmata patrum
[b] Euprepriu s

قاری کو خاص نہ لگے، لیکن یُوپرییپیُس کا دل چھِد گیا اور اُس نے توبہ کی۔ اُس نے فرمایا کہ گو مَیں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن مجھے کہیں بھی اِس مشورے سے بہتر ہدایت نہیں ملی۔[3]

دوسرے، ابّا کو ایک قسم کا نبی سمجھا جاتا تھا۔ نبی حالات کا باطنی پہلو معلوم کر کے خدا کا کلام سناتا تھا۔ ابّا بھی یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ شاگرد کے دل میں جھانک کر اُسے خدا کی طرف سے پیغام سناتا ہے۔ کچھ میں یہ نعمت حد سے زیادہ نمایاں تھی۔ مثال کے طور پر انتونی کے شاگرد ابّا پولس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُسے خداوند سے ہر انسانی روح کی حالت دیکھنے کی نعمت ملی تھی، یوں جس طرح ہم دوسروں کے چہرے دیکھتے ہیں۔[4]

چونکہ "نجات کا کلام" خدا سے ملتا تھا اِس لئے کبھی فوراً ملتا تھا اور کبھی دیر سے۔ ایک دن دو راہب ابّا پنبو سے "نجات کا کلام" حاصل کرنے آئے تو اُس نے چار دن تک جواب نہ دیا۔ پوچھنے والے مایوس ہو کر جانے لگے تو ابّا کے شاگردوں نے اُنہیں تسلی دے کر کہا، "بزرگ کی عادت یہ ہے کہ جب تک خدا یقین نہ دلائے جلدی میں کوئی بات نہ کریں۔" آخر میں اُس نے اُنہیں "نجات کا کلام" پیش کیا۔[5]

غرض ہم یہ نہ تصور کریں کہ ابّا عام مشورہ دیتا تھا۔ وہ روحانی حقیقتیں معلوم کر کے خدا کی طرف سے ہدایت دیتا تھا۔ اکثر ریگستان کی خاموشی میں پیدا ہوئی یہ ہدایات مختصر اور جامع ہیں۔ ابّا ہر لفظ تول تول کر پیش کرتا تھا۔

اِن ہدایات کا ایک اَور پہلو بھی ہے۔ چونکہ "نجات کا کلام" خدا کی طرف سے تھا اِس لئے لازم تھا کہ پوچھنے والا اُس پر عمل بھی کرے۔ اِس کے تابع رہنے کے بغیر روحانی ترقی ناممکن تھا۔ مذکورۂ بالا ابّا مکاریوس پوچھنے والے کو مُردوں کو گالیاں دینے اور اُن کی تعریف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ شاگرد کو وجہ نہیں دی جاتی۔ لیکن تابع رہنے کا حقیقی چیلنج بعد میں آتا ہے۔ شاگرد کا فرض ہے کہ جیتے جی ابّا کے کلام کے تابع رہے۔ کلام یہ ہے کہ مُردے کی مانند بننا، جو نہ گالی اور نہ تعریف پر دھیان دیتا ہے۔ ابّا

اور شاگرد کا تعلق اِس اطاعت پر منحصر تھا۔ جس طرح ایک کہاوت فرماتی ہے، ''اونٹ کی مانند ہو۔ اپنے گناہوں کو اُٹھائے ہوئے بندھی ہوئی حالت میں خدا کی راہ کو جاننے والے کے پیچھے چل۔''[6]

ابّا کے کلام کی تابع داری لازم تھی۔ جب اِس کی کمی تھی تو ''نجات کا کلام'' پیش کرنا مشکل ہی تھا۔ درجِ ذیل مثال یہ ظاہر کرتی ہے،

> کچھ بھائی ابّا فیلکس سے ملنے آئے۔ اُن کے ساتھ کچھ تھے جو راہب نہیں تھے۔ اُنہوں نے ابّا کو کہا کہ ہمیں کوئی کلام پیش کریں۔ لیکن بزرگ خاموش رہا۔ اُنہوں نے اُسے بہت سمجھایا تو وہ بولا، ''اچھا، آپ کلام سننا چاہتے ہیں؟'' اُنہوں نے جواب دیا، ''جی، ابّا۔'' تب بزرگ نے فرمایا، ''آج کوئی کلام نہ رہا۔ پہلے بھائی بزرگوں سے پوچھ کر اُن کی باتوں پر عمل کرتے تھے۔ جواب میں بزرگوں کو خدا کی طرف سے یہ نعمت ملتی تھی کہ کس طرح بولنا ہے۔ لیکن اب بھائی اُس پر عمل نہیں کرتے جو سنتے ہیں، اِس لئے خدا نے بزرگوں کو کلام دینے کے فضل سے محروم کر دیا ہے۔ اب اُنہیں کوئی کلام نہیں ملتا جو پیش کر سکیں، کیونکہ کوئی نہیں رہا جو اُن کی باتوں پر عمل کرے۔'' یہ سن کر مذکورہ بھائیوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، ''ابّا، ہمارے لئے دعا کریں۔''[7]

یہ کہاوت ظاہر کرتی ہے کہ ''نجات کا کلام'' خدا کی ایک نعمت تھی جو تابع داری کا تقاضا کرتی تھی۔ ابّا کے کلام پر عمل نہ کرنے سے نہ صرف شاگرد بلکہ ابّا بھی متاثر ہوتا تھا۔ اِس صورت میں ابّا ''نجات کا کلام'' پیش کرنے کی نعمت سے محروم ہو جاتا تھا۔

راہبوں کے کچھ مرکزی خیالات

راہبوں میں کون سے اہم مضامین پائے جاتے ہیں؟

خیالات کی جانچ پڑتال

راہب اکثر وقت اپنے کمرے کی علیٰحدگی میں گزارتا تھا۔ اِسی کٹھالی میں وہ سوتا، کام کرتا اور روحانی ترقی حاصل کرتا تھا۔ تاہم گو اکثر وقت تنہا رہتا لیکن کسی ابّا کے ساتھ تعلق لازمی تھا۔ ابّا اُس کا اُستاد تھا جس کے پاس وہ باقاعدگی سے جاتا اور جس کو وہ اپنے خیالات پیش کرتا تھا تاکہ اُن کی جانچ پڑتال ہو۔

کیتھولک چرچ کے ممبران بھی فادر کے پاس جا کر اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تاکہ معافی مل جائے۔ لیکن مصری راہبوں کا یہ عمل اِس رسم سے سراسر فرق تھا۔ اول، ابّا اکثر فادر نہیں تھا۔ دوسرے، ابّا سے ملنے کا مقصد گناہ سے معافی نہیں تھا بلکہ اُن خیالات کی جانچ پڑتال جو راہب کے ذہن میں اُبھرتے رہتے تھے۔

لازم نہیں تھا کہ یہ کوئی آزمائش ہو بلکہ یہ کوئی بھی خیال ہو سکتا تھا جس نے راہب کو قیدی بنائے رکھا ہو۔ شاید وہ کسی چیز یا شخص کا شدید آرزومند ہو، شاید کوئی ناراضی یا غم اُسے دبائے رکھے۔ ابّا شاگرد کا اِس میں مددگار ہوتا تھا۔ جب شاگرد اپنے خیالات پیش کرتا تو ابّا خیالات میں امتیاز کرنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ وہ خیالات پر روشن ڈالتا تھا۔ وہ دکھا سکتا تھا کہ کیا کوئی خیال بُرا ہے یا اچھا؟ کیا اُسے دبانے کی ضرورت ہے؟ یا کیا اُسے نظرانداز کرنا یا اُس پر عمل کرنا چاہئے؟ اِس سلسلے میں ابّا دایہ کا سا کردار ادا کرتا تھا۔ بےشک وہ لیکچر بھی دے سکتا تھا، لیکن زیادہ تر وہ شاگرد کی باتیں سن کر اُسے ایسی ہدایات دیتا جن سے شاگرد خود صحیح نتیجے تک پہنچ سکے۔

مسیح نے فرمایا تھا، ”مبارک ہیں وہ جو خالص دل ہیں، کیونکہ وہ اللہ کو دیکھیں گے۔“[a] راہب کو تمام ایسی چیزوں سے آزاد ہونا تھا جو خدا کو دیکھنے سے روک سکیں۔ ہر دھوکا، ہر جھوٹ، ہر غلط خیال ذہن سے نکالنا تھا تاکہ خدا کو دیکھنے کے قابل بن جائے۔ ابّا اِس میں اُس کی مدد کرتا تھا۔

---

[a] متی 8:5

کچھ راہب ہفتے میں دو یا تین دفعہ اپنے ابّا سے ملتے تھے بلکہ اگر ضرورت ہو وہ کبھی کبھار رات کے وقت بھی یا بار بار آ سکتے تھے۔ ایک مثال لیجئے،

> ایک بھائی کا ذکر ہے جسے ابلیس کفر بکنے پر اُکساتا رہتا تھا۔ لیکن اُسے اِس بات کی اِتنی شرم تھی کہ وہ یہ کسی کو بتا نہ سکا۔ اب جہاں بھی اُس نے سنا کہ کوئی عظیم ابّا ہو وہاں وہ اُس سے ملنے جاتا تھا تاکہ اپنی یہ آزمائش سنائے۔ لیکن جب کبھی کسی بزرگ کے پاس پہنچتا تو شرم کے مارے اِس بات کا اقرار نہ کر پاتا۔ بہت دفعہ وہ ابّا پوئیمین کے پاس بھی گیا۔ بزرگ نے جانچ لیا کہ اُس کے اندر خیالات ہیں، اور اُسے دُکھ ہوا کہ بھائی یہ بتانے کے قابل نہیں۔ ایک دن جب وہ دوبارہ آ کر جانے لگا تو خیرباد کرتے وقت ابّا بول اُٹھا، ”دیکھو، اِتنی دیر سے آپ میرے پاس آیا کرتے ہیں تاکہ مجھے وہ خیالات پیش کریں جو آپ کو تنگ کر رہے ہیں۔ لیکن جب پہنچتے تو یہ بتانا نہیں چاہتے بلکہ ہر دفعہ اُن کے تحت دبے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ بیٹے، اب مجھے بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے؟“
>
> اُس نے جواب دیا، ”شیطان مجھے خدا پر کفر بکنے پر اُکسانے کی کوشش کرتا ہے، اور مجھے اِتنی شرم آتی ہے کہ مَیں یہ کسی کو نہیں بتا سکتا۔“ بزرگ کو یہ بات بتاتے ہی شاگرد کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بزرگ نے کہا، ”بیٹے، دبے مت رہنا۔ آئندہ اگر یہ خیال آئے تو یہ کہنا کہ اے ابلیس، تیرا کفر تجھ پر آئے، کیونکہ میری روح یہ کرنا نہیں چاہتی۔ جو بھی کام روح نہیں کرنا چاہتی وہ تھوڑی دیر کا ہے۔“ بھائی شفا پا کر چلا گیا۔[8]

یہاں خیالات کی جانچ پڑتال کا طریقہ خوب نظر آتا ہے۔ کفر کے خیالات شاگرد کو تنگ کرنے لگتے ہیں، اور وہ اِن سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ لیکن شرم کے مارے وہ یہ

بات کسی بزرگ کو پیش نہیں کر سکتا۔ ابّا کو تو اُس کی روحانی حالت معلوم ہے، لیکن وہ اُسے مجبور نہیں کرتا۔ تو بھی ایک دن اُسے شاگرد کی دبی حالت دیکھ کر اِتنا دُکھ ہوتا ہے کہ وہ اُسے یہ خیالات ظاہر کرنے کو کہتا ہے۔ اور جب شاگرد اُسے صاف بات بتاتا ہے تو فوراً اُس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بزرگ کا مشورہ سن کر وہ اِس آزمائش سے آزاد ہو جاتا ہے۔

سکون

راہب اپنے کمرے کی تنہائی میں کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ ایک خاص ٹارگیٹ ہیسخیا[a] کا حصول تھا۔ اِس یونانی لفظ کا مطلب سکون، خاموشی، آرام ہے۔ ابّا انتونی نے ایک دفعہ فرمایا،

> ”جو مچھلیاں دیر سے پانی سے باہر رہیں وہ مر جاتی ہیں۔ اِسی طرح جو راہب اپنے کمرے سے باہر رہیں یا دنیاوی لوگوں کے ساتھ اپنا وقت ضائع کریں وہ اپنے سکون (ہیسخیا) کی کامل حالت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جس طرح مچھلیوں کو جلدی سے سمندر میں واپس آنا ہے اُسی طرح ہمیں اپنے کمرے میں واپس بھاگنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دیر سے باہر رہ کر اپنے اندر کی چوکس حالت کو بھول جائیں۔“[9]

راہبوں کا تجربہ ہے کہ وہ صرف اپنے کمرے کی تنہائی میں یہ سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی نے ابّا روفس سے پوچھا کہ سکون (ہیسخیا) کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا،

[a] ἡσυχία (hēsychia)

> سکون سے مراد یہ ہے کہ ہم خدا کا خوف اور عرفان رکھ کر اپنے کمرے میں بیٹھے رہیں۔ ساتھ ساتھ ہم دوسروں کی غلطیاں یاد کرنے اور مغرور ہونے سے پرہیز کریں۔ ایسا سکون تمام خوبیاں پیدا کر کے راہب کو دشمن کے جلنے والے تیروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ سکون ہونے ہی نہیں دیتا کہ راہب اِن تیروں سے زخمی ہو جائے۔ ہاں بھائی، اِس کو اپنا لیں۔ آنے والی موت کو پیشِ نظر رکھ کر یاد رکھیں کہ آپ کو معلوم نہیں کہ چور کب آئے گا۔ نیز، اپنی روح کے واسطے چوکس رہیں۔[10]

سکون کی کنجی خدا کا خوف اور عرفان ہے۔ یہ سکون کی پہلی شرط ہے۔ خدا کے خوف اور عرفان کی بنیاد پر راہب اپنے خیالات کو خدا کے جلالی حضور لاتا ہے تاکہ اُن کی جانچ پڑتال ہو جائے اور وہ پاک صاف ہو جائیں۔ اگر دوسروں کی غلطیاں یاد آئیں تو اُنہیں اپنے ذہن سے نکالنا ہے۔ اِسی طرح مغرور خیالات چھوڑنے ہیں۔ تب ہی حقیقی سکون حاصل ہوگا، جس سے باقی تمام خوبیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن اِس کے لئے ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنی فانی حالت کو یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ خیال کہ سکون خدا کے حضور ہی پیدا ہوتا ہے کئی ایک کہاوتوں میں پیش آتا ہے۔ کسی نے ابّا یسعیاہ سے پوچھا کہ راہب کو اپنے کمرے میں کس طرح سکون کی زندگی گزارنی ہے؟ اُس نے جواب دیا، ”کمرے میں سکون کی زندگی گزارنے سے یہ مراد ہے کہ ہم خدا کے حضور اوندھے منہ ہو کر پوری کوشش سے دشمن کے ہر بوئے ہوئے خیال کی مخالفت کریں۔“[11] کسی نے خوب کہا، ”راہب کا کمرا بابل کا وہ بھٹا ہے جس میں تینوں جوانوں نے خدا کا فرزند دیکھا، اور یہ بادل کا وہ ستون ہے جس میں سے خدا موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔“[12] اِسی بھٹے میں راہب کو خدا کا جلال حاصل ہوا، اور اِسی وسیلے سے وہ سکون حاصل کر سکتا تھا۔

ہَوس

یونانی میں راہب کا ایک نام اپوٹَیکٹِکُس[a] تھا جس کا مطلب ''چھوڑنے والا ، انکار کرنے والا'' ہے۔ یسوع مسیح نے فرمایا تھا، ''تم میں سے جو بھی اپنا سب کچھ نہ چھوڑے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔''[b] راہب اپنے آپ کو ایسا چھوڑنے والا سمجھتا تھا، کیونکہ اُس نے اپنی ملکیت، نوکری، عُہدہ اور خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔ اب اُسے فرشتے کی سی پاک زندگی گزارنی ہے۔ اور فرشتے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ شادی نہیں کرتا۔ جس طرح اتھناسیُس فرماتا ہے،

> خدا کا فرزند ہمارا خداوند اور نجات دہندہ ہماری خاطر انسان بن گیا۔ اُس نے موت کو منسوخ کرکے ہماری نسل کو فنا کی غلامی سے آزاد کر دیا۔ دیگر تمام نعمتوں کے علاوہ اُس نے بخش دیا کہ ہمیں زمین پر ہی کنوارپن حاصل ہو، وہی نعمت جو فرشتوں کی قدوسیت کی صورت ہے۔[13]

لیکن راہب کس طرح شادی کرنے کے فطری رجحان سے نپٹتے تھے؟ تنہائی میں بھی وہ کئی ایک آزمائشوں میں پڑ سکتے تھے۔ سوال اُٹھتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کس طرح پاک صاف رکھ سکتے تھے؟ ابّا اُلمپیُس[c] اِس کی ایک مثال دیتا ہے،

> کِلّیہ کا رہنے والا ابّا اُلمپیُس زناکاری کی آزمائش میں پڑ گیا۔ خیال اُس میں ابھر آیا، ''جا کر کسی عورت سے شادی کر۔'' اُس نے کھڑا ہو کر گارے سے عورت کا پُتلا بنایا اور مذکورہ خیال سے کہا، ''لے، تیری بیوی۔ اب بہت محنت درکار ہے تاکہ اُس کی پرورش کرے۔'' چنانچہ

---

[a] ἀποτακτικός (apotaktikos)

[b] لوقا 14:33

[c] Olympius

> اُس نے خوب محنت مشقت کی۔ ایک دن کے بعد اُس نے گارے سے اپنے لئے بچہ بنا کر مذکورہ خیال سے کہا، ''تیری بیوی کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ اب مزید محنت درکار ہے تاکہ اپنے بچے کی پرورش کر کے اُسے پناہ دے سکے۔'' یہ کرتے کرتے وہ نہایت تھک گیا اور مذکورہ خیال سے کہا، ''مَیں یہ سخت کام برداشت نہیں کر سکتا۔'' مذکورہ خیال بولا ، ''اگر تُو یہ کام برداشت نہ کر سکے تو بیوی کی تلاش مت کرنا۔'' جب خدا نے اُس کی محنت دیکھی تو اُس نے آزمائش کا یہ حملہ اُس سے دُور کر دیا، اور اُسے آرام ہوا۔[14]

لیکن ہر راہب اپنی آزمائشوں پر فتح مند نہ رہا۔ ایسے راہبوں کا ذکر بھی ہے جو گناہ میں گر گئے۔ مثلاً ایک راہب نے شہر میں جا کر زنا کی۔[15] دوسرے نے ریگستان میں اپنے پاس عورت رکھی۔[16] ہم جنسی تعلقات کا بھی خطرہ تھا۔ جب ایک لڑکا راہب بننا چاہتا تھا تو ابّا پِفنُوتیُس نے انکار کر کے فرمایا، ''دشمن کے حملوں کے باعث مَیں اجازت نہیں دیتا کہ عورت کا سا چہرہ سکیتِس میں ٹھہرے۔''[17]

ہَوس سے نپٹنے کے کیا طریقے تھے؟ اول، اُسے پہلوان کی طرح متواتر جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔

> بزرگوں کے ایک راہب نے زناکاری کے بارے میں فرمایا، ''اے سونے والے، کیا آپ نجات پانا چاہتے ہیں؟ جا کر محنت کریں، جا کر مشقت کریں، جا کر ڈھونڈیں تو مل جائے گا، جا کر جاگتے اور کھٹکھٹاتے رہیں تو آپ کے لئے دروازہ کھول دیا جائے گا۔ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو ہر ایک سے لڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جب اُنہیں ضربیں لگتی ہیں تو وہ نہ صرف کھڑے رہتے بلکہ تقویت پا کر انعام کا تاج

> حاصل کرتے ہیں۔ بہت دفعہ جب دو مرد ایک پر حملہ کریں تو وہ ضربوں سے تقویت پا کر مارنے والوں پر فتح پاتا ہے۔[18]

غرض زور اِس پر نہیں تھا کہ آزمائش بند ہو جائے بلکہ اِس پر کہ راہب پہلوان کی طرح اِس پر غالب آکر تقویت پائے۔ ایک راہبہ کا ذکر ہے جو 13 سال تک زناکاری کی آزمائش میں پڑی رہی۔ اُس نے کبھی دعا نہ کی کہ خدا یہ آزمائش دُور کرے بلکہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ اے میرے خدا، مجھے تقویت بخش دے۔[19]

دوسرے، اگر آزمائش ہو تو اِسے چھپانا نہیں بلکہ بزرگوں کو بتانا ہے۔

> ایک اَور بھائی کو زناکاری کی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ چودہ سال تک وہ پوری لگن کے ساتھ زُہد کرتا رہا۔ اِس پورے دوران وہ اِس ہدایت پر دھیان دیتا رہا کہ ہَوس سے رضامند مت ہونا۔ آخرکار اُس نے کلیسیا میں جا کر اپنا یہ معاملہ پوری جماعت پر ظاہر کی۔ تب اُسے ایک ہدایت دی گئی، اور سب نے اُس کی خاطر جد و جہد کر کے سات بار خدا سے دعا کی۔ تب جنگ تھم گئی۔[20]

ایک راہب کا ذکر ہے جو آزمائش کے باعث ایک رات کے دوران بار بار اپنے ابّا کے پاس گیا۔[21]

تیسرے، روزہ رکھنا تھا۔ بزرگ سمجھتے تھے کہ جو شخص روزہ رکھنے سے قاصر رہے وہ گناہ میں گرنے کے خطرے میں ہے۔ ایک نے فرمایا، "جو سنجیدگی سے روزہ رکھے اور بھوکا رہے اُس کی روح کو تنگ کرنے والے دشمن کمزور ہو جائیں گے۔"[22]

ہَوس پر قابو پانے کے لئے کچھ راہب انتہا تک جا سکتے تھے۔ ایک راہب کا ذکر ہے جو اپنی بیوی کو چھوڑ کر ریگستان میں جا بسا۔ اِس کے باوجود اُس کی بیوی کی یاد اُسے تنگ کرتی رہی۔ ایک دن اُسے بیوی کی موت کی خبر ملی تو وہ رات کو اپنے گاؤں واپس

آکر قبرستان گیا۔ اُس نے قبر کو کھول کر اپنے لباس کو بیوی کے خون سے لت پت کیا۔ وہ ریگستان میں واپس چلا تو لباس سے بدبو آنے لگی۔ اب جب کبھی اُسے ہَوس کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ یہ بدبودار لباس اپنے سامنے رکھ کر اپنے آپ سے کہتا، "دیکھ یہ وہ کچھ ہے جس کا تُو آرزومند ہے۔ اب یہ تیرے پاس ہے، اِس سے سیر ہو جا۔"[23]

لیکن ایسی کہاوتیں بھی ملتی ہیں جن میں حد سے زیادہ زُہد سے آگاہ کی جاتی ہے۔ ایک رنڈوے راہب کا ذکر ہے جو اپنی مرحوم بیوی کی یاد تلے دبا رہتا تھا۔ جب اُس نے بزرگوں کو یہ بتایا تو اُنہوں نے اُسے سخت ہدایات دیں۔ فائدہ کوئی نہ ہوا بلکہ وہ اِتنا کمزور ہوا کہ کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ ایک دن ایک پردیسی راہب اُس سے ملنے آیا۔ اُس کی حالت دیکھ کر اُسے صدمہ پہنچا۔ جب رنڈوے راہب نے اُسے وجہ بتائی تو اُس نے فرمایا،

> ابّا طاقت ور آدمی ہیں، اور اُنہوں نے آپ پر یہ بوجھ ڈالنے میں اچھا کیا ہے۔ لیکن ذرا میری بات سنیں، گو مَیں اِن معاملوں میں بچہ ہی ہوں۔ یہ تمام زُہد روک دیں، صحیح اوقات پر کچھ خوراک کھائیں، دوبارہ تقویت پائیں، تھوڑی دیر کے لئے خدا کی عبادت میں شریک ہو جائیں اور ذہن میں خداوند کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر آپ اپنی محنت سے غالب نہیں آ سکتے۔ انسان کا بدن لباس کی مانند ہے۔ اگر احتیاط سے اُس سے سلوک کریں تو بڑی دیر تک قائم رہے گا۔ لیکن اگر اُس کی پروا نہ کریں تو وہ گل سڑ جائے گا۔[24]

کئی ایک باتیں کہاوتوں میں پائی جاتی ہیں جو ہم کلام کی روشنی میں قبول نہیں کر سکتے۔ شادی کے بارے میں جو منفی خیال پایا جاتا ہے وہ کلام کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن کیا اُن کی ہَوس سے پاک رہنے کی کوششیں قابلِ تعریف نہیں ہیں؟ اِن سے ہم سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

غصہ

آبا کی کہاوتوں میں بار بار غصے پر قابو پانے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ گو راہب ریگستان میں رہتے تھے تاہم اُنہیں اپنے غصے کا سامنا کرنے کے کافی موقعے ملتے تھے۔ اُنہیں خود معلوم ہوا کہ جہاں بھی جائیں وہاں یہ مسئلہ رہے گا، کیونکہ یہ دل سے اُبھرتا ہے۔ اوگسطین اِس کی خوب مثال دیتا ہے، ”روزانہ لوگ کلیسیا میں آتے ہیں۔ وہ گھٹنے ٹیک کر اِتنے جھک جاتے ہیں کہ ماتھا فرش سے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اُن کے چہرے آنسوؤں سے تر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اِتنی فروتنی اور پریشانی کے ساتھ ساتھ وہ دعا کرتے ہیں، ’اے خداوند، میرا انتقام لے۔ میرے دشمن کو مار ڈال۔‘“[25]

انتقام کے خیالات سے نپٹنا راہبوں کے لئے بھی ایک بڑا چیلنج تھا۔ ایک راہب کا ذکر ہے جس نے ابّا سِسوئیس کے پاس جا کر اُسے بتایا کہ مَیں بدلہ لوں گا۔ ابّا نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بےفائدہ۔ بھائی نے اصرار کیا، ”جب تک بدلہ نہ لیا آرام نہیں کروں گا۔“ تب ابّا نے فرمایا، ”میرے بھائی، آئیں ہم دعا کریں۔“ اُس نے کھڑے ہو کر دعا کی، ”اے خدا، آئندہ ہمیں اِس کی ضرورت نہیں کہ تُو ہمارا لحاظ کرے، کیونکہ ہم خود ہی اپنا بدلہ لیں گے۔“ بھائی یہ سن کر بزرگ کے پاؤں میں گر گیا اور معافی مانگی۔[26] ابّا نے اِس مختصر دعا سے دکھایا کہ انتقام لینے سے ہم اُس کام کا انکار کرتے ہیں جو خدا ہماری خاطر کرتا آیا ہے۔ اگر ہم اُس کی مرضی کے تحت رہیں تو انتقام لینا ہمارے لئے ناممکن ہے۔

غصے کی آزمائش آبا میں عام تھی۔ ایک نے اقرار کیا، ”مَیں چودہ سال سے سکیتِس میں خدا سے التماس کرتا آیا ہوں کہ مجھے غضے پر غالب آنے کی توفیق دے۔“[27] وہ کس طرح اِس سے نپٹتے تھے؟ ایک کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دن سودہ بیچنے کے لئے بازار گیا۔ لیکن جب راستے میں غصہ آنے لگا تو وہ وہیں کے وہیں سودہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔[28]

اِس کا انتہا پسند طریقہ یہ تھا کہ راہب دوسرے راہبوں سے بھی دُور ہو جائے۔

ایک کا ذکر ہے جو راہبوں کی جماعت میں مضطرب رہتا تھا۔ بہت دفعہ وہ غصے بھی ہو جاتا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے آپ سے کہا، ”مَیں جا کر کہیں تنہائی میں رہوں گا۔ چونکہ کوئی نہیں ہو گا جس سے مَیں بات کروں یا جس کی بات سنوں اِس لئے مَیں سکون پاؤں گا اور میرا شدید غصہ بند ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ نکل کر ایک غار کی تنہائی میں ٹک گیا۔

ایک دن اُس نے اپنا برتن پانی سے بھر کر فرش پر رکھ دیا۔ لیکن رکھتے ہی وہ اُلٹ گیا۔ جب اُسے دوبارہ بھر دیا تو برتن پھر اُلٹ گیا۔ تیسری بار بھی یہی کچھ ہوا۔ راہب نے آگ بگولا ہو کر اُسے پٹخ دیا۔ تب اُس نے ہوش میں آ کر جان لیا کہ مَیں نے غصے کی بدروح سے دھوکا کھا لیا ہے۔ وہ بولا، ”دیکھ، تنہائی میں بھی یہ مجھ پر غالب آ گئی ہے۔ چنانچہ مَیں جماعت کے پاس واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ محنت، صبر اور خدا کی خاص مدد درکار ہیں۔“ وہ اُٹھ کر اپنی پہلی جگہ پر واپس چلا گیا۔[29]

راہب نے پہچان لیا کہ حقیقی جنگ میرے اندر ہی ہے۔ کبھی کبھی بھاگنا مفید ہے۔ لیکن بہت دفعہ یہ کافی نہیں ہے۔ ایک ابّا کے منہ سے خون نکلا تو دوسروں نے وجہ پوچھی۔ اُس نے جواب دیا، ”کسی بھائی کے الفاظ سے مجھے ٹھیس لگی۔ مَیں نے بہت جد و جہد کی تاکہ اُسے پتا نہ چلے، اور مَیں نے خدا سے التماس کی کہ یہ الفاظ مجھ سے دُور کر دے۔ تب یہ منہ میں خون بن گئے جو مَیں تھوک کر منہ سے خارج کر سکا۔ اب مجھے سکون ہے بلکہ مَیں ٹھیس کو بھول گیا ہوں۔“[30] ابّا جدید دور کے کچھ ماہرِ نفسیات کی یہ بات نہیں مانتے تھے کہ انسان کو ہر جذبہ اُگلنا چاہئے۔ وہ جانتے تھے کہ بہت دفعہ یہ کرنے سے مزید گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف اُنہیں معلوم ہوا تھا کہ غصے کی جڑ انسان کے اندر ہی ہوتی ہے۔ وہاں سے اُسے اُکھاڑنے کی ضرورت ہے۔

لیکن یہاں ایک اَور پہلو بھی نظر آتا ہے۔ ریگستان میں بھی ایک دوسرے کو مجروح کرنے کا خطرہ تھا۔ کہاوتوں میں بہت دفعہ زبان کے غلط استعمال سے آگاہ کی جاتی ہے۔

> کسی نے ابّا پوئیمین سے پوچھا کہ جب کلام فرماتا ہے کہ کسی سے بُرائی کے بدلے بُرائی مت کرنا تو اِس کا کیا مطلب ہے؟ ابّا پوئیمین نے جواب دیا، ”جذبے کے چار درجے ہوتے ہیں۔ اول، وہ دل سے اُبھر آتا ہے۔ دوسرے، وہ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے، تیسرے وہ زبان پر آ جاتا ہے اور چوتھے وہ بُرائی کے بدلے بُرائی کرتا ہے۔ غرض، اگر آپ دل کو پاک صاف رکھ سکیں تو جذبہ چہرے تک نہیں پہنچے گا۔ بولنے سے گریز کریں۔ لیکن اگر بول چکے ہوں تو جلد ہی اپنے آپ پر قابو پائیں، ایسا نہ ہو کہ آپ بُرائی کے بدلے بُرائی کریں۔[31]

یہاں ابّا غضب کی جڑ ظاہر کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ انسان اِسے جڑ سے یعنی دل سے نکالے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُسے چہرے تک روکنا۔ اگر یہ بھی بس کی بات نہ ہو تو بولنا بند کرنا۔ اگر یہ ہوا ہو تو پوری کوشش سے اپنے آپ پر قابو پانا تاکہ بُرائی کے بدلے بُرائی نہ کی جائے۔ یعنی مسئلے کا حل دل میں ہے، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو بہتر ہے کہ ہم خاموش رہ کر جذبے کو دبائیں۔

غصے پر قابو پانے کا ایک اَور طریقہ فروتنی تھی۔ جو فروتن ہے وہ اِس سے بہتر نپٹ سکتا ہے۔ جب ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ فروتنی کیا ہے تو اُس نے جواب دیا، ”اگر کسی بھائی نے آپ کا گناہ کیا ہو اور آپ اُس کو اِس سے پہلے کہ وہ توبہ کرے معاف کریں تو آپ فروتن ہیں۔“[32] یعنی جو فروتن ہے وہ دوسروں کو شرط کئے بغیر معاف کرتا ہے۔ وہ توقع نہیں کرتا کہ دوسرے مجھ سے معافی مانگیں یا توبہ کریں۔

ماتم

ریگستان کے بزرگوں کے نزدیک ایک مرکزی آیت متی 4:5 ہے، ''مبارک ہیں وہ جو ماتم کرتے ہیں، کیونکہ اُنہیں تسلی دی جائے گی۔'' یونانی میں فعل پِنتھیو[a] استعمال ہوا ہے۔ بزرگوں کے نزدیک اِس آیت کا ماتم کرنے والا اپنے گناہوں کا ماتم کر رہا ہے۔ سُریانی ترجمے بنام پشیطہ میں لفظ اویلا (aḇilā) استعمال ہوا ہے، اور شام کا راہب اویلا یعنی ماتم کرنے والا کہلاتا تھا۔

اِس کا یہ مطلب نہیں کہ بزرگ اُداس اور مایوس رہتے تھے۔ اُن کے لئے ماتم ایک مثبت جذبہ تھا، توبہ کا وہ جوش جو اُنہیں خدا کے قریب لاتا تھا۔ کیونکہ صرف وہ جو اپنے گناہوں کا ماتم کرے پاک صاف ہو کر خدا کے حضور آ سکتا ہے۔ البتہ اِس سے ہٹ کر غم اور دُکھ اُن کے پیشِ نظر گناہ تھا۔ اِس کے لئے وہ لفظ لِپے[b] استعمال کرتے تھے۔ لِپے کا مطلب ''مایوسی، اُداسی'' ہے۔ یہ جذبہ منفی ہے، کیونکہ یہ انسان کو خدا کی طرف نہیں بلکہ اُس سے دُور لے جاتا ہے، اِس لئے اُس کا سامنا کرنا ہے۔ جو اُداس ہے وہ خدا کی طرف نہ دیکھنے کے باعث مایوس ہے۔ غرض، راہب اپنے آپ کو لگاتار گناہ کا ماتم کرنے والے سمجھتے تھے۔

> ابّا یسعیاہ نے ابّا مکاریوس سے مشورہ کر کے کہا، ''مجھے کوئی ہدایت دیں۔'' بزرگ نے جواب دیا، ''لوگوں سے بھاگ جائیں۔'' ابّا یسعیاہ بولا، ''لوگوں سے بھاگنے کا کیا مطلب ہے؟'' بزرگ نے جواب دیا، ''اپنے کمرے میں بیٹھے اپنے گناہوں کے باعث رونا۔''[33]

راہبوں میں ایسے بھی تھے جن سے بڑے گناہ سرزد ہوئے تھے۔

---

[a] πενθέω (pentheo)
[b] λύπη (lypē)

سکیتِس کے ایک ابّا بنام اپولو[a] کا ذکر ہے جو پہلے جنگلی قسم کا گلہ بان تھا۔ ایک دن اُس نے کھیت میں ایک حاملہ عورت دیکھی۔ ابلیس کے اُکسانے پر وہ بولا، ''مَیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بچہ کس طرح عورت کے پیٹ میں لیٹا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے اُسے پھاڑ کر بچے کو دیکھا۔ لیکن فوراً اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا[b] اور اُس کا دل چھد گیا۔ اِسی حالت میں وہ سکیتِس پہنچا اور آبا کو وہ کچھ بتایا جو اُس سے سرزد ہوا تھا۔ اُن کا ایک گیت اُس کے ذہن میں بیٹھ گیا، ''ہماری عمر 70 سال یا اگر زیادہ طاقت ہو تو 80 سال تک پہنچتی ہے، اور جو دن فخر کا باعث تھے وہ بھی تکلیف دہ اور بےکار ہیں (زبور 10:90)۔'' اپولو نے اُن سے کہا، ''مَیں 40 سال کا ہوں۔ اِس دوران مَیں نے ایک دعا بھی نہیں کی۔ لیکن اب اگر میں مزید 40 سال جیتا رہوں تو خدا سے دعا کرنے سے کبھی باز نہیں آؤں گا تاکہ وہ میرے گناہوں کو معاف کرے۔'' وہ کبھی ہاتھ کا کام نہیں کرتا بلکہ ہر وقت یہ دعا کرتا تھا، ''مَیں انسان کی حیثیت سے گناہ کرتا رہا، لیکن تُو خدا کی حیثیت سے کفارہ دے۔'' وہ یہ دعا دن رات دہرانے کا عادی بن گیا۔ ساتھ رہنے والے ایک بھائی نے ایک دفعہ اُسے یہ کہتے ہوئے سنا، ''اے خداوند، مَیں نے تجھے تنگ کیا ہے۔ مجھے معاف کر تاکہ مَیں تھوڑی دیر کے لئے آرام کر سکوں۔''

دعا کرتے کرتے اُسے پورا اعتماد حاصل ہوا کہ خدا نے میرے تمام گناہوں کو معاف کر دیا ہے، عورت سے سرزد ہوئے گناہ کو بھی۔ لیکن بچے کے بارے میں اُسے پورا اعتماد نہ ہوا۔ تب بزرگوں میں سے ایک نے فرمایا، ''خدا نے وہ گناہ بھی معاف کر دیا ہے جو بچے سے سرزد ہوا ہے۔ لیکن اُس نے آپ کو تکلیف کی حالت میں چھوڑ دیا ہے، کیونکہ یہ تیری روح کے لئے مفید ہے۔''[34]

اکثر راہبوں سے اِس قسم کا سنجیدہ گناہ نہیں سرزد ہوا تھا۔ لیکن سب اپنے گناہوں کا ماتم کرتے تھے۔ ایک کا ذکر ہے جس نے بچپن میں دوستوں سے چوری کا ایک انجیر کھایا تھا۔ جب یہ عمل کبھی اُسے یاد آتا تو وہ بیٹھ کر رو پڑتا۔[35]

ابّا امونس نے ماتم کی یہ حالت یوں بیان کی،

> جا کر اُن مجرموں کی سوچ رکھیں جو جیل میں پڑے ہیں۔ ایسے لوگ پوچھتے ہیں کہ جج صاحب کہاں ہیں، وہ کب آئیں گے؟ اور اُس کا انتظار کرتے کرتے وہ روتے ہیں۔ راہب کو یہی رویہ اپنانا ہے۔ اُسے دھیان دے کر اپنی روح کی ملامت کرنا ہے، "ہائے، مَیں کتنا دُکھی ہوں! مَیں کس طرح منصف مسیح کے تختِ عدالت کے سامنے قائم رہوں گا؟ مَیں اپنے دفاع میں کیا کہوں گا؟" اگر آپ ہر وقت اِس پر غور و خوض کریں تو آپ کو نجات ملے گی۔[36]

اِس ہدایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ماتم کرنے کے پیچھے خدا کی عدالت کا خیال ہے، وہی خیال جس نے لوتھر کو مضطرب کر دیا، "مجھے کس طرح خدا کا رحم حاصل ہو گا؟" لیکن شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ زور گزشتہ گناہوں پر نہیں بلکہ اپنی گناہ آلودہ حالت پر تھا۔ اِسی لئے ابّا انتونی کہہ سکتا تھا، "جو کچھ ماضی میں سرزد ہوا ہے اُس کی فکر مت کرنا۔"[37] گو ہم گناہ گار ہیں، لیکن ماضی پر دھیان دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ حال کے اُن خیالات پر غور کرنا چاہئے جو اُبھرتے اُبھرتے ہماری گناہ آلودہ فطرت ظاہر کرتے ہیں۔

ریگستان کے بزرگوں کے نزدیک گناہ گار ہونے کا یہ احساس خدا کی قربت کا نشان ہے۔ ایک ابّا نے فرمایا، "جتنا انسان خدا کے قریب آئے اُتنا ہی وہ اپنی گناہ آلودہ حالت محسوس کرتا ہے۔ جب یسعیاہ نبی نے خدا کو دیکھا تو کہا کہ مَیں قابلِ افسوس اور

ناپاک ہوں۔"[a]38 چونکہ خدا قدوس اور پورے طور پر پاک ہے اِس لئے لازم ہے کہ ہم اُس کے حضور آ کر اپنی گناہ آلودہ فطرت محسوس کریں۔ یہی خیال درجِ ذیل کہاوت کے پیچھے ہے،

> ابّا سِسوئیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بسترِ مرگ پر اُس کا چہرہ سورج کی طرح چمک اُٹھا۔ بزرگ اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ اُس نے اُن سے کہا، "دیکھو، ابّا انتونی آ گیا ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد، "دیکھو، نبیوں کا گروہ آ چکا ہے۔" پھر اُس کا چہرہ بہت زیادہ چمک اُٹھا۔ وہ بولا ، "دیکھو، رسولوں کا گروہ پہنچ گیا ہے۔" تب اُس کے چہرے کی چمک دُگنا تیز ہو گئی۔ لگتا تھا کہ وہ مختلف لوگوں سے بات کر رہا ہو۔ بزرگوں نے اُس سے پوچھا، "ہمارے باپ، آپ کس سے گفتگو کر رہے ہیں؟" اُس نے کہا، "دیکھو، فرشتے مجھے لے جانے آئے ہیں، اور مَیں درخواست کر رہا ہوں کہ وہ مجھے تھوڑی دیر اَور توبہ کرنے دیں۔" بزرگوں نے کہا، "ہمارے باپ، آپ کو توبہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔" لیکن بزرگ نے اُن سے کہا، "حقیقتاً مجھے نہیں لگتا کہ مَیں نے شروع ہی کیا ہے۔" تب سب کو پتا چل گیا کہ وہ کامل[b] ہے۔
>
> ایک بار پھر اُس کا چہرہ اچانک آفتاب کی طرح چمکنے لگا۔ سب ڈر گئے۔ وہ بولا ، "دیکھو، خداوند آ گیا ہے، اور وہ کہہ رہا ہے، "بیابان کا یہ برتن اُٹھا کر لے جاؤ۔" یہ کہتے ہی وہ اپنی روح خدا کے سپرد کر کے کوچ کر گیا۔ بجلی چمک اُٹھی، اور پورے گھر میں خوش بو پھیل گئی۔39

گناہ گار ہونے کے اِس احساس نے ریگستان کے بزرگوں کو سخت نہیں بلکہ نرم دل بنایا۔ یاد رہے کہ قدیم کلیسیا کا گناہ گاروں سے سلوک نہایت سخت تھا۔ جس بپتسمہ

[a] یسعیاہ 6

یافتہ سے قتل، زنا یا ایمان کے انکار جیسا گناہ سرزد ہوا تھا اُسے توبہ کے نہایت مشکل قدم اُٹھانے تھے۔ اوّل، اُسے علانیہ اپنے گناہ کا اقرار کرنا تھا۔ پھر اُسے توبہ کا خاص لباس پہن کر بڑی دیر تک روزہ رکھنے، دعا کرنے اور خیرات دینے پڑتے۔ اُتنے میں اُسے غیر بپتسمہ یافتہ لوگوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ سالوں بعد اگر ثابت قدم رہا تو اُسے دوبارہ جماعت اور عشائے ربانی کی شرکت حاصل ہوئی۔

اِس دستور کی نسبت راہب اکثر زیادہ رحم دل تھے۔ ایک دفعہ جب کسی راہب کو عشائے ربانی میں شریک ہونے سے منع کیا گیا تو ایک ابّا یہ کہہ کر اُس کے ساتھ گرجا گھر سے نکلا، ''مَیں بھی گناہ گار ہوں۔''[40] شاید اِس ہم دردی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راہب اپنی پوری زندگی توبہ کے تحت گزارتا تھا۔ ایک اَور کہاوت بھی یہ ہم دردی ظاہر کرتی ہے۔

> ایک بھائی نے ابّا پوئیمین سے مشورہ کر کے پوچھا، ''مجھ سے سنجیدہ گناہ سرزد ہوا ہے، اور اب مَیں تین سال توبہ کرنا چاہتا ہوں۔'' لیکن ابّا نے اعتراض کیا، ''یہ بہت ہے۔'' بھائی نے پوچھا، ''کیا ایک سال کافی ہے؟'' بزرگ بولا، ''یہ بھی بہت ہے۔'' ''تو پھر 40 دن؟'' پوئیمین نے جواب دیا، ''یہ بھی بہت ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی پورے دل سے توبہ کرے اور آئندہ اِس سے گریز کرنے کا پکا ارادہ رکھے تو خدا تین دن کی توبہ بھی منظور کرے گا۔''[41]

رویا

شاید قاری سوچیں کہ راہبانہ زندگی کا ایک خاص مقصد رویا دیکھنا اور وجد کی حالت میں آنا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا، گو ایسے بزرگوں کا ذکر ہے جنہیں یہ چیزیں حاصل ہوئیں۔ ایک دل چسپ کہانی یہ بات ظاہر کرتی ہے،

> ابّا اُلمپیُس نے فرمایا کہ ایک دن یونانیوں کا ایک پجاری سکیتِس پہنچ کر میرے کمرے میں آیا اور سو گیا۔ جب اُس نے راہبوں کی زندگی دیکھی تو مجھ سے کہا، "جب آپ ایسی زندگی گزارتے ہیں تو کیا آپ کو اپنے خدا سے رویائیں نہیں ملتیں؟" مَیں بولا، "نہیں۔" پجاری نے کہا، "جہاں تک ہمارا تعلق ہے، جب ہم اپنے دیوتا کی پوجا کریں تو وہ ہم سے کچھ نہیں چھپاتا بلکہ ہم پر اپنے بھیدوں کا انکشاف کرتا ہے۔ آپ تو اِتنی محنت مشقت کرتے ہیں—آپ جاگتے رہتے، خاموشی اختیار کرتے اور زُہد میں لگے رہتے ہیں۔ تاہم آپ کہتے ہیں کہ ہمیں رویا نہیں ملتی۔ یقیناً اگر آپ کچھ نہیں دیکھتے تو اِس کا مطلب ہے کہ آپ کے دلوں میں بُرے خیالات ہیں جو آپ کو خدا سے الگ رکھتے ہیں۔ اِسی لئے آپ پر اُس کے بھیدوں کا انکشاف نہیں ہوتا۔"
>
> مَیں نے جا کر بزرگوں کو پجاری کے الفاظ سنائے۔ وہ ہکا بکا رہ کر کہنے لگے، "ایسا ہی ہے۔ ناپاک خیالات خدا کو انسان سے الگ کر دیتے ہیں۔"[42]

پجاری سمجھتا تھا کہ اگر مَیں اپنے دیوتا کے لئے کچھ کروں تو اُسے جواب میں لازماً کچھ نہ کچھ میرے لئے کرنا ہے۔ لیکن ریگستان کے بزرگوں کی سوچ سراسر فرق تھی۔ اُن کا نعرہ متی 8:5 تھا، "مبارک ہیں وہ جو خالص دل ہیں، کیونکہ وہ اللہ کو دیکھیں گے۔" ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے تھے۔ جس طرح ابّا انتونی نے فرمایا، "یہ انسان کا شاہ کار ہے کہ وہ خدا کے حضور اپنے گناہوں کا قصور ہر طرح سے تسلیم کر کے زندگی کے آخری دم تک آزمائش کی توقع کرے۔"[43]

اِس قسم کی سوچ رکھنے والا خدا کو دیکھنے کی توقع ہی نہیں کرتا۔ رویاؤں اور وجد کی نسبت گناہ پر زور بہت دفعہ پیش آتا ہے۔ جب کسی بزرگ کو بتایا گیا کہ فلاں فلاں لوگ

فرشتوں کی رویائیں دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ بولا، ''مبارک ہے وہ جو ہمیشہ اپنے گناہوں کو دیکھتا ہے۔''[44]

نیز، راہب اِس سے آگاہ تھے کہ ابلیس فرشتے کی صورت میں آ سکتا ہے۔[45] انتونی نے فرمایا،

> چنانچہ اگر بدروحیں رات کے وقت آ کر مستقبل کی باتیں بتانا چاہیں یا کہیں کہ ہم فرشتے ہیں تو دھیان مت دینا، کیونکہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ بلکہ خواہ وہ آپ کے زُہد کی تعریف کر کے آپ کو مبارک باد کیوں نہ کہیں اُن کی نہ سنیں اور نہ اُن کے ساتھی بنیں بلکہ اپنے اور اپنے گھر پر صلیب کا نشان بنا کر دعا کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اوجھل ہو جائیں گے۔[46]

ابّا پوئیمین نے فرمایا، اگر آپ رویائیں دیکھیں یا آوازیں سنیں تو اپنے پڑوسی کو یہ مت بتانا۔ یہ تو صرف جنگ کی تباہی کا نشان ہے۔[47]

اِس کا مطلب نہیں کہ ریگستان کے بزرگ کبھی رویا نہیں دیکھتے یا وجد کی حالت نہیں جانتے تھے۔ انتونی اور پخومیُس دونوں رویا دیکھتے تھے۔ اور پولس بنام سادہ پسِ پردہ روحانی حقیقتیں جانچنے کی نعمت رکھتا تھا۔ لیکن اکثر وہ ایسی باتیں پیش کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ایک بزرگ کا ذکر ہے جو وجد کی حالت میں تھا۔ جب دوسرے راہب نے یہ دیکھا تو اُس نے بعد میں اُس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ ابّا نے صاف بات نہ بتائی، لیکن دوسرے نے اُس کے پاؤں کو پکڑ کر کہا، ''مَیں آپ کو نہیں چھوڑوں گا جب تک مجھے نہ بتایا ہو کہ کیا دیکھا۔'' تب وہ بولا، ''مجھے آسمان پر اُٹھا لیا گیا، اور مَیں نے خدا کا جلال دیکھا۔ اِس وقت تک مَیں وہاں رہا، لیکن اب مجھے فارغ کر دیا گیا ہے۔''[48]

بزرگ اکثر ایسے معاملوں میں خاموشی کیوں اختیار کرتے تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُن کے نزدیک ایسی باتیں مرکزی اہمیت نہیں رکھتی تھیں، ہاں یہ انسان کو ایمان سے دُور

کھینچ سکتی تھیں۔ وہ صرف اُس وقت اِن کا ذکر کرتے تھے جب دوسروں کے لئے مفید تھیں۔
حقیقت میں بزرگوں کا ٹارگیٹ ایک اَور تھا۔ یہ درجِ ذیل گفتگو میں ظاہر ہوتا ہے،

> ابّا لوط نے ابّا یوسف کے پاس آ کر کہا، ”ابّا، مَیں ممکنہ حد تک مناسب زندگی گزارتا ہوں۔ اِس میں کچھ روزہ، دعا، غور و خوض اور خاموشی بھی شامل ہے۔ اور مَیں جتنا ممکن ہو اپنے دل کو بُرے خیالات سے پاک صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اِس کے علاوہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ جواب میں یوسف نے کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے۔ اُس کی اونگلیاں دس جلنے والی مشعلوں کی طرح چمکنے لگیں، اور وہ بولا، ”اگر آپ چاہیں تو پورے طور پر آگ بنیں گے۔“49

آگ بننے کا کیا مطلب ہے؟ بزرگ آدم کی ابتدائی جلالی حالت میں تبدیل ہونا چاہتے تھے، وہی حالت جو اُن کے نزدیک موسیٰ کو سینا پہاڑ پر حاصل ہوئی اور جو مسیح کی موسیٰ اور ایلیاہ سے ملاقت میں ظاہر ہوئی۔

> ابّا پنبو کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ موسیٰ کی مانند تھا جسے آدم کی جلالی صورت حاصل ہوئی جب اُس کا چہرہ چمکنے لگا۔ پنبو کا چہرہ بجلی کی طرح چمکتا تھا، ہاں وہ تخت پر بیٹھے بادشاہ کی مانند تھا۔ ابّا سلوانس اور ابّا سِسوئیس بھی اِسی طرح تھے۔50

غرض ریگستان کے بزرگ رویا کے سے عارضی تجربے سے کہیں زیادہ چاہتے تھے۔ وہ اُسی جلالی صورت میں تبدیل ہونا چاہتے تھے جسے آدم کو گناہ میں گرنے سے پہلے حاصل تھی۔ اُن کے زُہد اور دل کو پاک صاف کرنے کی کوششوں کے پیچھے یہی گہری آرزو ہے۔ اور یہ حاصل کرنے کے لئے وہ ظاہری حالت پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے،

بلکہ اُنہیں دل کی گہرائیوں میں جانا پڑتا تھا تاکہ ہر بُرائی کی جڑ اُکھاڑی جائے اور ہر کونا مسیح کی فروتنی، معافی اور محبت سے بھر جائے۔ اِس میں ہم اُن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

کلامِ مقدس

کلیسیائی بزرگوں کی نسبت ریگستان کے بزرگ کلام کا کم ہی اقتباس کرتے تھے۔ پہلی نظر میں لگتا ہے کہ وہ کلام سے ناواقف تھے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُنہیں کلام زبانی یاد تھا اور کہ وہ پورا وقت کلام کی تلاوت میں صَرف کرتے تھے۔ گو بہتوں کے پاس کلام کی لکھی ہوئی صورت نہیں تھی، لیکن اُنہیں کلام کے بہت حوالجات یاد تھے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیوں کلام کے حوالجات کو کم ہی پیش کرتے تھے؟ جب کبھی لوگ ابّا پنبو سے کسی حوالے کے بارے میں پوچھتے تو وہ کہتا کہ مَیں یہ حوالہ نہیں جانتا۔ اگر پوچھنے والا باز نہ آتا تو ابّا خاموش رہتا تھا۔[51]

ابّا پوئیمین نے فرمایا کہ کلام کے بارے میں بات کرنے کی نسبت بہتر یہ ہے کہ بزرگوں کی کہاوتوں پر غور کریں، کیونکہ ایسے کرنے کا اِتنا خطرہ نہیں ہے۔[52] ابّا کا یہ خیال ایک قصے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دن بیرونِ ملک کا ایک مشہور راہب اُس سے ملنے آیا۔ اُس کے پاس پہنچتے ہی وہ کلامِ مقدّس کے بارے میں بات کرنے لگا۔ لیکن پوئیمین اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر خاموش رہا۔ مہمان کو دُکھ ہوا، اور وہ چلا گیا۔ ابّا کے شاگرد نے اُس سے پوچھا،

> ”ابّا، یہ عظیم آدمی جسے اپنے علاقے میں بہت عزت حاصل ہے خاص کر آپ سے ملنے آیا ہے۔ آپ نے اُس سے بات کیوں نہ کی؟“ بزرگ نے جواب دیا، ”وہ اوپر سے ہے اور آسمانی باتیں کرتا ہے جبکہ مَیں نیچے سے ہوں، مَیں صرف دنیاوی باتیں کرتا ہوں۔[a] اگر وہ روح کے جذبوں کی بات کرتا تو مَیں جواب دیتا۔ لیکن اگر وہ روحانی معاملوں کی بات

کرنا چاہے تو مَیں اِس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' بھائی نے جا کر مہمان سے کہا، ''بزرگ جلدی سے کلام کی بات نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی اُن سے روح کے جذبوں کے بارے میں بات کرے تو وہ جواب دیتے ہیں۔'' مہمان کا دل چھد گیا، اور وہ بزرگ کے پاس جا کر بولا ، ''ابّا، مَیں کیا کروں؟ کیونکہ روح کے جذبات مجھ پر حکومت کرتے ہیں۔'' تب بزرگ نے خوش ہو کر اُس پر دھیان دیا اور کہا، ''اچھا ہوا کہ آپ فوراً آ گئے ہیں۔ اب اِن چیزوں کے لئے اپنا منہ کھول دیں، تو مَیں آپ کو اچھی چیزوں سے سیر کروں گا۔'' مہمان کو بہت فائدہ حاصل ہوا ، اور وہ بولا ، ''واقعی یہ سچی راہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ملک واپس چلا گیا، خدا کا شکر کرتے ہوئے کہ اُس نے مجھے ایسے مقدّس سے ملنے کے لائق سمجھا ہے۔[53]

ابّا میں ایک چیز پائی جاتی ہے جس سے جدید انسان اکثر محروم رہ گیا ہے۔ ابّا کو کلام کی مقدّس اور جلالی حالت کا شدید احساس ہے، لٰہذا وہ جلدی سے اُس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے معلوم ہے کہ جب گناہ گار انسان کلام کو منہ میں لے تو وہ جلد ہی اُسے دنیا کی کیچڑ میں ڈالنے کے خطرے میں ہے۔

تاہم ریگستان کے بزرگ کلام پر بہت غور و خوض کرتے تھے۔ دو راہب ایک ابّا سے ملنے گئے تو اُنھوں نے اُسے بڑی دیر تک پیدائش 3:46 پر غور و خوض کرتے ہوئے سنا۔ ساتھ ساتھ وہ رسّے بنا رہا تھا۔ چونکہ راہب اُسے غور و خوض کرتے ہوئے سن سکتے تھے اِس لئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ راہب یہ آیت زبان پر لا کر بولتا جا رہا تھا۔[54] پلادیُس ایک راہب کا ذکر کرتا ہے جس نے 40 میل کے سفر کے دوران 15 زبور بشمول زبور 119، عبرانیوں کے خط، یسعیاہ، یرمیاہ کے ایک حصے، لوقا کی اِنجیل اور امثال کی تلاوت کی۔[55]

---

[a]بمقابلہ یوحنا 23:8

ہم زیادہ تر کلام کو کتاب کی صورت میں پڑھتے ہیں۔ اور پڑھنے کا وسیلہ ہماری آنکھیں ہیں۔ ریگستان کے بزرگوں کا کلام دل میں محفوظ تھا۔ وہاں سے وہ اُسے بار بار لاتے اور دہراتے تھے۔ کلام زیادہ تر سنا اور سنایا جاتا تھا۔ اِس کا وسیلہ کان تھے۔ وہ اُسے زبانی دہراتے اور گیت کی صورت میں گاتے تھے۔ ساتھ ساتھ پورا زور کلام پر عمل کرنے پر تھا۔

ایک دن ایک راہب سکیتِس کے کسی بزرگ کے پاس آ کر فخر کرنے لگا کہ مَیں نے کلامِ مقدّس کی تمام کتابیں یاد کی ہیں۔ لیکن ابّا نے اُس کی ملامت کی، ”آپ نے محض ہَوا کو الفاظ سے بھر دیا ہے۔“[56]

ابّا پوئیمین کلام کا عملی پہلو ایک خوب صورت مثال سے پیش کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے، ”پانی نرم اور پتھر سخت ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم پانی کی بوتل پتھر کے اوپر لٹکا کر اُسے قطرہ قطرہ پتھر پر ٹپکنے دیں تو ہوتے ہوتے پتھر اِس سے گھِس جائے گا۔ اِسی طرح خدا کا کلام نرم اور ہمارا دل سخت ہوتا ہے۔ جو شخص بار بار خدا کا کلام سنے اُس کا دل خدا کا خوف رکھنے کے لئے کھل جاتا ہے۔“[57]

باب 19

آبا سے سبق

ریگستان کے بزرگوں کی بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں۔

تنہائی کی ضرورت

راہبوں نے علیٰحدگی میں رہنے کا فن سیکھ لیا۔ اُنہوں نے سیکھ لیا کہ روحانی ترقی کے لئے علیٰحدگی درکار ہے۔ جو شخص ہر وقت دنیا کے شور شرابہ میں ڈوبا رہے وہ خدا کی دھیمی آواز کو مشکل سے سن سکتا ہے۔ اُس کا ہر لمحہ اپنی اور اپنے جاننے والوں کی ضروریات پوری کرنے میں گزرتا ہے۔ تنہائی میں رہنے کی وجہ سے راہبوں کے سامنے وہ ہزاروں باتیں نہ رہیں جو عام انسان کی توجہ اِدھر اُدھر کھینچتی ہیں۔ اِسی وجہ سے وہ

ظاہری باتوں کو چھوڑ کر اپنے اندر دیکھنے کے قابل بن گئے۔ اِس سے وہ ماہرِ نفسیات بن گئے۔

الٰہی قدوسیت اور گناہ کا احساس

بزرگوں کو خدا اور اُس کے کلام کی قدوسیت کا شدید احساس تھا۔اِسی وجہ سے وہ جلد ہی نہ خدا کا نام اور نہ ہی اُس کے کلام کا ذکر کرتے تھے۔ الٰہی قدوسیت کے تجربے نے اُنہیں اِس کا شدید احساس دلایا تھا کہ ہم گناہ گار ہیں۔ کیا ہم خدا اور اُس کے کلام کی یہ مقدّس حالت جانتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ بہت دفعہ ہم اُس کے کلام کا صحیح احترام نہیں کرتے؟ یاد رہے کہ جو کلام کو منہ میں لے کر نہ اُس کا احترام کرے نہ اُس پر عمل کرے اُس کی عدالت خدا کرے گا۔

بزرگوں نے کلام پر عمل کرنے پر زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ کلام کو یاد کرنا کافی نہیں۔ ہزار آیات کو یاد کرنے کی نسبت ایک آیت پر عمل کرنا کہیں بہتر ہے۔

انسان کی تبدیلی

راہبوں کی پوری آرزو مسیح کی طرح کامل بننا تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسیح کی ہدایات اور خاص کر پہاڑی وعظ پر عمل کرنا ہر مسیحی کا فرض ہے۔ اُن کا پہلا مقصد مسیح کا ہم شکل بننا تھا۔ رویائیں دیکھنا یا معجزے کرنا اُن کے نزدیک اہم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسان کا حقیقی چیلنج اُس کی ذاتی تبدیلی ہے، کہ وہ مسیح کی مانند بن جائے۔ اِس وجہ سے وہ پہلوان کی طرح جد و جہد اور پرہیز گاری کرتے تھے۔

انسان مذہبی ہوتا ہے۔ خواہ وہ خدا کا انکار کیوں نہ کرے، لیکن وہ ضرور کوئی نہ کوئی بُت اپنے سامنے رکھتا ہے، کسی نہ کسی بُت کو سجدہ کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے خدا سے تبدیل ہوتا ہے؟ یہ مسیحیوں کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے۔ کیا ہم واقعی غیر مسیحیوں سے فرق ہیں؟ راہبوں کی تحریک ایک طرح سے احتجاج تھی—عام

مسیحیوں کی زندگی کے خلاف احتجاج جو بہت دفعہ بُت پرست زندگی سے بہتر نہیں تھی۔ راہب اصرار کرتے تھے کہ جو ایمان لائے اُسے لازماً تبدیل ہونا ہے۔ اُسے روز بہ روز مسیح کے ہم شکل بنتا جانا ہے۔ اِن کی نسبت ہماری زندگی کیسی ہے؟

خیالات کی صفائی

تبدیل ہونے کے لئے اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔ راہب اپنے خیالات کو پرکھتے رہتے تھے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی خیال سے آزمائش میں پڑ جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ گناہ کی جڑ دل میں ہوتا ہے۔ کافی نہیں کہ ہم زہریلے پودے کا محض پھول یا پتے توڑیں۔ ایسا کرنے سے وہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ لٰہذا لازم ہے کہ ہم بُرے خیال کو جڑ سے اُکھاڑیں۔ یہ مت سوچنا کہ میرے خیالات آزاد ہیں، کہ بُرے خیالات رکھنے سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ خدا چاہتا ہے کہ ہمارا ذہن ہر بُرے خیال سے خالی ہو۔

روحانی سفر میں مددگار

اکثر راہب گو تنہائی میں رہتے، تاہم اکیلے نہیں تھے۔ راہب بننے پر وہ کسی بزرگ راہب کے شاگرد بن گئے، اور بعد میں جب خود بزرگ تھے تو اُن کے اپنے شاگرد تھے۔ ساتھ ساتھ راہب ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے، بلکہ اکثر جگھوں پر ہفتے اور اتوار کو عبادت اور عشائے ربانی کے لئے جمع ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے آئینے تھے جن میں دیکھ کر ترقی ممکن تھی۔ اُن کی کہاوتوں کا مقصد صلاح مشورہ ہی تھا۔

اِس میں ہمارے لئے بھی پیغام ہے۔ اگر ہم روحانی ترقی کرنا چاہیں تو دوسروں کی رفاقت، ہدایت، اور تربیت درکار ہیں۔ مبارک ہے وہ جس کے اصلی استاد اور دوست ہیں۔ کیا ہم دوسروں کے روحانی سفر میں مددگار ثابت ہوتے ہیں؟

غیر جانب داری

راہب کا معاشرے میں اہم کردار تھا، کیونکہ وہ غیر جانب دار تھا۔ انتونی اور شمعون العمودی اِس کی اچھی مثالیں ہیں۔ چونکہ وہ معاشرے سے ہٹ کر رہتے تھے اِس لئے لوگ جانتے تھے کہ وہ کسی کی طرف داری نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ پیچیدہ معاملوں میں اُن سے فیصلہ مانگتے تھے۔

ملکِ پاکستان میں کئی ایک لوگ دیانت دار ہونے کے باوجود خاندان یا پیسوں کے دباؤ کے تحت غلط کام کرتے ہیں۔ راہبوں جیسے غیر جانب دار لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ کاش معاشرے سے الگ ایسے لوگ ہوتے جو نہ اپنے خاندان اور نہ پیسوں کی پروا کرتے۔

راہبانہ خدمت

تعجب کی بات ہے کہ جتنے راہب معاشرے سے الگ رہتے اُتنی ہی شدت سے معاشرہ راہبوں کے پاس آتا رہتا تھا۔ ہجوم نہ صرف اپنی بیماریوں سے شفا یا بدروحوں سے رِہائی پانے کے لئے حاضر ہوتے بلکہ بہت دفعہ اپنے مسئلے مسائل پیش کر کے بزرگوں سے مشورہ لیتے تھے۔ چند ایک راہب دوسروں کے دل میں جھانکنے کی نعمت رکھتے تھے۔ جو دھوکا باز خیالات دوسروں کو اندھا رکھتے اُنہیں وہ روح القدس کی مدد سے دُور کر کے روحانی مدد دے سکتے تھے۔

باسیل از قیصریہ کے راہب اِس میں آگے تھے۔ چونکہ باسیل نے اِس پر زور دیا کہ خاص کر راہب کو اپنی زندگی سے دوسروں کی خدمت کرنی ہے اِس لئے اُس کی خانقاہوں کی خدمت قابلِ تعریف تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اِس سے وہ خطرہ دُور ہو گیا کہ راہب کلیسیا سے الگ ہو جائیں۔

راہبانہ زندگی کا منفی پہلو

کچھ ایسی باتیں بھی نظر آتی ہیں جو کلام کی روشنی میں غیر مفید ہیں۔

راہب بننے کی غلط وجوہات

بے شک کچھ لوگ غلط وجوہات کے باعث راہب بن گئے۔ کچھ کسی قرض دار سے بھاگ کر راہب بن گئے یا اپنے خاندانی فرائض ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو اپنے فرائض چھوڑے وہ روحانی ترقی کی توقع نہ کرے۔

زُہد کی انتہا پسندی

راہب زُہد کی حد کو تجاوز کرنے کے خطرے میں رہتے تھے۔ خدا نے انسان کو جسم عطا کیا ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اِس نعمت کو صحیح طور سے استعمال کریں۔ البتہ کچھ راہبوں کی کہاوتوں سے نظر آتا ہے کہ وہ اِس بات سے آگاہ تھے۔ خطرہ نہ صرف جسم کی تباہی تھی۔ ایک راہب کا ذکر ہے جس پر انتہا پسند زُہد کی وجہ سے یہ وہم سوار ہوا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے اُس نے کنویں میں چھلانگ لگائی۔[1]

ازدواجی زندگی کی تحقیر

خطرہ تھا کہ راہب ازدواجی زندگی کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ یہ رجحان نہ صرف راہبوں پر محدود تھا۔ مباشرت اور ازدواجی زندگی کو نچلے درجے کی زندگی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن کیا اِس کی اشد ضرورت نہیں کہ ہم ازدواجی زندگی کے اچھے نمونے پیش کریں؟ میڈیا اور انٹرنیٹ غلط نمونے پیش کرتے ہیں۔ آج کل ایسے ایمان داروں کی خاص ضرورت ہے جو اپنے نمونے سے دوسروں کو دکھائیں کہ صحت مند خاندانی زندگی کیا ہے، کہ ماں، باپ اور بچے کس طرح صحت مند زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ آج کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔

اپنے نیک کام پر انحصار

جب کوئی اِتنی لگن سے مسیح کی مانند بننا چاہے تو بڑا خطرہ ہے کہ وہ بھول جائے کہ نجات شروع سے آخر تک خدا کے فضل پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہر جد و جہد کے ساتھ ساتھ یہ ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا ایمان اور ہماری ترقی ہم پر نہیں بلکہ خدا کے فضل پر منحصر ہوتی ہے۔ ورنہ یہ کوششیں بھی شریعت بن کر ہمیں مجرم ٹھہرائیں گی۔

خلاصہ

راہبوں میں کچھ ایسی باتیں ملتی ہیں جو کلامِ مقدّس کی روشنی میں مفید نہیں ہوتیں۔ اُن کی زُہد کے پیچھے بے شک آزمائشوں پر غالب آنے کی خواہش تھی، لیکن کئی بار یہ زُہد اُنہیں انتہا پسند زندگی اور انتہا خیلات کی طرف لے گیا۔ نیز، ازدواجی زندگی خدا کی طرف سے نعمت ہے جسے حقیر نہیں جاننا چاہئے۔

نئے عہد نامے میں راہبوں اور عوام میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ سب ہی برگزیدہ ہیں، سب ہی پر نئے عہد کے فرائض لاگو ہوتے ہیں۔

ہم خاص کر کچھ راہبوں کی وحدت الوجود کے بارے میں تعلیم منظور نہیں کر سکتے۔[a] خالق اور مخلوق میں جو فرق ہے وہ ہمیشہ تک رہے گا۔

تاہم راہبوں کی زندگی اور تعلیمات میں بہت کچھ ہے جس سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ کلیسیا کے یہ پہلوان سنجیدگی سے مسیح کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ آزمائشوں پر غالب آنے کے طریقے اور مسیح کی مانند بننا ایک قابلِ تعریف بات ہے۔

[a] دیکھئے صفحہ 494 و مابعد۔

ایمان کی عبادت

باب 20

قسطنطین کا عبادت پر اثر

پہلے پرستار عبادت کے لئے چپکے سے اپنے گھروں، زمین دوز قبرستانوں[a] اور دیگر ویران جگہوں میں جمع ہوتے تھے۔ لیکن کم از کم تیسری صدی سے گرجا گھر بننے لگے، کیونکہ طرُطلیان اور کلیمینس از اسکندریہ دونوں اِن کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ اِس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 303ء میں دیوقلیطیان کی ایذا رسانی نیقومیدیہ کے شان دار چرچ کی تباہی سے شروع ہوئی۔[1]

جب قسطنطین مسیحی بن گیا تو عبادت کے طور طریقوں میں مزید بہت فرق آ گیا۔ یہ نہ صرف اس لئے ہوا کہ اب سے مسیحی علانیہ عبادت کر سکتے تھے۔ ایک خاص وجہ مسیحیوں کا اضافہ تھی۔ ایذا رسانیوں کی کٹھالی میں پڑے پہلے مسیحیوں کی اکثریت خلوص

---

[a] catacomb

دل اور سنجیدہ تھی۔ اب جب بادشاہ کلیسیا کی حمایت کرنے لگا تو کلیسیا پر ایسے لوگوں کا سیلاب آ گیا جو سنجیدہ نہیں تھے۔ نتیجے میں اُن کے بُت پرست رسم و رواج اُن کے ساتھ کلیسیا میں داخل ہوئے۔

جب کلیسیا بادشاہ کا آلہ بن گئی تو اُس کے بشپ رئیس بن گئے، اور اُن کے شان دار کپڑوں نے یہ بات منعکس کی۔ امرا اور منصب دار ابتدائی کلیسیا کی سادہ عبادت پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا عبادت بھی شان دار بن گئی۔ ظاہر ہے کہ اُسے بادشاہ کی شان و شوکت سے مطابقت رکھنے کی ضرورت تھی۔ مندروں کی جگہ خوب صورت گرجا گھر وجود میں آئے اور ساتھ ساتھ فنون بھی کلیسیا کی خدمت میں استعمال ہونے لگے۔

کم ازکم اب سے یہ بات پکی ہو گئی کہ پادری کاہن اور عشائے ربانی قربانی ہے۔ ساتھ ساتھ عبادت ڈراما بن گئی، ایسا پروگرام جس سے عوام نہ صرف دل سے بلکہ آنکھوں اور کانوں سے خدا کا جلال محسوس کر سکتے تھے۔ وہی عناصر کلیسیا میں آ گئے جو آج تک رومی کلیسیا اور اکثر مشرقی کلیسیاؤں میں پائے جاتے ہیں۔

یہ تبدیلی سراسر غلط تو نہیں ہے، لیکن ابتدائی کلیسیا کی سادگی جاتی رہی، اور کئی ایک رسم و رواج داخل ہوئے جو نقصان دہ تھے۔ لیو اعظم اِس کا ذکر کرتا ہے کہ ایمان دار گرجا گھر میں جانے سے پہلے پہلے آفتاب کی پوجا کرتے ہیں۔[2] اور یوحنا فم الذہب کے وعظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عبادت میں تالیاں بجاتے تھے، وہی کچھ جو تماشا گاہ میں کیا جاتا تھا۔[3] غیرمسیحی رسموں کا ایک پہلو شہدا اور مقدسین کا احترام بھی ہے۔ بے شک خود کلیسیا نے فرمایا کہ ہم شہدا کی پوجا نہیں بلکہ اُن کا احترام کرتے ہیں، لیکن عملی طور پر ایسا نہیں لگتا تھا۔

آ ئیے ہم تفصیل سے عبادت کی تبدیلیوں پر غور کریں۔

باب 21

اتوار کا دن

اِس کا ذکر ہو چکا ہے کہ قسطنطین نے اتوار کو سرکاری چھٹی مقرر کی۔ یہ مسیحیوں کے لئے مفید تھا، کیونکہ اب سے وہ سکون سے عبادت کر سکتے تھے۔ البتہ قسطنطین نے یہ دن "آفتاب کا دن" مقرر کیا، اور دیہات میں جہاں بُت پرستی زیادہ تھی، وہاں اُس نے رعایا کو یہ دن منانے پر مجبور نہ کیا۔ اُس نے یہ فرمان بھی صادر کیا کہ اتوار کو مسیحی فوجی عبادت میں شریک ہو جائیں اور بُت پرست فوجی بھی خدا کو ایک مقرر کردہ دعا پیش کریں۔[1]

قدیم کلیسیا میں اتوار کا دن کم ہی سبت یعنی آرام کا دن سمجھا جاتا بلکہ پورا زور مسیح کے جی اُٹھنے پر تھا۔[2] اِس وجہ سے اتوار کو روزہ رکھنا عام طور پر منع تھا۔ ایمان دار اُس دن گھٹنے ٹیک کر عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ کھڑی حالت میں۔

عبادت کی ترتیب کے بارے میں سب سے قدیم بیان ایک بُت پرست کے ہاتھوں ملتا ہے۔ 112ء میں پلینی بادشاہ سے خط لکھ کر فرماتا ہے کہ مقررہ دن مسیحی پَو پھٹنے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔ عبادت میں وہ مسیح کی حمد میں گیت گاتے اور پھر قسم کھاتے ہیں کہ ہم غلط کام نہیں کریں گے۔ بعد میں وہ شام کے وقت دوبارہ اکٹھے ہو کر عام کھانا کھاتے ہیں۔[3] پلینی کا خط دکھاتا ہے کہ اب تک عبادت کا سلسلہ نہایت سادہ تھا۔ قسم کھانے سے پلینی عشائے ربانی بیان کر رہا ہے جبکہ شام کے کھانے سے مراد محبت (اگاپے) کا وہ کھانا ہے جو نئے عہد نامے میں عشائے ربانی کے ساتھ ساتھ کھایا جاتا تھا۔[a] اب لگتا ہے کہ عشائے ربانی اور محبت کا کھانا ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔

تقریباً 140ء میں یوسطین شہید زیادہ تفصیل سے عبادت کا سلسلہ قلم بند کرتا ہے،

> اتوار کو جو سورج کا دن کہلاتا ہے شہروں اور دیہات میں رہنے والے ایک ہی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ وقت کی گنجائش کے مطابق رسولوں کی یادداشتوں (یعنی اناجیل) اور نبیوں کے صحائف (یعنی پرانے عہدنامے) کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اِس کے اختتام پر پیشوا نصیحت کرکے اِن شریف باتوں کی تقلید کرنے پر پورا زور دیتا ہے۔ تب ہم مشترکہ دعا کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ہم پہلے کہہ چکے ہیں، دعا کرنے کے بعد روٹی اور پانی کے ساتھ ملائی ہوئی مے پیش کی جاتی ہے۔ پیشوا پورے زور سے دعا کرکے اِن کا شکر کرتا ہے، اور جماعت جواب میں آمین کہتی ہے۔ تب جن چیزوں کا شکر کیا گیا ہے وہ سب میں تقسیم ہو جاتی ہیں، اور یہ اِن میں شریک ہوتے ہیں۔ ڈیکن اِنہیں غیر حاضر ایمان داروں کے گھروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ پھر دولت مند اور جو چاہتے ہیں اپنی خوشی سے ہدیہ دیتے ہیں۔ یہ ہدیہ

---

[a] ا۔کرِنتھیوں 17:11

> پیشوا کے سپرد کی جاتی ہے جو یہ لے کر سیدھے یتیموں، بیوواؤں، بیماری یا کسی اَور وجہ سے ضرورت مندوں، قیدیوں اور اجنبی ملک میں رہنے والے پردیسیوں کی مدد کرتا ہے۔
> ہم عام طور پر اتوار کو جمع ہوتے ہیں، کیونکہ یہ پہلا دن ہے، وہ دن جب خدا نے مادے اور تاریکی کو تبدیل کر کے دنیا خلق کی۔ ہم اِس لئے بھی یہ دن مناتے ہیں کہ یسوع مسیح ہمارا نجات دہندہ اِسی دن مُردوں میں سے جی اُٹھا۔[4]

یہاں بھی عبادت کی سادہ شکل نظر آتی ہے۔ اِس کے اہم نقطے کلام کی تلاوت، پیغام، دعا، عشائے ربانی اور ہدیہ جات ہیں۔ اب تک عشائے ربانی ہر اتوار کی عبادت کا اٹوٹ حصہ لگتی ہے۔ یہاں یوسطین گیت کا ذکر نہیں کرتا، لیکن دوسری جگہ سے پتا چلتا ہے کہ عبادت میں گیت اور خاص کر زبور گائے جاتے تھے۔[5]

دوسری صدی کے وسط سے عشائے ربانی عبادت کے دوسرے حصوں سے الگ ہونے لگی۔ پہلا حصہ سب کے لئے کھلا رہا جبکہ دوسرے حصے سے پہلے اُن سب کو عبادت خانے کو چھوڑنے کو کہا جاتا تھا جو عشائے ربانی میں شریک ہونے کے لائق نہیں تھے۔ اِن میں غیر بپتسمہ یافتہ اور توبہ کرنے والے شامل تھے۔ مثلاً طرطُلیان اُن بدعتیوں کو ملامت کرتا ہے جو اِس پر دھیان نہیں دیتے۔[6]

یہ خیال اسکندریہ کے بزرگوں کلیمینس اور اورِغین سے شروع ہوا کہ عشائے ربانی مخصوص لوگوں کے لئے راز دار عمل ہے جسے پوشیدگی میں منانا ہے۔ اِس کی کیا وجہ تھی؟ ایک تو یہ خیال دیگر کئی ایک مذاہب میں ملتا تھا۔ مثلاً مِتھراس کے مذہب میں بھی الٰہی بھید پوشدگی میں منائے جاتے تھے۔ دوسرے، بے شک بزرگ یہ مقدّس رسومات غیر ایمانداروں کی بے حرمتی سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ رجحان بپتسمے کی رسم میں بھی نظر آتی ہے، گو اِس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بالغوں کو ننگی یا آدھ ننگی حالت میں بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ تیسرے، چونکہ لوگ عشائے ربانی کو مسیح کی قربانی سمجھنے لگے اِس

لئے اُنہیں محسوس ہوا کہ غیر بپتسمہ یافتہ شخص کے لئے حاضر ہونا غیر مناسب ہے، گو وہ بپتسمے کے کتنے قریب کیوں نہ ہو۔

رومن کیتھولک چرچ میں یہ دستور ختم ہو گیا ہے لیکن مشرقی کلیسیاؤں میں آج تک عشائے ربانی سے پہلے دیگر لوگوں کو عبادت خانے کو چھوڑنے کو کہا جاتا ہے، اور آج تک قربان گاہ پردے یا لکڑی کی دیوار کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔

باب 22

کلیسیائی عیدیں

ہر معاشرہ سالانہ ایسے دن مقرر کرتا ہے جن پر خاص اشخاص اور واقعات یاد کئے جاتے ہیں۔ مسیحی ایمان کی یہ خصوصیت تھی کہ ایسے تمام دن مسیح کا کردار اور نجات بخش کام یاد کرتے تھے۔ البتہ نئے عہد نامے میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا بلکہ یہ دن بعد میں مقرر ہوئے۔ کم از کم دوسری صدی سے عیدِ قیامت اور عیدِ پنتکست منائی جاتی تھی۔ یہ دو عیدیں آج تک مسیحی ایمان کے لئے مرکزی اہمیت رکھتی ہیں۔ عیدِ ظہورِ مسیح کچھ دیر کے بعد وجود میں آئی۔ اُس دن مسیح کی پیدائش اور بپتسمہ یاد کیا جاتا تھا۔ چوتھی صدی میں اُسی عیدِ ولادت کا آغاز ہوا جو ہم آج کل مناتے ہیں۔ اکثر ممالک میں عیدِ ولادت عیدِ ظہور کی جگہ لے کر عیدِ قیامت اور عیدِ پنتکست کے ساتھ سب سے اہم

عید بن گئی۔ اِن تین عیدوں کی نسبت یسوع کے ظہور اور صعود کی دو عیدیں کچھ کم اہمیت رکھتی ہیں۔

لیکن یہ عیدیں قدیم کلیسیا کے لئے ناکافی تھیں۔ کم از کم چوتھی صدی سے مریم اور دیگر مقدسین کے دنوں کا اضافہ ہوا، اور ہوتے ہوتے کلیسیا سال کے ہر دن کو کسی مقدّس کی یاد میں منانے لگی۔

عیدِ ولادت

ابتدا میں عیدِ ظہورِ مسیح مشرقی رومی ممالک میں وجود میں آکر مغربی ممالک تک پھیل گئی۔ اِس کے برعکس عیدِ ولادت پہلے مغربی ممالک میں منائی گئی اور رفتہ رفتہ اکثر مشرقی ممالک سے اپنائی گئی۔

اب مغربی کلیسیا عیدِ ظہورِ مسیح پر خاص کر تین مجوسیوں کو یاد کرتی ہے۔ تاہم آج تک کئی مشرقی ممالک میں مسیح کی پیدائش عیدِ ظہورِ مسیح پر منائی جاتی ہے۔ کلیسیائی کیلنڈروں میں فرق کے باعث کچھ کلیسیاؤں میں یہ دن 6 جنوری اور کچھ میں 7 جنوری منایا جاتا ہے۔

عیدِ قیامت

عیدِ قیامت سب سے پرانی عید ہے۔ یہودی عیدِ فسح کی طرح قدیم کلیسیا میں یہ عید سال کا آغاز سمجھی جاتی تھی۔ کم از کم چوتھی صدی کی ابتدا سے ایمان دار عید سے پہلے کے چالیس دن روزہ اور توبہ کی حالت میں گزارنے لگے۔ لیکن اِس رسم پر بھی بُت پرستوں کا اثر پڑ گیا۔ اِسی لئے آج تک خاص کر رومن کیتھولک ممالک میں توبہ کے اِن چالیس دنوں سے پہلے لوگ تہوار بنام کارنِوَل (carnival) مناتے ہیں جس موقع پر اکثر بے قابو عیاشی سرزد ہوتی ہے۔

چوتھی صدی سے پام سنڈے (جس دن مسیح یروشلم میں داخل ہوا) اور گُڈ فرائڈے سے پہلے کی جمعرات (جب مسیح نے شاگردوں کے پاؤں دھوئے) منائے جاتے تھے۔ گُڈ فرائڈے کو مسیح کی موت کے پیشِ نظر عیدِ فسح نہیں منائی جاتی تھی۔ ہفتے کو یہ یاد کیا جاتا تھا کہ مسیح عالمِ ارواح میں اُتر گیا۔ بپتسمہ لینے والوں کی کوشش یہ تھی کہ اِسی دن بپتسمہ لیں، کیونکہ بپتسمے میں ایمان دار مسیح کے ساتھ دفنایا جاتا ہے۔

ہفتے کی رات کو مسیحی اور کئی ایک بُت پرست گرجا گھر میں گزارتے تھے۔ کلام کی تلاوت، گیت اور دعا آدھی رات تک جاری رہتی، پھر جلوس نکلتا اور آبادی کا چکر لگا کر دوبارہ چرچ میں داخل ہوتا تھا۔ پو پھٹنے پر لوگ ایک دوسرے سے کہتے، "خداوند جی اُٹھا ہے! وہ واقعی جی اُٹھا ہے۔"

شروع میں عیدِ قیامت کی تاریخ کے بارے میں اتفاق نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کچھ کلیسیائیں اُسے یہودی ماہِ نسان کے 14ویں دن کو مناتی تھیں جبکہ دیگر اصرار کرتی تھیں کہ اُسے ہمیشہ اتوار کو ہی منانا ہے، اُسی دن کو جب مسیح جی اُٹھا۔ آخر میں نقایہ کی مجلسِ عامہ میں فیصلہ کیا گیا کہ اُسے کبھی نہیں عیدِ فسح کے دن منانا ہے بلکہ ہمیشہ 14 نسان کے بعد ہی یعنی جو اتوار موسمِ بہار کے پہلے پورے چاند (تقریباً 21 مارچ) کے بعد ہی آتا ہے۔ اِس میں سب سے اہم وجہ یہ پیش کی گئی کہ یہودیوں نے مسیح کو مصلوب کرنے سے عیدِ فسح کی بے حرمتی کی ہے۔[1]

تاہم مشرق میں بڑی دیر تک ایسے گروہ قائم رہے جو یہ عید 14 نسان کو مناتے تھے۔ یہ لوگ "چودہ دن والے"[a] کہلاتے تھے۔ اور آج تک مشرقی کلیسیا یہ دن یولیانی کیلنڈر کے مطابق مناتی ہے جبکہ مغرب اُسے گریغوری کیلنڈر کے مطابق مقرر کرتی ہے۔ نتیجے میں آج تک مغربی اور مشرقی کلیسیاؤں میں عیدِ قیامت اکثر سالوں میں فرق دنوں پر منائی جاتی ہے۔

---

quartodecimanians[a]

عیدِ پنتکست اور صعودِ مسیح

پنتکست کا مطلب 50 ہے، کیونکہ یہ دن عیدِ قیامت کے 50 دن بعد آتا ہے۔ اِس دن کو عیدِ قیامت کے بعد آنے والے آٹھویں اتوار کو منایا جاتا ہے۔ چونکہ عیدِ قیامت مشرقی اور مغربی کلیسیاؤں میں فرق فرق دنوں پر منائی جاتی ہے اِس لئے اکثر سال عیدِ پنتکست کو بھی فرق فرق دنوں پر منائی جاتی ہے۔

چونکہ اِس دن روح القدس کو شاگردوں پر اُنڈیلا گیا اور کلیسیا پیدا ہوئی[a] اِس لئے یہ دن بپتسمہ دینے اور کسی کو خدمت کے لئے مخصوص کرنے کے لئے خاص مقبول تھا۔

چوتھی صدی سے لوگ عیدِ قیامت کے 40 دن بعد صعودِ مسیح کا دن منانے لگے۔

[a] مشرقی کلیسیا کے مطابق کلیسیا عیدِ پنتکست پر پیدا نہ ہوئی بلکہ دنیا کی تخلیق سے پہلے ہی وجود میں آئی۔

باب 23

مقدّس رسومات

مقدّس رسم کا تصور

پروٹیسٹنٹ کلیسیاؤں میں عبادت کا مرکز وعظ یعنی خدا کے کلام کی تفسیر اور اُس کا ایمان دار کی زندگی پر اطلاق ہے۔ اِس کے برعکس مذکورہ قدیم کلیسیاؤں میں عشائے ربانی عبادت کا مرکز ہے۔

مقدّس رسومات کے لئے لاطینی کلیسیا میں sacramentum اور یونانی کلیسیا میں mystērion استعمال ہوتا ہے۔ پہلے لفظ کا لفظی مطلب "مقدّس چیز" ہے جبکہ دوسرے کا ترجمہ "راز" ہے۔ شروع میں یہ الفاظ ایمان کی ہر بات یا چیز کے لئے استعمال ہوتے تھے جو کسی نہ کسی طرح مقدّس یا راز دار تھی، مثلاً تثلیث فی التوحید

کے لئے۔ لیکن پانچویں صدی سے یہ الفاظ خاص کر کلیسیا کی اُن مقدّس رسومات کے لئے استعمال ہونے لگے جو مسیح سے قائم ہوئیں اور جن کے وسیلے سے الٰہی برکات حاصل ہوتی ہیں۔

اوگسطین پہلی دفعہ مقدّس رسم کا صاف مطلب بیان کرتا ہے۔ اُس کے مطابق یہ ایک اَن دیکھی فضل یا الٰہی برکت کا ظاہری نشان ہے۔ مثلاً عشائے ربانی کی روٹی اور مے اُس الٰہی برکت کا ظاہری نشان ہیں جو کھانے اور پینے والے کو ایمان سے ملتی ہے۔ مخصوصیت کے الفاظ سے نشان اور برکت ایک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب پادری فرماتا ہے کہ یہ میرا بدن ہے تو نشان (روٹی) برکت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

اوگسطین فرماتا ہے کہ مقدّس رسومات جادو منتر کی طرح کام نہیں کرتیں۔ وہ بعد کی تعلیم نہیں جانتا جس کے مطابق یہ رسوم مقدّس ہونے کی بنا پر براہِ راست کام کرتی ہیں۔[a] نہیں، وہ فرماتا ہے کہ یہ برکت ایمان کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ کام کرنے والا خدا ہی ہے۔ دوسری صورت میں مقدّس رسومات لعنت کا باعث ہیں۔ دوناتی تفرقے کے خلاف وہ کہتا ہے کہ مقدّس رسومات کا اثر پیش کرنے والے کے کردار پر منحصر نہیں ہوتا۔

اوگسطین کے نزدیک بپتسمہ اور خدمت کے لئے مخصوصیت ایسی چیزیں ہیں جو مٹ نہیں سکتیں۔ جس طرح فوجی فوج کا بَیج (نشان) موت تک اپنے پاس رکھتا ہے اُسی طرح مسیحی کبھی اپنے بپتسمے یا خدمت کی مخصوصیت سے آزاد نہیں ہو سکتا، البتہ وہ ہلاک ہو سکتا ہے۔[b]

کلیسیائی بزرگ اِس میں متفق تھے کہ گو مقدّس رسومات گناہوں کی معافی اور خدا کا فضل حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں تاہم انسان اِن سے محروم رہنے سے نہیں بلکہ اِنہیں حقیر جاننے سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گو موسیٰ اور مسیح کے ساتھ مصلوب ہونے

[a] ex opere operato
[b] دیکھئے صفحہ 277۔

والے مجرم جیسے لوگوں کو یہ رسومات حاصل نہیں ہوئیں تاہم اُنہوں نے نجات پائی۔ اور کُرنیلیُس کو بپتسمہ ملنے سے پہلے ہی روح القدس ملا۔

چوتھی اور پانچویں صدی میں مقدّس رسومات کی تعداد پکی نہیں تھی۔ کچھ بزرگوں نے بپتسمہ اور عشائے ربانی کو کلیسیا کی واحد مقدّس رسومات ٹھہرائیں جبکہ کچھ کے نزدیک یہ سب سے اہم رسومات ہیں۔ مثلاً اوگسطین اِن دو رسومات کو اصلی مقدّس رسومات قرار دیتا ہے جبکہ اُس کے مطابق بپتسمے کے بعد بپتسمہ یافتوں پر ہاتھ رکھنے کی رسم، شادی اور پادری کی مخصوصیت بھی ایک طرح مقدّس رسومات ہیں، گو یہ اصلی مقدّس رسومات نہیں ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر پانچویں صدی سے تمام کلیسیاؤں میں رجحان اِس طرف بڑھ گیا کہ سات مقدّس رسومات ہیں۔ کیتھولک چرچ میں یہ تعداد 12 ویں صدی میں صاف طور پر مقرر کی گئی۔

بپتسمہ

دوسری صدی کے وسط میں یوسطین شہید بپتسمے کا رواج بیان کرتا ہے۔ اب تک یہ سادہ سا لگتا ہے،

> بپتسمے کی شرط یہ ہے کہ لوگ قائل ہو کر ایمان لائیں کہ جو کچھ ہم سکھاتے اور فرماتے ہیں وہ درست ہے۔ ساتھ ساتھ اُنہیں وعدہ کرنا ہے کہ ہم اِس کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ روزہ رکھ کر خدا سے دعا اور منت کریں کہ ماضی کے گناہوں کو معاف کر۔ ہم اُن کے ساتھ دعا اور روزہ رکھتے ہیں۔
>
> پھر ہم اُنہیں پانی کی کسی جگہ پر لاتے ہیں جہاں وہ ہماری طرح نئے سرے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں خدا کے نام میں جو کائنات کا باپ اور خداوند ہے، اور ہمارے نجات دہندہ یسوع مسیح کے نام میں اور روح القدس کے نام میں پانی میں اُن کا غسل ہوتا ہے۔ کیونکہ مسیح

> نے بھی فرمایا، ”صرف وہ شخص اللہ کی بادشاہی میں داخل ہو سکتا ہے جو پانی اور روح سے پیدا ہوا ہو . . .“
>
> اِس رسم کے لئے ہم نے رسولوں سے یہ وجہ سیکھ لی ہے: ہم جہالت اور مجبوری کے تحت یعنی اپنے والدین کے ملاپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ساتھ ساتھ ہم نے بُری عادتیں اور غلط تربیت بھی پائی ہیں۔ جو نئے سرے سے پیدا ہونے کا انتخاب کرکے اپنے گناہوں سے توبہ کرے اُس پر خدا کا نام پکارا جاتا ہے، اُس خدا کا جو کائنات کا باپ اور خداوند ہے۔ کیونکہ اِس سے ہم مجبوری یا جہالت کے فرزند نہیں رہتے بلکہ انتخاب اور عرفان کے فرزند بن کر پانی میں ماضی کے گناہوں سے معافی پاتے ہیں۔
>
> جو غسل ہونے والے کو پانی میں لے جاتا ہے وہ اُس پر صرف خدا کا مذکورہ نام پکارتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ناقابلِ بیان خدا کا نام منہ میں نہیں لے سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرے کہ ایسا کوئی نام ہے تو وہ نااُمید دیوانگی کا شکار ہے۔
>
> یہ غسل ”روشن ہو جانا“[a] بھی کہلاتا ہے، کیونکہ جو یہ باتیں سیکھ لیں اُن کی سمجھ روشن ہو جاتی ہے۔ روشن ہونے والے پر یسوع مسیح کا نام بھی پکارا جاتا ہے جو پنطیُس پیلاطس کے تحت مصلوب ہوا، نیز روح القدس کا نام جس نے نبیوں کے ذریعے یسوع کے بارے میں تمام باتوں کی پیش گوئی کی۔[1]

ہم دوسری صدی کی دیگر تصانیف سے جانتے ہیں کہ اُس وقت بپتسمہ لینے والا وعدہ کرتا تھا کہ مَیں ابلیس کی خدمت مسترد کرتا ہوں۔ پھر وہ اپنے آپ کو مسیح کے سپرد کرکے خدا باپ، بیٹے اور روح القدس پر ایمان کا اقرار کرتا تھا۔ اِس پر خادم دعا کرنے

---

[a] φωτισμός (phōtismos)

کے بعد اُسے خدا باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام میں تین بار ڈبو دیتا تھا۔ بعد میں اُس پر ہاتھ رکھ کر تیل سے مسح کیا جاتا تھا۔[a] اِس مخصوصیت سے بپتسمہ لینے والا روح القدس حاصل کرکے روحانی کاہن بن جاتا تھا۔

جہاں پانی کی قلت تھی وہاں لوگوں کے سر پر کچھ پانی ڈالنے کی اجازت تھی۔ اُس وقت بپتسمہ ننگی یا آدھ ننگی حالت میں لیا جاتا تھا۔ اِس کے پیچھے یہ خیال تھا کہ بپتسمہ لینے سے وہ پرانی انسانیت اُتار کر نئی انسانیت پہن لیتا ہے۔ خادمائیں بپتسمہ لینے والی عورتوں کی مدد کرتی تھیں۔ بعد میں یہ رواج شروع ہوا کہ بپتسمہ لیتے وقت سفید لباس پہنائے جائیں۔

مختصراً دوسری صدی میں بپتسمے کے پیچھے خیال یہ تھا: بپتسمے کے لئے توبہ اور ایمان لازم ہے۔ بنیادی تعلیم بھی لازم ہے۔ عام طور پر یہ تعلیم 2 یا 3 سال تک دینی ہے۔ اِس کے بعد بپتسمہ دینا ہے جو نئے سرے سے پیدا ہونے کے سلسلے کی تکمیل اور تصدیق ہے۔ اِس میں پرانی انسانیت پانی میں ڈوب جاتی اور نئے انسانیت اُس سے نکلتی ہے۔ بپتسمے سے ماضی کے گناہوں کی معافی اور روح القدس حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ بپتسمہ لینے والا اِس میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرکے وعدہ کرتا ہے کہ اب سے مَیں اپنی زندگی صرف مسیح اور اُس کے لوگوں کی خدمت میں گزاروں گا۔

چونکہ بزرگوں کے نزدیک بپتسمہ لینے والے کو صرف ماضی کے گناہوں کی معافی ملتی ہے اِس لئے بہت سے لوگ موت تک بپتسمہ لینے سے کتراتے تھے۔ سوال پیدا ہوا کہ بپتسمے کے بعد کس طرح گناہوں کی معافی ملتی ہے؟ طرطُلیان[2] اور قبریانس[3] نے جواب میں کہا کہ ایمان دار دعا اور خیرات جیسے نیک کاموں سے اپنے گناہوں کی معافی حاصل کر سکتا ہے۔ بعد میں یہی کمی دُور کرنے کے لئے توبہ کی مقدّس رسم قائم کی گئی۔

ہوتے ہوتے کم از کم چوتھی صدی میں بپتسمے کی سادگی ختم ہوئی۔ بپتسمے سے پہلے بپتسمہ لینے والے سے ابلیس نکالا جاتا، اُس پر پھونکا جاتا (روح القدس کا نشان)، اُس

---

chrism[a]

کے کانوں کو چھو کر ”اِفتح!“ کہا جاتا (روحانی سمجھ کا نشان)[a] اور صلیب کا نشان ماتھے اور سینے پر لگایا جاتا (فوجی ہونے کا نشان)۔ افریقہ میں اُسے نمک بھی دیا جاتا تھا (کلام کا نشان)۔ اکثر وہ نیا نام بھی لیتا تھا۔[b]

بپتسمے کے وقت وہ مغرب کی طرف رخ کر کے ابلیس کو رد کرتا اور پھر مشرق کی طرف مُڑ کر مسیح پر ایمان اور تثلیث فی التوحید کا اقرار کرتا تھا۔ پھر اُسے پانی میں ڈال کر بپتسمہ دیا جاتا۔ کبھی اُسے ایک، کبھی تین بار ڈبویا جاتا تھا۔ پھر اُسے تیل سے مسح کرنے سے کلیسیا کا ممبر قرار دیا جاتا، اُس کے سر سے نقاب اُتارا جاتا (روحانی بلوغت کا نشان) اور اُسے سفید لباس پہنائے جاتے تھے (بحالی اور پاکیزگی کا نشان)۔ مغرب میں اُسے ساتھ ساتھ شہد سے ملایا ہوا دودھ پلایا جاتا تھا (معصومیت کا نشان اور عشائے ربانی کی طرف اشارہ)۔

چوتھی صدی میں اکثر بزرگوں کے نزدیک انسان بپتسمے کے وسیلے سے ابلیس کی بادشاہی سے مسیح کی بادشاہی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پورا زور اِسی پر ہے۔

یونانی بزرگ موروثی گناہ کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ اِن کے برعکس اوگسطین موروثی گناہ کی تعلیم پیش کر کے فرماتا ہے کہ بپتسمہ انسان کی بحالی کی رسم ہے۔ اِس سے موروثی گناہ اور بپتسمے سے پہلے سرزد ہوئے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ خدا کا فضل نئی روحانی زندگی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔ اِس کی شرط یہ ہے کہ انسان توبہ کر کے ایمان لائے۔ جو بچہ بپتسمہ لے اُس نے اب تک گناہ نہیں کیا، لٰہذا بپتسمے سے اُس کا صرف موروثی گناہ مٹ جاتا ہے۔ وہ اب تک ایمان بھی نہیں لایا، لٰہذا کلیسیا اُس کے والدین اور ضامنوں کی صورت میں بچے کو تعلیم دینے کے ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔

دوسری صدی میں لگتا ہے کہ بچوں کا بپتسمہ ممکن تھا، گو اکثر اوقات بالغوں کو بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ چوتھی صدی کی کلیسیا میں زور اِس پر تھا کہ بچوں کو بھی بپتسمہ دیا جائے،

---

[a] دیکھئے مرقس 34:7

[b] مکاشفہ 17:2

لیکن بہت دفعہ یہ نہ ہوا۔ وجہ نہ صرف غفلت تھی بلکہ عام خیال یہ تھا کہ چونکہ بپتسمے سے ماضی ہی کے گناہوں کی معافی ملتی ہے اِس لئے دیر سے بپتسمہ لینا چاہئے۔ چنانچہ بہتوں کو بسترِ مرگ پر ہی بپتسمہ دیا گیا۔ قسطنطین بادشاہ کو بھی مرتے وقت بپتسمہ دیا گیا۔[4]

عشائے ربانی

یوسطین شہید دوسری صدی کے وسط میں عشائے ربانی کی رسم بیان کرتا ہے۔ اُس کی سادگی پر غور کریں،

> دعاؤں کے بعد ہم ایک دوسرے کو بھائیوں کا بوسہ دیتے ہیں۔ پھر روٹی، نیز پانی اور مے سے بھرے ہوئے پیالے کو بھائیوں کے پیشوا کے سپرد کیا جاتا ہے۔ یہ کچھ ملنے پر وہ بیٹے اور روح القدس کے نام میں کائنات کے باپ کو جلال دے کر اُس کی تمجید کرتا ہے۔ کافی دیر تک وہ اِس کا شکر کرتا ہے کہ ہم خدا کے ہاتھ سے یہ نعمتیں پانے کے لائق ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دعاؤں اور شکر گزاری کے اختتام پر پوری جماعت ہاں میں ہاں ملا کر آمین کہتی ہے۔ عبرانی زبان میں آمین کا مطلب ”ایسا ہی ہو“ ہے۔ پیشوا کی شکر گزاری اور تمام حاضرین کے آمین پر وہ جن کو ہم ڈیکن کہتے ہیں حاضرین میں سے ہر ایک کو یہ چیزیں[a] پیش کرتے ہیں تاکہ وہ اِن میں شریک ہو جائیں۔ جو غیر حاضر ہیں اُن تک بھی ڈیکن یہ نعمتیں پہنچاتے ہیں۔

[a] لفظی وہ روٹی اور پانی کے ساتھ ملائی ہوئی وہ مے پیش کرتے ہیں جس پر شکر گزاری کی دعا کی گئی ہے۔

> ہم میں یہ کھانا ''شکر گزاری'' کہلاتا ہے۔ صرف وہ اِس میں شریک ہو سکتا ہے جو ہماری تعلیم کی سچائی پر ایمان لایا اور جسے اُس غسل سے نہایا گیا ہے جس سے گناہوں کی معافی ملتی ہے اور جس سے وہ نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے۔ شرط یہ بھی ہے کہ وہ مسیح کی ہدایات کے مطابق چلے۔
> کیونکہ ہم یہ چیزیں عام کھانے اور پینے والی چیزیں سمجھ کر نہیں لیتے۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمارا نجات دہندہ یسوع مسیح کلامِ خدا سے تجسم ہوا، کہ اُس نے ہماری نجات کی خاطر جسم اور خون اپنا لیا۔ اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ اِسی طرح جس کھانے پر اُس کے کلام کی دعا سے شکر گزاری کی گئی ہے وہ مجسم ہوئے یسوع کا جسم اور خون ہے۔ اِس کھانے کے تبدیل ہونے سے ہمارے خون اور جسم کی پرورش ہوتی ہے۔[5]

قاری دھیان دیں کہ یوسطین کے مطابق عشائے ربانی شکر گزاری[a] ہے۔ روٹی اور مے کا شکر کرنے پر ایک تبدیلی[b] آ جاتی ہے جس سے ایمان دار کی پرورش ہوتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ چیزیں مادی طور پر مسیح کے بدن اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اِن پہلی صدیوں میں عشائے ربانی کے بارے میں تعلیم تفصیل سے پیش نہیں کی جاتی۔ کیونکہ کلیسیا کا پورا دھیان اِس پر تھا کہ اِسے لائق طور پر منایا جائے، اور یہ سوال کہ مسیح روٹی اور مے میں کس طرح حاضر ہوتا ہے کم ہی اُبھر آیا۔

یوسطین کی طرح اِغناطسیوس اور ایرینیُس بھی سمجھتے ہیں کہ مسیح روٹی اور مے میں حاضر ہوتا ہے۔ تاہم وہ تفصیل سے بیان نہیں کرتے کہ یہ کس قسم کی حضوری ہے۔ طرطُلیان اور قبریانس روٹی اور مے میں مسیح کے بدن اور خون کے نشان دیکھتے ہیں، لیکن اُن کے

---

[a] (eucharistia) εὐχαριστία

[b] (metabolē) μεταβολή

بیانات میں بھی یہ صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ اِس سے کیا مراد ہے۔ اور اسکندریہ کے بزرگوں کلیمینس اور اورِغین کے نزدیک روٹی اور مے مسیح کے بدن اور خون کی علامت ہیں جن سے ایمان دار کو مسیح کا روحانی بدن اور روحانی خون حاصل ہوتے ہیں۔ مذکورہ پہلے دو بزرگ بعد کی تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسری صدی میں تعلیمِ الرُسُل سے شروع ہو کر سب اِس میں متفق ہیں کہ عشائے ربانی ایک قربانی ہے۔ لیکن یہ مسیح کی قربانی کی دہرائی نہیں ہے بلکہ اِس میں کلیسیا مسیح کی قربانی یاد کر کے اپنے آپ کو شکر گزاری کی قربانی کے طور پر پیش کرتی ہے۔ بعد کی تعلیم کہ عشائے ربانی سے پادری خدا کو نئے سرے سے کفارہ کی قربانی پیش کرتا ہے کہیں نظر نہیں آتی۔ مثلاً یوسطین شہید صاف طور پر فرماتا ہے کہ صرف شکر گزاری کی قربانی خدا کو منظور ہے۔[6]

چوتھی صدی میں بھی عشائے ربانی کو قربانی سمجھی جاتی ہے، لیکن اب تک بزرگوں میں اتفاق نہیں کہ یہ کس طرح کی قربانی ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک روٹی اور مے میں حقیقی طور پر مسیح کا بدن اور خون شامل ہے۔ اِس خیال کے مطابق ایک طرح سے عشائے ربانی میں کلامِ خدا دوبارہ مجسم ہوتا ہے۔ لیکن گو روٹی اور مے مخصوص ہوتے وقت تبدیل ہو کر مسیح کی زندگی کے وسائل بن جاتی ہیں تاہم اب تک یہ خیال نہیں پایا جاتا کہ روٹی اور مے مادی طور پر مسیح کا بدن اور خون بن جاتی ہیں۔[a] ساتھ ساتھ ایک اَور گروہ سمجھتا ہے کہ گو مسیح روٹی اور مے میں حقیقی طور پر حاضر ہے تاہم یہ حضوری روحانی اور علامتی ہے۔[b]

اوگسطین سب سے صاف نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ عشائے ربانی میں ظاہری نشان اور اندرونی فضل میں امتیاز کر کے فرماتا ہے کہ روٹی اور مے مسیح کے بدن اور خون کے نشان ہیں، جو ایمان دار ایمان کے ذریعے اپنا لیتا ہے۔

---

[a] مثلاً قورلوس از یروشلم، گریغوری از نیسہ، یوحنا فم الذہب اور امروز

[b] مثلاً اثناسیُس، گریغوری از نزیانز اور باسیلِ اعظم

چوتھی اور پانچویں صدی میں جو تصانیف عشائے ربانی کی عبادت بیان کرتی ہیں وہ اِس کی تصدیق کرتی ہیں کہ مسیح روٹی اور مے میں حاضر ہوتا ہے، گو یہ نہیں کہا جاتا کہ کس طرح۔ یعنی بعد کی رومی کلیسیا کی تعلیم کہ روٹی اور مے مادی طور پر مسیح کے بدن اور مے میں تبدیل ہو جاتی ہیں کہیں نہیں ملتی۔

غرض، سب اِس میں متفق ہیں کہ مسیح کسی نہ کسی طرح روٹی اور مے میں حاضر اور مؤثر ہوتا ہے، لیکن اِس میں اتفاق نہیں کہ کس طرح۔ لگتا ہے کہ لوگوں کے نزدیک یہ اِتنا اہم سوال نہیں تھا، ورنہ وہ اِس پر بحث مباحثہ کرتے۔

بعد میں رومن کیتھولک چرچ نے یہ تعلیم پیش کی کہ عشائے ربانی میں روٹی اور مے مادی طور پر مسیح کے بدن اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہیں گو ظاہری طور پر نہیں۔ مشرقی کلیسیائیں آج تک یہ کہنے سے گریز کرتی ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ ایک بھید ہے جس کی وضاحت انسانی الفاظ سے کرنا ناممکن ہے۔

عشائے ربانی کی قربانی

رومن کیتھلک اور مشرقی کلیسیائیں آج تک ایمان رکھتی ہیں کہ عشائے ربانی قربانی ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک اِس میں نہ صرف خدا اپنا فضل ایمان دار کو پیش کرتا ہے بلکہ اِس سے بڑھ کر روٹی اور مے ایک ایسی قربانی ہیں جو خود انسان خدا کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ خیال چوتھی صدی سے سرِ عام ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ گو چوتھی صدی میں میافیسی اور دیوفیسی کلیسیائیں مسیح کے بارے میں تعلیم کے باعث خلقیدونی کلیسیا اور ایک دوسری سے الگ ہو گئیں تاہم یہ بھی عشائے ربانی کو کافی حد تک اِسی طرح مناتی ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ عشائے ربانی کی بنیاد وہ قربانی ہے جو یسوع نے ہماری خاطر دی۔ اِس ناتے سے عشائے ربانی اِس قربانی کی یاد میں ضیافت ہے جس میں ایمان دار شکر گزاری سے وہ قربانی مناتا ہے جو مسیح سے سرانجام ہوئی۔ وہ ایمان کے

ذریعے نئے سرے سے اُس میں شریک ہو کر اُس سے روحانی برکت پاتا ہے۔ بے شک عشائے ربانی شکر گزاری کی قربانی بھی ہے جس میں ایمان دار اپنے آپ کو نئے سرے سے خدا کو پیش کرتا ہے۔

لیکن کیتھولک اور مشرقی کلیسیاؤں نے یہ بنیادی خیال بڑھا کر اُس میں ایسی باتیں ڈال دیں جو کلامِ مقدّس پیش نہیں کرتا۔ اُن کے نزدیک عشائے ربانی مسیح کی قربانی کی دہرائی ہے جو پادری زندوں اور مُردوں کی خاطر پیش کرتا ہے۔ اِس کے مطابق مسیح کے بدن کو حقیقی طور پر قربان کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب روٹی اور مے حقیقی طور پر مسیح کا بدن اور خون ہیں تو پادری کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

مجلسِ نقایہ سے پہلے کے بزرگ عشائے ربانی کو شکر گزاری کی قربانی سمجھتے تھے جس میں جماعت روٹی اور مے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو خدا کو پیش کرتی ہے۔ تیسری صدی کے وسط میں قبریانس یہ خیال کچھ آگے لے جاتا ہے۔ اُس کے نزدیک پادری اِس لئے مرکزی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ عشائے ربانی میں مسیح کی جگہ قربانی پیش کرتا ہے۔ لیکن قبریانس یہ نہیں کہتا کہ یہ پیش کردہ قربانی مسیح ہے۔ اُس کے نزدیک یہ قربانی مسیح کا پوشیدہ بدن یعنی کلیسیا ہے۔

چوتھی صدی سے یہ تعلیم بڑھا دی گئی، اور چھٹی صدی کے آخر تک پاپائے روم گریگوری اعظم نے اُسے بڑھا چڑھا کر وہ شکل دی جو آج تک اِن کلیسیاؤں میں مانی جاتی ہے۔ اِس کے درجِ ذیل عناصر ہیں،

- یہ ایک رُعب دار اور خوف ناک قربانی ہے۔
- یہ نئی قربانی نہیں بلکہ مسیح کی ایک ہی قربانی کی دہرائی ہے۔
- موسوی قربانی اِس اصلی قربانی کا سایہ ہے۔ اِسی طرح جو روٹی اور مے ملِک صدق نے پیش کیں وہ بھی اِس قربانی کا سایہ ہیں۔

- قربانی میں مسیح کا بدن بالکل اُسی طرح قربان گاہ پر موجود ہے جس طرح صلیب پر لگا تھا۔ اِس میں وہ پادری کے ذریعے اپنے آپ کو خدا کو پیش کرتا ہے۔

- صرف اور صرف پادری یہ قربانی پیش کر سکتا ہے۔

- یہ قربانی زندوں اور مُردوں دونوں کے لئے ہے۔ آج تک اِن کلیسیاؤں میں عشائے ربانی کے موقع پر مُردوں کی لمبی فہرست دعا میں سنائی جاتی ہے، جن میں مریم، رسول اور شہید بھی شامل ہیں۔

- یہ عمل بیان کرنے کے لئے خاص کر مشرقی کلیسیاؤں میں لفظ تھیوسس[a] استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب "الٰہی بننا" ہے۔ روٹی اور مے کے ذریعے انسان نئے سرے سے مسیح کی الٰہی فطرت میں شریک ہو جاتا ہے گو مخلوق اور خدا کے فرزند کی حیثیت سے۔

مشرق میں روٹی اور مے کو روح القدس کو پکارنے سے مخصوص کیا جاتا ہے جبکہ رومن کیتھولک چرچ میں مسیح کے عشائے ربانی کے بارے میں الفاظ کافی سمجھے جاتے ہیں۔ قرونِ وُسطیٰ میں مغرب میں یہ رواج قائم ہوا کہ روٹی اور مے کو اُٹھایا جائے تاکہ اُن کا احترام کیا جائے۔ اُس وقت کیتھولک چرچ میں یہ رواج بھی شروع ہوا کہ لوگ مخصوص کی گئی مے پینے سے گریز کرنے لگے۔ اِس کے پیچھے یہ خیال تھا کہ عام انسان مشکل سے مسیح کا پاک خون پی سکتا ہے، اِس لئے بہتر ہے کہ اِسے نہ چھیڑے۔

مشرق میں خمیری روٹی اور مغرب میں بےخمیری روٹی استعمال ہوتی ہے۔ دونوں میں مے کو پانی سے ملایا جاتا ہے۔

---

[a] θέωσις (theosis)

کم از کم چوتھی صدی سے مشرقی کلیسیاؤں میں یہ رواج وجود میں آیا کہ جس قربان گاہ پر روٹی اور مے رکھی جاتی ہیں اُسے عام ایمان داروں سے الگ رکھنا ہے۔ چنانچہ آج تک اِن کلیسیاؤں میں قربان گاہ گرجا گھر کے سامنے والے حصے میں ہوتی ہے جو پردے یا لکڑی کی دیوار سے باقی کمرے سے الگ کیا گیا ہے۔ یونانی اعتقادی کلیسیا میں یہ شرط بھی ہے کہ ہر قربان گاہ میں کسی نہ کسی مقدّس کی کوئی نہ کوئی یادگار ہو۔[7]

ایمان کی رفاقتی شکل: کلیسیا

باب 24

پادریت کا فروغ

دوسری صدی سے خدمت گزاروں اور دیگر ایمان داروں میں نمایاں فرق یعنی پادریت نظر آنے لگتی ہے۔ ہوتے ہوتے لوگ تصور کرنے لگتے ہیں کہ خدمت گزار کاہن ہیں۔

اب رسولی نظام بشپ کے نظام میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور ہوتے ہوتے بڑے شہروں کے بشپ مرکزی کردار ادا کرنے لگتے ہیں۔ پھر چوتھی صدی کے بعد پاطریارک یعنی بشپوں کے رئیس کا نظام شروع ہو جاتا ہے۔ لاطینی کلیسیا میں پوپ کا خیال بھی شروع ہو جاتا ہے۔

بشپ کے نظام کی کیا وجہ ہے؟ ایذا رسانیوں اور بدعتوں کے پیشِ نظر یگانگت کی ضرورت تھی۔ اِس کا منفی پہلو یہ ہے کہ عام ایمان داروں کے روحانی حقوق محدود ہو

گئے۔ اور ظاہر ہے کہ جہاں زیادہ اختیار ہے وہاں اُسے غلط استعمال کرنے کی آزمائش بھی بڑھ جاتی ہے۔ تبدیلِ قسطنطین کے بعد یہ رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا۔

پادری کاہن بن جاتے ہیں

ابتدائی کلیسیا میں پادریت کا خیال تک پایا نہیں جاتا بلکہ اِس پر زور دیا جاتا ہے کہ مسیح ہم سب کا سردار کاہن ہے جبکہ ہر ایمان دار کاہن ہے۔[a] یہ خیال کہ صرف خدمت گزار کاہن ہے کہاں سے آیا؟ ایک تو پرانے عہد نامے کا اثر اِس میں نظر آتا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے کہ جس طرح قدیم اسرائیل میں سردار کاہن، عام کاہن اور لاوی تھے اُسی طرح کلیسیا میں بشپ، پادری اور ڈیکن ہیں۔ ساتھ ساتھ عشائے ربانی کو قربانی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن بُت پرستی میں بھی کہانت کا خیال تھا۔ مندر کے پجاری بھی قربانی پیش کرتے تھے۔

بے شک نئے عہد نامے میں خدمت گزاروں کا ذکر ہے۔ لیکن یہ خدمت گزار کہیں بھی عام ایمان داروں سے فرق کاہن نہیں کہلاتے۔ خود رسول بھی دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ ہم دیگر ایمان داروں کی نسبت خاص کاہن ہیں۔

نئے عہد نامے میں ایمان دار کو کیا قربانی دینی ہے؟ پورا زور اِس پر ہے کہ واحد حقیقی قربانی مسیح کی صلیبی موت ہے۔ چنانچہ جو قربانی ایمان دار کو دینی ہے وہ بالکل فرق ہے۔ جو بھی قربانی وہ دے اُس کا سرچشمہ شکر گزاری ہے۔ ایمان دار جانتا ہے کہ مجھے نجات اور خدا کی منظوری مفت میں مل گئی ہے، اب سے مَیں شکر گزاری کے تحت اپنے آقا کی خدمت کروں گا۔ جو بھی قربانی مَیں دوں اُس سے مَیں خدا کی منظوری حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ صرف اور صرف اِس شکر گزاری کا اظہار ہے۔[b]

لیکن جتنا کلیسیا رسولی دور سے دُور ہوئی اُتنا ہی خدمت گزاروں کا خاص گروہ نظر آنے لگا۔ دوسری صدی کی ابتدا میں اِغناطسیوس فرماتا ہے،

---

[a] ۱۔ پطرس 5:2، 9؛ مکاشفہ 6:1؛ 10:5؛ 6:20

[b] رومیوں 1:12؛ فلپّیوں 17:2؛ ۱۔ پطرس 5:2؛ عبرانیوں 16:13

> جو قربان گاہ کے اندر ہو وہ پاک ہے جبکہ قربان گاہ سے باہر شخص
> ناپاک ہے۔ یعنی جو بشپ اور بزرگ اور ڈیکن کے بغیر کچھ کرے اُس کا
> ضمیر پاک نہیں۔[1]

یہاں صاف طور پر کہا جاتا ہے کہ خدمت گزار خدا سے رابطہ رکھنے کا لازمی وسیلہ ہیں۔ تاہم اِغناطسیوس کہیں نہیں فرماتا کہ پادری کاہن ہے۔ البتہ طرُطلیان یہ کچھ کہتا ہے،[2] اور قبریانس بڑی تفصیل سے کلیسیائی خدمت کا یہودی کاہنوں کی خدمت سے مقابلہ کرتا ہے۔ بہت دفعہ جب وہ خدمت گزاروں کا ذکر کرتا ہے تو لفظ کاہن[a] استعمال کرتا ہے۔ اِسی طرح وہ اُن کی خدمت کہانت[b] سمجھتا ہے۔[3] نتیجے میں تیسری صدی سے پادریوں اور بشپوں کو کاہن کا نام دیا جاتا ہے۔ اُس وقت کلیسیا عام ایمان داروں[c] اور خدمت گزاروں[d] میں امتیاز کرنے لگتی ہے۔ بشپ، بزرگ اور ڈیکن کو کاہن سمجھا جاتا ہے۔

جب کہانت کا یہ خیال غالب آنے لگا تو خدمت گزاروں کو دوسروں سے الگ رکھنے کا رجحان بھی شروع ہوا۔ نتیجے میں تیسری صدی کے بعد اُنہیں کلیسیائی خدمت کے علاوہ کوئی اَور نوکری رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ خدمت گزاروں کو کلیسیائی خزانے سے پیسے ملتے تھے۔ اب تک شادی ممکن تھا گو شادی نہ کرنے کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔

تاہم یہ خیال کہ ہر ایمان دار کاہن ہے پورے طور پر مٹ نہ گیا۔ ایرینئیُس[4] اور طرُطلیان[5] دونوں یہ بات پیش کرتے ہیں۔ اور اب تک لازم تھا کہ پوری جماعت خدمت

---

[a] Greek: ἱερεύς (hiereus); Latin: sacerdos

[b] sacerdotium

[c] Greek: λαϊκός (laikos); English: laity, layman

[d] Greek: κλῆρος (klēros); English: clergy۔ کلیروس کا لفظی مطلب قرعہ ہے (متی 35:27)۔ جو کچھ قرعے کے ذریعے ملا وہ بھی کلیروس کہلاتا تھا۔ اعمال 17:1، 25 میں جو کچھ ملا وہ خدمت کی ذمہ داری ہے، لہٰذا اُس کے لئے بھی کلیروس مستعمل ہوا۔ ۱۔ پطرس 3:5 میں جن ایمان داروں کو پاس بان کے سپرد کیا گیا ہے وہ کلیروس کہلاتے ہیں۔ لیکن تیسری صدی میں یہ لفظ صرف خدمت گزاروں کے لئے استعمال ہونے لگتا ہے۔

گزاروں کا انتخاب کرے[6] بلکہ کئی دفعہ عوام نے زبردستی کسی کو بشپ بنا دیا۔ قبریانس، اثناسیُس، امروز، اور اوگسطین سب اِسی طرح بشپ بنے۔ اور گو قبریانس بشپ اور پادریت پر اِتنا زور دیتا ہے تاہم وہ فرماتا ہے کہ مَیں بشپ کی حیثیت سے بزرگوں اور ڈیکنوں کے مشورے اور عوام کی تصدیق کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔[7]

اب تک لازم نہیں تھا کہ وعظ کرنے والا خدمت کے لئے مخصوص کیا گیا ہو۔ بلکہ قرطاجنہ کی مجلسِ عامہ (397ء) میں یہ فرمان صادر ہوا کہ مخصوصیت کے بغیر وعظ کرنے کی اجازت ہے اگر خدمت گزاروں کو منظور ہو۔[8]

ہوتے ہوتے کلیسیا خدمت گزاروں اور عام ایمان داروں میں نمایاں امتیاز کرنے لگی۔ اب اُن پر ہاتھ رکھ کر اور تیل سے مسح کرکے مخصوص کیا جاتا تھا، اور یہ مخصوصیت کسی بھی صورت میں منسوخ نہیں ہو سکتی تھی۔ کپڑوں اور بالوں کے سٹائل سے یہ فرق نظر آنے لگا۔ نیز، غیر شادی شدہ رہنے کا فرض بھی عام ہو گیا۔

جتنا پادریت کا نظام بڑھ گیا اُتنا ہی عام ایمان داروں کا خدمت گزاروں کو منتخب کرنے کا حق مارا گیا۔ کچھ دیر کے لئے وہ نئے بشپ کی تصدیق کر سکتے تھے، لیکن آٹھویں صدی کے بعد یونانی کلیسیا میں یہ رواج بھی ختم ہوا، اور صرف بشپوں کو کسی بشپ کو چننے کی اجازت ملی۔ 11ویں صدی میں یہی کچھ لاطینی کلیسیا میں بھی ہوا۔ ساتھ ساتھ مغرب اور مشرق میں بہت سے بشپوں کے چناؤ میں حکمرانوں کا ہاتھ بھی نظر آتا ہے۔

مشرق یعنی اَرامی بولنے والی کلیسیا میں آج تک بشپ کو جماعت سے چنا جاتا ہے، اور بشپوں سے پاطریارک منتخب ہوتا ہے، البتہ قدیم زمانے میں بہت دفعہ بادشاہ کی تصدیق درکار تھی۔[9]

خدمت میں غیر شادی شدہ رہنے کی شرط

ابتدائی کلیسیا کے کچھ خدمت گزار غیر شادی شدہ تھے، لیکن اِس سے کوئی اصول نہیں بنایا گیا۔ پولس رسول کُرِنتھس کے غیر شادی شدہ ایمان داروں کو مشورہ تو دیتا ہے کہ وہ اِسی حالت میں رہیں، لیکن وہ صاف طور پر فرماتا ہے کہ یہ مسیح کی طرف سے حکم نہیں بلکہ مشکل حالات کے پیشِ نظر میری ذاتی رائے ہے۔[a]

لیکن رفتہ رفتہ یہ مشورہ متی 12:19 اور مکاشفہ 4:14 جیسی آیات کے ساتھ ملا کر خدمت گزاروں کے لئے اصول بن گیا۔[b] پورے دور کا رجحان راہبانہ زندگی کی طرف تھا۔ اِس ماحول میں لوگ سمجھنے لگے کہ بیوی کے ساتھ تعلق سے مرد ناپاک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خاص کر جو قربان گاہ یعنی عشائے ربانی کی خدمت کرے اُسے غیر شادی شدہ ہونا چاہئے۔ بے شک اِس شرط کا مثبت پہلو بھی ہے۔ غیر شادی شدہ ہونے سے خدمت گزار رشتے داری کی مجبوریوں سے آزاد رہ سکتے تھے۔ لیکن اِس کا منفی پہلو یہ تھا کہ غیر شادی شدہ خدمت گزار اِس خطرے میں رہتے تھے کہ خفیہ طور پر ناجائز تعلقات میں پھنس جائیں۔

تاہم یونانی اور لاطینی کلیسیاؤں میں رواج آج تک فرق ہے۔ یونانی کلیسیا غیر شادی شدہ ہونے کی شرط صرف بشپوں پر محدود رکھتی ہے جبکہ لاطینی کلیسیا نے یہ شرط نچلے درجے کے خدمت گزاروں پر بھی لگا دی۔

چوتھی اور پانچویں صدی تک یونانی کلیسیا میں شادی شدہ بشپ موجود تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ رواج ختم ہو گیا۔ اِس کے برعکس آج تک یونانی کلیسیا میں پادری اور

---

[a] ا۔کُرِنتھیوں 7۔

[b] متی 12:19 میں مسیح فرماتا ہے، ”بعض نے آسمان کی بادشاہی کی خاطر شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔“ لیکن یہ حکم نہیں ہے۔ مکاشفہ 4:14 میں لکھا ہے، ”یہ وہ مرد ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خواتین کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، کیونکہ وہ کنوارے ہیں۔ جہاں بھی لیلا جاتا ہے وہاں وہ بھی جاتے ہیں۔“ یہ بھی حکم نہیں ہے۔ نیز، یہ بات ناممکن ہے کہ یہاں لفظی معنوں میں کنواروں کا ذکر ہے۔ یہ خیال کلام سے ہٹ کر ہے کہ مرد شادی سے ناپاک ہو جاتا ہے۔

ڈیکن کو آزمائش سے بچنے کے باعث شادی کی اجازت ہے۔ لیکن عشائے ربانی جیسی مقدّس عبادات سے پہلے بیوی سے ہم بستر ہونا منع ہے۔

لاطینی کلیسیا میں چوتھی صدی سے کوشش کی گئی کہ پادری بھی غیر شادی شدہ رہیں، لیکن اِس کا عملی نتیجہ بہت دفعہ یہ تھا کہ پادری چپکے سے کوئی نہ کوئی عورت رکھتا تھا۔

مشرق کی دیوفیسی کلیسیا شروع میں خدمت گزاروں کی غیر شادی شدہ حالت پر زور دیتی تھی، لیکن پانچویں صدی کے آخر میں پاطریارک تک تمام خدمت گزاروں کو شادی کرنے کا حکم دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد خود پاطریارک پر غیر شادی شدہ رہنے کی شرط دوبارہ لگائی گئی جبکہ دیگر خدمت گزاروں کو بشپوں سمیت شادی کرنے کی اجازت ملی۔ لیکن 12ویں صدی سے مشرق کی کلیسیا کی یہ پالیسی یونانی کلیسیا کی پالیسی سے مطابقت رکھنے لگی۔[10]

باب 25

بشپ کے عُہدے کا فروغ

یونانی اور رومن کیتھولک کلیسیائیں آج تک اِس پر اصرار کرتی ہیں کہ بشپ رسولوں کی جگہ آ گئے ہیں۔ یعنی کہ رسولوں نے پہلے بشپوں کو مقرر کیا جن سے بشپ کے نظام کا تسلسل شروع ہوا۔ اُن کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ تسلسل آج تک سالم رہا ہے، لہٰذا صرف اُن ہی کی کلیسیائیں حقیقی ہیں۔ لیکن تحقیقات نے کچھ اَور سکھایا ہے۔

نئے عہد نامے میں بشپ کا عُہدہ

نئے عہد نامے میں کلیسیا کے راہنماؤں کے لئے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، episkopos[a] اور presbyteros۔[b] لیکن یہ دو مختلف عُہدے نہیں تھے بلکہ دونوں ایک ہی عُہدہ یعنی کلیسیا کے بزرگوں کا عُہدہ بیان کرتے تھے۔[c] یہ بات پہلی اور دوسری صدی کی دیگر تصنیفات میں بھی پائی جاتی ہے۔ کلیمینس از روم کُرِنتھیوں سے لکھ کر امتیاز کئے بغیر کبھی پہلا اور کبھی دوسرا نام استعمال کرتا ہے۔[1]

نئے عہد نامے کے مطابق ہر جماعت میں ہمیشہ بزرگوں کا پورا گروہ مقرر کیا گیا۔ اور یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ ہمیشہ رسولوں کے ہاتھوں ہوا۔[d] لوگوں کو علم تھا کہ ایک آدمی کی راہنمائی غیر صحت مند ہے۔ ہر کام کو مشورہ کرکے اور یک دلی سے کرنا ہے۔ لگتا ہے کہ بشپ کی طرف پہلا قدم یہ تھا کہ ہر جماعت کے بزرگ ایک صدر یا چیرمین چننے لگے۔ شروع میں اِس چیرمین کا خاص کردار نہیں تھا، لیکن آہستہ آہستہ اُس کی اہمیت بڑھتی گئی۔

صدیوں کے بعد کلیسیا کو یہ احساس رہا کہ بشپی نظام ابتدائی انتظام سے فرق تھا۔ کلیسیا کا بزرگ ایرونیمُس فرماتا ہے کہ شروع میں بزرگوں (presbyteros) کا گروہ کلیسیاؤں کی راہنمائی کرتا تھا۔ بعد میں ہی اُن میں سے ایک کو چن لیا گیا تاکہ کلیسیا کی نگاہ بانی کرکے اُسے بدعتوں سے دُور رکھے۔ چنانچہ اُس کے نزدیک بشپ کا نظام کلامِ مقدّس پر نہیں بلکہ کلیسیائی رواج پر مبنی ہے۔[2]

ایک قدیم روایت اِس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ فرماتی ہے کہ پہلی صدیوں میں اسکندریہ کی کلیسیا کے 12 بزرگ (presbyteros) اپنے آپ میں سے ایک کو صدر کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ اُسے وہ بشپ (episkopos) کہتے تھے۔[3]

---

[a] ἐπίσκοπος
[b] πρεσβύτερος
[c] اعمال 20:17، 28؛ فلپّیوں 1:1؛ ططس 1:5؛ ا۔تیم 3:1-7، 8-13؛ ا۔پطرس 5:1–2
[d] مثلاً اعمال 14:23؛ 15:2؛ 20:17

نئے عہد نامے کے بعد بشپ کا عُہدہ

پادریت اور بشپی نظام کی وجوہات دیگر جگہوں پر بیان کی گئی ہیں۔[a] مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک رسول زندہ تھے بشپ کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن دوسری صدی سے یہ نظام سرِ عام ہو گیا۔ لگتا ہے کہ بدعتوں کے رُوبرُو زمانے کا تقاضا یگانگت تھا۔ ایک اور وجہ بھی معلوم ہوئی ہے۔ ہر جماعت ضرورت مندوں کی مدد کرتی تھی۔ بڑے شہروں میں اِس خدمت میں بہت پیسے خرچ ہوتے تھے۔ یہ انتظام چلانے کی ذمہ داری بشپ کی تھی۔ کیا عجب، کیونکہ بشپ کا لفظ (episkopos) غیرمسیحی معاشرے میں بھی فائنینس آفسر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ڈیکن یہ امداد تقسیم کرتے تھے، لہٰذا ڈیکنوں اور بشپ کے درمیان تعلق بڑھ گیا۔ خاص کر ڈیکنوں کے منتظم آرچ ڈیکن کو اکثر بہت اختیار حاصل تھا۔[4] یہ فطری بات تھی کہ ایک معاشرہ جس میں ہر کوئی کسی سرپرست کے تحت زندگی گزارتا تھا بشپ کا تقاضا کرتا تھا۔

آیئے، ہم بشپ کے عُہدے کے فروغ پر مزید غور کریں۔

اِغناطسیوس: بشپ کی لازمی سرپرستی

اِغناطسیوس بار بار بشپ کے خاص کردار پر زور دیتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ جہاں بشپ ہے وہاں ایمان دار بھی ہوں، بالکل اُسی طرح جس طرح پوری کلیسیا وہاں ہے جہاں مسیح ہے۔[5] بشپ کے پاس ہونا کلیسیا میں ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اِغناطسیوس کے خطوں میں بشپ پوری کلیسیا کا سرپرست نہیں بلکہ ایک ہی جماعت کا سرپرست ہے۔ بعد میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ بشپ رسولوں کے جانشین ہیں، لیکن اِغناطسیوس سمجھتا ہے کہ دیگر بزرگ اور ڈیکن رسولوں کے جانشین ہیں جبکہ بشپ مسیح کا نمائندہ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے، ”آپ سب بشپ کی پیروی یوں کریں جس طرح یسوع مسیح باپ کی پیروی کرتا ہے۔ اِسی طرح بزرگوں کی یوں پیروی کریں جس طرح رسولوں کی۔“[6]

---

[a] دیکھئے صفحہ 107-108؛ 149-152۔

نیز، ''ظاہر ہے کہ ہمیں بشپ کو مسیح کی مانند سمجھنا چاہئے۔''[7] اُس کے خطوں میں یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ تمام بشپ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

غرض، اِغناطیوس کے خطوں میں بشپ بزرگوں میں سے ایک ہے گو وہ اُن کا صدر یا چیرمین ہے۔

ایرینیُس اور طرطُلیان: بشپوں کا اٹوٹ تسلسل

دوسری صدی کی آخری دہائیوں میں ایرینیُس بدعتوں کے دفاع میں پہلی دفعہ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ بشپ رسولوں کے وارث ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ چونکہ رسولوں سے لے کر آج تک بشپوں کا اٹوٹ تسلسل قائم رہا ہے اِس لئے اُنہوں نے صحیح تعلیم قائم رکھی ہے۔[8] تاہم وہ کلیمینس از روم کی طرح بشپ (episkopos) اور بزرگ (presbyteros) میں امتیاز نہیں کرتا بلکہ ایک حوالے میں روم کے بشپ کو بزرگ (presbyteros) کہتا ہے۔[9]

تقریباً 200ء میں طرطُلیان بشپوں کے تسلسل کا خیال دہراتا ہے، گو وہ بشپوں اور بزرگوں میں صاف امتیاز کرتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ مُنطانس کا پیروکار بن کر اِس کا انکار کرتا ہے۔[10] اِس کے برعکس اب وہ کہتا ہے کہ کلیسیا بشپوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ ہر ایمان دار کاہن ہے۔[11]

قبریانس: جہاں بشپ نہیں وہاں کلیسیا نہیں

تیسری صدی کے وسط میں قبریانس بشپ کی مرکزی اہمیت عروج تک پہنچاتا ہے۔ چونکہ اُس کے نزدیک خدمت گزار کاہن اور عشائے ربانی قربانی ہے اِس لئے ظاہر ہے کہ بشپ مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ بھی رسولوں سے لے کر آج تک بشپوں کے اٹوٹ تسلسل پر زور دیتا ہے۔ بشپ روح القدس سے معمور ہوتے ہیں، اور وہی اصلی عبادت اور رفاقت کی ضمانت دیتے ہیں۔ قبریانس یہاں تک کہہ سکتا ہے کہ بشپ کلیسیا میں ہے اور کلیسیا بشپ میں، لٰہذا جو بشپ کے ساتھ نہ ہو وہ کلیسیا میں نہیں

ہے۔ اُس کے نزدیک بشپ وہ گوند ہے جس سے کلیسیا میں یگانگت رہتی ہے۔[12] تاہم وہ کلیسیا کے بزرگوں سے مشورہ کرنے کے بغیر فیصلہ نہیں کرتا تھا، اور قرطاجنہ کی مجلسِ عامہ (397ء) نے فرمایا کہ جو بھی فرمان بشپ بزرگوں کے بغیر صادر کرے وہ منسوخ ہے۔[13]

بڑے شہروں کے بشپ اور پاطریارک

رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ بڑے شہروں کے بشپ خاص اہم بن کر میٹروپالٹن[a] کہلانے لگے۔ چوتھی صدی کے شروع میں یہ امتیاز عام ہوا۔ وہ شہر خاص اہمیت رکھتے تھے جو رسولی مادری کلیسیائیں سمجھے جاتے تھے، یعنی یروشلم، انطاکیہ، اسکندریہ، اِفسس، کُرِنتھس اور روم۔ اِن میں اسکندریہ، انطاکیہ اور روم سب سے اہم بن گئے۔ بعد میں قسطنطنیہ بھی اِن میں گنا گیا۔ چوتھی صدی سے اسکندریہ، انطاکیہ، روم، قسطنطنیہ اور یروشلم کے بشپ پاطریارک کہلانے لگے۔[14]

تبدیلیِ قسطنطین کے بعد بشپ کا نظام

آہستہ آہستہ بشپوں کی اہمیت اِتنی بڑھ گئی کہ آخرکار اُن کے انتخاب میں عام ایمان داروں کا کوئی حصہ نہ رہا۔ بشپ خود دیگر بشپوں اور خدمت گزاروں کو چن لیتے تھے۔ پانچویں صدی کے بعد وہ بپتسمہ لینے والوں کی تصدیق اور مخصوصیت بھی کرتے تھے، گو یہ پہلے بزرگوں کی ذمہ داری تھی۔

جب کلیسیا حکومت کے ساتھ جُڑ گئی تو بشپ سرکاری ملازم بھی بن گئے۔ وہ جج کی حیثیت بھی رکھتے اور کلیسیا کی ملکیت کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ کئی دفعہ وہ شہر کی کچھ سرکاری ملکیت کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ نیز، وہ سرکاری عدالت کے تحت نہیں تھے۔ اُنہیں خاص عزت حاصل تھی۔ بے شک بشپ بہت دفعہ یہ اختیار نیک کام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ہاں، اثناسیُس اور اوگسطین جیسے بشپ غریب کی سی زندگی گزارتے

metropolitan[a]

تھے۔ لیکن ایسے بشپ بھی تھے جو بڑے رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ قسطنطین سے پہلے بھی بشپوں کے بارے میں بہت سی شکایتیں ملتی ہیں۔ بعض بشپوں کی شان و شوکت بُت پرست امیروں سے کم نہیں تھی۔ بشپ پولس از سمیساط کی عجیب و غریب زندگی اِس کی خوب صورت مثال ہے۔[a]

مشرق کی کلیسیا اِس ناتے سے فرق تھی کہ وہ اِسی طرح حکومت میں شامل نہ ہوئی۔ تاہم اُس میں بھی غیرمسیحی حکومت کی مداخلت کئی دفعہ نظر آتی ہے۔ ساتھ ساتھ اُس کے بڑے عہدیدار بھی اپنا اختیار غلط استعمال کرنے کے خطرے میں تھے۔

بشپ کے علاوہ دیگر خدمت گزار

مغرب میں جتنا بشپ کا کردار اہم بن گیا اُتنا ہی دوسرے خدمت گزار بشپ کے اختیار میں آ گئے۔ تاہم بزرگ بشپ کے مشاورتی قونصل میں شامل رہے۔ بزرگ پادری نہیں بلکہ عام ایمان دار تھے۔ چوتھی صدی میں بزرگوں میں سے ایک کو راہنما کے طور پر مقرر کرنے کا رواج عام ہوا۔ یہ بزرگ بنام آرچ پریسبِٹر[b] عبادت کی راہنمائی کرتا اور بشپ کی غیر موجودگی میں اُس کی نمائندگی کرتا تھا۔

ڈیکن لاوی بھی کہلاتے تھے۔ غریبوں کی فکر کرنے کے علاوہ وہ کلام کی تلاوت کرتے تھے۔ اُنہیں بپتسمہ اور پیغام دینے کی اجازت بھی تھی۔ اکثر اُن کی تعداد اعمال 6 کے مطابق 7 پر محدود تھی۔ ڈیکن رتبے کے لحاظ سے بزرگوں کے تحت تھے، لیکن چونکہ وہ بشپ کی مدد کرتے تھے اِس لئے اُن کا اثر کئی دفعہ بزرگوں سے بڑھ کر تھا۔ چوتھی صدی سے اُن پر ایک ڈیکن بنام آرچ ڈیکن[c] مقرر تھا جو بشپ کا خاص مشیر تھا۔ بہت دفعہ وہ بشپ کا جانشین بھی بن گیا۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 187۔
[b] archpresbyter
[c] archdeacon

قدیم کلیسیا میں ابتدا سے ڈیکنیس کا عُہدہ بھی تھا۔[a] یہ عورتیں خواتین میں وہ خدمت سرانجام دیتی تھیں جو ڈیکن مردوں میں کرتے تھے۔ یعنی وہ غریب، بیمار یا جیل میں ڈالی ہوئی عورتوں کی فکر کرتی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ خواتین کے بپتسمے اور اُس کی تیاریوں میں مدد کرتی تھیں۔ مشرق میں یہ عُہدہ قائم رہا جبکہ مغرب میں وہ ہوتے ہوتے ختم ہوا۔

بڑے شہروں میں کئی دفعہ کلیسیا کی ملکیت بہت زیادہ تھی۔ اِسے سنبھالنے کے لئے منتظم کا عُہدہ بن گیا۔ اِس کے علاوہ سیکرٹری، ایک قسم کے میل نرس[b] اور مُردوں کو دفنانے والے بھی کلیسیائی خدمت سرانجام دیتے تھے۔[15]

[a] رومیوں 16:1،2
[b] parabolani

باب 26

پوپ کے عُہدے کا فروغ

روم کی کلیسیا دعویٰ کرتی ہے کہ اُس کا بشپ یعنی پوپ کا اول درجہ ہے۔ وہ متی 16:
18-19 میں اِس کا ثبوت دیکھتی ہے، جہاں مسیح فرماتا ہے،

> تُو پطرس یعنی پتھر ہے، اور اِسی پتھر پر مَیں اپنی جماعت کو تعمیر کروں گا، ایسی جماعت جس پر پاتال کے دروازے بھی غالب نہیں آئیں گے۔ مَیں تجھے آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں دے دوں گا۔ جو کچھ تُو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بھی بندھے گا۔ اور جو کچھ تُو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر بھی کھلے گا۔

پوپ کی اولیت پر یقین پانچ بنیادی خیالوں پر منحصر ہوتا ہے۔

- پطرس نہ صرف عزت کے لحاظ سے اول درجہ رکھتا ہے بلکہ قیادت اور فیصلہ کرنے میں بھی۔
- پطرس کا اختیار ایک عُہدہ تھا جو وراثت میں دوسروں پر منتقل ہو گیا ہے۔
- یہ عُہدہ نہ یروشلم، انطاکیہ یا کسی اَور کلیسیا کے بشپ پر منتقل ہوا بلکہ صرف روم کے بشپ پر۔
- پطرس نہ صرف روم میں شہید ہوا بلکہ وہاں بشپ بھی تھا۔ اُس نے یہ عُہدہ بعد کے بشپ پر منتقل کر دیا، اور عُہدے کا یہ تسلسل آج تک روم میں قائم رہا ہے۔
- روم کا بشپ ابتدا سے ہی پوری کلیسیا کی قیادت کا اختیار رکھتا ہے۔

اِن تمام باتوں میں سے ایک بھی کتابِ مقدّس سے یا تاریخی لحاظ سے ثابت نہیں کی جا سکتی ہے۔ البتہ اِس میں کوئی شک نہیں کہ روم کی کلیسیا نہایت قدیم تھی اور قدیم زمانے میں مرکزی اہمیت رکھتی تھی۔ اُس کی محبت اور ایذا رسانیوں میں اُس کی ثابت قدمی مشہور تھیں۔

تاریخی تصانیف میں روم کے بشپ کا کیا کردار تھا؟ پہلی صدی کے آخری سالوں میں روم کا بشپ کلیمینس کُرِنتھس کی جماعت کو خط لکھتا ہے۔ اِس میں وہ حکم نہیں دیتا بلکہ برادرانہ انداز میں اُسے مشورہ دیتا ہے۔ روم کے بشپ کی اولیت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اِغناطیوس دوسری صدی کے شروع میں روم کی کلیسیا کو خط لکھ کر بشپ کا ذکر تک نہیں کرتا گو کئی بار کلیسیا سے مخاطب ہوتا ہے۔

نہ ایرینیُس اور نہ ہی طرطُلیان پوپ کی اولیت کا ذکر کرتے ہیں۔ اور گو قبریانس روم کے بشپ کو پطرس کا جانشین سمجھ کر اُس کے خاص کردار پر زور دیتا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ سمجھتا ہے کہ تمام بشپ برابر ہی ہیں۔

اِس کے باوجود آہستہ آہستہ مغرب کی تمام کلیسیائیں یکے بعد دیگرے روم کے تحت آگئیں۔ پوپ کا یہ فائدہ تھا کہ وہ مغرب میں واحد پاطریارک تھا۔ نیز، وحشی قبیلوں کے حملوں سے بہت سے کلیسیائی علاقے کمزور ہو گئے تھے۔ روم کے بشپوں نے اِس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ مثال کے طور پر شمالی افریقہ میں مضبوط کلیسیا تھی جس میں اوگسطین اور قبریانس جیسے بشپ اپنی کلیسیا کا دفاع کرتے تھے۔ لیکن پانچویں صدی میں وحشی قبیلے کے حملوں کے باعث شمالی افریقہ کی کلیسیا کمزور ہو کر روم کے تحت آ گئی۔ اِسی طرح پوپ دیگر علاقوں پر بھی حاوی ہوا۔ جہاں کام یاب نہ رہا وہاں بعد کے پوپوں نے یہی کوششیں جاری رکھیں۔[1]

باب 27

مدرسوں کا انتظام

کلیسیا کے خدمت گزاروں کو کہاں سے تعلیم حاصل ہو سکتی تھی؟ اسکندریہ میں دوسری صدی سے چوتھی صدی کے آخر تک ایک مشہور مدرسہ تھا جو علامتی تفسیر[a] پر زور دیتا تھا۔ اِس کے سب سے مشہور اُستاد کلیمنیس اور اورِغین تھے۔ بعد میں اورِغین نے فلسطین کے شہر قیصریہ میں ایک نیا مدرسہ کھولا۔

انطاکیہ میں 290ء میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو مذکورہ مدرسوں سے بہت فرق تھا۔ علامتی تفسیر کے برعکس اُس نے لفظی تفسیر پر زور دیا۔ اُس کے مشہور عالِم تھیُودور، نسطوریُس اور یوحنا فم الذہب تھے۔

---

allegorical exegesis[a]

افرائیم سُریانی نے چوتھی صدی کے آخر میں ایدیسہ کا مدرسہ قائم کیا۔ اُس کی تعلیم انطاکیہ کے مدرسے کے قریب تھا، اور وہ سَو سال تک قائم رہا۔ پانچویں صدی کے آخر میں جب یونانی حکومت نے یہ بند کیا تو اُس کے دیوفیسی اُستادوں نے فارس کے شہر نِصیبین میں مدرسہ کھولا۔ یہ مدرسہ مشرق کی کلیسیا کے لئے مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔

اُس زمانے کے مغرب میں مشرق کی سی تعلیم کا معیار نہیں تھا۔ اکثر تعلیم خانقاہوں اور بشپوں کے ذاتی مدرسوں میں حاصل ہوئی۔ مثلاً اوگسطین کے تحت بہت سے خدمت گزاروں کو تربیت حاصل ہوئی۔

کلیسیا کی ایک خوبی یہ تھی کہ اُس نے غیرمسیحی تعلیم اپنا لی بلکہ کئی ایک بزرگوں نے غیرمسیحی مرکزوں سے تعلیم حاصل کی۔ اِن میں باسیلِ اعظم، یوحنا فم الذہب، امروز، اوگسطین اور ایرونیمُس شامل ہیں۔

باب 28

کلیسیا کی یگانگت

پولس رسول کے خطوط میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ کلیسیا مسیح کا بدن ہے، جو متحد، قدوس اور ہمہ گیر ہے۔ اُس وقت سے ایمان دار یقین رکھتے ہیں کہ کلیسیا ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ قدیم کلیسیا نے یہ خیال بشپ کے نظام کے ساتھ جوڑ دیا۔ یعنی اُس نے اصرار کیا کہ خالی ایمان لانا ناکافی ہے بلکہ صرف وہی ایمان دار ہے جو اِس بشپی کلیسیا کا ممبر ہو۔ تینوں بزرگ اِغناطیوس، ایرینئیُس اور قبریانس کلیسیا کا اتحاد بشپ کے نظام کے ساتھ یوں جوڑ دیتے ہیں۔

اِغناطیوس پہلی دفعہ لفظ ''کیتھولک'' استعمال کر کے فرماتا ہے، ''جہاں مسیح یسوع ہے وہاں کیتھولک کلیسیا ہے۔''[1] کیتھولک کے پیچھے یونانی لفظ katholikos ہے۔ اِس لفظ سے کیا مراد ہے؟ مطلب یہ ہے کہ دیگر فرقوں کے برعکس کلیسیا سالم ہے۔

وہ ہمہ گیر، متحد اور خدا کی واحد جماعت ہے۔ اُس کی بنیاد خود مسیح اور اُس کے رسول ہیں۔ اِغناطیوس کے نزدیک کلیسیا نجات اور آسمان کی بادشاہی کا واحد وسیلہ ہے۔ جو اُس سے الگ ہو جائے وہ نجات سے محروم رہ جائے گا۔[2]

ایرینئیُس بھی اِس پر زور دیتا ہے کہ کلیسیا نجات کا وسیلہ ہے۔ وہ دنیا میں روح القدس کا گھر ہے۔[3]

طرطُلیان پہلی بار کلیسیا کا مقابلہ نوح کی کشتی سے کرتا ہے۔ جس طرح نوح اپنے خاندان سمیت سیلاب سے بچ گیا اُسی طرح ایمان دار کلیسیا کے وسیلے سے بچ جاتا ہے۔[4]

خاص کر قبریانس کلیسیا کے ہمہ گیر، متحد اور ایمان کے لئے لازم کردار پر زور دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک جس طرح شاخ درخت سے الگ قائم نہیں رہ سکتی اُسی طرح ایمان دار کلیسیا سے الگ قائم نہیں رہ سکتا۔ کلیسیا بشپ کے نظام سمیت ایمان کے لئے لازم ہے۔[a]

غرض، بزرگوں نے مل ملا کر زور کلیسیا کی ظاہری شکل پر دیا۔ جہاں کتابِ مقدّس کا زور روحانی یگانگت پر ہے وہاں اُنہوں نے کلیسیا کے ظاہری انتظام کی یگانگت پر خاص دھیان دیا۔ جہاں کلام میں لکھا ہے کہ مسیح سے باہر نجات نہیں ملتی وہاں خاص کر قبریانس فرماتا ہے کہ کلیسیا سے باہر نجات نہیں ملتی۔

گو اتحاد بزرگوں کا مرکزِ خیال رہا تاہم کلیسیائی رفاقت خلقیدون کی مجلسِ عامہ میں ٹوٹ گئی، اور نتیجے میں میافیسی، دیوفیسی اور خلقیدونی کلیسیائیں ایک دوسری سے الگ ہو گئیں۔

---

[a] دیکھئے صفحہ 150 و مابعد۔

مجلس کا انتظام

کلیسیائی مجلسیں یگانگت اور نظم و ضبط قائم رکھنے کا خاص وسیلہ تھیں۔ اِن کا نمونہ وہ میٹنگ تھی جس کا ذکر اعمال 15 میں ہے۔ یہ مجلسیں اُن مجلسوں سے کچھ مطابقت رکھتی تھیں جو رومی ممالک میں سیاسی سطح پر منعقد ہوتی تھیں۔

پہلی کلیسیائی مجلسوں کا ذکر دوسری صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ نقایہ کی مجلسِ عامہ (325ء) پہلی بین الاقوامی مجلس تھی۔ اِس کی وجہ قسطنطین کی تبدیلی تھی جو اپنے ممالک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کلیسیائی امن کا تقاضا کرتا تھا۔ اِس سے پہلے کلیسیائی مجلسیں مقامی یا صوبائی سطح پر محدود رہتی تھیں۔

نقایہ کی مجلس تک نہ صرف خدمت گزار بلکہ دیگر ایمان دار بھی حصہ لیتے تھے۔ لیکن پادریت کی ترقی پر یہ رواج آہستہ آہستہ ختم ہوا۔ نقایہ کی مجلس میں اور اُس کے بعد صرف بشپ شرکت کرتے تھے۔ اور چونکہ بشپ اپنے آپ کو رسولوں کے جانشین سمجھتے تھے اِس لئے وہ صحیح معنوں میں اپنی کلیسیاؤں کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔

جو سات مجلسیں عام طور پر کلیسیاؤں سے مانی جاتی ہیں وہ سب رومی بادشاہوں سے منعقد ہوئیں۔ وہی دھیان دیتے تھے کہ مجلسوں کے فرمانوں کی تعمیل کی جائے۔ لیکن وہ اِس لئے منظور نہیں ہوئیں بلکہ اِس لئے کہ تمام کلیسیاؤں نے اُنہیں تسلیم کیا۔

گو عام ایمان داروں کو اِن مجلسوں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی تاہم اِن کا نمونہ اِس ناتے سے اچھا تھا کہ بادشاہ نے یہ فرمان صادر نہ کئے بلکہ خود بشپ مشورے کے بعد اور مل کر اِن فرمانوں تک پہنچے۔

فیصلے تک پہنچنے کا کیا طریقہ تھا؟ نظم و ضبط کے معاملوں میں اکثریت کی رائے کافی تھی، لیکن تعلیم کے فیصلوں کے لئے سب کے اتفاق کی ضرورت تھی۔ تعلیم کے فرمان آج تک اکثر کلیسیاؤں سے مانے جاتے ہیں جبکہ نظم و ضبط کے فرمان قدیم کلیسیا میں بھی عارضی سمجھے جاتے تھے۔

پروٹیسٹنٹ کلیسیائیں خاص کر پہلی چار مجلسوں کی تعلیم کو اِس حساب سے قبول کرتی ہیں کہ وہ کلام پر مبنی ہوتی ہے۔ یونانی اور رومی کلیسیائیں ساتوں مجلسوں کو کلام کے ساتھ ساتھ مانتی ہیں۔ مشرق کی دیوفیسی کلیسیا نے صرف نقایہ اور قسطنطنیہ (381ء) کی مجلسوں کو تسلیم کیا جبکہ مصر اور ایتھوپیا کی میافیسی کلیسیا نے صرف پہلی تین مجلسیں مان لیں یعنی نقایہ، قسطنطنیہ اور اِفسس (431ء) کی مجلسیں۔

باب 29

کلیسیا کا نظم و ضبط

قدیم کلیسیا سخت نظم و ضبط کے تحت چلتی تھی۔ لیکن قسطنطین تک یہ نظم و ضبط کلیسیا کا ذاتی معاملہ تھا۔ جب کلیسیا قسطنطین کی تبدیلی پر حکومت میں شامل ہو گئی تو وہ بڑے مجرموں کو حکومت کے سپرد کرنے لگی۔

نظم و ضبط کا کیا مقصد تھا؟ ایک تو کلیسیا کی پاکیزگی اور عزت برقرار رکھنی تھی۔ دوسرے، گناہ گار کی روحانی بحالی بھی پیشِ نظر رکھنی تھی۔ تربیت سے اُسے دوبارہ صحیح راہ پر لانا تھا۔ سب سے سنگین گناہوں کے جواب میں گناہ گار کو رفاقت سے خارج کیا جاتا تھا۔ اِس سے وہ ایمان داروں کے تمام حقوق سے محروم رہ جاتا تھا۔ اِن گناہوں میں کیا کیا شامل تھا؟ کفر، بدعت، تفرقہ بازی، چوری، قتل، زنا اور مسیح کا انکار۔ طرطُلیان

کی پیروی میں کلیسیا ایسے گناہوں کو موت تک لے جانے والے گناہ[a1] قرار دے کر اُن میں اور دیگر گناہوں میں امتیاز کرنے لگی۔

رفاقت سے خارج کیا گیا شخص کس طرح دوبارہ جماعت میں داخل ہو سکتا تھا؟ پہلے وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہو کر عشائے ربانی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا بلکہ صرف اُس عبادت میں جس میں غیر بپتسمہ یافتہ آ سکتے تھے۔ جو کچھ بپتسمہ لینے سے پہلے ادا کرنا تھا اُسے توبہ کرنے والے کو بھی کرنا تھا۔ ساتھ ساتھ اُسے خلوص دلی، پرہیز گاری، خیرات اور نیک اعمال سے توبہ کا اظہار کرنا تھا۔

توبہ کرنے والوں کے اکثر چار مرحلے تھے۔ پہلے وہ "رونے والے" کہلاتے تھے جب ماتمی کپڑے پہن کر گرجا گھر کے دروازے پر جماعت سے بحالی کی التجا کرتے تھے۔ پھر وہ "سننے والے" بن کر کلام کی تلاوت اور وعظ سن سکتے تھے۔ اِس کے بعد وہ "گھٹنے ٹیکنے والے" بن جاتے تھے۔ اب اُنہیں گھٹنے ٹیک کر عام دعاؤں میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔ آخر میں وہ "کھڑے ہونے والے" بن کر کھڑی حالت میں عشائے ربانی کے سوا پوری عبادت میں شریک ہو سکتے تھے۔

عام طور پر توبہ کا دورانیہ تین یا چار سال تھا۔ اِس کے بعد توبہ کرنے والا جماعت کے سامنے گناہ کا اقرار کرتا اور پادری اُس پر ہاتھ رکھ کر معاف کرتا اور اُسے برکت دیتا تھا۔ اِس کے بعد اُسے دوبارہ عشائے ربانی میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔

اِس سلسلے میں سوال اُٹھا کہ کیا کلیسیا ہر صورت میں گناہ گار بحال کر سکتی ہے، گو اُس کا گناہ کتنا سنگین کیوں نہ ہو؟ مُنطانی، نواتسیانی اور دوناتی فرقوں نے اعتراض کیا کہ جس سے سنجیدہ گناہ سرزد ہوا ہو اُسے بحال نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر جس نے مسیح کا انکار کیا ہو اُسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسروں نے کہا کہ جو بھی توبہ کرے اُسے بحال کرنے کا موقع دیا جائے۔ خاص کر مصر اور روم کی کلیسیائیں یہ تعلیم دیتی تھیں۔

---

[a] mortal sins

پہلی پارٹی نے خدا کی پاکیزگی اور قدوسیت پر زور دیا جبکہ دوسری نے خدا کے فضل پر۔ پہلی چاہتی تھی کہ کلیسیا خدا جیسی پاک ہو، گو یہ حالت اِس دنیا میں ناممکن ہے۔ دوسری خدا کے فضل پر زور دینے سے گناہ کی سنجیدگی نظر انداز کرنے کے خطرے میں تھی۔

روم کی کلیسیا دوسری پارٹی کی تعلیم میں آگے تھی۔ مثال کے طور پر کلِستُس[a] نامی پوپ نے فرمایا کہ جس طرح خود رَو پودے گندم کے ساتھ ساتھ اُگتے ہیں[b] اور نوح کی کشتی میں پاک اور ناپاک جانور تھے اُسی طرح کلیسیا بھی پاک اور ناپاک لوگوں سے بھری رہے گی۔ اُس کے نزدیک کلیسیا کے ہاتھ میں ہر گناہ کو معاف کرنے کی کنجی ہوتی ہے۔ بعد کے پوپوں نے یہ خیال مزید بڑھایا۔

روم کی یہ تعلیم کلیسیا کے پھیلاؤ کے لئے فائدہ مند تھا، لیکن ساتھ ساتھ کلیسیا غیر سنجیدہ ایمان داروں سے بھرنے کے خطرے میں آ گئی۔ نیز، اِس سے پادری اور بشپ کا اختیار مزید بڑھ گیا، کیونکہ اُن ہی کے ہاتھوں معافی ملتی تھی۔

قسطنطین کی تبدیلی کے بعد حکومت نظم و ضبط قائم رکھنے میں کلیسیا کی مدد کرنے لگی۔ کسی بشپ کو کرسی سے ہٹا کر جلاوطن کرنا حکومت کی ذمہ داری بن گئی۔ اب سے بدعت کی سزا بھی حکومت کی طرف سے دی جاتی تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ کلیسیا بہت دفعہ ایمان داروں کے اخلاقی گناہوں سے نپٹنے سے قاصر رہی۔ اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ قسطنطین کے ساتھ ساتھ بے شمار بُت پرست کلیسیا میں داخل ہوئے جو سنجیدہ نہیں تھے۔ بادشاہوں کا اپنا نمونہ اکثر اوقات اچھا نہیں تھا۔ گو وہ سختی سے بدعتوں سے نپٹتے تھے لیکن بہت دفعہ اُن کی زندگی کلام کی ہدایات سے کہیں دُور تھی۔

آہستہ آہستہ کلیسیا کا نظم و ضبط گھٹتا گیا، یہاں تک کہ آخر میں ہر ایمان دار کو عشائے ربانی میں شریک ہونے کی اجازت ملی اگر وہ اپنے آپ کو لائق سمجھے۔ پہلے خاص

---

[a] Kallistus
[b] متی 30:13

ملازم اِس پر دھیان دیتے تھے کہ توبہ کرنے والا توبہ کی شرائط پوری کرے۔ لیکن چوتھی صدی کے آخر میں یہ عُہدہ ختم ہوا۔

البتہ ہر زمانے کے ایسے بشپ رہے جو اِن باتوں پر دھیان دیتے تھے۔ مثلاً امروز نے بادشاہ کو کلیسیا سے خارج کر دیا جب اُس نے بلاوجہ 7,000 افراد کو مروا دیا۔ آٹھ ماہ توبہ کرنے کے بعد ہی اُسے نئے سرے سے کلیسیا کی رفاقت میں شامل کر دیا گیا۔

دوناتی تفرقہ

دوناتی تفرقے کا ذکر ہو چکا ہے۔[a] دوناتیوں اور عام کلیسیا کی تعلیم میں کیا فرق تھا؟ دوناتیوں کے نزدیک کلیسیا مقدسین کی جماعت ہے۔ کلیسیا کی پاکیزگی، روحانی اختیار اور جائز کردار اِس پر منحصر ہے کہ اُس کے ایمان دار مقدّس ہوں۔ غرض، دوناتیوں کے نزدیک کلیسیا نہ صرف وہ جگہ ہے جہاں ایمان داروں کو مقدّس بننے کی تربیت ملتی ہے بلکہ ایسی جماعت جس میں ایمان دار کافی حد تک مقدّس ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو مقدّس رسومات غیر مؤثر رہتی ہیں۔

چنانچہ دوناتی سخت کلیسیائی نظم و ضبط کا تقضا کرتے تھے۔ نالائق ممبران کو خارج کرنا چاہئے، خاص کر اُن کو جنہوں نے ایمان کا انکار یا کلام کو ستانے والوں کے سپرد کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بشپ سِلیانس کا اختیار نہیں مانتے تھے، کیونکہ جن بشپوں نے اُسے مخصوص کیا تھا اُن میں سے ایک نے کلام کو ستانے والوں کے سپرد کر دیا تھا۔

اِن کے جواب میں اوگسطین نے فرمایا کہ کلیسیا کی مقدّس حالت ممبران پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اِس پر کہ وہ مسیح کا بدن ہے۔ جو کلیسیا پوری دنیا میں پھیل کر بشپوں کے اٹوٹ تسلسل پر قائم رہی ہے وہی حقیقی کلیسیا ہے۔ اُس کے نزدیک چونکہ کلیسیا کی

---

[a] دیکھئے صفحہ 274-275؛ 324 و مابعد؛ 472۔

بنیاد مسیح ہے اِسی لئے مقدّس رسومات جائز اور پُراثر ہوتی ہیں، خواہ اُنہیں پیش کرنے والا نالائق کیوں نہ ہو۔

دوناتی فرقے کے نزدیک اُن کی تعلیم کا ثبوت متی 13:24-30 میں ملتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس کھیت میں گندم اور خود رَو پودوں کا بیج بویا گیا وہ دنیا ہے جبکہ باقی کلیسیا کے مطابق یہ کھیت آسمان کی بادشاہی یعنی کلیسیا ہے۔ یعنی موجودہ کلیسیا میں صحیح اور جھوٹے ایمان دار ہوتے ہیں، لیکن جھوٹے لوگوں کو نکالنا ہمارا کام نہیں۔ اُنہیں آخرت پر نکالا جائے گا۔[a] یہ دو نظریئے آج تک چلتے آئے ہیں۔[2]

[a]بمقابلہ متی 13:47-50

ضمیمے

باب 30

ضمیمہ اول

قورلوس کا اضافہ (451ءتا 680ء)

عقیدۂ خلقیدون آخری عقیدہ تھا جس میں دیوفیسی کلیسیائے مشرق کے سوا تمام کلیسیائیں شریک تھیں۔ ساتھ ساتھ بعد کے عقیدے سب خلقیدون کی تشریح پر محدود رہے۔ تعلیم کے لحاظ سے اُن کی اہمیت کم ہے۔ مغربی کلیسیا کے لئے زیادہ تر پہلے چار عقیدے اہم رہے جبکہ اُس پر پانچویں عقیدے و مابعد کا کم ہی اثر پڑا۔

اب سے ایک اَور رجحان بھی نظر آتا ہے۔ چوتھی صدی کے انجام تک کئی ایک مسیحی عالِم مشہور ہو گئے، ایسے عالِم جو خود مختار اور انفرادی سوچ رکھتے تھے۔اِن میں ایرینئیُس،

اورِغین، اثناسیُس، اپولینار اور کپڈُکی بزرگ شامل تھے۔ پانچویں صدی میں یہ تسلسل قورلوس، انطاکیہ کے بزرگوں اور اوگسطین سے جاری رہا۔

لیکن ہوتے ہوتے ایک عجیب سی تبدیلی نظر آنے لگی۔ اب سے لوگ اپنی رائے آبائے کلیسیا کے اقتباسات سے ثابت کرنے لگے۔ چھٹی صدی سے ہر ایک اپنی تعلیم کی تصدیق کرنے کے لئے ایسے حوالجات کا پورا لشکر پیش کرنے لگا۔ چنانچہ اُس وقت سے ایسی کتابیں اہم بن گئیں جو بزرگوں کے سب سے اہم قول جمع کرتی تھیں۔ غرض انفرادی سوچ کم ہی پائی جاتی تھی، ہاں وہی آدمی عالِم سمجھا جاتا تھا، جو اپنی ہر بات بزرگوں کے لاتعداد حوالجات سے ثابت کر پایا۔[1]

خلقیدون کے نتائج

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عقیدۂ خلقیدون کا مقصد تمام پارٹیوں کو متحد کرنا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔[2] مشرق کی میافیسی اکثریت کو بڑا غصہ آیا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ہم سے زیادتی ہوئی ہے۔ نتیجے میں مشرق کے تین بڑے مراکز اسکندریہ، یروشلم اور انطاکیہ یکے بعد دیگرے عقیدے کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ مغرب میں روم بھی کُڑھتا رہتا تھا۔ بے شک وہ خلقیدون سے خوش تھا۔ لیکن یہ بات اُسے ناگوار لگی کہ عقیدے کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی صادر ہوا تھا کہ اب سے قسطنطنیہ رُتبے کے لحاظ سے روم کے برابر ہے۔

قسطنطیہ کے حکمران خلقیدون کی سرِ عام قبولیت کروانے کے کوشاں رہے۔ اِس مقصد کے تحت کئی ایک مخالف بشپ کو تبدیل کیا گیا۔ تاہم وہ سب کو خلقیدون کے تحت کرنے میں ناکام رہے۔ خاص کر مصر کافی حد تک میافیسی رہا جبکہ اب انطاکیہ بھی میافیسیت کا اہم مرکز بن گیا گو وہ پہلے دیوفیسیت کا مرکز تھا۔

فلسطین میں میافیسیت کا اثر ایک واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کافی دیر سے ایک دعا بنام 'تین مقدّس'[a] عبادت کا حصہ بن گئی تھی۔ دعا یوں شروع ہوتی ہے، ''اے مقدّس خدا، اے تُو جو مقدّس اور قوی ہے، اے تُو جو مقدّس اور لافانی ہے، ہم پر رحم کر۔'' اب انطاکیہ کے میافیسی بشپ نے الفاظ ''جو ہمارے لئے مصلوب ہوا'' سے اِس کا اضافہ کیا۔ یعنی ''. . . اے تُو جو لافانی ہے اور ہمارے لئے مصلوب ہوا، ہم پر رحم کر۔'' گو انطاکیہ میں اِس دعا کا تعلق مسیح سے تھا لیکن عقیدۂ خلقیدون کے پیروکار سمجھتے تھے کہ یہ تثلیث کی دعا ہے، اور کہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے دُکھ اُٹھایا ہے۔ جواب میں خاص کر قسطنطنیہ میں بڑی افرا تفری مچ گئی۔

سمجھوتے کی عبث کوششیں: اِنکیکلیَن اور ہِنوطِقان

نااتفاقی پر قابو پانے کے لئے حکومت نے یکے بعد دیگرے سمجھوتے کے دو فرمان صادر کئے جو اِنکیکلیَن اور ہِنوطِقان کہلاتے ہیں۔

اِنکیکلیَن: خلقیدون منسوخ

جب رومی بادشاہ زینو کو تخت سے ہٹایا گیا تو نئے بادشاہ نے سب کو خوش رکھنے کے لئے 476ء میں ایک فرمان بنام اِنکیکلیَن (گشتی چٹھی) صادر کیا جس میں عقیدۂ خلقیدون کو منسوخ قرار دیا گیا۔

اگرچہ مصر اور شام خوش ہوئے لیکن قسنطنطنیہ کے بشپ اکاق نے شور مچا کر دار الحکومت کے باشندوں اور راہبوں کو اِس کے خلاف کھڑا کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینو دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ مختلف پارٹیوں کے باعث مشکل سے ہی عقیدۂ خلقیدون کو بحال کر پایا۔ مسئلے کو حل کرنے کے لئے اُس نے 482ء میں ہِنوطِقان (اتحاد کا کاغذ) صادر کیا۔

---

[a] τρισάγιον (trishagion)

ہِنوطِقان : میافیسی رجحان

بشپ اقاق سے تیار کردہ اِس 'کاغذ' کا مقصد لوگوں کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ یہ عقیدۂ خلقیدون کو منسوخ نہیں کرتا بلکہ اُسے نظر انداز کرکے اپنے بیانات صرف پہلے تین عقیدوں کی بنیاد پر رکھتا ہے۔ خلقیدون نے ایک اقنوم اور دو ذاتوں میں امتیاز کیا تھا۔ ہِنوطِقان اِس امتیاز کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ مجموعی طور پر میافیسیت کو خوش رکھنے کی باتیں کرتا ہے۔

لیکن اِس کاغذ نے بھی اتحاد پیدا نہ کیا، بلکہ اب کچھ اِس کے خلاف اور کچھ اِس کے حق میں جھگڑنے لگے۔ چھٹی صدی کا ایک مؤرخ لکھتا ہے، ''دنیا کی تمام کلیسیائیں مختلف پارٹیوں میں بٹ گئیں، یوں کہ بشپ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت نہیں رکھتے تھے۔'' ایمان میں سمجھوتا ایک خطرناک چیز ہے! اقاقی تفرقہ (484ء تا 519ء) اِس کا سب سے کڑوا پھل تھا۔ اقاق اور ہِنوطِقان کے جواب میں مغرب نے مشرق کے ساتھ کلیسیائی رفاقت بند کر دی۔ یہ تلخ رخنہ اُس وقت تک رہا جب تک ہِنوطِقان کو منسوخ نہ کیا گیا۔ تین باتوں نے ہِنوطِقان کو ناکام ہونے دیا۔ ایک تو مغرب کے پاپائے روم نے اِسے رد کرکے مشرق سے کلیسیائی رفاقت بند کر دی۔ دوسرے، خلقیدون کی پارٹی خاص کر فلسطین اور قسطنطنیہ میں مضبوط تھی۔ تیسرے، یُوسطِنیان بادشاہ نے اِسے ختم کرکے عقیدۂ خلقیدون کو آئندہ کے لئے بادشاہت کا اٹوٹ انگ بنا دیا۔

ساتھ ساتھ میافیسیت کے نزدیک ہِنوطِقان کا سمجھوتا بھی ناکافی تھا۔ ویسے بھی چھٹی صدی سے میافیسی کلیسیا دیگر کلیسیاؤں سے جدا ہو کر خود مختار ہونے لگی۔ یہ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب میافیسی تعلیم کے مجموعے قلم بند ہونے لگے۔ اِس تعلیم کے بڑے

نمائندے فلاکسِنُس از منبج [a] اور سویُرس از انطاکیہ[b] ہیں۔ ہوتے ہوتے میافیسی کلیسیا اِتنی بے لچک ہوگئی کہ کوئی بھی سمجھوتا نامنظور تھا، خواہ ہِنوطِقان ہو خواہ خلقیدون۔

اِس جگہ پر اُس زمانے کے اہم بادشاہ یُوسطِنیان پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

یُوسطِنیان اعظم: دنیاوی اور روحانی حکمران

یُوسطِنیان 527ء تا 565ء بادشاہ تھا۔ اُس کا کلیسیا پر بھاری اثر سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم اُس کی کلیسیا کے بارے میں سوچ پر نگاہ ڈالیں۔ اِس سوچ کا سرچشمہ قسطنطین ہے۔ قسطنطین پہلا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ اور اُسی نے کلیسیا کی مجلسِ عامہ کا انتظام شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت سے رومی بادشاہ کلیسیائی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے لگا۔ کیونکہ ایمان کی یگانگت لازم تھی اگر بادشاہت قائم رہے۔

یُوسطِنیان نے یہی سوچ بڑی سنجیدگی سے اپنائی۔ لیکن اُس میں اِس سے بڑھ کر ایک نئی بات بھی آ گئی۔ وہ قائل تھا کہ روحانی اور دنیاوی معاملے بادشاہ کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، کہ ایمان کی یگانگت اور سچائی قائم رکھنا دونوں ہی بادشاہ کی ذمہ داری ہیں۔ یعنی اُسے نہ صرف دنیا میں حکومت کرنے کا اختیار ہے بلکہ کلیسیا میں بھی۔ اِس سوچ کو قیصرو پاپیت [c] کہا جاتا ہے، وہ حالت جب کلیسیا کی حکومت بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یعنی بادشاہ (قیصر) اپنے آپ کو کلیسیا کا سربراہ (پاپا) سمجھتا ہے۔ اگرچہ قسطنطین پہلے سے دار الحکومت کو روم سے قسطنطنیہ میں منتقل کر چکا تھا لیکن اب سے رومی ممالک کا مشرقی حصہ مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے مغرب سے دُور ہونے لگا۔ اِس بادشاہت کو بیزنطینی کہا گیا۔

Philoxenus of Mabbug[a]
Severus of Antioch[b]
caesaropapism[c]

یُوسطِنیان بیزنطینی بادشاہت کا بانی تھا، یعنی اُس کی حکومت کے تحت رومی بادشاہت بیزنطینی بادشاہت میں تبدیل ہوئی۔ بیان کردہ سوچ بیزنطینی سلطنت کا ایک اہم ستون بن گیا۔

کیا عجب کہ یُوسطِنیان نے اُس وقت کا سب سے بڑا گرجا گھر ہاگیہ صوفیہ (مقدّس حکمت) تعمیر کیا۔ 537ء میں اِس کے افتتاح پر وہ پکار اُٹھا، ''اے خدا، تیری تمجید ہو جس نے مجھے ایسا کام تکمیل تک پہنچانے کے لائق سمجھا ہے۔ اے سلیمان، مَیں تجھ پر غالب آ گیا ہوں!'' یہ الفاظ صاف دکھاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو کلیسیا کا رئیس بھی سمجھتا ہے۔ جس طرح سلیمان نے خدا کی قوم کے لئے ہیکل تعمیر کی اُسی طرح یُوسطِنیان نے کلیسیا کے لئے گرجا گھر بنایا۔

ظاہر ہے کہ ایسا بادشاہ کلیسیا کی تعلیم اور معاملات میں بھی مداخلت کرے گا۔ اُس کا کلیسیائی فیصلوں پر کیا اثر پڑا؟

اقاقی تفرقے کا اختتام

519ء میں بادشاہ نے ہِنوطِقان کو منسوخ کر کے روم سے صلح کرائی۔ اِس سے اقاقی تفرقہ ختم ہوا۔ یہ کچھ یُوسطِنیان کے تخت نشین ہونے سے پہلے سرانجام ہوا، لیکن اِس میں شک نہیں کہ صلح کے پیچھے یُوسطِنیان کا ہاتھ تھا۔

یہ عمل سیاسی لحاظ سے بہت ضروری تھا۔ کیونکہ ہِنوطِقان نے اتحاد کے باوجود پارٹی بازی ناگوار حد تک بڑھا دی تھی۔ یہ بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رومی ممالک کے اہم گروہ خلقیدون کا تقاضا کرتے تھے۔ نیز، خود شاہی خاندان خلقیدون کا عقیدہ مانتا تھا۔

دوسرے اقنوم کا دُکھ اُٹھانے کا بیان منظور

اقاقی تفرقہ ابھی ختم ہونے والا تھا کہ قبیلۂ سکوتی کے کچھ راہب جن کا نمائندہ یوحنا مقسینطیُس[a] تھا سامنے آئے جنہوں نے مشورہ دیا کہ خلقیدون کے علاوہ یہ بھی کہا جائے کہ تثلیث میں سے ایک نے جسم کے لحاظ سے دُکھ اُٹھایا۔

پہلی نگاہ میں یہ جُملہ میافیسی لگتا ہے۔ لیکن یوحنا کا ایک اَور مقصد تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ خلقیدون میں قورلوس کی کافی باتیں پائی جاتی ہیں تو بھی قورلوس کو پوری طرح نہیں اپنایا گیا۔ اگر عقیدہ پوری طرح قورلوس کے مطابق ہوتا تو وہ اِس پر زور دیتا کہ مسیح کا اقنوم اور اُس کی الٰہی ذات ایک ہی ہیں۔ نیز، دونوں ذاتیں اِتنی قریب ہوتیں کہ مسیح کی الٰہی ذات کے بارے میں بھی کہا جا سکتا کہ اُس نے دُکھ اُٹھایا۔

یوحنا کا مقصد عقیدۂ خلقیدون کی یہ کمی دور کرنی تھی۔ اِس جُملے سے دونوں ذاتیں ایک دوسری کے قریب ہی لائی گئی ہیں اور میافیسیوں کا اعتراض کہ خلقیدون دو مسیح پیش کرتا ہے غلط ثابت ہوئی ہے۔ یہ جُملہ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جو مسیح خلقیدون میں بیان کیا گیا ہے وہ مجسم ہوا کلامِ خدا ہے، اور جس طرح مسیح کی انسانی ذات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے دُکھ اُٹھایا اُسی طرح الٰہی ذات کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے دُکھ اُٹھایا۔

یہی جُملہ نئی خلقیدونی تعلیم کی بنیاد بن گیا۔ اِس سے پہلی دفعہ یہ بات پیش آئی کہ خلقیدون کے عقیدے کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ دوسرے، اُس کی تشریح قورلوس کی پوری تعلیم سے کی گئی۔ ہاں، لوگ سمجھتے تھے کہ قورلوس کی پوری تعلیم سے خلقیدون کی تشریح کرنا لازم ہے تاکہ صاف ہو جائے کہ خلقیدون نہ نسطوریُس اور نہ ہی یوطخیس کے حق میں ہے۔ مختصراً نئی خلقیدونی تعلیم کا یہی مقصد تھا۔

یُوسطِنیان نے یہ جُملہ اپنا کر اِسے 553ء میں بادشاہت کی منظور تعلیم قرار دیا۔

---

[a] John Maxentius

اورِغین اور انطاکیہ کے تین بزرگوں پر لعنت

یُوسطِنیان کی سوچ کے مطابق بادشاہت کا ایک ہی ایمان لازم تھا۔ نتیجے میں اُس نے بُت پرستوں، یہودیوں اور بدعتیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ بدعتی کو حکومت کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ خاص کر مانویوں کو سختی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ بت پرستی کو دبانے کے لئے اتھینے کی مشہور افلاطونی اکیڈمی کو بھی بند کر دیا گیا (529ء)۔

میافیسیت کو ختم کرنے میں بادشاہ ناکام رہا۔ لیکن ایک اَور شعبے میں وہ زیادہ کام یاب ہوا، جو ہمیں آج عجیب اور ناگوار لگتا ہے۔ یعنی مُردوں کے شعبے میں۔

543ء میں اُس نے اورِغین اور اُس کے پیروکاروں کو بدعتی اور ملعون ٹھہرایا۔ اور 544 / 545ء میں اُس نے ایک فرمان بنام 'تین ابواب' میں انطاکیہ کے تین مرحوم بزرگوں کو بدعتی اور ملعون قرار دیا یعنی تھیُدور از مپسویسطیہ کو اُس کے نوشتوں سمیت، تھیُدور از قبرص کے قورلوس کے خلاف کچھ نوشتے اور ایباس از ایدیسہ[a] کا قورلوس کے خلاف ایک خط۔ (دو آخری اُستادوں کے صرف نوشتوں کو ملعون ٹھہرایا گیا، کیونکہ اُنہیں خود خلقیدون میں منظور کیا گیا تھا۔)[b]

بادشاہ کے اِس فعل سے جدید انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مُردوں کو ملعون کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ خاص کر یہ پیشِ نظر رکھ کر کہ وہ جیتے جی بدعتی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بادشاہ کا ایک سیاسی مقصد تو تھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ بادشاہت کی تعلیم کسی بھی طرح نسطوری نہیں ہے۔ دیوفیسی مغرب اور خاص کر شمالی افریقہ میں لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ اُنہیں لگتا تھا کہ بادشاہ مذکورہ تین اُستادوں کو ملعون ٹھہرانے سے خلقیدون کو چھیڑنا چاہتا ہے۔

---

[a] Edessa of Ibas

[b] اِن تین بزرگوں کے مذکورہ نوشتے 'تین ابواب' کہلاتے تھے۔

نئ خلقیدونی تعلیم

مذکورۂ بالا فیصلوں کی تصدیق 553ء کی مجلسِ عامہ میں ہوئی۔ سوال اُبھر آتا ہے کہ اِن فیصلوں کے پیچھے بادشاہ کا کیا مقصد تھا؟ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں نئ خلقیدونی تعلیم پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔[3]

پہلے کافی دیر تک خیالِ عام یہ تھا کہ مشرق نے پانچویں مجلسِ عامہ میں مغرب سے بدلہ لیا۔اِس خیال کے مطابق مغرب نے عقیدۂ خلقیدون میں مشرق کی میافیسی اکثریت کو اپنی دیوفیسی باتیں ماننے پر مجبور کیا تھا۔ مشرق یہ قبول نہیں کر سکتا تھا، اِس لئے وہ قورلوس کی تعلیم سے عقیدۂ خلقیدون کی تشریح کر کے اُسے میافیسیت کے قریب لایا۔

لیکن نئ تحقیقات کے مطابق یہ خیال درست نہیں۔ پانچویں مجلس کے پیچھے مغرب سے بدلہ لینے کی بات نہیں تھی بلکہ ایک نئ تعلیم جو 'نئ خلقیدونیت' کہلاتی ہے۔حقیقت میں یہ تعلیم نہ خلقیدون کے حامیوں سے اور نہ ہی اُس کے مخالفوں سے تعلق رکھتی ہے بلکہ یہ اِن سے الگ شروع ہوئی۔

نئ خلقیدونیت کا کیا مقصد تھا؟ جس طرح میافیسیت قورلوس کی پوری تعلیم کا تقاضا کرتی تھی اُسی طرح یہ بھی اِس کے حق میں تھی۔ کیونکہ اِس سے وہ میافیسیوں کا شک دُور کرنا چاہتی تھی کہ عقیدۂ خلقیدون پسِ پردہ نسطوریت یعنی دیوفیسیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہاں، وہ ہِنوطِقان کی مشکوک اور دھندلی سی باتوں کو چھوڑ کر خلقیدون کی کمیوں کو قورلوس سے درست کرنا چاہتی تھی۔

تحقیقات نے بڑی باریک بینی سے اِس تعلیم کے نمائندوں کو معلوم کیا ہے۔ مصری راہب نیفالیُس، یوحنا مقسینطیُس اور مزید معلموں کے علاوہ یُوسطِنیان بادشاہ بھی اِس تعلیم کے حق میں تھا۔

نئ خلقیدونی تعلیم کی کیا خصوصیات تھیں؟ خلقیدون نے فرمایا تھا کہ ایک ہی مسیح کی دو ذاتیں ہیں۔ یہ میافیسیوں کو مشکوک لگتا تھا۔ کیونکہ لگتا تھا کہ دو ذاتوں سے مراد دو مسیح اور نتیجے میں دو اقانیم ہے۔ لہٰذا دو سوالوں کا جواب دینا تھا: اول، دونوں ذاتوں

کا مسیح کے ایک ہی اقنوم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دوسرے، اگر مسیح کی دو ذاتیں ہیں تو وہ اُس میں کس طرح ایک ہیں؟[4]

ایک ہی اقنوم کی دو ذاتیں اور دو جوہر ہیں

پہلا سوال: دونوں ذاتوں کا مسیح کے ایک ہی اقنوم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اِس کے جواب میں نئ خلقیدونی تعلیم نے نقایہ کی اصطلاحات کو خلقیدون کے ساتھ جوڑ دیا۔ خلاصاً ہم یہ یوں بیان کر سکتے ہیں،

نقایہ کی تعلیم

تین اقانیم کا ایک ہی جوہر ہے۔

خلقیدون کی تعلیم

مسیح کا ایک ہی اقنوم اور دو ذاتیں ہیں۔ نیز، الوہیت کے لحاظ سے اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے جبکہ انسانیت کے لحاظ سے اُس کا اور ہمارا ایک ہی جوہر ہے۔

نئی خلقیدونی تعلیم

مسیح کے ایک ہی اقنوم کی دو ذاتیں اور دو جوہر ہیں۔

خیال یہ ہے: اگر الوہیت کے لحاظ سے مسیح کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے جبکہ انسانیت کے لحاظ سے اُس کا اور ہمارا ایک ہی جوہر ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کے دو جوہر ہیں۔ غرض ذات اور جوہر ایک دوسرے کے برابر ہو گئے ہیں۔ اِس کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ اِس سے یہ بات صاف بیان کی جاتی ہے کہ مجسم ہوتے وقت بھی بیٹے، باپ اور روح القدس کا ایک ہی جوہر رہا جبکہ تثلیث کے دوسرے اقنوم نے ایک اَور یعنی ایک انسانی جوہر اپنا لیا۔

دوسرے الٰہی اقنوم نے انسانی ذات کو وجود میں لا کر اپنا لیا

رہا دوسرا سوال: اگر مسیح کی دو ذاتیں ہیں تو وہ اُقنوم میں کس طرح ایک ہیں؟

نئ خلقیدونیت نے کلیسیا کا ایک پرانا خیال اپنا لیا، یہ کہ کلامِ خدا نے مجسم ہوتے ہی اپنی انسانیت خلق کی۔ یعنی اُسی لمحے کلامِ خدا اور انسان ایک ہو گئے۔ نئ خلقیدونیت نے اِس خیال کا فائدہ پہچان کر بڑھا دیا۔

میافیسیت کی شکایت یہ تھی کہ خلقیدون دو الگ الگ مسیحیوں کی تعلیم دیتا ہے۔ مذکورہ تعلیم نے یہ شک دُور کر دیا۔ کیونکہ اگر مسیح کی انسانیت کلام کے مجسم ہوتے ہی کلام سے خلق ہوئی تو کوئی وقت نہیں تھا جب مسیح کی انسانی ذات کلام سے الگ اور خود مختار تھی۔

تصور کچھ یہ تھا: تثلیث کے تین اقانیم ہیں۔ دوسرا اقنوم خدا بیٹا یعنی کلامِ خدا ہے۔ یہی اقنوم ہے جبکہ انسانی ذات اقنوم نہیں ہو سکتا، ورنہ چار اقانیم ہوتے۔ مجسم ہوتے ہی کلامِ خدا یعنی تثلیث کے دوسرے اقنوم نے مسیح کی انسانی ذات وجود میں لا کر اُسے اپنا لیا۔ تاہم دونوں ذاتوں اور جوہروں میں امتیاز رہتا ہے۔

اِس تعلیم کے مطابق دو نابرابر چیزیں یعنی الٰہی اقنوم اور انسانی ذات ایک دوسری کے ساتھ جُڑ گئی ہیں۔ دیگر الفاظ میں الٰہی ذات نہیں بلکہ خود اقنوم انسانی ذات سے جُڑ گیا۔ پسِ پردہ خیال یہ ہے کہ تثلیث کا دوسرا اُقنوم مسیح کی شخصیت کا تحریک دینے والا مرکز ہے۔ اُسی نے انسانی ذات کو اپنا لیا۔ تاہم دونوں ذاتوں اور جوہروں میں امتیاز رہتا ہے۔

یہ تعلیم قورلوس کی اُس تعلیم کے قریب ہی آ گئی ہے جس کے مطابق ہر ذات دوسری ذات میں موجود ہوتی ہے۔ البتہ قورلوس کی نسبت یہاں دونوں ذاتوں میں امتیاز زیادہ صاف بیان کیا گیا ہے۔

یہ فرق قورلوس کے ایک نعرے کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ نعرہ یہ تھا، ''کلامِ خدا کی مجسم ہوئی ایک ہی ذات۔'' خلقیدونی تعلیم نے یہ نعرہ اپنا کر یوں تبدیل کیا، ''کلامِ خدا کا مجسم ہوا ایک ہی اقنوم،'' یعنی ایسا اقنوم جس نے انسانی ذات کو اپنا لیا۔

قورلوس یہ بھی کہہ چکا تھا کہ مسیح کے ایک ہی اقنوم کو دونوں ذاتوں کی خصوصیات ملتی ہیں۔ یوں مسیح کی الٰہی ذات کو انسانی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں جبکہ اُس کی انسانی ذات کو الٰہی ذات کی خصوصیات ملتی ہیں۔[a] نئی خلقیدونی تعلیم نے یہ خیال بھی اپنا لیا۔ اِسی بنا پر وہ کہہ سکتی ہے کہ تثلیث میں سے ایک نے دُکھ اُٹھایا۔

غرض صاف نظر آتا ہے کہ نئی خلقیدونی تعلیم نے قورلوس کی روشنی میں عقیدۂ خلقیدون کی تشریح کی ہے۔ بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اِس تعلیم میں مسیح کی انسانیت اُس کی الوہیت کے تحت دب تو نہیں جاتی؟

نئی خلقیدونی تعلیم کی خوبیاں اور خامیاں

ماہروں کا شعبہ

بے شک نئی خلقیدونی تعلیم نے یہ بیان کرنے میں اپنی مہارت دکھائی کہ مسیح کس طرح دو ذاتوں پر مشتمل ایک اقنوم ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کی باتیں بہت ہی فلسفیانہ ہو گئی ہیں۔ جو سلسلہ خلقیدون کی مجلسِ عامہ میں شروع ہوا وہ جاری رہا ہے۔ یعنی یہ تعلیم کلام کے زندگی بخش سرچشمے سے کہیں دُور ہو کر علمِ الٰہیات کے ماہروں کا شعبہ بن گئی ہے۔ جب کلام کے بجائے اِس قسم کی پیچیدہ باتیں ایمان کی کسوٹی بن جاتی ہیں تو دال میں کچھ کالا ہے۔

قورلوس کی تعلیم کا اضافہ

البتہ نئی خلقیدونیت کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اُس نے قورلوس کی پوری تعلیم خلقیدون کے ساتھ جوڑ کر نسطوریت کا نام نہاد خطرہ دُور کر دیا۔ لیکن یہ صرف اِس طرح ہوا

communicatio idiomatum[a]

کہ لیو کے خط کو چپکے سے ایک طرف کر دیا گیا۔ لیو کے اِس خیال کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ مسیح کی پستی میں خالق اور مخلوق ایک ہو گئے ہیں۔ اور اِس خط کو نظر انداز کرنا مغرب کی دیوفیسیت کو رد کرنے کے برابر تھا۔ نتیجے میں یہ تعلیم نہ مغرب کا عقیدہ بنی، نہ میافیسیت کا بلکہ صرف بیزنطینی یعنی یونانی اعتقاد پرست کلیسیا کا۔

مسیح کے جلال پرزور

نئ خلقیدونی تعلیم کا مرکز اِس خیال میں ہے کہ الٰہی اقنوم نے انسانی ذات کو خلق کر کے اپنا لیا۔ اِس سے اُس نے قورلوس کا مقصد زیادہ صاف بیان کیا ہے کہ کلامِ خدا نے انسانیت کو یوں اپنایا کہ انسان الٰہی بن سکتا ہے۔ تاہم وہی خطرہ رہتا ہے جو میافیسیت میں پنہاں ہے۔ گو اِس کے مطابق مسیح کی انسانی ذات جسم اور روح کے لحاظ سے مکمل ہے تو بھی چونکہ کلامِ خدا مسیح کی شخصیت کا تحریک دینے والا مرکز ہے اِس لئے مسیح کی انسانیت دب کر کم ہی نظر آتی ہے۔

اِس کا کیا عملی نتیجہ نکلا؟ لوگوں کی سوچ میں خاص کر مسیح کا جلال ذہن نشین ہوا، وہی جلال جس کا دنیاوی نمائندہ بادشاہ ہے۔ یوں یہ تعلیم اِس سوچ کی تصدیق کرتی ہے کہ بادشاہ ملک کا روحانی اور دنیاوی سربراہ ہے۔ جلالی مسیح کا دنیا میں نمائندہ بھی جلالی ہونا چاہئے۔

قسطنطنیہ کی پانچویں مجلسِ عامہ (553ء)

قسطنطنیہ میں پانچویں مجلسِ عامہ منعقد ہوئی۔ پہلی چار مجالس کی نسبت یہ کتنی عجیب مجلس تھی۔ سب نے بادشاہ کے ہاں میں ہاں ملا کر اُس کی ہر بات پر دست خط کیا۔ ایک ہی شخص موجود تھا جو بادشاہ کا سامنا کر سکتا تھا یعنی پاپائے روم۔ لیکن یہ پاپا بنام وِگیلیُس[a] لیو اعظم کا معیار نہیں رکھتا تھا۔ گو وہ آٹھ سال تک قائم رہا، لیکن آخر کار وہ

[a] Vigillius

بھی اپنی سیاست کے جال میں اُلجھ کر دست خط کرنے پر مجبور ہوا۔ آخرکار 553ء کی مجلس نے یُوسطِنیان کی ہر بات کو منظور کر دیا۔

پانچویں مجلسِ عامہ میں نئی خلقیدونیت کی مذکورہ تعلیم قلم بند ہوا ہے۔[5] نقایہ اور خلقیدون کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ مسیح کے ایک ہی اقنوم کی دو ذاتیں اور دو جوہر ہیں۔ یہ تعلیم بھی شامل ہے کہ دوسرے الٰہی اقنوم نے انسانی ذات کو وجود میں لا کر اپنا لیا۔ ساتھ ساتھ خدا کا دُکھ اُٹھانے کا بیان منظور ہوا یعنی یہ جُملہ کہ تثلیث میں سے ایک نے جسم کے لحاظ سے دُکھ اُٹھایا۔

آخر میں اورِغین، اُس کے پیروکاروں اور 'تین ابواب' پر لعنت بھیجا گیا۔ لعنت کے دو نتیجے تھے۔ ایک تو ملعون کو کلیسیا کی نجات سے محروم کر دیا گیا، دوسرے اُسے حکومت کی سزا کے لائق قرار دیا گیا۔

اِس عقیدے کے تمام 14 نکتے لعنت کی شکل میں قلم بند ہوئے۔ پہلی بار ایک مجلسِ عامہ نے اپنا پورا عقیدہ اِس طرح پیش کیا۔ میافیسی کلیسیا نے پہلے ہی خلقیدونی پارٹی پر لعنت بھیجی تھی۔ یہ کلیسیائیں مسیح کے پیغام سے کتنی دُور ہو گئی تھیں جس نے فرمایا، "جو تم پر لعنت کرتے ہیں اُنہیں برکت دو، اور جو تم سے بُرا سلوک کرتے ہیں اُن کے لئے دعا کرو۔"[a]

میافیسی کلیسیا کی جُدائی

پانچویں مجلس کی نئی خلقیدونی تعلیم سے عقیدۂ خلقیدون کو قورلوس کے قریب لایا گیا تھا۔ شاید قاری سوچیں کہ اِس سے اسکندریہ کے میافیسی خوش ہو جائیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔[6] بے شک اسکندریہ کا بشپ سوِیُرس یہ جُملہ قبول کر سکتا تھا کہ تثلیث میں سے ایک نے جسم کے لحاظ سے دُکھ اُٹھایا۔ لیکن اِس کا خلقیدون کے ساتھ ملانا اُس کے لئے نامنظور تھا۔ یوں قورلوس نہ صرف خلقیدون کے حق میں بلکہ اُس کے خلاف بھی

[a] لوقا 28:6 بمقابلہ رومیوں 14:12 اور ا۔ پطرس 9:3۔

استعمال ہوا، نہ صرف خلقیدون کی تصدیق اور تشریح کے لئے بلکہ اُس پر لعنت بھیجنے کے لئے بھی۔

اسکندریہ کی مخالفت کے باعث اُس کے راہنماؤں کو ستایا گیا۔ ساتھ ساتھ خود میافیسیت میں تفرقہ بازی شروع ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ اگر مسیح کی ایک ہی ذات ہے تو کیا مسیح کا جسم دُکھ اُٹھا سکتا تھا؟ ایک انتہا پسند فرقے بنام یولیانی نے انکار کیا جبکہ دوسرا بنام سویریانی اِس کے حق میں تھا۔

اِس جگہ پر راہب یعقوب از بردعنا[a] کا ذکر کرنا لازم ہے۔ اُس نے شام میں خفیہ طور پر میافیسی جماعتیں قائم کیں۔ یہ خفیہ کلیسیا یعقوبی کہلاتی ہے۔ اِس سے بادشاہت کی خلقیدونی اور میافیسی کلیسیاؤں کے درمیان رخنہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ رخنہ بادشاہ کے خاندان میں بھی نظر آتا ہے۔ کیونکہ یُوسطِنیان کی اہلیہ تھیُودورا میافیسی تھی، اور یعقوب کے علاوہ کئی میافیسی سربراہوں نے اُس کی آڑ میں پناہ لی۔

چھٹی صدی میں میافیسیت کی خلقیدونی کلیسیا سے صاف جدائی اِس سے ظاہر ہوتی ہے کہ کئی نوشتوں میں عقیدۂ خلقیدون اور اُس کے پیروکاروں پر لعنت قلم بند ہے۔ اب رخنہ پکا ہو گیا ہے، اب سے فلسطین اور مصر کی میافیسی کلیسیاؤں کا روحانی مرکز شاہی کلیسیا اور تعلیم نہیں بلکہ میافیسی راہب ہیں۔

میافیسیت کے بڑے نمائندوں فلاکِسنُس از منبج اور سویُرس از انطاکیہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اُن کی سوچ کیا تھی؟

اول، وہ اِس پر زور دیتے تھے کہ ہم نئی تعلیم پیش نہیں کر رہے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ قورلوس کی پوری تعلیم کو مانا جائے۔ عقیدۂ نقایہ کی بنیاد پر وہ اِس پر زور دیتے ہیں کہ تثلیث کا دوسرا اقنوم ایک ہی ہے۔ اُن کے نزدیک مسیح کی انسانیت اور الوہیت دو ذاتیں نہیں ہو سکتیں، ورنہ تثلیث کے علاوہ ایک چوتھا اقنوم ہوگا، یعنی تثلیث کی بجائے چار اقانیم ہوں گے۔ جب کلامِ خدا مجسم ہوا تو وہ انسانیت کے ساتھ ایک ہی

---

[a] Jacob Baradaeus

ذات بن گیا۔ اگر مجسم ہوئے کلام کے علاوہ کوئی اَور ذات ہوتی تو مسیح ایک نہ ہوتا۔ یہ تجسم معجزہ ہے اور عقل سے سمجھا نہیں جا سکتا۔

میافیسیت کے نزدیک مسیح میں خدا حقیقی اور جسمانی طور پر حاضر ہو گیا ہے۔ اِسی حضور کے باعث وہ ہمیں نجات دیتا ہے۔ چونکہ مسیح ایک ہے اِس لئے اُس میں خدا کا جلال اور اُس کی انسانی پستی ایک ہی ہیں۔ جہاں شاہی خلقیدونی تعلیم کا مرکز مسیح کا جلال ہے وہاں میافیسی تعلیم اِس پر زور دیتی ہے کہ مسیح وہی غریب اور خدمت کرنے والا خدا ہے جو کمزوروں کو قبول کرتا ہے۔

تاہم میافیسیت کے مسیح میں الوہیت بہت ہی زیادہ اور اُس کی انسانیت کم ہی نظر آتی ہے۔ یہی اُس کی کمی رہی ہے۔ بے شک انسان یسوع کے پاؤں جھیل پر چلتے ہیں، لیکن کلامِ خدا (لوگوس) ہی یہ کچھ سرانجام دیتا ہے۔ مسیح کی انسانیت تو دُکھ اُٹھاتی ہے، لیکن دُکھ نہ اُٹھانے والا کلام ہی ہونے دیتا ہے کہ اُس کی انسانیت دُکھ اُٹھائے۔

میافیسی تعلیم کی خوبی اِس میں ہے کہ وہ ''عمانوایل'' (خدا ہمارے ساتھ ہے) کو زندگی کے ہر پہلو میں دیکھتی ہے۔ مسیح میں خدا براہِ راست ہمارے درمیان آ گیا ہے۔ اِس سے وہ حقیقی طور پر ہمارا درمیانی بن گیا ہے۔ کیونکہ مسیح مجسم ہوا خدا ہے، وہی نیا انسان جس کے انسان بننے کے باعث نئی انسانیت پیدا ہو گئی ہے۔

چھٹی مجلسِ عامہ: مسیح کی دو ذاتیں، دو قوتیں اور دو مرضیاں

قسطنطنیہ میں چھٹی مجلسِ عامہ (680ء) بیزنطینی بادشاہت کے پہلے سنجیدہ بحران کا نتیجہ تھا۔[7] مغرب سے دشمن قبیلۂ سلاو[a] کی صورت میں قسطنطنیہ کی فصیل تک پہنچ گیا جبکہ مشرق سے ایران اُس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ساتھ ساتھ حکمران کا رعایا پر ظلم ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اِتنے میں ایک جرنیل بنام ہرقل[b] نے شمالی افریقہ سے بحریہ لے کر

Slav[a]
Heraclius[b]

ظالم کو ہٹا دیا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اُس کا پہلا قدم بادشاہت کو بحال کرنا تھا۔ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ اِس بادشاہ نے ایران کو شکست دے کر اِتنا کمزور کر دیا کہ بعد میں مسلمان بڑی آسانی سے اُس پر قبضہ پا سکے۔

فلسطین اور مصر کی میافیسی اکثریت کو خوش رکھنے کی اشد ضرورت تھی تاکہ وہ نئے بادشاہ کا ساتھ دیں اور بادشاہت میں یگانگت ہو۔ اِس مقصد کے تحت ہرقل نے سمجھوتے کا ایک جُملہ ڈھونڈ نکالا جس کے مطابق مسیح نے ایک ہی الٰہی اور انسانی قوت کے تحت سب کچھ سرانجام دیا۔ جب اِس پر اعتراض کیا گیا تو لفظ 'قوت' کی جگہ مرضی استعمال ہوا۔

لیکن خاص کر خلقیدون کے جو حامی شمالی افریقہ اور مغرب میں تھے اِس سے ناخوش ہوئے۔ جب فلسطین، مصر اور افریقہ یکے بعد دیگرے اسلام کے قبضے میں آ گئے تو میافیسیت کے ساتھ صلح کی ضرورت جاتی رہی، اور بادشاہ نے 648ء میں اِس مضمون کو چھیڑنا منع کیا۔ جب مغرب اِس سے باز نہ آیا تو بادشاہ نے مغرب کے دونوں راہنماؤں پاپائے روم اور مکسِمُس بنام اقرار کرنے والے کو قسطنطنیہ لا کر سخت سزا دی۔ تاہم معاملہ 680ء سے پہلے ختم نہ ہوا جب چھٹی مجلسِ عامہ میں فیصلہ صادر ہوا کہ مسیح کی دو ذاتیں، دو قوتیں اور دو مرضیاں ہیں۔

لوگوں نے اِس پر اصرار کیوں کیا کہ مسیح کی دو قوتیں اور مرضیاں ہیں؟ چونکہ ہر ذات مکمل ہے اِس لئے لازم ہے کہ ہر ذات کی اپنی سمجھ، قوت اور مرضی ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ مسیح کی ایک ہی قوت اور مرضی تھی تو مسیح کی انسانی روح کے لئے جگہ نہیں رہتی، وہی خطرہ جو میافیسیت میں موجود ہے۔

باب 31

ضمیمہ دوم

وحدت الوجود کے راہب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصر کے راہبوں میں عام طور پر رویا اور وجد کی اِتنی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن دو راہب نکلے جو وحدت الوجود کے مشہور نمائندے بن گئے۔ اول، یُواگریُس پُنتِکُس جس کے بہت سے خیالات مشرق کی یونانی کلیسیا میں آج تک محفوظ رہے ہیں اور دوسرے، یوحنا کسیان، جس سے مغرب کی لاطینی کلیسیا آج تک متاثر رہی ہے۔

یُواگریُس پُنٹِکُس

یُواگریُس[a] صوبہ پُنتُس (شمالی تُرکی) میں پیدا ہوا۔ باسیل از قیصریہ کے وسیلے سے وہ کلیسیا کا خادم بن گیا، پھر گریغوری از نزیانز کے تحت قسطنطنیہ میں خدمت کرنے لگا۔ تثلیث کے بارے میں بحث مباحثہ میں اُس کا علم اور فصاحت مشہور تھی۔ لیکن ایک دن وہ ایک بڑے سرکاری افسر کی اہلیہ کی محبت میں گرفتار ہوا۔ اُس نے تعلق منقطع کرنے کا فیصلہ تو کیا، مگر خود عورت اُس کے پیچھے پڑ گئی۔ ایک رات اُس نے خواب میں اپنے آپ کو زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھا۔ تب ایک فرشتے نے خواب میں اُسے شہر کو چھوڑنے کی قسم کھلائی۔ جاگتے ہی وہ فوراً یروشلم کے لئے روانہ ہوا۔

یروشلم میں اُس کی واقفیت ایک مشہور راہبہ بنام مِلانیا[b] سے ہوئی۔ مِلانیا رومی ممالک کی شاید سب سے امیر عورت تھی۔ بیوہ بننے پر وہ روم شہر سے مصر کے لئے روانہ ہوئی تھی تاکہ ریگستان کے مختلف بزرگوں سے ملے۔ بعد میں اُس نے بڑے عالمِ رُفینُس کے ساتھ کوہِ زیتون پر ایک خانقاہ قائم کی تھی۔

یروشلم میں یُواگریُس بیمار پڑ گیا۔ اُس کی طبیعت چھ ماہ تک نازک رہی، اور ڈاکٹروں کو وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن اُس نے مِلانیا کے اُبھارنے پر اُسے ماضی کا سارا ماجرا سنایا۔ مِلانیا نے اُسے راہب بننے کی قسم کھلائی اور اُس کے لئے دعا کرنے کا وعدہ کیا۔ اِس پر اُس کی صحت جلد ہی بحال ہوئی، اور وہ راہب بن کر مصر چلا گیا۔ باقی زندگی اُس نے پہلے نِطریہ اور پھر کلِّیہ میں گزاری۔[1]

مصر کے اکثر راہب ٹوکریاں یا رسّیاں بنانے سے روزی کماتے تھے، لیکن یُواگریُس کاتب کا کام کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ اُس سے کئی تصانیف قلم بند ہوئیں۔ اِن میں اورِگین کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ اُسے سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم پہلے اُس تنازع پر غور کریں جو اورِگین کی موت کے بعد چھڑ گیا۔

Euagrius Ponticus (ca 345–399 AD)[a]
Melania the Elder[b]

اورِغینی تنازع

399ء میں یُواگریُس فوت ہوا۔[2] اُسی سال اسکندریہ کے بشپ تھیُفلِس نے ایک کلیسیائی خط میں یہ خیال رد کیا کہ خدا کا انسان جیسا جسم ہے۔ گو پیدائش 26:1 میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا، لیکن تھیُفلُس نے اورِغین کی طرح اِس پر زور دیا کہ یہ مشابہت صرف روحانی ہے۔ خط کو تمام کلیسیاؤں اور خانقاہوں کو بھیجا گیا۔

یہ بات ہمیں اِتنی خاص نہیں لگتی، لیکن مصر کے اکثر راہبوں نے اِسے رد کیا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اکثریت کا قدرتی رجحان فلسفیانہ باتوں کی طرف نہیں تھا۔ ایک طرح سے اُن کی سوچ یہودی سوچ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ ابّا سراپیون کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بشپ کا فرمان مان گیا لیکن عبادت ہوتے وقت اچانک فرش پر گر کر زار و قطار رونے لگا، یہ کہہ کر کہ "ہائے، مجھ بدنصیب پر افسوس! اُنہوں نے میرے خدا کو مجھ سے چھین لیا ہے، اور اب میرے پاس کوئی نہیں جسے میں تھامے رکھ سکوں، نہ مجھے معلوم کہ مَیں کس طرح اُس کی عبادت کروں، کس طرح اُس سے ہم کلام ہو جاؤں۔"[3]

یہ معاملہ دکھاتا ہے کہ ایسی باتیں لوگوں کے لئے نہ صرف خیالی پلاؤ تھیں۔ اُن سے اُن کی پوری زندگی متاثر ہوتی تھی۔ کسیان جو اِس کا ذکر کرتا ہے سراپیون کو سادہ لوح قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سراپیون جیسے لوگ حقیقت میں بُت پرست رہ گئے تھے، کیونکہ گو اُن کے بیرونی بُت نہیں تھے لیکن اُن کے دلوں میں خدا کا بُت رہ گیا تھا۔

بشپ تھیُفلِس بُت پرستی کا سخت مخالف تھا، اور مصر کے کئی ایک مندر اُس کی نگرانی کے تحت ڈھا دیئے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ ایسے نام نہاد اندرونی بُت تڑوانا چاہتا تھا۔ لیکن مصر کی اکثریت اور خاص کر راہب اُس کے خلاف کھڑے ہوئے۔ جب بشپ احتجاج کے سیلاب میں ڈوبنے لگا تو اُس نے اپنا اعلان مسترد کر دیا۔ لوگ اِس سے بہانہ بنا کر اُس سے تقاضا کرنے لگے کہ وہ اورِغین کی تصانیف بھی رد کرے۔ بشپ

مان گیا اور اب سے اورِغین کے حامیوں کا تعاقب کرنے لگا۔ نتیجے میں 300 سے زائد راہب فلسطین چلے گئے۔ اُن میں یُواگریُس کے کئی دوست بھی تھے۔ لیکن اسکندریہ کے بشپ نے وہاں بھی اُنہیں نہ چھوڑا، لہٰذا تقریباً 40 راہبوں نے قسطنطنیہ جا کر یوحنا فم الذہب سے اپیل کی جو دار الحکومت کا بشپ تھا۔ جب اُس نے اُنہیں براہِ راست رد نہ کیا تو تھیُفلُس نے اپنی سازشوں سے کروایا کہ اُسے کرسی سے ہٹایا جائے۔

مصر کے علاوہ فلسطین میں بھی اورِغین کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ امیر بیوہ مِلانیا اور مشہور مصنف رُفینُس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اُن کے قریب بیت لحم میں ایک اَور امیر بیوہ بنام پَولا رہتی تھی جس نے عالِم ایرونیمُس کے ساتھ ایک الگ خانقاہ قائم کی تھی۔ ایرونیمُس رُفینُس کی طرح راہب بھی تھا اور عالِم بھی۔ فلسطین میں وہ کتابِ مقدّس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا۔ ایرونیمُس گو علم کے حساب سے اعلیٰ معیار رکھتا تھا، لیکن شخصی تعلقات کے حساب سے وہ بچہ تھا۔ دوسروں کی تنقید اُس کے لئے قابلِ برداشت نہ تھی، اور جتنا کوئی اُس کے قریب ہوا اُتنا ہی خطرہ تھا کہ تعلق بگڑ جائے۔

شروع میں ایرونیمُس اورِغین کا حامی تھا۔ لیکن اب وہ اُس کے خلاف کھڑا ہوا جبکہ رُفینُس اور مِلانیا اورِغین کے حق میں رہے۔ جب رُفینُس نے اورِغین کی کتاب 'ابتدائی اصول' کا ترجمہ کیا تو ایرونیمُس آگ بگولا ہوا، حالانکہ رُفینُس نے اورِغین کی زیادہ قابلِ اعتراض باتوں کا ترجمہ نہ کیا۔ فلسطین میں یہ جھگڑا نہ صرف اِن چار لوگوں پر محدود رہا بلکہ ہر طرف پھیل گیا۔ اگرچہ ایرونیمُس کا رویہ سخت تھا، لیکن اورِغین کے بارے میں اُس کی تنقید مناسب ہے۔

اِس تنازع میں یُواگریُس ملوث نہ ہوا، کیونکہ وہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ لیکن وہ نہ صرف اورِغین کا حامی تھا بلکہ وحدت الوجود کے بارے میں اُس کی تعلیم اورِغینی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو یونانی کلیسیا نے اورِغین کو رد کیا، تاہم اُس نے خاموشی سے یُواگریُس جیسے لوگوں کی معرفت اورِغین کی بہت سی باتیں اپنائیں۔ ہم یہی کچھ مغرب میں

یوحنا کسیان کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ گو وہ اورِغین سے کافی متاثر تھا، لیکن اُس نے کبھی اِس کا ذکر نہ کیا، غالباً اورِغینی تنازع کے باعث۔

یُواگریُس کی تعلیم

یُواگریُس کا لکھنے کا طرز اِتنا جامع اور مشکل ہے کہ اُس کے خیالات کا مفہوم بہت دفعہ فوراً نہیں بلکہ غور و خوض کے بعد ہی نکلتا ہے۔ گو اُس کے اورِغینی خیالات مجموعی طور پر رد کئے گئے اور اُسے بدعتی قرار دیا گیا، تاہم اُس کی تصانیف کی بہت ساری باتیں آج تک مقبولِ عام ہیں۔ لٰہذا لازم ہے کہ ہم اُس کی تعلیم پر خاص دھیان دیں۔

آٹھ بُرے خیالات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریگستان کے بزرگ اپنے خیالات کو پاک صاف رکھنے پر خاص دھیان دیتے تھے۔ یُواگریُس نے یہ بات اپنا کر اپنی تصنیف 'عملی باتیں' میں[a] آٹھ بُرے خیالات کی فہرست تیار کی،

1 پیٹو پن[b]
2 زناکاری[c]
3 پیسوں کا لالچ[d]
4 غم[e]
5 غصہ[f]
6 مُردہ دلی[g]

---

[a] Praktikos
[b] (gastrimargia) γαστριμαργία
[c] (porneia) πορνεία
[d] (philarguria) φιλαργυρία
[e] (lupē) λύπη
[f] (orgē) ὀργή
[g] (acēdia) ἀκηδία

7 فضول عزت کا لالچ[a]
8 غرور[b]

اِس قسم کی فہرستیں پہلے بھی ملتی تھیں، لیکن یُواگریُس کی فہرست اِس لئے مشہور ہوئی کہ اُس نے تفصیل سے اُنہیں اور اُن کے نفسیاتی پہلو بیان کئے۔

قاری نوٹ کریں کہ یُواگریُس کے مطابق یہ گناہ نہیں بلکہ خیالات ہیں۔ جب یہ اُبھر آتے ہیں تو ہم اِنہیں روک نہیں سکتے اور یہ براہِ راست گناہ نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ہم اِنہیں ٹھہرنے دیں اور نتیجے میں جذبات اُبھر آئیں تو گناہ پیدا ہوتا ہے۔[4] بہت دفعہ یُواگریُس اِنہیں بدروحیں بھی کہتا ہے۔

مُردہ دلی[c] کا کیا مطلب ہے؟ مصنف کے نزدیک اِس کا دوسرا نام ''دوپہر کی بدروح'' ہے، ایک نام جو زبور 6:91 کے یونانی ترجمے میں استعمال ہوا ہے۔ یُواگریُس فرماتا ہے،

> مُردہ دلی کی بدروح جو دوپہر کی بدروح بھی کہلاتی ہے وہ بدروح ہے جو سب سے زیادہ تنگ کرتی ہے۔ وہ تقریباً 10 بجے راہب پر حملہ آور ہو کر اُسے دو بجے تک گھیرے رکھتی ہے۔
>
> پہلے وہ ہونے دیتی ہے کہ سورج کی حرکت آہستہ آہستہ یا رُکی ہوئی نظر آئے۔ وہ ذہن میں یہ تصور ڈال دیتی ہے کہ دن کے 50 گھنٹے ہیں۔
>
> پھر وہ راہب کو بار بار کھڑکیوں میں سے جھانکنے دیتی ہے۔ اُس سے مجبور ہو کر وہ اُچھل پڑتا اور اپنے کمرے سے نکل کر احتیاط سے سورج کی طرف دیکھنے لگتا ہے تاکہ معلوم کرے کہ تین بجے یعنی کھانے تک کتنا

---

[a] (kenodoxia) κενοδοξία
[b] (huperēphania) ὑπερηφανία
[c] (acēdia) ἀκηδία

وقت رہ گیا ہے۔ کبھی وہ اِس طرف، کبھی اُس طرف دیکھتا ہے کہ کیا کوئی بھائی آ رہا ہے؟

تب بدروح راہب کے دل میں اُس جگہ سے، اپنی زندگی سے اور ہاتھوں کے کام سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ اُسے اِس پر غور کرنے دیتی ہے کہ بھائیوں میں سے مہربانی جاتی رہی ہے، کہ حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

اگر کسی نے حال ہی میں اُسے تنگ کیا ہو تو بدروح یہ بھی کام میں لا کر نفرت بڑھا دیتی ہے۔ اُس کے اُکسانے پر راہب کے دل میں دیگر جگہوں کی آرزو اُبھر آتی ہے، ایسی جگہوں کی جہاں زیادہ آسانی سے ضروریات حاصل ہوں، جہاں وہ زیادہ آسانی اور کام یابی سے کام کر سکے۔ بدروح اِس خیال کا اضافہ کرتی ہے کہ آخر ہم خدا کو ہر جگہ پسندیدہ ہو سکتے ہیں، یہ بات جگہ پر منحصر نہیں ہوتی۔ اُسے ہر جگہ سجدہ کیا جا سکتا ہے۔

ساتھ ساتھ وہ عزیزوں اور پہلی زندگی کی یاد دلاتی ہے۔ وہ راہب کے ذہن میں یہ تصور ڈال دیتی ہے کہ میری زندگی کا طویل حصہ باقی ہے، کہ راہب کی جد و جہد کتنی دشوار ہے۔

غرض وہ ہر ممکن طریقے سے راہب کو کمرا چھوڑنے اور مقابلے سے بھاگنے پر اُکسانے کی کوشش کرتی ہے۔

جب راہب اِس پر غالب آ جائے تو فوراً کوئی اَور بدروح نہیں آتی بلکہ اِس مقابلے سے پُرسکون حالت اور ناقابلِ بیان خوشی پیدا ہوتی ہے۔[5]

اِس مثال میں مصنف ماہرِ نفسیات کی طرح آزمائش کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ یہ الفاظ یُواگریُس کا ذاتی تجربہ منعکس کرتے ہیں۔ اُن کا بہتر طور پر مقابلہ کرنے کے لئے

اُس نے مذکورہ کتاب 'عملی باتیں' کے علاوہ ایک کتاب بنام 'مقابلے میں دلائل'[a] قلم بند کی جس میں 487 آزمائشیں اور اُن کا حل درج ہیں۔ ہر آزمائش بیان کرنے کے بعد مصنف کلام کا ایک حوالہ پیش کرتا ہے جس سے قاری آزمائش پر غالب آ سکیں۔

ایک مثال لیجئے۔ غرور کا جو خیال مجھ سے کہتا ہے، "مَیں خداوند کا مقدّس ہوں" اُس کا مقابلہ پیدائش 14:3 سے کرنا ہے (رب خدا نے سانپ سے کہا، "چونکہ تُو نے یہ کیا، اِس لئے تُو تمام مویشیوں اور جنگلی جانوروں میں لعنتی ہے۔ تُو عمر بھر پیٹ کے بل رینگے گا اور خاک چاٹے گا)۔[6]

وحدت الوجود

جن عملی باتوں پر ہم نے غور کیا ہے وہ مفید ہیں۔ لیکن ایک پہلو ہے جو ہم اِس طرح قبول نہیں کر سکتے۔ یُواگریُس اورِغین کا پیروکار ہے۔[7] وہ اورِغین کی طرح سمجھتا ہے کہ خدا نے دنیا کی تخلیق سے پہلے ہی ایسی ہستیاں پیدا کیں جن کا جسم نہیں تھا بلکہ جو خالص ذہن[b] تھیں۔ لیکن سب گناہ میں گر کر روحیں[c] بن گئیں سوائے یسوع کے جو بیٹے یعنی کلامِ خدا کے ساتھ متحد ہوا۔[8] اِن روحوں پر قابو پانے کے لئے خدا نے کلامِ خدا یعنی یسوع سے مادی دنیا بنا کر اِنہیں اُس میں بسا دیا۔ پھر یسوع نے کنواری مریم کے ذریعے انسانی جسم اپنا لیا۔ اپنے تجسم، اسرائیل میں خدمت، صلیبی موت اور جی اُٹھنے سے اُس نے دوسری روحوں کے لئے راستہ کھول دیا۔[9]

یُواگریُس کے نزدیک مسیح سب کو سب کچھ ہو گیا تاکہ خدا سب میں سب کچھ ہو جائے۔ اِس لئے لازم ہے کہ جس طرح سب کچھ آبشار کی طرح خدا سے نکل آیا اُسی طرح سب کچھ شیاطین سمیت بحال ہو کر اُس کے ساتھ ایک ہو جائے۔ یہ خالص بننے کا ایک سلسلہ ہے جس کے لئے روح کا مختلف جسموں اور دنیاؤں میں سے گزرنا درکار

Antirrhetikos[a]
(logikos) λογικός; (nous) νοῦς[b]
(psychē) ψυχή[c]

ہے۔ یُواگریُس اِس کے لئے ایک تصویر پیش کرکے فرماتا ہے کہ گو مختلف ندیوں اور دریاؤں کا پانی سمندر میں بہتا ہے لیکن خود سمندر کا پانی اُن سے تبدیل نہیں ہوتا۔ گو اُس میں بہنے والے پانی کے مختلف رنگ اور ذائقے ہیں، لیکن سمندر میں آکر اُن کا پانی سمندر کے پانی کی طرح بن جاتا ہے۔ اِسی طرح آخرت پر تمام ذہنی ہستیاں خدا کے ساتھ ایک ہو جائیں گی۔[10]

اورِغین کے بارے میں جن باتوں کی تنقید کی گئی ہے وہ یُواگریُس پر بھی صادق آتی ہے۔ اور یُواگریُس نہ صرف اِن پر زور دیتا ہے بلکہ عرفان کی جو راہ وہ پیش کرتا ہے وہ اِسی اورِغینی تعلیم پر مبنی ہے۔

عرفان کی راہ

یُواگریُس کے نزدیک روحانی ترقی کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ زُہد[a] اور دوسرا عرفان[b] ہے۔

زُہد کے تحت راہب خدا کا خوف رکھ کر مذکورہ 8 آزمائشوں پر غالب آ جاتا ہے۔ اِس کا ٹارگیٹ جذبات سے آزادی[c] ہے۔ اِس حالت میں راہب اپنے جذبات پر قابو پا کر سکون حاصل کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے،

---

[a] πρακτική (praktikē)
[b] γνωστική (gnōstikē)
[c] ἀπάθεια (apatheia)

> ممکن نہیں کہ زنجیروں میں جکڑا ہوا آدمی دوڑے۔ اِسی طرح ممکن نہیں کہ جذبات کی غلامی میں پھنسا ہوا ذہن[a] روحانی دعا کا مقام دیکھ سکے۔ کیونکہ اُسے گھسیٹ کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر کھینچا جاتا ہے، وہ سکون سے کھڑا نہیں رہ سکتا۔11 b

مصنف کے نزدیک جذبات سے آزادی راہبانہ زندگی کا پھول ہے۔ لیکن اِس آزادی کا فرزند محبت ہی ہے۔12 یعنی یہ حالت انسان کو دوسروں سے دُور نہیں کرتی بلکہ اُن کے لئے محبت قائم کرتی ہے۔ ایسی محبت ظاہر کرتی ہے کہ ہر انسان نہ صرف خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے بلکہ وہ ممکنہ حد تک اِس صورت کی اصل یعنی مسیح کی مانند ہے، خواہ وہ کتنا گندا اور کمزور کیوں نہ ہو۔13

جذبات سے آزاد ہونے پر راہب دوسرے مرحلے پر آ جاتا ہے۔ اب اُس کا ٹارگیٹ عرفان ہے۔ وہ زُہد کو نہیں چھوڑتا بلکہ اُسی کی بنیاد پر عرفان حاصل کرنے لگتا ہے۔ کس طرح؟ وہ قدرت کا ملاحظہ کر کے اُس کی خوب صورتی اور انتظام پر غور و خوض کرتا ہے۔ یہ کرتے کرتے وہ قدرت اور مخلوقات کے اندرونی حقائق تک پہنچتا ہے۔14 جو راہب اِس راہ پر چلتا ہے وہ بلاناغہ دعا کرتا ہے۔ اِس کے لئے وہ خدا کی کوئی بھی تصویر اپنے سامنے نہیں رکھتا بلکہ اپنے ذہن کو بھی خدا کے بارے میں ہر تصویر سے خالی کر لیتا ہے۔ اور جب اُس کی دعا خالص ہو گئی ہے تو وہ الفاظ کے بغیر ہی سرانجام ہوتی ہے۔15

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصنف کے نزدیک ذہن (nous) انسان کا وہ حصہ ہے جو پہلی تخلیق میں خدا سے پیدا ہوا اور بعد میں گناہ میں گرنے سے روح (psychē) میں تبدیل ہوا۔ یُواگریُس فرماتا ہے کہ انسان خالص دعا کے ذریعے دوبارہ ابتدائی ذہنی

[a] νοῦς (nous)

[b] دوسری جگہ پر مصنف فرماتا ہے کہ جذبات سے آزادی ذہنی روح کی وہ پُرسکون حالت ہے جو نرمی اور ضطب پر مشتمل ہوتی ہے (Skemmata 3)۔

حالت حاصل کر سکتا ہے۔ "دعا ذہن کا خدا کے پاس صعود ہے۔"[16] آخرکار وہ اپنی حقیقی حالت دیکھتا ہے جو الٰہی نور سے چمکتی ہے۔ اور یہ نور دیکھ کر انسان خدا کا ہی نور دیکھتا ہے۔ کیونکہ اُس کی حقیقی حالت خدا کا یہ نور منعکس کرتی ہے۔ یُواگریُس کے نزدیک نور کا یہ تجربہ کوہِ سینا پر خدا کے مکاشفے سے مطابقت رکھتا ہے۔ خروج 24: 10 میں لکھا ہے کہ اسرائیل کے بزرگوں نے وہاں "اسرائیل کے خدا کو دیکھا۔ لگتا تھا کہ اُس کے پاؤں کے نیچے سنگِ لاجورد کا سا تختہ تھا۔ وہ آسمان کی مانند صاف و شفاف تھا۔" جو خالص دعا کے ذریعے خدا کے قریب آ جائے اُسے یہی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔[17]

ہم یُواگریُس سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ 8 خیالات کی فہرست مفید ہے، ہاں کہ مصنف ماہرِ نفسیات ہے جو ہمیں آزمائشوں کے بارے میں کئی ایک باتیں سکھا سکتا ہے۔ اِسی طرح اُس کا خیال کہ ہمیں اپنے ذہن میں خدا اور مسیح کا بُت نہیں رکھنا چاہئے اچھا ہے۔ بُت پرستی کی جڑ ذہن میں ہے، لٰہذا ہمیں اُسی سے بُت کی ہر صورت نکالنا چاہئے۔

گو اورِغین کو بدعتی قرار دیا گیا، تاہم یُواگریُس کے اورِغینی خیالات مختلف صورتوں میں آج تک قائم رہے ہیں۔ اُس کی اہمیت اِس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اُس کی دو تصانیف یونانی کلیسیا کی مشہور کتاب بنام فلوکلیہ[a] (خوب صورتی کا دوست) میں درج ہوئی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ گو اُس کی کچھ باتیں کلامِ مقدّس کی روشنی میں سراسر غلط ہیں تاہم بہت سی باتیں مفید ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کے بارے میں اُس کی تعلیم تمام باتوں کی بنیاد ہے۔ بے شک اُس کے مذکورہ پہلے مرحلے کے بارے میں خیالات دل چسپ اور ایک حد تک فائدہ مند ہیں۔ آزمائشوں پر غالب آنے کے مشورے نہایت مفید ہیں، کیونکہ وہ اُن کی اندرونی جڑوں تک پہنچتے ہیں۔

Philokalia[a]

لیکن سوال ہے کہ کیا پہلے مرحلے کا ٹارگیٹ مناسب ہے؟ کیا خدا چاہتا ہے کہ ہم یوں جذبات سے عاری ہو جائیں؟ ہاں، جذبات پر قابو پانا اچھی بات ہے۔ ہمیں اپنے جذبات کے غلام نہیں بننا چاہئے۔ لیکن ہمارے جذبات ہماری انسانیت کا اٹوٹ انگ ہیں۔

اورِغینی تعلیم کے مطابق ہمارے جسم اور روحیں گناہ میں گرنے کے بعد پیدا ہوئے۔ کلامِ مقدّس ہمیں کچھ اَور فرماتا ہے۔ اُس کے مطابق خدا نے ہمیں گناہ میں گرنے سے پہلے ہی جسم اور روح سمیت خلق کیا۔ لٰہذا ہمارا ٹارگیٹ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے جذبات کو جسم سمیت دبائیں بلکہ یہ کہ ہم روح القدس کی مدد سے اُن کا صحیح استعمال سیکھیں۔

دوسرے مرحلے کا ٹارگیٹ یعنی خدا کا نور دیکھنا مزید مشکوک لگتا ہے۔ یُواگریُس کے مطابق آخر کار خالق اور مخلوق ایک ہو جائیں گے۔ مخلوقات کے تمام دریا الٰہی سمندر میں آ کر ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات کلامِ مقدّس سے کہیں دُور ہو گئی ہے۔

یوحنا کسیان

کسیان[a] غالباً رومینیا میں پیدا ہوا۔ اُس نے بہت وقت فلسطین اور مصر کے راہبوں کے پاس گزارا۔ بعد میں وہ فرانس میں آباد ہوا۔ جو تعلیم اُسے راہبوں سے حاصل ہوئی تھی اُسے اُس نے دو تصانیف میں قلم بند کیا۔

کسیان یُواگریُس کا شاگرد تھا، اور اُس نے اورِغین سے بھی بہت کچھ سیکھ لیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں اِن کا ذکر نہیں کرتا۔ غالباً اِس کی وجہ مذکورہ اورِغینی تنازع تھی۔ وہ کسی کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ نیز، اُس کا ٹارگیٹ زیادہ عملی تھا۔ وہ مغرب میں راہبانہ زندگی کی صحت مند بنیاد رکھنا چاہتا تھا۔ لٰہذا گو اُس کی تصنیفات

John Cassian (ca 360–435 AD)[a]

میں وحدت الوجود کا ذکر ہوتا ہے تاہم اُن میں اورِغین کی دو تخلیقوں اور تمام چیزوں کی بحالی کے بارے میں تعلیم پائی نہیں جاتی۔

پہلی کتاب کا نام 'خانقاہ میں رہنے والے راہبوں کے انتظامات اور 8 اصولی گناہوں کے علاج'[18] ہے۔ اِس کے دو مقاصد ہیں۔ اول، وہ دکھانا چاہتا ہے کہ راہب کا طرزِ زندگی کس طرح ہونا چاہیے، یعنی اُس کو کیا لباس پہننا اور کس طرح دعا کرنی چاہیے۔ نیز، نوآموز کو کیا ہدایات دینی ہیں۔ دوسرے، وہ یُواگریُس کی 8 آزمائشوں کے علاج پیش کرتا ہے۔

اِس کتاب سے کسیان نے اِن 8 آزمائشوں کا تعارف مغرب سے کرایا، اور بعد میں یہ کانٹ چھانٹ کرکے مغرب میں سات سنجیدہ گناہوں کی صورت میں مشہور ہوئیں۔

دوسری کتاب کا نام 'بیابانِ سکیتِس میں آبا سے صلاح مشورہ'[19] ہے۔ اِس میں ریگستان کے 24 آبا سے ملاقاتیں قلم بند ہوئی ہیں۔ ہر ایک میں کسیان اور اُس کا دوست گرمانس کسی ایک ابّا سے مشورہ لیتے ہیں۔ ہر گفتگو کا ایک خاص مضمون ہے۔ مذکورہ پہلی کتاب میں زیادہ تر راہب کی بیرونی زندگی بیان کی گئی ہے، جبکہ اِس دوسری کتاب میں زور راہب کی اندرونی زندگی پر ہے۔

کسیان بھی وحدت الوجود کا حامی ہے۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ راہب زُہد اور خالص دعا کے ذریعے خدا کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔[20]

گو کسیان مغرب میں راہبانہ زندگی کا بانی نہیں تھا لیکن اِن دو کتابوں کے ذریعے اُس کا زور دار اثر مغرب کے راہبانہ انتظامات پر پڑ گیا۔

نوٹس

باب 1

1. Plato, *Phaedo*, 117c–118a.

باب 2

1. Schürer, *The History of the Jewish People, vol. 2*, pp. 20–28,74–80.
2. Ibid., pp. 34–35,46.

باب 4

1. Irenaeus, *Against Heresies*, 1.26.2, 3.21.1, 4.33.4, 5.1.3); Tertullian, *On the Flesh of Christ*, 14.5; Jerome, *Letters*, 112.4.13; Andresen and Ritter, *Handbuch, vol. 1*, pp. 73–75.
2. Hippolytus, *Refutation of All Heresies*, 9.8–12; Eusebius, *Church History*, p. 6.38; Adam, *Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 156–158.

باب 5

1. Hage, *Das orientalische Christentum*, pp. 18–24.

باب 6

1. Eusebius, *Church History*, 1.13.
2. Cureton, *Ancient Syriac Documents*, pp. 1ff.
3. Neusner, *The Early Sasanian Period*, p. 23.
4. Eusebius, *Church History*, 5.23.
5. “The Chronicle of Edessa,” 8.
6. Ephrem the Syrian, *Carmina Nisibina*, hymn 42; translated in Medlycott, *India and the Apostle Thomas*, pp. 194ff.
7. *The Chronicle of Arbela*.
8. Neusner, *From Shapur I to Shapur II*, pp. 354–58; Kawerau, *Chronicle of Arbela*; Philip, *East of the Euphrates*, ch.2.
9. Asmussen, “Christians in Iran,” pp. 924ff.
10. Vööbus, *History of Asceticism in the Syrian Orient*, pp. 3–10.
11. Frend, *The Archaeology*, pp. 198f.
12. Potts, *Mesopotamian Civilization*, p. 285.
13. *The Council of Mar ’Ishaq 410 AD*.
14. *The Council of Mar Dadišo’ 424 AD*.
15. Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 137–145.
16. Buck, *Paradise and Paradigm*, pp. 51ff; Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 161–163.
17. Buck, *Paradise and Paradigm*, pp. 52f.
18. Moffett, *A History of Christianity, 1*, p. 161.
19. Ibid., pp. 273–281.
20. Based on the lists of the Council of Mar Ishaq (410) and Mar Dadisho (424); Buck, *Paradise and Paradigm*, pp. 45–50; Asmussen, “Christians in Iran,” p. 932.
21. Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 208f.
22. Ibid., pp. 344–347.356f.

23. Atiya, *A History*, pp. 45–50; Hage, *Das orientalische Christentum*, pp. 288ff.
24. Witek, "China and Christianity," pp. 13f.
25. Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 288–314.
26. Ibid., pp. 443–275.
27. Ibid., pp. 475–488.
28. Medlycott, *India and the Apostle Thomas*, pp. 189ff; Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 26ff.
29. Eusebius, *Church History*, 5.10.
30. Medlycott, *India and the Apostle Thomas*, pp. 194ff; Philip, *East of the Euphrates*, ch. 6.
31. Philip, *East of the Euphrates*, ch. 7.
32. Cosmas Indicopleustes, *Christian Topography*, 3, 11.
33. Thomson, *Moses Khorenats'i*, pp. 174–176; Atiya, *A History*, pp. 315–317; Nersessian, "Armenian Christianity," 25f.
34. Neusner, "The Jews in Pagan Armenia."
35. Greppin, "Syrian Loanwords."
36. Nersessian, "Armenian Christianity," pp. 23–46; Atiya, *A History*, pp. 305–356.
37. Eusebius, *Church History*, 3.1.1.
38. Nersessian, "Armenian Christianity," pp. 23ff; Hage, *Das orientalische Christentum*, pp. 226ff.
39. Lerner, *The Wellspring*, pp. 60–66.
40. Rapp Jr., "Georgian Christianity," pp. 137–155; Hage, *Das orientalische Christentum*, pp. 112–126.
41. Omer, "Sudan Connection."
42. Appleyard, "Ethiopian Christianity," pp. 117–136; Hage, *Das orientalische Christentum*, pp. 200–222; Atiya, *A History*, pp. 146-166.
43. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 67–78.
44. Tertullian, *Apology*, 37.4.
45. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 69f.

باب 7

1. Pliny the Younger, *Letters*, 10.96f.
2. Origen, *Against Celsus*, 3.14.
3. Tertullian, *To Scapula*, 5.1.
4. Josephus, *The Antiquities of the Jews*, 20.17ff, esp. 49–53; Eusebius, *Church History*, 2.12.1,3; Sellwood, *Adiabene*; Neusner, *From Shapur I to Shapur II*, 354ff.
5. Najim, *Antioch and Syrian Christianity*, pp. 7f.
6. Ibid., pp. 11ff.
7. Aland, *Der Text des Neuen Testaments*, 202f; Vööbus, *Studies in the History of the Gospel Text in Syriac*; for a newer summary of how the Peshitta came into being see Najim, *Antioch and Syrian Christianity*, pp. 11–20.
8. *Didache*, 11.4–6.
9. Lucian of Samosata, *The Passing of Peregrinus*.
10. Eusebius, *Church History*, 6.43.11, 4.23.10.
11. Tertullian, *Apology*, 39.6.
12. Atiya, *A History*, pp. 257f.
13. Buck, *Paradise and Paradigm*, p. 60; Sims-Williams, *Christian Literature in Middle Iranian Languages*.
14. Comneno, "Nestorianism in Central Asia," pp. 23ff.
15. Gillmann and Klimkeit, *Christians in Asia*, pp. 223f; cf Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 208f, 275.
16. Luttikhuizen, *The Nestorians*; Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 354f.
17. Luttikhuizen, *The Nestorians*, p. 5.
18. Moffett, *A History of Christianity, 1*, p. 354.
19. *Roman road system*; Chevallier, *Roman Roads*, esp pp. 202ff.

باب 8

1. Moffett, *A History of Christianity, 1*, p. 298.
2. Buck, *Paradise and Paradigm*, pp. 41f.53f.57–61.

3. William of Rubruck, *Itinerarium Fratris Willielmi de Rubruquis*, 14.
4. Browne, *The Eclipse in Eastern Christianity*, pp. 87–92.
5. Ibid., pp. 84f.

باب 10

1. *2Clement*, 1.1.
2. *Epistle of Barnabas*, 12.10(9).
3. Ignatius, *Letter to the Magnesians*, 8.2.
4. Hermas, *Similitudes*, 7.1.4.
5. Hermas, *Mandates*, 4.1.7f.
6. *2Clement*, 16.4.
7. Hermas, *Similitudes*, 5.3.3.
8. Ibid., 9.28.3.
9. Ignatius, *Letter to the Romans*, 4.2.
10. Ignatius, *Letter to the Philadelphians*, 8.2.
11. Ibid., 4.1.
12. Ignatius, *Letter to the Ephesians*, 20.2.
13. Ignatius, *Letter to the Smyrnaeans*, 8.1.
14. Cf. Ignatius, *Letter to the Ephesians*, 10.1–3.
15. Justin Martyr, *Dialogue with Trypho*, 8.1f.
16. Tatian, *Hortatory Address to the Greeks*, 1,21,29,31–35.
17. Plato, *The Republic*, 7.514–517.
18. Philo, *The Special Laws*, 1.9f.
19. Aristides, *Apology*, 1.
20. Justin Martyr, *Apology*, 1.32.8, 2.8.1.
21. Ibid., 1.46.1–3.
22. Ibid., 2.10,13.
23. Althaus, *Die christliche Wahrheit*, p. 28.
24. For the following see Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 120–132.
25. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, p. 136; Adam, *Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 150–153.
26. Sundermann, *Mani*, *Manicheism. i. Survey*.

27. Adam, *Dogmengeschichte, vol. 1*, p. 158.
28. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 139–141.
29. For the following see Andresen and Ritter, *Handbuch, vol. 1*, pp. 65–69; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 142-147; Adam, *Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 146-149.
30. For the following see Andresen and Ritter, *Handbuch, vol. 1*, pp. 69–72; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 147–149.
31. Irenaeus, *Against Heresies*, 1.10.1.
32. Cyprian, *On the Unity of the Church*, 6.
33. Cyprian, *Epistles*, 72.21.
34. Cyprian, *On the Unity of the Church*, 12.
35. Ibid., 13.
36. Ibid., 4.
37. Ibid., 5.
38. Ibid., 5.

باب 11

1. Irenaeus, *Against Heresies*, 3.1ff.
2. Ibid., 2.27.1ff.
3. Ibid., 4.38.3.
4. Ibid., 5.14.3.
5. Ibid., 3.11.8, 1.10.3, 4.9.
6. Ibid., 2.28.5ff.
7. Ibid., 3.23.
8. Ibid., 4.7.4, 4.20.1, 4.38.3.
9. Ibid., 4.6.6.
10. Ibid., 4. 20. 10f.
11. Ibid., 5.18.1–3.
12. Ibid., 4.37f, esp. 4.37.1,7, 4.38.3, 5.6.1, 5.12.2.
13. Ibid., 3.18.2ff.
14. Ibid., 5.12.1ff, 3.21.10.

15. Ibid., 3.18.7.
16. Ibid., Cf 3.16.6, 3.21.9f, 3.22.3 et al.
17. Tertullian, *The Prescription Against Heretics*, 13, 19.
18. Tertullian, *Apology*, 50.13.
19. Tertullian, *Against Praxeas*, 7.1–3.
20. Ibid., 8.5–7, 9.1–3, 26.4.
21. Ibid., 30.5.
22. Ibid., 8.5–7.
23. Ibid., eg 3.1, 4.2, 8.7.
24. Ibid., 7.1–9, 2.4.
25. Tertullian, *On the Flesh of Christ*, 5.4.
26. Tertullian, *Against Praxeas*, 27.
27. Tertullian, *On the Testimony of the Soul*, 3.
28. Tertullian, *On the Soul*, 41, *On the Flesh of Christ*, 16.
29. Cf Tertullian, *Against Marcion*, 2.5f.
30. Tertullian, *On Modesty*, 9.16.
31. Tertullian, *On Repentance*, 2.11.
32. Tertullian, *On Modesty*, 3.3, *On Repentance*, 7ff.
33. Cf the 'Song of the Word' in Clement, *Exhortation to the Greeks*, 1.5ff.
34. Ibid., 1.5–7, 1.9, 9.4.
35. Plato, *The Laws*, 4.716C/717A.
36. Ibid., 10.897B.
37. Plato, *Theaetetus*, 176AB.
38. Clement, *Exhortation to the Greeks*, 1.5ff esp 1.7, 9.4, *Stromata*, 7.7.3.
39. Clement, *Who is the Rich Man*, 3.
40. Clement, *Stromata*, 6.8.9– 6.9.9, 6.18.6f, 10.1f.
41. Clement, *Stromata*, 7.7.21, 7.14.14, *Exhortation to the Greeks*, 9.4.
42. Clement, *Stromata*, 6.14.6.
43. Clement, *Stromata*, 7.1.4, 7.7.11, 7.7.31–33, 6.9, *Exhortation to the Greeks*, 12.1.
44. Brown, *Augustine of Hippo*, p. 422.

45. Eg Clement, *Stromata*, 6.9.1.
46. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 111–127.
47. Origen, *Homilies on Joshua*, 11.4.
48. Origen, *On First Principles*, 1.1.6.
49. Origen, *Against Celsus*, 3.70.
50. Origen, *Commentary on John*, 2.2, 2.6.
51. Origen, *On First Principles*, 2.9.2.
52. Origen, *On First Principles*, 2.6.3–6, 2.8.3f; reconstruction of the original text in *Vier Bücher von den Prinzipien*, pp. 360–371, 386–397.
53. Origen, *On First Principles*, 2.1.2.
54. Ibid., 1.8.1ff.
55. Ibid., 1.5.5.
56. Origen, *On First Principles*, 2.8.3; reconstruction of the original text in *Vier Bücher von den Prinzipien*, pp. 386–395.
57. Origen, *On First Principles*, 1.6.3, 1.8.4; reconstruction of the original text in *Vier Bücher von den Prinzipien*, pp. 224–229, 258–265, cf other sources cited on pp. 266–283.
58. Origen, *On First Principles*, 2.6.2ff; reconstruction of the original text in *Vier Bücher von den Prinzipien*, pp. 358ff.
59. Origen, *On First Principles*, 3.6.2ff; *Vier Bücher von den Prinzipien*, pp. 648ff.
60. Origen, *On First Principles*, 2.7.3, *Against Celsus*, 3.62.
61. On the doctrine of ransom see Origen, *Commentary on John*, 1.39, *Commentary on Matthew*, 16.8, 12.28.
62. Origen, *Commentary on John*, 10.28, *Against Celsus*, 4.9, *Commentary on Matthew*, 12.12.
63. Hippolytus, *Refutation of All Heresies*, 7.23, 10.19; a related sect apparently related revered Melchisedek above Christ, see 7.24; 10.20.

64. Epiphanius, *Panarion / Adversus Haereses*, 62.1; cf Hippolytus, *Refutation of All Heresies*, 9.6f.
65. Eusebius, *Church History*, 7.30.1–19.
66. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 222f; sources in Loofs, *Leitfaden*, 171f.
67. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 140f.152–155.
68. Sources in Loofs, *Leitfaden*, 171f; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 241-243.
69. For text see *http://patristica.net/325*.
70. For the following see Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 147ff; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, 258ff.
71. For text see *http://patristica.net/381*.
72. Athanasius, *On the Incarnation*, 1.1 et al.
73. Athanasius, *Defence of the Nicene Definition*, 20ff.
74. Athanasius, *On the Incarnation*, esp. 2.6ff, *Four Discourses Against the Arians*, 2.61,65.
75. Athanasius, *On the Incarnation*, 4.19, *Four Discourses Against the Arians*, 3.34.
76. Athanasius, *Four Discourses Against the Arians*, 2.75.
77. Athanasius, *On the Incarnation*, 4.25.
78. Ibid., 8.54.
79. Athanasius, *Four Discourses Against the Arians*, 3.22ff.
80. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 256f; Adam, *Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 231f.
81. For the following see Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 1*, pp. 257ff.
82. Gregory of Nyssa, *Against Eunomius*, 2.1, 2.3f; Basil of Caesarea, *On the Holy Spirit*, 27.67, *Homilies*, 3.2.
83. Gregory of Nyssa, *Against Eunomius*, 2.3; Basil of Caesarea, *Letters*, 38.3.
84. Basil of Caesarea, *Letters*, 38, 214.3f, 236.6.

85. Basil of Caesarea, *Letters*, 38.4; Gregory of Nyssa, *Against Eunomius*, 2.2.

باب 12

1. Apollinaris, *Ad Jovianum*, 1; in: Lietzmann, *Apollinaris*, p. 251.
2. Apollinaris, *Fragmenta*, 107; in: Lietzmann, *Apollinaris*, p. 232; Apollinaris, *Anakephalaiosis*, 1ff esp. 16; in: Lietzmann, *Apollinaris*, pp. 242ff.
3. Apollinaris, *Fragmenta*, 116, 153, 160; in: Lietzmann, *Apollinaris*, pp. 235, 248, 254.
4. Apollinaris, *De Fide et Incarnatione Contra Adversarios*, 6ff; in: Lietzmann, *Apollinaris*, pp. 197ff.
5. Apollinaris, *Fragmenta*, 116; in: Lietzmann, *Apollinaris*, p. 235.
6. Cf Apollinaris, *De Fide et Incarnatione Contra Adversarios*, 8 (Christ delivered the whole of creation through the blood of his hypostasis); in: Lietzmann, *Apollinaris*, pp. 200f.
7. Apollinaris, *De Unione*, 6; in: Lietzmann, *Apollinaris*, p. 187.
8. Gregory of Nazianz, *Letters*, 101.7; in Rouet de Journel, *Enchiridion*, 1018.
9. For the following Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 27ff; Theodore of Mopsuestia, *Commentary on the Psalms*, 46; cf Rooy, "Reading the Psalms," pp. 120–134.
10. Fairbairn, "Patristic Exegesis," pp. 1–19.
11. McLeod, "Theodore of Mopsuestia Revisited," 456ff.
12. Theodore of Mopsuestia, *Commentary on the Psalms*, 8.4–6.
13. McLeod, "Theodore of Mopsuestia Revisited," p. 454.
14. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 34–36.

15. Theodore of Mopsuestia, *On the Incarnation*, 7.
16. Timothy I, *Apology for Christianity*, 40, cf 87f.
17. For the following see Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 224ff; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 44–58.
18. For the following see Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 58–62.
19. Loofs, *Nestoriana*, p. 274.
20. Ibid., pp. 224f.
21. Ibid., pp. 337f.
22. Nestorius, *The Bazaar of Heracleides*, 53–62 etc; Kyle, "Nestorius," p. 79.
23. Loofs, *Nestoriana*, pp. 262; cf 260.
24. For the following see Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 63–73.
25. Cf Cyril of Alexandria, *Second Letter to Nestorius*.
26. Cyril of Alexandria, *Second Letter to Succensus*, esp. 2ff.
27. Cf Cyril of Alexandria, *Third Letter to Nestorius*, *First Letter to Succensus*, *Second Letter to Nestorius*; Weinandy, "Cyril and the Mystery of the Incarnation," pp. 23ff esp. 31–55.
28. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, p. 89.
29. For the discussion see ibid., pp. 90–100.
30. Leo, *Letters*, 28.4.
31. Ibid., 28.3, 35.3.
32. Ibid., 28.3.
33. Ibid., 28.3.
34. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, p. 116.
35. *http://patristica.net/451*.

باب 13

1. Tertullian, *The Prescription Against Heretics*, 7.9ff.
2. *http://patristica.net/denzinger/*.
3. Hermas, *Visions*, 2.2f.
4. Ibid., 1.1ff.
5. Hermas, *Visions*, 3, *Similitudes*, 9.
6. Tertullian, *On Repentance*, 10.6.
7. Cyprian, *On the Unity of the Church*, 4; cf the protest in Tertullian, *On Modesty*, 1.6ff.
8. Cyprian, *Epistles*, 10, *Treatises*, 3.35f.
9. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.2*, p. 15.
10. Hermas, *Mandates*, 4.2.3.
11. *2Clement*, 18.2.
12. Tertullian, *On the Soul*, 41.1ff, cf 39.1.
13. Tertullian, *On Baptism*, 18; cf Cyprian, *Epistles*, 58.5.
14. Wiley, *Original Sin*, pp. 51f.
15. Hermas, *Similitudes*, 1.1; Tertullian, *Apology*, 1.2; Polycarp, *Letter to the Philippians*, 1.1; *Epistle of Mathetes to Diognetus*, 5.5, 6.8.
16. *1Clement*, 1.1–2.8.
17. Eusebius, *Church History*, 5.18.9.
18. *1Clement*, 37.1–3; see already 2Cor 10:3–4; 1Tim 1:18; 2Tim 2:3–4; Eph 6:10–18; Philemon 2 etc.
19. Tertullian, *To the Martyrs*, 3.1ff, *On Idolatry*, 19.2.
20. *1Clement*, 21.4; Ignatius, *Letter to Polycarp*, 6.2.
21. Hermas, *Similitudes*, 5.1.1f.
22. Cyprian, *Epistles*, 10.1.
23. *1Clement*, 5.1f; Cyprian, *Epistles*, 10.1f, esp. 15.1.
24. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.2*, pp. 20f; Harnack, *Militia Christi*, pp. 18–23, 32ff.
25. Hermas, *Similitudes*, 9.31.5 et al; *1Clement*, 16.1, 44.3, 54.2, 57.2; Ignatius, *Letter to the Romans*, 9.1;

Tertullian, *On Flight During Persecution*, 11.4; Cyprian, *Epistles*, 10.2.

26. Cyprian, *Epistles*, 54.5.
27. Ibid., 26.1.
28. Augustine, *On True Religion*, 39.72.
29. Augustine, *Confessions*, See esp; Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.2*, pp. 24–28.
30. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.2*, pp. 29ff.
31. Augustine, *On True Religion*, 8.14f, *Tractates on the Gospel of John*, 29.6.
32. Augustine, *On the Trinity*, 15.2.2.
33. Augustine, *Soliloquies*, 1, 2.1.
34. Augustine, *Confessions*, 3.6,11, *Tractates on the Gospel of John*, 19.12.
35. Augustine, *Confessions*, 10.8.12ff.
36. Augustine, *Tractates on the Gospel of John*, 47.3, *On the Free Choice of the Will*, 3.13, *On Eighty-Three Various Questions*, 46.2.
37. Augustine, *On the Teacher*, 11.38.
38. Augustine, *On the Free Choice of the Will*, 3.1ff.
39. Augustine, *On the Trinity*, 6.7.9, *The City of God*, 11.10.1.
40. Augustine, *On the Trinity*, 8 preface.
41. Augustine, *Confessions*, 13.11.12.
42. Augustine, *On the Trinity*, 8.10.
43. Ibid., 9.3.
44. Ibid., 10.11.17f.
45. Augustine, *Confessions*, 7.21.27, 13.14.15.
46. Augustine, *The City of God*, 14.13, *On the Trinity*, 13.17.22.
47. Augustine, *Various Questions in Response to Simplician*, 1.2.2, 1.2.9.
48. Augustine, *Confessions*, 10.29.40.

49. Augustine, *On the Trinity*, 4.10.13.
50. Augustine, *Sermons*, 123.3.
51. Augustine, *Various Questions in Response to Simplician*, 1.2.
52. Augustine, *On the Trinity*, 4.1.2.
53. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 266ff.
54. Pelagius, *Letter to Demetrias*.
55. Esp. Ambrosiaster to Rom 5:12 *Ambrosiaster*; Bonaiuti and La Piana, "The Genesis," p. 168.
56. Augustine, *On the Catechising of the Uninstructed*, 4.7.
57. Augustine, *The City of God*, 14.26, *On Rebuke and Grace*, 10.28.
58. Augustine, *The Literal Meaning of Genesis*, 11.5.7.
59. Augustine, *On Rebuke and Grace*, 10.28–11.29.
60. Augustine, *On Rebuke and Grace*, 11.30f, *Retractions*, 2.24.2, *Unfinished Work in Answer to Julian*, 6.9.26.
61. Augustine, *Enchiridion*, 30, 45, 118.
62. Augustine, *Unfinished Work in Answer to Julian*, 4.14.71, *Against Two Letters of Pelagius*, 1.13.27.
63. Seeberg, *Lehrbuch der Dogmengeschichte, vol. 1*, 272.
64. Augustine, *On the Spirit and the Letter*, 14.23.
65. Augustine, *On Nature and Grace*, 57.67, *On Grace and Free Will*, 17.33.
66. Augustine, *On the Grace of Christ and on Original Sin*, 1.26.27.
67. Augustine, *On the Predestination of the Saints*, 1.8.13.
68. Augustine, *On the Spirit and the Letter*, 34.60, 26.45, 29.50.
69. Ibid., 34.60.
70. Ibid., 25.42, 27.47.
71. Augustine, *Enchiridion*, 42.
72. Augustine, *Sermons*, 272.
73. Ibid., 123.3.
74. Augustine, *On Nature and Grace*, 66.79, 70.84.

75. Augustine, *Confessions*, 9.13.34.
76. Augustine, *Against Two Letters of Pelagius*, 1.8.13, 1.10.17.
77. For the following see esp. Augustine, *On the Predestination of the Saints*.
78. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.2*, pp. 93–96.
79. Optatus, *Against the Donatists*, 7.
80. Ibid., 2.1, 3.8.
81. Ibid., 2.1.
82. Ibid., 7.2.
83. Ibid., 5.4.
84. Augustine, *The City of God*, 1.35, *On Baptism, Against the Donatists*, 5.27.38–28.39.
85. Augustine, *On Baptism, Against the Donatists*, 3.19.26, 6.4.6.
86. Augustine, *Sermons*, 137, *Tractates on the Gospel of John*, 21.8.
87. Augustine, *Tractates on the Gospel of John*, 26.13.
88. Augustine, *The City of God*, 10.5.
89. Augustine, *Confessions*, 8.7.16.
90. Augustine, *Tractates on the Gospel of John*, 26.11–13.
91. Ibid., 80.3.
92. Augustine, *Confessions*, 11.
93. Ibid., 11.28.37.
94. Ibid., 11.29.39.
95. Augustine, *The City of God*, eg 1.35.
96. Ibid., 19.14, 19.16–17.
97. Ibid., 4.3.
98. Eusebius, *Church History*, 10.9.

باب 14

1. Justin Martyr, *Apology*, 1.6.
2. Tacitus, *The Annals of Imperial Rome*, 14.44.

3. Eg Tertullian, *Of the Crown*, 7, 10, 13.
4. Cf Markus Minucius Felix, *Octavius*, 8–10.
5. Athenagoras of Athens, *A Plea for the Christians*, 3.
6. Suetonius, *Life of Claudius*, 25.4; cf Acts 18:2.
7. Origen, *Against Celsus*, 8.67–69.
8. Justin Martyr, *Apology*, 2.2.
9. Eg Justin Martyr, *Dialogue with Trypho*, 109.
10. Tacitus, *The Annals of Imperial Rome*, 15.44.
11. Tertullian, *Scorpiace (Antidote Against the Poison of Scorpions)*, 15.3; Eusebius, *Church History*, 2.25.5.
12. Eusebius, *Church History*, 3.17–20; cf Smallwood, "Domitian's attitude towards the Jews and Judaism," pp. 1–13.
13. Eusebius, *Church History*, 4.15–16.
14. Pliny the Younger, *Letters*, 10.96f.
15. Eusebius, *Church History*, 5.1.
16. *The Passion of St. Perpetua, St. Felicitas, and their Companions*.
17. Eusebius, *Church History*, 6.1ff.
18. Ibid., 8.14ff.
19. Ibid., 6.39ff.
20. Eusebius, *Church History*, cf 7.10–13; Cyprian, *Letters*, 81.1.
21. Eusebius, *Church History*, 7.30.21f; Lactantius, *On the Death of the Persecutors*, 6.
22. Eusebius, *Church History*, 8.2.4ff, 9.9.14; Lactantius, *On the Death of the Persecutors*, 12–15.
23. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 136ff.
24. Lactantius, *On the Death of the Persecutors*, 44.
25. Eusebius, *Life of Constantine*, 28–31.
26. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 142–146.
27. For the following see Schaff, *Nicene and Post-Nicene Christianity*, pp. 83ff.

28. Theodoret, *Ecclestiastical History*, 1.25.
29. Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 137–145.

باب 15

1. Eusebius, *Church History*, 5.2.2f.
2. *The Martyrdom of Polycarp*, 9.3.
3. Ibid., 14.1–3.
4. Ignatius, *Letter to the Romans*, 2.2.
5. Eusebius, *Church History*, 5.1.52; cf 2Cor 2:14.
6. Eusebius, *The Martyrs of Palestine*, 5.
7. *The Martyrdom of Polycarp*, 17.1–18.3.
8. Ibid., 18.3.
9. Augustine, *Sermons*, 359B.5.
10. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 23–25.
11. Brown, *The Cult of the Saints*, pp. 23–49.
12. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 17–19.
13. *The Acts of Carpus, Papylus, and Agathonicê*, 44; in: Musurillo, *The Acts*, pp. 28f.
14. Eusebius, *Church History*, 8.6.6.
15. *The Acts of Euplus*, 1.1; in: Musurillo, *The Acts*, pp. 310f.
16. *The Acts of Euplus*, 2.6; in: Musurillo, *The Acts*, pp. 316f.
17. Eusebius, *Church History*, 8.12.3–5.
18. Bowersock, *Martyrdom and Rome*, pp. 72f.
19. Tertullian, *To the Martyrs*, 4.3–8.
20. Ambrose, *Death as a Good*, 2.7.
21. Chrysostom, *Homilies on Galatians*, 1.4 (PG 61:618).
22. Chrysostom, *On Saints Bernike, Prosdoke, and Domnina*, 6.7 (PG 50:638–640); Ambrose, *Concerning Virgins*, 3.7.32ff.
23. *The Martyrdom of Polycarp*, 4.1.
24. Clement, *Stromata*, 4.4.2.
25. Ibid., 4.10.

26. Augustine, *The City of God*, 1.17, 1.22.
27. Ibid., 1.19.
28. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 21–27.
29. Augustine, *The City of God*, 22.8–10.
30. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 23–24.
31. Brown, *Augustine of Hippo*, pp. 81–82.
32. Ambrose, *Concerning Virgins*, 1.11, 1.13. (PL 16:192).
33. Ibid., 3.10 (PL 16:191).
34. Ambrose, *Death as a Good*, 2.5.
35. Ibid., 3.8.
36. Ibid., 3.10.
37. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 95–98.
38. Ambrose, *Letters*, 22.1f.
39. Ibid., 22.10.
40. Ambrose, *Letters*, 22.1f; Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," ppno 98–104.
41. Chrysostom, *On Saint Lucian*, 2 (PG 50:522).
42. Chrysostom, *On the Holy Martyr Ignatius*, 4 (PG 50:593).
43. Chrysostom, *On the Martyrs Juventinus and Maximinus*, 2 (PG 50:575).
44. Chrysostom, *On the Holy Martyr Julian*, 1 (PG 50:667).
45. Downey, *A History of Antioch*, pp. 364, 387f.
46. Chrysostom, *On Saint Babylas*, 1 (PG 50:529).
47. Chrysostom, *On the Holy Martyr Ignatius*, 5 (PG 50:594f).
48. Chrysostom, *On the Holy Martyrs*, 2 (PG 50:649).
49. Chrysostom, *On the Martyrs Juventinus and Maximinus*, 3 (PG 50:576).
50. Chrysostom, *On Saint Meletius*, 3 (PG 50:520).
51. Chrysostom, *Homilia dicta postquam reliquiae martyrum*, 1 (PG 63:469).
52. Chrysostom, *On the Maccabees*, 1.1 (PG 50:618).

53. Chrysostom, *On Saint Barlaam*, 1 (PG 50:675–677).
54. Ibid., 4 (PG 50:682).
55. Chrysostom, *On Saint Lucian*, 3 (PG 50:525).
56. Chrysostom, *An Encomium on Egyptian Martyrs*, 2 (PG 50:697f).
57. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," p. 122.
58. Chrysostom, *On the Maccabees*, 1.3 (PG 50:622).
59. Chrysostom, *On the Virgin and Martyr Saint Pelagia*, 1 (PG 50:580).
60. Eg ibid.
61. Chrysostom, *On Saint Babylas*, 3 (PG 50:534).
62. Chrysostom, *On the Holy Martyrs*, 2 (PG 50:710).
63. Victricius, *Praising the Saints*, 8 (PL 20:450).
64. Ibid., 11f (PL 20:453–8).
65. Ibid., 6 (PL 20:447).
66. Jerome, *Against Vigilantius*, 4.
67. Ibid., 6.
68. Ibid., 10.
69. Ibid., 13f.
70. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," p. 185.
71. *Acta Saturnini*, 16–20 (PL 8:699–703).
72. Brown, *Augustine of Hippo*, p. 215.
73. Augustine, *Sermons*, 318.1 (PL 38:1438).
74. Cf Augustine, *Sermons*, 328.4 (PL 38:1453), *Sermons*, 327.2 (PL 38:1451).
75. *Acta Saturnini*, 18 (PL 8:701).
76. Augustine, *Sermons*, 299A.augm.2.
77. Garbarino, "Resurrecting the Martyrs," pp. 152f.
78. Augustine, *Sermons*, 280.6 (PL 38:1283).
79. Ibid., 325.1 (PL 38:1447).
80. Ibid., 311.1 (PL 38:1414).
81. Ibid., 313E.5.
82. Ibid., 273.7 (PL 38:1251).
83. Ibid., 273.8 (PL 38:1251f).

84. Augustine, *Sermons*, 273.9 (PL 38:1252).
85. Ibid., 285.5 (PL 38:1295).
86. Augustine, *Sermons*, 306E.6, *Sermons*, 260E.2.
87. Augustine, *Sermons*, 328.9.
88. Ibid., 328.9.
89. For the following see Schaff, *History of the Christian Church*, 3, pp. 361–383.
90. Justin Martyr, *Dialogue with Trypho*, 100; Tertullian, *On the Flesh of Christ*, 17; Irenaeus, *Against Heresies*, 3.22.4.
91. Irenaeus, *Against Heresies*, 5.19.1.
92. Augustine, *On Nature and Grace*, 36.42.
93. Augustine, *Against Faustus*, 1.20.21.

باب 16

1. Serapion of Thmuis, *Letter to the Disciples of St. Anthony*, 5, 7f; in: Draguet, "Une lettre de Sérapion de Thmuis," pp. 4f, 13.
2. Athanasius, *The Life of St. Anthony*, 2.
3. Ibid., 3.
4. Ibid., 4.
5. Ibid., 5.
6. Ibid., 6.
7. Ibid., 7.
8. Ibid., 8.
9. Ibid., 9.
10. Ibid., 10.
11. Ibid., 12.
12. Ibid., 13.
13. Ibid., 14.
14. Harmless, *Desert Christians*, 90–93.
15. Athanasius, *The Life of St. Anthony*, 11f.
16. Ibid., 13,23,35, esp. 74–80.
17. Ibid., 14.

18. Ibid., 15.
19. Ibid., 14.
20. Ibid., 46.
21. Ibid., 47.
22. Ibid., 49.
23. Ibid., 58.
24. Ibid., 84.
25. Eg ibid., 62–64.
26. Eg ibid., 82,65.
27. Eg ibid., 58,59,62.
28. Ibid., 89ff.
29. Ibid., 86.
30. Ibid., 82.
31. Cf Justin Martyr, *Apology*, 1.5.
32. Athanasius, *The Life of St. Anthony*, 80.
33. Ibid., 84.
34. Ibid., 81.
35. Ibid., 89–92.
36. Ibid., 91.
37. Ibid., 92.
38. Harmless, *Desert Christians*, pp. 115–141.
39. Ibid., p. 123.
40. Boon, *Pachomiana latina*, ep. 7, p. 95.
41. Harmless, *Desert Christians*, pp. 271–280.
42. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Macarius the Egyptian 1 (PG 65:257–260).
43. Harmless, *Desert Christians*, pp. 279–281.
44. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Antonius 34 (PG 65:85–88).
45. Harmless, *Desert Christians*, pp. 281f.

باب 17

1. Horsley, *New Documents*, pp. 126–130.
2. Theodoret, *Religious History*, 21.

3. Harmless, *Desert Christians*, p. 426.
4. Theodoret, *Religious History*, 26.
5. Moffett, *A History of Christianity, 1*, pp. 75–77.
6. Murray, "The Exhortation to Candidates," pp. 58–79.
7. Harmless, *Desert Christians*, pp. 427f.
8. Ephrem the Syrian, *Hymns on Paradise*, 7.17; in: Brock, *St. Ephrem the Syrian*, p. 125.
9. Palladius, *Historia Lausiaca*, PG 34:1204.1209.
10. Gather, *The Concept of Philanthropy in the Early Syrian Fathers*, pp. 82–86.
11. Harmless, *Desert Christians*, pp. 432–435.
12. Basil of Caesarea, *Regulae Fusius Tractatae (Longer Rule)*, 7.4.34f (PG 31:933).
13. Ibid., 3.1.80–82 (PG 31:917).

باب 18

1. Palladius, *Historia Lausiaca*, Moses the Ethiopian 22 (PG 34:1067).
2. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Macarius the Egyptian 23 (PG 65:272).
3. Ibid., Eupreprius 7 (PG 65:172).
4. Ibid., Paul the Simple (PG 65:381).
5. Ibid., Pambo 2 (PG 65:368).
6. Nau, F. [ed.], "Histoire des Solitaires Égyptiens18," 399, p. 146.
7. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Felix (PG 65:433).
8. Ibid., Poimen 93 (PG 65:344f).
9. Guy, *Les Apophtegmes*, 2.1, p. 124.
10. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Rufus 1 (PG 65:389).
11. Guy, *Les Apophtegmes*, 2.15, p. 132.
12. Ibid., 7.46, pp. 376–378.
13. Athanasius, *Apologia ad Constantium*, 33, line 1–6 (PG 25:640).

14. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Olympius 2 (PG 65:313–316).
15. Guy, *Les Apophtegmes*, 5.31, pp. 268–270.
16. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Amon 10 (PG 65:121–124).
17. Ibid., Eudemon (PG 65:176).
18. Nau, F. [ed.], "Histoire des Solitaires Égyptiens 13," 166, p. 54.
19. Guy, *Les Apophtegmes*, 5.13, p. 252.
20. Ibid., 5.17, p. 254.
21. Ibid., 5.16, pp. 252–254.
22. *Verba Seniorum*, 4.19 (PL 73:867).
23. Ibid., 5.22 (PL 73:878f).
24. Ibid., 5.40 (PL 73:886).
25. Augustine, *Sermons*, 211.7 (PL 38:1057f).
26. *Verba Seniorum*, 16.10 (PL 73:971).
27. Guy, *Les Apophtegmes*, 7.3, pp. 336–338.
28. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Isidor 7 (PG 65:221).
29. *Verba Seniorum*, 7.33 (PL 73:901).
30. Guy, *Les Apophtegmes*, 4.9, p. 188.
31. *Verba Seniorum*, 18.18 (PL 73:983f).
32. Ibid., 15.60 (PL 73:964).
33. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Macarius 27 (PG 65:273).
34. Ibid., Apollos 2 (PG 65:133–136).
35. Ibid., Macarius the Egyptian 37 (PG 65:277–280).
36. Guy, *Les Apophtegmes*, 3.4, p. 150.
37. Ibid., 1.2, p. 102.
38. *Verba Seniorum*, 15.28 (PL 73:959).
39. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Sisoes 14 (PG 65:396).
40. Guy, *Les Apophtegmes*, 9.2, p. 426.
41. *Verba Seniorum*, 10.40 (PL 73:920).
42. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Olympius 1 (PG 65:313).
43. *Verba Seniorum*, 15.2 (PL 73:953).
44. Ibid., 15.87 (PL 73:968).

45. Cf. *Verba Seniorum*, 15.68 (PL 73: 965).
46. Athanasius, *The Life of St. Anthony*, 35 (PG 26:893).
47. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Poemen 139 (PG 65:356f).
48. Ibid., Silvanus 3 (PG 65:409).
49. *Verba Seniorum*, 12.8 (PL 73:942).
50. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Pambo 12 (PG 65:372).
51. Ibid., Pambo 9 (PG 65:371f).
52. *Verba Seniorum*, 11.20 (PL 73:936).
53. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Poemen 8 (PG 65:321–324).
54. Ibid., Achilles 5 (PG 65:125).
55. Palladius, *Historia Lausiaca*, Heron 32 (PG 34:1091).
56. *Verba Seniorum*, 10.94 (PL 73:929).
57. *Apophthegmata (Alph. Coll.)* Poimen 183 (PG 65:365–368).

باب 19

1. Cassian, *Conferences of the Desert Fathers*, 2.5.

باب 20

1. Lactantius, *On the Death of the Persecutors*, 12; Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 137.
2. Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 144.285.
3. Chrysostom, *Homilies on John*, 3.1, cf 1.1.

باب 21

1. Eusebius, *Life of Constantine*, 4.18–20.
2. Eg Ignatius, *Letter to the Magnesians*, 8f; *Epistle of Barnabas*, 15; Justin Martyr, *Apology*, 1.67; Irenaeus, *Against Heresies*, 4.16.
3. Pliny the Younger, *Letters*, 10.96f.
4. Justin Martyr, *Apology*, 1.67.3–7.
5. Ibid., 1.13.1f.
6. Tertullian, *The Prescription Against Heretics*, 41.

باب 22

1. Socrates of Constantinople, *Ecclestiastical History*, 1.9; Theodoret, *Ecclestiastical History*, 1.10; Eusebius, *Life of Constantine*, 2.17.

باب 23

1. Justin Martyr, *Apology*, 61.2–4,9–13.
2. Tertullian, *On Repentance*.
3. Cyprian, *On Works and Alms*.
4. Schaff, *Nicene and Post-Nicene Christianity*, pp. 411ff.
5. Justin Martyr, *Apology*, 65.2–66.2.
6. Justin Martyr, *Dialogue with Trypho*, 22.8–11, 23.3, 41.2–3, 116.3–117.3, 118.2.
7. Schaff, *Nicene and Post-Nicene Christianity*, pp. 421ff.

باب 24

1. Ignatius, *Letter to the Trallians*, 7.2.
2. Eg Tertullian, *On the Soul*, 51.6, *On Baptism*, p. 17.1.
3. Eg Cyprian, *Epistles*, 54.5, 61.1.
4. Irenaeus, *Against Heresies*, 4.8.3.
5. Tertullian, *On Exhortation to Chastity*, 7.
6. *1Clement*, 44; Cyprian, *Epistles*, 40.1.
7. Cyprian, *Epistles*, 5.4.
8. *Council of Carthage (397)*, Canon 98; cited in Schaff, *Ante-Nicene Christianity*, p. 83.
9. Baumer, *The Church of the East*, p. 78.
10. Ibid., p. 78.

باب 25

1. *1Clement*, 42.
2. Jerome, *Commentary on Titus*, 1.5 (PL 26:563) , *Letter to Evangelus*, 1; cf Augustine, *The City of God*, 22.10.
3. Jerome, *Letter to Evangelus*, 1.
4. Schaff, *Ante-Nicene Christianity*, p. 90.

5. Ignatius, *Letter to the Smyrnaeans*, 8.2.
6. Ibid., 8.1.
7. Ignatius, *Letter to the Ephesians*, 6.1.
8. Irenaeus, *Against Heresies*, 3.3.1f, 3.4.1, 4.33.8.
9. Ibid., 3.2.2.
10. Tertullian, *The Prescription Against Heretics*, 32, 36.
11. Tertullian, *On Modesty*, 21.17.
12. Cyprian, *Epistles*, 68.8.
13. *Council of Carthage (397)*, Canon 3; cited in Schaff, *Ante-Nicene Christianity*, p. 95.
14. Schaff, *Nicene and Post-Nicene Christianity*, pp. 229–237.
15. Ibid., pp. 224–228.

باب 26

1. Ibid., pp. 250–253.

باب 28

1. Ignatius, *Letter to the Smyrnaeans*, 8.2.
2. Ignatius, *Letter to the Ephesians*, 5, *Letter to the Trallians*, 7, *Letter to the Philadelphians*, 3.
3. Irenaeus, *Against Heresies*, 3.24.1.
4. Tertullian, *On Idolatry*, 24.3.

باب 29

1. Tertullian, *On Modesty*, pp. 19.28, 21.2.
2. Schaff, *Ante-Nicene Christianity*, pp. 119–123.

باب 30

1. For Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 162–164.
2. For the following see ibid., pp. 136ff.
3. Pavouris, "The Condemnation," 139ff.
4. For the following see ibid., pp. 145ff.

5. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 183ff; *http://patristica.net/553*.
6. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 164ff.
7. Beyschlag, *Grundriß der Dogmengeschichte, vol. 2.1*, pp. 185ff; *http://patristica.net/680*.

باب 31

1. Palladius, *Historia Lausiaca*, Euagrius 86 (PG 34:1188–1195).
2. For the following see Chadwick, *Die Kirche in der antiken Welt*, pp. 214–23; Harmless, *Desert Christians*, pp. 359–63.
3. Cassian, *Conferences of the Desert Fathers*, 10.2f.
4. Evagrius Pontikus, *The Praktikos*, 6.
5. Ibid., 12.
6. Evagrius Pontikus, *The Antirrhetikos*, 8.1.
7. For the following Harmless, *Desert Christians*, pp. 349ff.
8. Evagrius Pontikus, *Kephalaia Gnostika*, 6.18, 6.20, 1.68, 3.2, 3.57.
9. Evagrius Pontikus, *Great Letter to Melania*, 56–59.
10. Ibid., 27, cf 22.
11. Evagrius Pontikus, *On Prayer*, 72.
12. Evagrius Pontikus, *The Praktikos*, 81.
13. Ibid., 89.
14. Eg Evagrius Pontikus, *Kephalaia Gnostika*, 2.16.
15. Evagrius Pontikus, *On Prayer*, 57, 67f, 70-75, 117–120.
16. Ibid., 36.
17. Evagrius Pontikus, *Peri Logismon*, 39, *Skemmata*, 25; see Harmless, *Desert Christians*, pp. 353f.
18. Cassian, *On the Institutes of the Coenobia, and the Remedies for the Eight Principal Faults*.
19. Cassian, *Conferences of the Desert Fathers*.

20. Cassian, *Conferences of the Desert Fathers*, 10.7ff.

References

NOTE: PG 1:2 = PATROLOGIA GRAECA VOL. 1, P. 2
PL 4:5 = PATROLOGIA LATINA VOL. 4, P. 5

Adam, A. *Lehrbuch der Dogmengeschichte*. 5th ed. Vol. 1. Gütersloh: Gütersloher Verlagshaus, 1985.

Aland, K. u. B. *Der Text des Neuen Testaments*. Stuttgart: Deutsche Bibelgesellschaft, 1982.

Althaus, P. *Die christliche Wahrheit. Lehrbuch der Dogmatik*. 7th ed. Gütersloh, 1966.

Andresen, C. and A. M. Ritter, eds. *Handbuch der Dogmen- und Theologiegeschichte*. unter Mitarb. v. Gustav Adolf Benrath… Vol. 1: *Die Lehrentwicklung im Rahmen der Katholizität*. v. Carl Andresen… 2nd ed. Göttingen: Vandenhoeck & Ruprecht, 1999.

Appleyard, D. "Ethiopian Christianity." In: *Blackwell Companions to Religion. The Blackwell Companion to Eastern Christianity*. Ed. by K. Parry. Malden MA, Oxford UK, and Victoria Australia: Blackwell, 2007.

Asmussen, J. "Christians in Iran." In: *The Seleucid, Parthian and Sasanian Periods*. Ed. by E. Yarshater. Vol. 3.2. The Cambridge History of Iran. Cambridge, 1983.

Athenagoras of Athens. *A Plea for the Christians*.

Atiya, A. S. *A History of Eastern Christianity.* London: Kraus Reprint, 1991.

Augustine. *Various Questions in Response to Simplician.*

Baumer, C. *The Church of the East. An Illustrated History of Assyrian Christianity.* London and New York: I.B. Taurus, 2006.

Beyschlag, K. *Grundriß der Dogmengeschichte. Gott und Mensch. Das christologische Dogma.* Vol. 2.1. Darmstadt: Wissen. Buchgesellsch., 1991.

– *Grundriß der Dogmengeschichte. Gott und Mensch. Die abendländische Epoche.* Vol. 2.2. Darmstadt: Wissen. Buchgesellsch., 1999.

– *Grundriß der Dogmengeschichte. Gott und Welt.* Vol. 1. Darmstadt: Wiss. Buchgesellsch., 1982.

Bonaiuti, E. and G. La Piana. "The Genesis of St. Augustine's Idea of Original Sin." In: *The Harvard Theological Review* 10/2 (1917), pp. 159–175.

Boon, A. *Pachomiana latina.* Louvain: Bibliothèque de la Revue d'histoire ecclésiastique, 1932.

Bowersock, G. W. *Martyrdom and Rome.* Cambridge: Cambridge University Press, 1995.

Brock, S. [*St Ephrem the Syrian, Hymns on Paradise.* Crestwood NY: St Vladimir's Seminary Press, 1990.

Brown, P. *Augustine of Hippo. A Biography.* Berkeley and Los Angeles: University of California Press, 1967.

– *The Cult of the Saints: its Rise and Function in Latin Christianity.* Chicago: University of Chicago Press, 1981.

Browne, L. E. *The Eclipse in Eastern Christianity. From the Time of Muhammad till the Fourteenth Century.* New York: Howard Fertig, 1967.

Buck, C. *Paradise and Paradigm. Key Symbols in Persian Christianity and Bahai Faith.* Albany: State University of New York, 1999.

Chadwick, H. *Die Kirche in der antiken Welt.* Berlin and New York, 1972.

Chevallier, R. *Roman Roads.* B.T. Batsford, 1976.

Chrysostom. *Homilia dicta postquam reliquiae martyrum.*

Comneno, M. "Nestorianism in Central Asia during the First Millennium: Archaeological Evidence. Archaeological evidence." In: *Journal of Assyrian Academic Studies* 11:1.1 (1997), pp. 20–53.

Cureton, W. *Ancient Syriac Documents. Relative to the Earliest Establishment of Christianity in Edessa and the Neighboring Countries, From the Year of our Lords Ascension to the Beginning of the Fourth Century; discovered, edited, translated and annotated by the late W. Cureton.* London: William and Norgate, 1864.

Downey, G. *A History of Antioch in Syria: From Seleucus to the Arab Conquest.* Princeton: Princeton University Press, 1961.

Draguet, R. "Une lettre de Sérapion de Thmuis aux disciples d'Antoine (A.D. 356) en version syriaque et arménienne." In: *Le Muséon* 64 (1951), pp. 1–25.

Ephrem the Syrian. *Carmina Nisibina.* Trans. by G. Bickell. additis prolegomenis et supplemento lexorum syriacorum. primus edidit, vertit, explicavit Dr. Gustavus Bickell. Leipzig: F.A. Brockhaus, 1866.

Fairbairn, D. "Patristic Exegesis and Theology: The Cart and the Horse." In: *Westminster Theological Journal* 69 (2007), pp. 1–19.

Frend, W. H. *The Archaeology of Early Christianity.* Minneapolis, MN: Fortress Press, 1998.

Garbarino, C. "Resurrecting the Martyrs. The Role of the Cult of the Saints, AD 370-430." PhD thesis. Louisiana State University, 2010.

Gather, J. *The Concept of Philanthropy in the Early Syrian Fathers.* Version The Concept of Philanthropy. URL: http://

academiccommons.columbia.edu/download/fedora_content/download/ac:138610/CONTENT/SophiaVol2Gather.pdf.

Gillmann, I. and H.-J. Klimkeit. *Christians in Asia Before 1500*. Richmond UK: Curzon Press, 1999.

Greppin, J. A. "Syriac Loanwords in Classical Armenian." In: *Humanism, Culture, and Language in the Near East: Studies in Honor of Georg Krotkoff*. Ed. by A. Afsaruddin and A. Mathias Zahniser. Winona Lake, Indiana: Eisenbrauns, 1997, pp. 247–251.

Guy, J.-C. *Les Apophtegmes des Pères, 1. Collection systématique. Chapitres I-IX*. Vol. 387. Sources Chrétiennes. Paris: Éditions du Cerf, 1993.

Hage, W. *Das orientalische Christentum*. Kohlhammer, 2007.

Harmless, W. *Desert Christians : An Introduction to the Literature of Early Monasticism*. New York: Oxford University Press, 2004.

Horsley, G. *New Documents Illustrating Early Christianity*. Vol. 1. North Ryde, N.S.W: Macquarrie University, 1976.

Kawerau, P. *Chronicle of Arbela*. In: *Encyclopaedia Iranica*. Ed. by E. Yarshater. URL: www.humanities.uci.edu/sasanika/pdf/ChronicleofArbela.pdf,%20urldate%20=%20%7B2011-08-30%7D (visited on 03/30/2011).

Kyle, R. "Nestorius: The Partial Rehabilitation of a Heretic." In: *Journal of the Evangelical Theological Society* 32/1 (1989), pp. 73–83.

Lerner, C. B. *The Wellspring of Georgian Historiography. The Early Medieval Historical Chronicle 'The Conversion of Kartli' and 'The Life of St. Nino'*. translated with Introduction, Commentary and Indices by Lerner. London: Bennett and Bloom, 2004.

Lietzmann, H. *Apollinaris von Laodicea und seine Schule: Texte und Untersuchungen*. Mohr, 1904.

Loofs, F. *Leitfaden zum Studium der Dogmengeschichte. 1. und 2. Teil: Alte Kirche, Mittelalter und Katholizismus bis zur Gegenwart.* Ed. by K. Aland. 7th ed. Niemeyer, 1968.

– *Nestoriana : die Fragmente des Nestorius. ges., unters. und hrsg. v. F. Loofs. mit Beitr. v. S.A. Cook & G. Kampffmeyer.* Niemeyer, 1905.

Luttikhuizen, F. *The Nestorians: A Forgotten Link in the Transfer of Greek Science to the West.* 2005. URL: https://www.academia.edu/12126231/The_Nestorians_A_Forgotten_Link_in_the_Transfer_of_Greek_Science_to_the_West.

McLeod, F. "Theodore of Mopsuestia Revisited." In: *Theological Studies* 29–31 (2000), pp. 456–459.

Medlycott, A. *India and the Apostle Thomas. An Inquiry, with a Critical Analysis of the Acta Thomae.* London: David Nutt, 1905.

Moffett, S. *A History of Christianity in Asia. Beginnings to 1500.* 2nd ed. Vol. 1. American Society of Missiology Series 35. Maryknoll, New York: Orbi, 1998.

Murray, R. "The Exhortation to Candidates for Ascetical Vows at Baptism in the Ancient Syrian Church." In: *New Testament Studies* 21 (1974–75), pp. 58–79.

Musurillo, H. A., ed. *The Acts of the Christian Martyrs.* Oxford Early Christian Texts. introduction, texts and translations by Herbert Musurillo. Oxford: Clarendon Press, 1972.

Najim, M. *Antioch and Syrian Christianity. A Chalcedonian Perspective on a Spiritual Heritage.* Ed. by T. Frazer. URL: www.stnicholasla.com/frmichel/antiochandsyriacchristianity.pdf (visited on 08/31/2011).

Nau, F. [ed.] "Histoire des Solitaires Égyptiens." In: *Revue de l'Orient Chrétien* 13 (1908), pp. 47–66, 266–297.

– "Histoire des Solitaires Égyptiens." In: *Revue de l'Orient Chrétien* 18 (1913), pp. 137–146.

Nersessian, V. N. "Armenian Christianity." In: *Blackwell Companions to Religion. The Blackwell Companion to Eastern Christianity*. Ed. by K. Parry. Malden MA, Oxford UK, and Victoria Australia: Blackwell, 2007.

Neusner, J. *A History of the Jews in Babylonia*. Vol. 12.3: *From Shapur I to Shapur II*. Studia Post Biblica. Leiden: E.J. Brill, 1968.

– *A History of the Jews in Babylonia*. Vol. 11.2: *The Early Sasanian Period*. Studia Post Biblica. Leiden: E.J. Brill, 1966.

– "The Jews in Pagan Armenia." In: *Journal of the American Oriental Society* 84.3 (1964), p. 11.

Omer, I. "Sudan Connection: Are Ethiopian Jews Descendants of Ancient Israelites?" In: (July, 2013). URL: https://www.geneticliteracyproject.org/2013/07/22/the-sudan-connection-are-ethiopian-jews-descendants-of-the-ancient-israelites/.

Origenes: Vier Bücher von den Prinzipien. Hrsg., übers., mit krit. u. erl. Anm. vers. v. H. Görgemanns und H. Karpp. 2nd ed. Vol. 24. Texte zur Forschung. Wissenschaftliche Buchgesellschaft, 1985.

Pavouris, R. "The Condemnation of the Christology of the Three Chapters in its Historical and Doctrinal Context: the Assessment and Judgement of Emperor Justinian and the Fifth Ecumenical Council (553)." PhD thesis. University of Glasgow, 2001.

Philip, T. *East of the Euphrates. Early Christianity in Asia*. Tiruvalla: CSS & ISPCK, 1998.

Potts, D. T. *Mesopotamian Civilization. The Material Foundations*. New York: Cornell University Press, 1997.

Rapp Jr., S. H. "Georgian Christianity." In: *Blackwell Companions to Religion. The Blackwell Companion to Eastern Christianity*. Ed. by K. Parry. Malden MA, Oxford UK, and Victoria Australia: Blackwell, 2007.

Roman road system. In: *Encyclopædia Britannica. Encyclopædia Britannica Online*. Encyclopædia Britannica Inc., 2016. URL: https://www.britannica.com/technology/Roman-road-system (visited on 04/02/2016).

Rooy, H. v. "Reading the Psalms Historically. Antiochene Exegesis and a Historical Reading of Psalm 46." In: *Acta Theologica* 29/2 (2009), pp. 120–134.

Rouet de Journel, M. J., ed. *Enchiridion Patristicum. Loci SS. Patrum, Doctorum Scriptorum Ecclesiasticorum*. 5th ed. Herder, 1922.

Schaff, P. *Ante-Nicene Christianity. A.D. 100-325*. 5 (rev.) Vol. 2. History of the Christian Church. Oak Harbor, WA: Logos Research Systems, Inc., 1997 (1910).

– *Nicene and Post-Nicene Christianity. From Constantine the Great to Gregory the Great A.D. 311–600*. 5 (rev.) Vol. 3. History of the Christian Church. Oak Harbor, WA: Logos Research Systems, Inc., 1997 (1910).

Schürer, E. *The History of the Jewish People in the Age of Jesus Christ (175 B.C.-135 A.D.)* Ed. by G. Vermes, F. Millar, and M. Black. revised edition. Vol. 2. Edinburgh: T. & T. Clark, 1979.

Seeberg, R. *Lehrbuch der Dogmengeschichte. Die Dogmengeschichte der alten Kirche*. Vol. 1. Erlangen: Deichert, 1895.

Sellwood, D. *Adiabene*. In: *Encyclopaedia Iranica*. Ed. by E. Yarshater. URL: http://www.iranicaonline.org/articles/adiabene,%20urldate%20=%20%7B2011-08-30%7D (visited on 05/10/2016).

Sims-Williams, N. *Christian Literature in Middle Iranian Languages*. In: *Encyclopaedia Iranica*. Ed. by E. Yarshater. URL: url%20=%20%7Bhttp://www.iranicaonline.org/articles/christianity-iv%7D,%20urldate%20=%20%7B2011-08-31%7D (visited on 03/30/2011).

Smallwood, E. "Domitian's attitude towards the Jews and Judaism." In: *Classical Philology* 51 (1956), pp. 1–13.

Sundermann, W. *Mani.* In: *Encyclopaedia Iranica.* Ed. by E. Yarshater. URL: http://www.iranicaonline.org/articles/mani-founder-manicheism%20(accessed%202%20May,%202016) (visited on 03/30/2011).

– *Manicheism. i. Survey.* In: *Encyclopaedia Iranica.* Ed. by E. Yarshater. URL: available%20at%20http://www.iranicaonline.org/articles/manicheism-1-general-survey (visited on 03/30/2011).

The Chronicle of Arbela. Corpus Scriptorum Christianorum Orientalium 468 (Scriptores Syri 200 1985).

"The Chronicle of Edessa." In: *The Journal of Sacred Literature.* New Series [=Series 4] 5 (1864), pp. 28–45.

The Council of Mar Dadišo' 424 AD. Trans. by M. Birnie. URL: http://www.fourthcentury.com/the-council-of-mar-dadiso-ad-424 (visited on 08/30/2011).

The Council of Mar 'Ishaq 410 AD. Trans. by M. Birnie. URL: http://www.fourthcentury.com/the-council-of-mar-ishaq-ad-410 (visited on 08/30/2011).

Thomson, R. *Moses Khorenats'i. History of Armenia.* Trans. and comm. by R. Thomson. trans. and comm. on the literary sources by R.W. Thomson. Cambridge MA and London UK: Harvard University Press, 1978.

Vööbus, A. *Studies in the History of the Gospel Text in Syriac.* Vol. 1. Corpus Scriptorum Christianorum Orientalium 128. Louvain, 1951.

Vööbus, A. *History of Asceticism in the Syrian Orient. A Contribution to the History of Culture in the Near East.* 2 vols. CSCO and Subsidia 184 and 197 and 14 and 17. Subsidia 14 and 17. Leuven: Peeters Publishers, 1958 and 1960.

Weinandy, T. "Cyril and the Mystery of the Incarnation." In: *The Theology of St. Cyril of Alexandria. A Critical Ap-*

preciation. Ed. by T. Weinandy and D. Keating. London, 2003, 23ff.

Witek, J. “China and Christianity. Universal Teaching From the West.” In: *Burdened Past, Hopeful Future*. Ed. by S. Uhalley and X. Wu. New York: M.E. Sharp, 2000, pp. 11–28.

p. 26:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ASocrates_Louvre.jpg
Sting [CC BY-SA 2.5 (http://creativecommons.org/licenses/by-sa/2.5)], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 34:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ACaesarea_maritima_BW_4.JPG
By Berthold Werner (Own work) [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 38:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ACaesarea_maritima_BW_4.JPG
By Berthold Werner (Own work) [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 61:
https://commons.wikimedia.org/untitled-8wiki/File%3ACtesiphon-ruin_1864.jpg
See page for author [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 60:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ADura_Europos_baptistry_overview.jpg
See page for author [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 64:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3AFrits-Holm-Chinas-Foremost-Monument-the-Chingchiaopei.png
By Frits V. Holm (? - 1930) [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 36:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3AGandharan_Athena.jpg
By Uploadmo (Own work, photographed at Musee Guimet) [CC BY-SA 3.0 (http://creativecommons.org/licenses/by-sa/3.0) or GFDL (http://www.gnu.org/copyleft/fdl.html)], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons

p. 57:
(modified with Urdu names)
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3AN-Mesopotamia_and_Syria-ar.svg
By Rafy [CC BY-SA 3.0 (http://creativecommons.org/licenses/by-sa/3.0)], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 34:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ASilver_tetradrachm_obverse_Alexander_the_Great_CdM_Paris_FG718.jpg
See page for author [CC BY 2.5 (http://creativecommons.org/licenses/by/2.5)], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 72:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3ATombs_of_the_kings_Jerusalem_Holy_Land.jpg
By SnapshotsOfThePast (Tombs of the kings Jerusalem Holy Land) [CC BY-SA 2.0 (http://creativecommons.org/licenses/by-sa/2.0)], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons
p. 42:
https://commons.wikimedia.org/wiki/File%3AWailing_Wall_by_Gustav_Bauernfeind.png
By Gustav Bauernfeind (1848-1904) (Sotheby's) [Public domain], via Wikimedia Commons from Wikimedia Commons